اردو زبان میں سرورِ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے جامع ترین کتاب

سیرۃ النبی ﷺ

علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ

علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

جلد اوّل

ادارہ اسلامیات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض ناشر

اس ذات پاک کے نام سے جس کے دست قدرت میں ہر کام کی ابتدا و انتہا ہے اور جو آغاز کو انجام تک پہنچانے والا ہے۔

اور

اس کے اسم مبارک سے جو ہر کام میں آسانیاں پیدا کرنے والا اور مسافروں کے لئے راستوں کو لپیٹ دینے والا ہے۔

اور

اس کے نام نامی سے جو برکت ڈالنے والا اور توفیق بخشنے والا ہے۔

اس کے احسانات کا کتنا شکر ادا کیا جائے کہ اس نے پیغمبر آخر الزماں سرور کائنات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت و سوانح پر مشہور کتاب "سیرت النبی" جدید انداز سے عمدہ معیار کے ساتھ طبع کرنے کی توفیق ہمیں عطا فرمائی۔

"سیرت النبی" مؤلفہ علامہ شبلی نعمانی / سید سلیمان ندوی وہ معروف و بے مثل کتاب ہے جو اب سیرت کی جانی پہچانی کتب میں شمار کی جاتی ہے۔ ان دو اکابر علماء کی یہ تصنیف اپنی گوناگوں خصوصیات کی بنا پر ہر دور میں مقبول رہی ہے۔ اس موقع پر ہم اس شہرۂ آفاق کتاب کی خصوصیات کا ذکر اس لئے نہیں کرنا چاہتے کہ کتاب کے اندرونی صفحات پر حضرت سید سلیمان ندوی نے تفصیل سے ان کو بیان کیا ہے اور ان پر کسی اضافہ کی نہ ضرورت ہے اور نہ گنجائش۔

البتہ اس ایڈیشن کی اشاعتی خصوصیات کے بارے میں ہمیں کچھ عرض کرنا ہے۔ ہر دور میں ناشرین اس کتاب کی اشاعت کو اپنے لئے سعادت سمجھ کر اپنے اپنے انداز میں شائع کرتے آئے ہیں۔ ہمارا ادارہ "ادارۂ اسلامیات" جو قرآن مجید اور عربی، اردو، انگریزی اسلامی کتب کا اندرون و بیرون ملک ممتاز و جانا پہچانا ادارہ ہے، اب تک سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اردو و انگریزی میں بہت سی کتب شائع کر چکا ہے جو اللہ تعالیٰ کے فضل سے بہت پسند کی گئی ہیں۔ ہماری بہت عرصے سے خواہش تھی کہ ہمارے ادارے کو "سیرت النبی" بھی شائع کرنے کی سعادت حاصل ہو۔ ہم بھی چاہتا تھا کہ اگر اس کام کا بیڑا اٹھایا جائے تو یہ ایڈیشن مروجہ ایڈیشنوں

سے معیار کے لحاظ سے منفرد ثابت ہو اور کتاب اور سیرت کے موضوع کی کوئی اضافی خدمت ہمارے حصے میں آ جائے۔ چنانچہ آج جب آپ کے ہاتھوں میں یہ کتاب موجود ہے تو ہمارے دل اللہ تعالیٰ کے حضور شکر کے جذبات سے معمور ہیں کہ اس ایڈیشن میں متعدد خصوصیات ایسی ہیں جو تاحال کسی بھی نسخے میں موجود نہیں ہیں اور اس طرح یہ نسخہ دیگر ایڈیشنوں سے ممتاز ٹھہرتا ہے۔ ان خصوصیات میں چند ایک درج ذیل ہیں۔

۱۔ یہ نسخہ جدید کمپیوٹر کتابت پر کمپوز کیا گیا ہے جس میں خوبصورتی۔ تناسب اور موزونیت کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔

۲۔ تصحیح کے معاملے میں خصوصی احتیاط سے کام لیا گیا ہے۔ متعدد بار تصحیح کرائی گئی ہے اور اب ان شاء اللہ امید ہے کہ تصحیح کے اعتبار سے یہ ایڈیشن دیگر نسخوں پر فائق ہوگا۔

۳۔ یہ کتاب اب تک شایانِ شان کاغذ پر نہیں چھپ سکی تھی اور عموماً ادنیٰ اور متوسط کاغذ پر چھاپی جاتی رہی تھی۔ اب پہلی بار یہ کتاب اعلیٰ امپورٹڈ آفسٹ کاغذ پر بھی چھاپی جا رہی ہے جس سے کتاب کے حسن میں اضافہ ہوا ہے۔

۴۔ طباعت میں بھی معیار عام طباعت سے بہتر رکھا گیا ہے اور یہ فرق نمایاں اور واضح ہے۔

۵۔ جلد سازی میں بھی خوبصورتی اور پائیداری کا خصوصی اہتمام کیا گیا ہے۔

۶۔ ایک بہت بڑی خصوصیت جو "ادارۂ اسلامیات" کے ایڈیشن کو بالکل مختلف اور منفرد درجہ دیتی ہے، اس نسخے میں سیرت سے متعلق نادر و نایاب قدیم و جدید تصاویر (عموماً رنگین) اور نقشوں کا اضافہ ہے۔ کافی عرصے سے ہمارا ارادہ تھا کہ سیرت النبیؐ سے متعلق آثار اور نشانیوں میں سے جن مقامات اور اشیاء کی تصاویر مل سکتی ہیں وہ اس کتاب میں شامل کی جائیں۔ یہ کام اس لئے بھی اہم ہے کہ ڈیڑھ ہزار سال کے بعد اب بہت سی نشانیاں اور آثار معدوم ہوتے جا رہے ہیں، چنانچہ ان کی حفاظت آئندہ کے لئے ضروری ہے۔ بیان کرنے میں یہ کام جتنا آسان ہے، عملاً اتنا ہی دشوار ثابت ہوا اور مطلوبہ تصاویر حاصل کرنے میں مہینے نہیں بلکہ سال لگ گئے۔ اس سلسلے میں یہ کوشش کی گئی کہ یہ تصاویر مستند ذرائع سے حاصل کی جائیں۔ چنانچہ بہت سی تصاویر اس لئے چھوڑ دی گئیں کہ ان کے مآخذ قابلِ اعتماد نہ تھے۔ یہ بھی اہتمام کیا گیا کہ حاصل کردہ تصاویر روشن، واضح اور صاف ہوں اور ان کا طباعتی معیار اعلیٰ ہو۔ نیز کسی مقام سے متعلق عام دستیاب تصویروں پر کسی مقام کی نادر و نایاب (قدیم ہوں یا جدید) تصاویر کو ترجیح دی گئی۔ چنانچہ اب الحمد للہ اس نسخے میں جابجا آپ انتہائی محنت سے شامل کی گئی تصاویر ملاحظہ فرما سکتے ہیں جو سیرت کے متعلقہ مقام کو سمجھنے میں ان شاء اللہ معاون ہوں گی۔ "سیرت النبیؐ" کے جو حصے تاریخی ترتیب کے مطابق اور سوانحی ہیں ان میں یہ تصاویر متعلقہ واقعہ کی مناسبت سے لگائی گئی ہیں جبکہ دیگر حصص میں مختلف مقامات پر یہ تصاویر شامل کی گئی ہیں۔ اس طرح قارئین ان

مقامات کی زیارت سے مشرف ہو سکتے ہیں جہاں چودہ سو سال قبل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پائے مبارک پڑے تھے اور جن کی فضاؤں نے آپؐ کے سانس کی خوشبو جذب کی تھی۔

تصنیف سے لے کر موجودہ ایڈیشن تک برس ہا برس کی محنت ہے۔ مگر یہ محنت ٹھکانے لگ جائے اگر بارگاہِ سرورِ کونین ﷺ میں قبول و منظور ہو جائے۔

دل سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس محنت کو باریاب فرمائے۔ مصنفین و ناشرین سمیت تمام حضرات جو اس کے کسی مرحلے میں شریک یا معاون رہے ہوں اُن کی کوشش کو قبول فرمائے اور تمام فروگزاشتوں اور غلطیوں کو اپنی رحمت سے معاف فرمائے! آمین۔

اشرف برادران (سلیم الرحمٰن)

فہرست مضامین

سیرت النبی ﷺ (حصہ اوّل)

فہرست مضامین

سیرت النبی ﷺ (حصہ دوم)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ طبع ثانی

سیرت النبی ﷺ جلد اول طبع اول کو شائع ہوئے آج چار برس ہوئے، اس اثنا میں خداوند تعالیٰ نے اس کو جو مقبولیت عطا فرمائی وہ ہم جیسے کم زبان و دراز مصنفین کے لئے فخر و ناز کا سرمایہ ہے۔ یہ صرف یہی نہیں کہ عام قدردانوں نے اس کو جوش و دل سے خریدا اور امراء اور والیانِ ملک نے اس کی خدمت کو مستحق داد تحسین سمجھا بلکہ خواص اور علماء کے طبقہ نے بھی اس کی قدرشناسی کی۔

ہندوستان میں اہل علم کا کوئی طبقہ ایسا نہ تھا جس نے اپنے اپنے فن کی میزان نقد میں سیرت کے مضامین و تحقیقات کو نہ تولا ہو، فقہاء نے اس کی آیات قرآنی کو پرکھا، محدثین نے اس کی حدیثیں جانچیں، ادیبوں نے اس کے عربی اشعار اور ترجموں پر نقد کیا، علمائے انساب نے اسماء کی تنقیح کی، منجموں اور حساب دانوں نے اس کے زائچوں اور تاریخوں پر نظر ثانی کی، اہل تاریخ و سیر نے واقعات کی جانچ پڑتال کی اور ہم ممنون ہیں کہ نہایت خلوص و محبت سے انہوں نے اپنے نتائج افکار سے ہم کو مطلع کیا اور ہم نے ان سے فائدہ اٹھایا۔

طبع اول میں جیسا کہ خاتمہ میں ہم نے اقرار کیا تھا چھاپے کے اغلاط اور سہو کے چند مسامحات رہ گئے تھے۔ اس طبع میں جہاں تک امکان انسانی ہے صحیح کی انتہائی کوشش کی گئی ہے اور یقین ہے کہ ان شاء اللہ یہ اغلاط و مسامحات سے پاک ہوگا۔ جو لوگ سیرت پر نقد کرنا چاہتے ہوں ان کو یہی نسخہ پیش نظر رکھنا چاہئے۔

طبع اول بڑی تقطیع پر شائع ہوئی تھی، لوگوں کا اصرار تھا کہ طبع ثانی کتابی تقطیع پر شائع ہو تاکہ وہ با آسانی ہر وقت استعمال میں آسکے۔ یہ ان کی تعمیل ہے۔ ان شاء اللہ ہر جلد کے طبع اول کی بڑی تقطیع کے بعد طبع ثانی چھوٹی تقطیع پر شائع ہوتی رہے گی۔

سید سلیمان ندوی

۲۸ ذیقعدہ ۱۳۳۹ھ

سرنامہ

ایک گدائے بے نوا شہنشاہ کونین کے دربار
میں اخلاص و عقیدت کی نذر لے کر آیا ہے
زچشم آستیں بردار و گوہر را تماشا کن

"شبلی"

شوال ۱۳۳۰ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ ﴾

عالم کائنات کا سب سے بڑا مقصد، بڑا فرض اور سب سے زیادہ مقدس خدمت یہ ہے کہ نفوس انسانی کے اخلاق و تربیت کی اصلاح و تکمیل کی جائے۔ یعنی پہلے ہر قسم کے فضائل اخلاق، زہد و تقویٰ، عصمت و عفاف، احسان و کرم، حلم و عفو، عزم و ثبات، ایثار، وفا، لطف، غیرت، استغنا، کے اصول و فروع نہایت صحیح طریقے سے قائم کئے جائیں اور پھر تمام عالم میں ان کی عملی تعلیم رائج کی جائے۔

اس مقصد کے حصول کا عام طریقہ وعظ و پند ہے۔ اس سے زیادہ مستحسن طریقہ یہ ہے کہ فن اخلاق میں اعلیٰ درجہ کی کتابیں لکھ کر تمام ملک میں پھیلائی جائیں اور لوگوں کو ان کی تعلیم دی جائے۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ لوگوں سے بجبر محاسن اخلاق کی تحصیل کرائی جائے اور رذائل سے روکے جائیں۔

یہی طریقے ہیں جو ابتدا سے آج تک تمام دنیا میں جاری ہیں اور آج اس اقبال ترقی یافتہ دور میں بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن سب سے زیادہ صحیح، سب سے زیادہ کارگر، سب سے زیادہ عملی طریقہ یہ ہے کہ زبان سے کچھ نہ کہا جائے، نہ تحریری نقوش پیش کئے جائیں، نہ جبر و تشدد سے کام لیا جائے، بلکہ فضائل اخلاق کا ایک پیکر مجسم سامنے آ جائے جو خود سرتاپا آئینہ عمل ہو۔ جس کی ہر جنبش سب ہزاروں تصنیفات کا کام دے اور جس کا ایک ایک اشارہ اوامر سلطانی بن جائے۔ دنیا میں آج اخلاق کا جو سرمایہ ہے سب انہی نفوس قدسیہ کا پرتو ہے۔ یہ گھر اور اسباب صرف انہی ایوان تمدن کے نقش و نگار ہیں۔

لیکن اس وقت تک دنیا کی جس قدر تاریخ معلوم ہے اس نے اس قسم کے نفوس قدسیہ جو پیش کئے ہیں وہ فضائل اخلاق کی کسی خاص صنف کے نمونے تھے۔ مثلاً جناب مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مکتب درس میں صرف حلم و تحمل، صلح و عفو، قناعت و تواضع کی تعلیم ہوتی تھی۔ حکومت و فرمانروائی کے لئے جو فضائل و اخلاق درکار ہیں مسیحی تعلیم کی جامعیت میں ان سطروں کی جگہ سادہ ہے۔ حضرت موسیٰ اور نوح علیہم السلام کے اوراق تعلیم میں حلم عام کے صفحے خالی ہیں۔ اسی بنا پر ہر ہر قدم پر نئے رہنما کی ضرورت پیش آئی۔ اور اسی لئے عالم انسانی اپنی تکمیل کے لئے ہمیشہ ایک[1] جامع کامل کا محتاج

---

۱ یہاں پر کتاب کی اس عبارت ... کے مطابق نقل کیا گیا ہے جس میں موجودہ صحیفوں میں ان انبیاء کے جو احوال ملتے ہیں ان کی صورت میں ہیں اس کے مصنف نے ان کے بیان کردہ جامعیت اور کمال کی تفریق کی ہے۔ ... تمام کی ہے لیکن چونکہ از روئے اسلام ایک طرف تمام انبیاء علیہم السلام کی صداقت پر ایمان لانا اور ان کو تمام پیغمبرانہ کمالات سے متصف جاننا ضروری ہے جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّن رُّسُلِهِ ﴾ (بقرہ ۲۸۵)

ہم اس کے رسولوں میں سے کسی کے درمیان تفریق نہیں کرتے۔

اس نے یہ ضروری ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام کو یکساں صفات و کمالات نبوت سے متصف مانا جائے۔ دوسری طرف ارشاد ہے کہ

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں)

میں اس بات سے تو واقف نہ تھا کہ مسلمان کی حیثیت سے میرا فرض اولین یہی تھا کہ تمام تصنیفات سے پہلے میں سیرت نبوی ﷺ کی خدمت انجام دیتا لیکن یہ ایک ایسا اہم اور نازک فرض تھا کہ مدت تک اس کے ادا کرنے کی جرأت نہ کر سکا تاہم میں دیکھ رہا تھا کہ اس فرض کے ادا کرنے کی ضرورت بڑھتی جاتی ہے۔

اگلے زمانہ میں سیرت کی ضرورت صرف تاریخ اور واقعہ نگاری کی حیثیت سے تھی، علم کلام سے اس کو واسطہ نہ تھا لیکن معترضین حال کہتے ہیں کہ اگر مذہب صرف خدا کے اعتراف کا نام ہے تو بحث یہیں تک رہ جاتی ہے لیکن جب اقرار نبوت بھی جزو مذہب ہے تو یہ بحث پیش آتی ہے کہ جو شخص حامل وحی و سفیر الٰہی تھا اس کے حالات، اخلاق اور عادات کیا تھے؟

یورپ کے مورخین آنحضرت ﷺ کی جو اخلاقی تصویر کھینچتے ہیں (نعوذ باللہ) وہ ہر قسم کے معائب کا مرقع ہوتی ہے۔ آج کل مسلمانوں کو جدید ضرورتوں نے عربی علوم سے بالکل محروم کر دیا ہے اس لئے اس گروہ کو اگر کبھی پیغمبر اسلام ﷺ کے حالات اور سوانح کے دریافت کرنے کا شوق ہوتا ہے تو انہی یورپ کی تصنیفات کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح یہ زہر آلود معلومات آہستہ آہستہ اثر کرتی جاتی ہیں اور لوگوں کو خبر تک نہیں ہوتی۔ یہاں تک کہ ملک میں ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا ہے جو پیغمبر ﷺ کو صرف ایک مصلح سمجھتا ہے جس نے مجمع انسانی میں کوئی اصلاح کر دی تو اس کا فرض ادا ہو گیا۔ اس بات سے اس کے منصب نبوت میں فرق نہیں آتا کہ اس کے ذاتی اخلاق پر معصیت کے دھبے لگے ہیں۔

یہ واقعات تھے جنہوں نے مجھ کو بالآخر مجبور کیا اور میں نے سیرت نبوی ﷺ پر ایک مبسوط کتاب لکھنے کا ارادہ کر لیا۔ یہ کام بظاہر نہایت آسان تھا۔ عربی زبان میں سینکڑوں کتابیں موجود ہیں ان کو سامنے رکھ کر ایک ضخیم اور دلچسپ کتاب لکھ دینا زیادہ سے زیادہ چند مہینوں کا کام تھا لیکن واقعہ یہ ہے کہ کوئی تصنیف اس تصنیف سے زیادہ دیر طلب اور جانکاہ نہیں ہو سکتی۔

آگے چل کر ہم تفصیل سے بیان کریں گے کہ فن سیرت[1] پر آج تک کوئی ایسی کتاب نہیں لکھی گئی جس میں صرف صحیح روایتوں کا التزام کیا جاتا۔ حافظ زین الدین عراقی جو حافظ ابن حجر کے استاد تھے سیرت نبوی میں لکھتے ہیں

---

[1] اس موقع پر ایک نہایت ضروری بحث طے کر دینے کے قابل ہے جو آج کل کی قوت طبع اور ناواقفی نے پیدا کر دی ہے۔ بہت سے لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ سیرت فن حدیث ہی کی ایک خاص قسم کا نام ہے یعنی وہ روایتیں جن میں واقعات لکھ دیئے گئے جو آنحضرت ﷺ کے اخلاق و عادات سے متعلق ہیں وہ سیرت بن گئی اور چونکہ حدیث میں متعدد کتابیں ایسی موجود ہیں ان میں ایک حصہ بھی ضعیف نہیں مثلاً بخاری و مسلم تو پھر یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ سیرت میں کوئی کتاب آج تک صحت کے التزام کے ساتھ نہیں لکھی گئی۔ اس بحث کے طے کرنے کے لئے اصول ذیل پیش نظر رکھنے چاہئیں۔

(۱) پہلی بحث یہ ہے کہ سیرت کا اطلاق کن چیزوں پر ہوتا ہے؟ محدثین اور ارباب رجال کی اصطلاح قدیم یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے غزوات کو مغازی اور سیرت کہتے تھے۔ چنانچہ ابن اسحاق کی کتاب کو مغازی بھی کہتے ہیں اور سیرت بھی۔ حافظ ابن حجر فتح الباری کتاب المغازی میں یہ دونوں نام ایک ہی کتاب کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ فقہا کی بھی یہی اصطلاح ہے۔ فقہ میں جو باب کتاب الجہاد والسیر باندھتے ہیں اس میں سیرت کے لفظ سے غزوات اور جہاد کے احکام مراد ہوتے ہیں۔

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

صنعا عليه الف درهم فضة كيلا بالحديدة و متى دعاه بها اجابه شهد الله و الملكان ﴾[1]

یعنی عبدالمطلب بن ہاشم (جو مکہ کا باشندہ ہے) کا فلاں فلاں شخص پر ہے جو صنعا کا رہنے والا ہے۔ یہ چاندی کے ہزار درہم ہیں۔ جب طلب کیا جائے گا وہ ادا کرے گا۔ خدا اور دو فرشتے اس کے گواہ ہیں۔

اس دستاویز سے ظاہر ہوتا ہے کہ عبدالمطلب نے کسی حمیری شخص کو ہزار درہم قرض دیے تھے۔ خاتمہ میں دو فرشتوں کی گواہی لکھی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں فرشتوں کا (اور شاید کراماً کاتبین کا) اعتقاد موجود تھا۔

ابن الندیم نے لکھا ہے کہ اس دستاویز کا خط ایسا تھا جیسا عورتوں کا خط ہوتا ہے۔

علامہ بلاذری نے تصریح کی ہے کہ آنحضرت ﷺ کی جب بعثت ہوئی تو قریش میں سترہ شخص لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت ابو عبیدہؓ، طلحہؓ، یزیدؓ، ابو حذیفہؓ، ابو سفیانؓ، شفاء بنت عبداللہؓ وغیرہ۔[2]

بدر کی لڑائی جو ۲ھ میں ہوئی اس میں قریش کے جو لوگ گرفتار ہوئے ان سے فدیہ لیا گیا، لیکن بعض ایسے بھی تھے جو ناداری کی وجہ سے فدیہ نہیں ادا کر سکتے۔ آنحضرت ﷺ نے ان کو حکم دیا کہ ہر شخص دس دس بچوں کو اپنے فدیہ کے بدلے لکھنا سکھا دے۔ چنانچہ حضرت زید بن ثابتؓ نے جو کاتب وحی ہیں اسی طرح لکھنا سیکھا تھا۔[3]

ان واقعات سے معلوم ہوگا کہ عرب اور خصوصاً مکہ و مدینہ میں آنحضرت ﷺ کے زمانہ ہی میں لکھنے پڑھنے کا کافی رواج ہو چکا تھا۔ البتہ یہ تحقیق طلب ہے کہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں روایتیں اور حدیثیں بھی قلمبند ہوئی تھیں یا نہیں اور اس بنا پر سیرت کا کوئی تحریری سرمایہ بھی موجود تھا یا نہیں۔ بعض حدیثوں میں جن میں سے بعض صحیح مسلم میں مذکور ہیں تصریح ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حدیثوں کے قلمبند کرنے سے منع فرمایا تھا۔ مسلم کے یہ الفاظ ہیں:

﴿ لا تكتبوا عني و من كتب عني غير القرآن فليمحه ﴾

مجھ سے جو سنو اس کو قلمبند نہ کرو (بجز قرآن کے) اور کسی نے قلمبند کیا ہو تو اس کو مٹا دینا چاہیے۔

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ ابتدائی زمانہ کا ارشاد ہے کیونکہ متعدد صحیح حدیثوں سے ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ ہی کے زمانہ میں بعض صحابہؓ آنحضرت ﷺ کی اجازت سے آپ کے ارشادات قلمبند کر لیا کرتے تھے۔ صحیح بخاری (باب العلم) میں حضرت ابو ہریرہؓ کا قول ہے کہ "صحابہ میں مجھ سے زیادہ کسی کو حدیثیں محفوظ نہیں البتہ عبداللہ بن عمرو مستثنیٰ ہیں کیونکہ وہ آنحضرت ﷺ کی حدیثیں لکھ لیا کرتے تھے اور میں لکھتا نہ تھا۔"

ایک اور روایت میں ہے کہ "حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی عادت تھی کہ آنحضرت ﷺ سے جو سنتے تھے لکھ لیا کرتے تھے۔ قریش نے ان کو منع کیا کہ آنحضرت ﷺ کبھی غصہ کی حالت میں ہوتے ہیں کبھی خوشی میں اور تم سب کچھ لکھتے جاتے ہو۔ عبداللہ بن عمروؓ نے اس بنا پر لکھنا چھوڑ دیا اور آنحضرت ﷺ سے یہ واقعہ بیان کیا۔ آپ نے اس

۱۔ [illegible] صفحہ ۵

۲۔ فتوح البلدان [illegible]

۳۔ [illegible]

﴿ واما المغازی فمن اشھرھا کتاب محمد بن اسحاق و کان یاخذ من اھل الکتاب و قد قال الشافعی کتب الواقدی کذب ﴾

مغازی میں اس فن کی مشہور کتاب محمد بن اسحاق کی کتاب ہے اور وہ عیسائیوں اور یہودیوں سے روایت کرتے تھے اور امام شافعی نے کہا ہے کہ واقدی کی کتابیں جھوٹ ہیں۔

باوجود ان باتوں کے یہ ناممکن تھا کہ یہ حصہ نظر انداز کر دیا جاتا اس لئے اکابر صحابہؓ اور محدثین نہایت احتیاط کے ساتھ جو واقعات جہاں تک خوب محفوظ ہوتے تھے روایت کرتے تھے۔

تصنیف و تالیف کی ابتدا حکومت کی طرف سے ہوئی:

صحابہؓ اور خلفائے راشدینؓ کے زمانہ میں اگرچہ فن حدیث کی نہایت کثرت سے اشاعت ہوئی بہت سے درس کے حلقے قائم ہوئے لیکن جو کچھ تھا زیادہ تر زبانی تھا لیکن بنوامیہ نے علماء سے تصنیفیں لکھوائیں قاضی ابن عبدالبر نے جامع بیان العلم میں امام زہری کا قول نقل کیا ہے۔

﴿ کنا نکرہ کتاب العلم حتی اکرھنا علیہ ھؤلاء الامراء ﴾ [مطبوعہ مصر صفحہ ۳۳]

ہم لوگ علم کا قلمبند کرنا پسند نہیں کرتے تھے یہاں تک کہ امراء نے ہم کو مجبور کیا۔

سب سے پہلے امیر معاویہؓ نے عبید بن شریہ کو یمن سے بلا کر قدما کی تاریخ مرتب کرائی جس کا نام اخبار الماضیین ہے۔[1] امیر معاویہؓ کے بعد عبدالملک بن مروان نے جو ۶۵ھ میں تخت نشین ہوا ہر فن میں علماء سے تصنیفیں لکھوائیں۔ سعید بن جبیر جو اعلم العلماء تھے ان کو حکم بھیجا کہ قرآن مجید کی تفسیر لکھیں۔ چنانچہ امام موصوف نے تفسیر لکھ کر بھیجی جو کتب خانہ شاہی میں رکھی گئی۔ عطاء بن دینار کے نام سے جو تفسیر مشہور ہے وہ انہی کی تفسیر ہے عطاء کو خزانۂ شاہی سے یہ نسخہ ہاتھ آ گیا تھا۔[2]

حضرت عمر بن عبدالعزیز کا زمانہ آیا تو انہوں نے تصنیف و تالیف کو زیادہ ترقی دی۔ تمام ممالک میں حکم بھیجا کہ احادیث نبوی ﷺ مدون اور قلمبند کی جائیں۔ سعد بن ابراہیم جو بہت بڑے محدث اور مدینہ منورہ کے قاضی تھے ان سے دفتر کے دفتر حدیثوں کے قلمبند کرائے اور تمام ممالک مقبوضہ میں بھیجے۔ علامہ ابن عبدالبر جامع بیان العلم میں لکھتے ہیں

﴿ عن سعد بن ابراھیم قال امرنا عمر بن عبدالعزیز بجمع السنن فکتبناھا دفترا دفترا فبعث الی کل ارض له علیھا سلطان دفترا ﴾[3]

سعد بن ابراہیم کہتے ہیں کہ عمر بن عبدالعزیز نے ہم کو احادیث کے جمع کرنے کا حکم دیا۔ ہم نے دفتر کے دفتر لکھے۔ عمر نے جہاں جہاں ان کی حکومت تھی ایک ایک دفتر بھیج دیا۔

ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم انصاری جو اس زمانہ کے بہت بڑے محدث اور امام زہری کے استاد اور مدینہ کے

---

[1] فہرست ابن الندیم صفحہ ۸۹۔

[2] میزان الاعتدال ذہبی ترجمہ عطاء بن دینار۔

[3] مطبوعہ مصر صفحہ ۷۶۔

قاضی تھے، ان کو بھی خاص طور پر احادیث کے جمع کرنے کا حکم بھیجا۔[1]

حدیث میں حضرت عائشہؓ کی مرویات کی ایک خاص حیثیت ہے کیونکہ ان سے اکثر وہ حدیثیں مروی ہیں جو عقائد یا فقہ کے مہمات مسائل ہیں۔ اس لئے عمر بن عبدالعزیز نے ان کی روایتوں کے ساتھ زیادہ اعتنا کیا۔ عمرۃ بنت عبدالرحمن ایک خاتون تھیں، ان کو حضرت عائشہؓ نے خاص اپنے آغوش تربیت میں پالا تھا۔ وہ بہت بڑی محدثہ اور عالمہ تھیں۔ تمام علماء کا اتفاق ہے کہ حضرت عائشہؓ کی مرویات کا ان سے بڑھ کر کوئی عالم نہ تھا۔ عمر بن عبدالعزیز نے ابوبکر بن محمد کو لکھا کہ عمرۃ کے مسائل اور روایات قلمبند کر کے بھیج دیں۔[2]

مغازی پر خاص توجہ:

اب تک مغازی و سیر کے ساتھ اعتنا نہیں کیا گیا تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اس فن کی طرف خاص توجہ کی اور حکم دیا کہ غزوات نبوی ﷺ کا خاص حلقہ درس قائم کیا جائے۔ عاصم بن عمر بن قتادہ انصاری المتوفی ۱۲۱ھ اس فن میں خاص کمال رکھتے تھے۔ ان کو حکم دیا کہ جامع مسجد دمشق میں بیٹھ کر لوگوں کو مغازی اور مناقب کا درس دیں۔[3]

اسی زمانہ میں امام زہری نے مغازی پر ایک مستقل کتاب لکھی اور جیسا کہ امام سہیلی نے روض الانف میں تصریح کی ہے یہ اس فن کی پہلی تصنیف تھی۔ امام زہری اس زمانہ کے اعلم العلماء تھے۔ فقہ اور حدیث میں ان کا کوئی ہمسر نہ تھا۔ امام بخاری کے شیخ الشیوخ ہیں۔ انہوں نے حدیث و روایات کے حاصل کرنے میں یہ کوشش اٹھائی کہ مدینہ منورہ میں ایک ایک انصاری کے گھر پر جاتے۔ جو ان، بڈھے، عورت، مرد جو مل جاتا یہاں تک کہ پردہ نشین عورتوں سے جا کر آنحضرت ﷺ کے اقوال اور حالات پوچھتے اور قلمبند کرتے۔ وہ نسباً قریشی تھے، ۵۰ھ میں پیدا ہوئے، بہت سے صحابہؓ کو دیکھا تھا۔ ۸۲ھ میں عبدالملک بن مروان کے دربار میں گئے۔ اس نے بہت قدر و منزلت کی۔ کتاب المغازی غالباً حضرت عمر بن عبدالعزیز کی ہدایت کے موافق لکھی۔ یہ بات خاص طور پر لحاظ کے قابل ہے کہ امام موصوف سلاطین کے دربار سے تعلق رکھتے تھے اور مقربین خاص میں داخل تھے۔ ہشام بن عبدالملک نے اپنے بچوں کی تعلیم ان کے سپرد کی تھی۔ ۱۲۴ھ میں وفات پائی۔

امام زہری کی وجہ سے مغازی و سیرت کا عام مذاق پیدا ہو گیا۔ ان کے حلقہ درس سے اکثر ایسے لوگ نکلے جو خاص اس فن میں کمال رکھتے تھے۔ ان میں سے یعقوب بن ابراہیم، محمد بن صالح تمار، عبدالرحمن بن عبدالعزیز فن مغازی میں خاص شہرت رکھتے تھے۔ چنانچہ تہذیب التہذیب وغیرہ میں ان لوگوں کا امتیازی وصف "صاحب المغازی" لکھا ہوتا ہے۔

زہری کے تلامذہ میں سے دو شخصوں نے اس فن میں نہایت شہرت حاصل کی اور یہی دو شخص ہیں جن پر اس فن کا

---

1. طبقات ابن سعد، جزء ثانی، قسم ثانی، صفحہ ۱۳۴
2. تہذیب التہذیب، جلد ۱۲، ترجمہ عمرۃ بنت عبدالرحمن و طبقات ابن سعد [illegible]
3. تہذیب التہذیب، ترجمہ عاصم بن عمر بن قتادہ
4. تہذیب التہذیب، ترجمہ امام زہری (محمد بن مسلم)

محمد بن اسحاق کی کتاب المغازی کا ترجمہ شیخ سعدی کے زمانہ میں ابوبکر سعد زنگی کے حکم سے فارسی میں ہوا اس کا قلمی نسخہ الہ آباد میں ہماری نظر سے گزرا ہے۔

محمد بن اسحاق کی کتاب کثرت سے پھیلی اور بڑے بڑے مشہور محدثوں نے اس کے نسخے مرتب کئے۔ اسی کتاب کو ابن ہشام نے زیادہ منقح اور اضافہ کر کے مرتب کیا جو سیرت ابن ہشام کے نام سے مشہور ہے۔ چونکہ اصل کتاب آج ناپید ہے اس لئے آج اس کی جو یادگار موجود ہے وہ یہی ابن ہشام کی کتاب ہے۔

ابن ہشام کا نام عبدالملک ہے۔ وہ نہایت ثقہ اور نامور محدث اور مورخ تھے۔ حمیر کے قبیلہ سے تھے اور غالباً اسی تعلق سے سلاطین حمیر کی تاریخ لکھی جو آج بھی موجود ہے۔ انہوں نے سیرت میں یہ اضافہ کیا کہ سیرت میں جو مشکل الفاظ آتے ہیں ان کی تفسیر بھی لکھی۔ ۲۱۳ھ یا ۲۱۸ھ میں وفات پائی۔

سیرت ابن اسحاق کی مقبولیت کی بنا پر لوگوں نے اس کو نظم کیا۔ چنانچہ ابونصر فتح بن موسیٰ خضراوی المتوفی ۶۶۳ھ، عبدالعزیز بن احمد المعروف بہ سعد دیری المتوفی فی حدود ۶۰۰ ہجری، ابو اسحاق انصاری تلمسانی، فتح الدین محمد بن ابراہیم معروف بہ ابن الشہید المتوفی ۷۹۳ھ نے منظوم کیا۔ آخر کتاب میں قریباً دس ہزار شعر ہیں اور اس کا نام فتح الغریب فی سیرت الحبیب ہے۔

واقدی خود تو قابل ذکر نہیں لیکن ان کے تلامذہ خاص میں سے ابن سعد نے آنحضرت ﷺ اور صحابہؓ کے حالات میں ایک جامع اور مفصل کتاب لکھی کہ آج تک اس کا جواب نہ ہو سکا۔

ابن سعد مشہور محدث ہیں۔ محدثین نے صاف لکھا ہے کہ گو ان کے استاد (واقدی) قابل اعتبار نہیں لیکن وہ خود قابل سند ہیں۔ خطیب بغدادی نے ان کی نسبت یہ الفاظ لکھے ہیں۔

﴿ کان من اهل العلم والفضل والفهم والعدالة صنف کتابا کبیرا فی طبقات الصحابة والتابعین الی وقته فاجاد فیه واحسن ﴾۔[1]

یہ موالی بنوہاشم سے تھے، بصرہ میں پیدا ہوئے لیکن بغداد میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ واقدی جو مشہور مورخ ہیں انہی کے شاگرد ہیں۔ ۲۳۰ھ میں ۶۲ برس کی عمر میں وفات پائی۔

ان کی کتاب کا نام طبقات ہے، ۱۲ جلدوں میں ہے۔ دو جلدیں خاص آنحضرت ﷺ کے حالات میں ہیں اور یہ حصہ دراصل سیرت نبوی ہے۔ باقی جلدیں صحابہؓ (و تابعین) کے حالات میں ہیں اور چونکہ صحابہؓ کے حالات میں ہر جگہ آنحضرت ﷺ کا ذکر آتا ہے اس لئے ان حصوں میں بھی سیرت کا بڑا سرمایہ موجود ہے۔

یہ کتاب تقریباً ناپید ہو گئی تھی یعنی دنیا کے کسی کتب خانہ میں اس کا پورا نسخہ موجود نہ تھا۔ شہنشاہ جرمنی کو اس کی طبع و اشاعت کا خیال ہوا۔ چنانچہ لاکھ روپے جیب خاص سے دیئے اور پروفیسر ساخو کو اس کام پر مامور کیا کہ ہر جگہ سے اس کے اجزا فراہم کر کے لائیں۔ پروفیسر موصوف نے قسطنطنیہ، مصر اور یورپ جا کر جا بجا سے تمام جلدیں بہم پہنچائیں۔ یورپ کے نامور پروفیسروں نے الگ الگ جلدوں کی تصحیح اپنے ذمہ لی چنانچہ نہایت اہتمام اور صحت کے ساتھ یہ نسخہ چھپ

---

[1] تہذیب التہذیب ترجمہ ابن سعد

(ہالینڈ) میں چھپ کر شائع ہوا۔

اس کتاب کا بڑا حصہ واقدی سے ماخوذ ہے لیکن چونکہ تمام روایتیں بہ سند مذکور ہیں اس لئے واقدی کی روایتیں با آسانی الگ کی جا سکتی ہیں۔

اس زمانہ میں سیرت پر اور بھی بہت سی کتابیں لکھی گئیں چنانچہ کشف الظنون وغیرہ میں ان کے نام مذکور ہیں لیکن چونکہ نام کے سوا ان کے متعلق اور کچھ معلوم نہیں نہ ان کا آج وجود ہے اس لئے ہم ان کے نام نظر انداز کرتے ہیں۔

سیرت کے سلسلہ سے الگ تاریخی تصنیفات ہیں ان میں سے جو محدثانہ طریقہ پر لکھی گئیں یعنی جن میں روایتیں بہ سند مذکور ہیں ان میں آنحضرت ﷺ کے حالات اور واقعات کا جو حصہ ہے وہ بھی در اصل سیرت نبوی ﷺ ہے۔ ان میں سب سے مقدم اور قدیم استاد امام بخاری کی دونوں تاریخیں ہیں لیکن دونوں نہایت مختصر ہیں تاریخ صغیر چھپ گئی ہے اس میں سیرت نبوی ﷺ کا حصہ کتاب کا دسواں حصہ بھی نہیں یعنی صرف ۱۵ صفحے ہیں اور ان میں بھی کوئی ترتیب نہیں کبیر البتہ بڑی ہے جس نے اس کا نسخہ جامع ایاصوفیہ میں دیکھا تھا لیکن سوانح نبوی اس میں بہت کم ہیں اور جستہ جستہ واقعات بلا ترتیب مذکور ہیں۔

تاریخی سلسلہ میں سب سے جامع اور مفصل کتاب امام طبری کی تاریخ کبیر ہے طبری اس درجہ کے شخص ہیں کہ تمام محدثین ان کے فضل و کمال وثوق اور وسعت علم کے معترف ہیں ان کی تفسیر احسن التفاسیر خیال کی جاتی ہے محدث ابن خزیمہ کا قول ہے کہ "دنیا میں کسی کو ان سے بڑھ کر عالم نہیں جانتا" ۳۱۰ھ میں وفات پائی۔

بعض محدثین (سلیمانی) نے ان کی نسبت لکھا ہے کہ "یہ شیعوں کے لئے حدیثیں وضع کیا کرتے تھے" لیکن علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں لکھا ہے۔

﴿ هذا رجم بالظن الكاذب بل ابن جرير من كبار ائمة الاسلام المعتمدين ﴾

یہ جھوٹی بدگمانی ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ابن جریر اسلام کے معتمد اماموں میں سے ایک بڑے امام ہیں۔

علامہ ذہبی نے اسی موقع پر لکھا ہے کہ "ان میں فی الجملہ تشیع تھا لیکن مضر نہیں" تمام مستند اور مفصل تاریخیں مثلاً تاریخ کامل ابن الاثیر، ابن خلدون، ابو الفداء وغیرہ انہی کی کتاب سے ماخوذ اور اسی کتاب کے مختصرات ہیں یہ کتاب بھی نایاب تھی اور یورپ کی بدولت شائع ہوئی۔

جو لوگ خاص فن سیرت کے ارکان اور معتمد ہیں ان کا اور ان کی تصنیفات کا ایک مختصر نقشہ ہم اس مقام پر درج کرتے ہیں۔[1]

---

[1] ان مصنفین کی تصریحات اکثر تہذیب التہذیب وغیرہ سے مرتب کی گئی ہیں ان کے نام لکھنے سے یہ غرض ہے کہ آج جو تصنیفات سیرت کی ہیں ان میں کن کا ان کے ہاتھ آتے ہیں۔

محمد بن اسحاق بن یسار المطلبی	۱۵۱ھ	ان کا تذکرہ اوپر گذر چکا ہے۔
معمر بن راشد الازدی	۱۵۳ھ	امام زہری کے تلامذہ میں امام مالک کے بعد ان کا دوسرا درجہ ہے۔ اساطین علم حدیث میں تھے مغازی میں ایک کتاب ان کی تصنیف ہے جس کا نام ابن ندیم نے کتاب المغازی لکھا ہے۔
عبدالرحمن بن عبدالعزیز الاوسی	۱۶۲ھ	زہری کے شاگرد تھے، مسلم نے ان سے ایک روایت کی ہے، محدثین کے نزدیک ضعیف الروایت ہیں، فن سیرت کے عالم تھے۔ ابن سعد نے ان کے متعلق لکھا ہے "کان عالماً بالسیرۃ"
محمد بن صالح بن دینار التمار	۱۶۸ھ	زہری کے شاگرد اور واقدی کے استاد ہیں۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ وہ سیرت و مغازی کے عالم تھے، محدثین نے ان کی توثیق کی ہے۔ ابوالزناد جو بڑے پایہ کے محدث ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اگر مغازی سیکھنا ہو تو محمد بن صالح سے سیکھو۔
ابو معشر نجیح المدنی	۱۷۰ھ	ہشام بن عروہ کے شاگرد تھے۔ ثوری اور واقدی نے ان سے روایت کی ہے، گو محدثین نے روایت حدیث میں ان کی تضعیف کی ہے لیکن سیرت و مغازی میں ان کی جلالت شان کا اعتراف کیا ہے۔ امام احمد بن حنبل کہتے ہیں کہ وہ اس فن میں صاحب نظر ہیں۔ ابن ندیم نے ان کی کتاب المغازی کا ذکر کیا ہے، کتب سیرت میں ان کا نام کثرت سے آتا ہے۔
عبداللہ بن جعفر بن عبدالرحمن المخرمی	۱۷۰ھ	مشہور صحابی مسور بن مخرمہ کے پڑپوتے تھے، فن حدیث میں خاص پایہ رکھتے تھے۔ سیرت نبوی ﷺ کے عالم بھی تھے۔ ابن سعد نے ان کی شان میں یہ الفاظ لکھے ہیں "کان من رجال اهل المدینه عالماً بالمغازی"
عبدالملک بن محمد بن ابی بکر بن عمرو بن حزم الانصاری	۱۷۶ھ	فن حدیث و سیر میں ان کا خاندان ہمیشہ ممتاز رہا، ان کے دادا وہ شخص ہیں جنہوں نے خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے حکم سے سب سے پہلے فن حدیث کی تدوین کی۔ ان کے رشتہ کی دادی عمرہ حضرت عائشہؓ کی تربیت یافتہ تھیں۔ یہ خود سیر و مغازی کے عالم تھے اپنے باپ اور چچا سے تعلیم پائی تھی، خلیفہ ہارون الرشید نے ان کو قاضی مقرر کیا تھا، لوگ ان سے مغازی سیکھتے تھے۔ اس فن میں ان کی ایک تصنیف کتاب المغازی بھی ہے۔

علی بن مجاہد الرازی الکندی	بعد ۱۸۰ھ	ابو معشر نجیح کے تلامذہ میں تھے امام احمد بن حنبل نے ان سے روایت کی ہے مغازی کے جامع اور مصنف ہیں لیکن ارباب فن کے نزدیک ان کی تصنیف اعتبار کے قابل نہیں۔
زیاد بن عبداللہ بن الطفیل البکائی	۱۸۳ھ	ابن اسحاق کے شاگرد اور ابن ہشام کے استاد تھے ان دونوں بزرگواروں کے واسطہ متوسط بھی ہیں سیرت کے عشق میں گھر بار بیچ کر استاد کے ساتھ نقل کرتے رہے تھے اور مدت تک سفر و حضر میں ان کے شریک رہے محدثین کی بارگاہ میں گو ان کا اعزاز کم ہے لیکن کتاب السیرۃ کے سب سے معتبر راوی یہی سمجھے جاتے ہیں۔
سلمہ بن الفضل الابرش الانصاری	۱۹۱ھ	ابن اسحاق کے شاگرد اور ان کی سیرت کے راوی ہیں رے کے قاضی تھے اہل فن کے نزدیک قابل احتجاج نہیں لیکن ابن معین جو اسمائے رجال کے بڑے ماہر ہیں مغازی میں ان کی توثیق کرتے ہیں اور ان کی سیرت کو بہترین سیرت ہائے نبوی سمجھتے ہیں طبری میں ان کے واسطہ سے اکثر روایتیں مروی ہیں۔
ابو محمد یحییٰ بن سعید بن ابان الاموی	۱۹۴ھ	ہشام بن عروہ اور ابن جریج سے تلمذ تھا ابن سعد نے لکھا ہے کہ وہ قلیل الروایت ہیں لیکن ثقہ ہیں صاحب کشف الظنون نے مصنفین مغازی میں ان کا نام بھی لیا ہے۔
ولید بن مسلم القرشی	۱۹۵ھ	شام کے مشہور محدث اور نہایت قوی الحافظہ تھے۔ شام میں ان کے زمانہ میں ان سے بڑا کوئی عالم نہ تھا تاریخ و مغازی میں دیگر سے ان کا درجہ بڑا سمجھا جاتا تھا ان کی تصنیفات کی تعداد ستر ہے جن میں ایک کتاب المغازی ہے کتاب الفہرست میں اس کا ذکر موجود ہے۔
یونس بن بکیر	۱۹۹ھ	ہشام بن عروہ اور ابن اسحاق کے شاگرد ہیں فن روایت حدیث میں ان کا متوسط درجہ ہے اکثر محدثین نے ان کی توثیق کی ہے علامہ ذہبی نے تذکرہ میں ان کا نام بلقب صاحب المغازی لیا ہے۔ انہوں نے مغازی ابن اسحاق کا ذیل لکھا ہے [زرقانی مواہب جلد ۳ صفحہ ۱۰]

محمد بن عمر الواقدی اسلمی	۲۰۷ھ	سیرت نبوی کے متعلق ان کی دو کتابیں ہیں، کتاب السیرۃ اور کتاب التاریخ والمغازی والمبعث۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ واقدی کی تمام تصانیف جھوٹ کا انبار ہے۔ کتب سیرت کی اکثر بیہودہ روایتوں کا سرچشمہ انہی کی تصانیف ہیں۔ ایک ظریف محدث نے خوب کہا ہے کہ اگر واقدی سچا ہے تو دنیا میں کوئی اس کا ثانی نہیں اور اگر جھوٹا ہے تب بھی دنیا میں اس کا جواب نہیں۔
یعقوب بن ابراہیم الزہری	۲۰۸ھ	حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ کی اولاد میں تھے، زہری اور ان کے تلامذہ کے شاگرد ہیں، مغازی میں ان کا یہ رتبہ تھا کہ ابن معین جیسا ناقد رجال ان سے مغازی کی تحصیل کرتا تھا۔
عبدالرزاق بن ہمام بن نافع الحمیری	۲۱۱ھ	اکابر محدثین میں ان کا شمار ہے، مزاج میں کسی قدر تشیع تھا۔ ابن معین کہتے ہیں کہ اگر عبدالرزاق مرتد بھی ہو جائیں تب بھی ہم ان سے روایت حدیث ترک نہیں کر سکتے۔ آخر عمر میں بصارت جاتی رہی تھی اس لئے اس زمانہ کی حدیثیں ناقابل سند ہیں۔ فن مغازی میں ان کی ایک تالیف ہے۔
عبدالملک ابن ہشام الحمیری	۲۱۸ھ یا ۲۱۳ھ	ان کا ذکر گزر چکا ہے۔
علی بن محمد المدائنی	۲۲۵ھ	ابومعشر نجیح اور مسلمہ بن الفضل وغیرہ کے شاگرد تھے۔ تاریخ و انساب عرب میں نہایت وسیع معلومات تھے۔ محدثین میں ان کا شمار نہیں لیکن مورخین کے امام ہیں۔ طبری کے دفتر بے پایاں کا مخزن یہی ہیں۔ تاریخ و ادب میں ان کی کثرت سے تصنیفات ہیں۔ آنحضرت ﷺ کے غزوات میں ان کی کتاب نہایت مبسوط ہے اور ابن الندیم کے بیان کے مطابق ہر قسم کے متعدد اور مختلف عنوان قائم کئے ہیں۔
عمر بن شبہ البصری	۲۶۲ھ	حدیث، تاریخ، ادب، لغت، شاعری اور نحو کے امام ہیں۔ کئی مجلدات میں بصرہ و کوفہ کی تاریخیں لکھی ہیں۔ فہم میں نہایت بلند پایہ تھے۔ حدیث میں ابن ماجہ اور تاریخ میں بلاذری اور ابونعیم ان کے شاگرد تھے۔
محمد بن عیسیٰ ترمذی	۲۷۹ھ	مشہور محدث ہیں جن کی کتاب صحاح ستہ میں تیسرا درجہ رکھتی ہے۔ سیرت نبوی میں ان کا خاص رسالہ ہے جس کا موضوع گذشتہ تصانیف سے الگ ہے۔ اس رسالہ کا نام کتاب الشمائل ہے جس میں رسول اللہ ﷺ کے ذاتی حالات، عادات و اخلاق کا ذکر ہے۔ اس بات کا التزام کیا ہے کہ تمام روایتیں معتبر ہوں۔ اس رسالہ پر متعدد علماء نے شرحیں اور حواشی لکھے۔

ابراہیم بن اسحاق بن ابراہیم	۲۸۵ھ	محدثین کبار میں شمار ہے۔ مسند کتاب ان کی تالیف ہے جس کے ضمن میں کتاب المغازی شامل ہے۔
ابوبکر احمد بن علی خیثمہ بغدادی	۲۷۹ھ	حدیث میں ابن حنبل اور ابن معین کے شاگرد اور تاریخ و سیر کے جلیل القدر عالم تھے۔ تاریخ کبیر ان کی تصنیف ہے جس میں سیرت نبوی ﷺ کا حصہ بھی شامل ہے۔
محمد بن عائذ دمشقی		ان کی مغازی معتبر خیال کی جاتی ہے۔ حافظ ابن حجر وغیرہ اکثر اس کے حوالے دیتے ہیں۔

یہ قدماء کی تصنیفات تھیں۔ ما بعد کی تصنیفات کا ہم ایک مختصر نقشہ ذیل میں درج کرتے ہیں۔ یہ تصنیفات قدیم تصنیفات اور احادیث کی کتابوں سے ماخوذ ہیں۔ اس نقشہ میں ان کتابوں کا ذکر بھی ہے جو قدماء کی تصنیفات کے متعلق شرح کے طور پر لکھی گئی ہیں۔ ان کا ذکر اس وجہ سے کیا گیا ہے کہ یہ فی نفسہ مستقل تصنیفات تھیں اور ان میں جس قدر زائد معلومات ہیں خود اصل کتابوں میں نہیں۔

روض الانف:

سیرت ابن اسحاق کی شرح ہے۔ مصنف کا نام عبدالرحمن سہیلی ہے جنہوں نے ۵۸۱ھ میں وفات پائی۔ یہ اکابر محدثین میں سے ہیں اور تمام مصنفین ما بعد سیرت نبوی ﷺ کی تحقیقات اور معلومات کے متعلق ان کے خوشہ چین ہیں۔ مصنف نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ میں نے یہ کتاب ۱۲۰ کتابوں کی مدد سے لکھی۔ اس کا قلمی نسخہ ادارے نے استعمال کیا ہے۔

سیرت دمیاطی:

حافظ عبدالمومن دمیاطی المتوفی ۷۰۵ھ کی تصنیف ہے۔ اکثر کتابوں میں اس کے حوالے آتے ہیں۔ اس کتاب کا نام المختصر فی سیرۃ سید البشر ہے۔ تقریباً ۲۰ صفحوں کی ہے۔ پٹنہ کے کتب خانہ میں اس کا ایک نسخہ موجود ہے۔

سیرت مغلطائی:

علاء الدین علی بن محمد مغلطائی ترکی کی تصنیف ہے۔ ۷۶۲ھ میں وفات پائی۔

سیرت کازرونی:

شیخ ظہیر الدین علی بن محمد کازرونی المتوفی ۶۹۴ھ کی تصنیف ہے۔[1]

سیرت ابن ابی طے:

مصنف کا نام یحییٰ بن حمیدۃ الحلبی المتوفی ۶۳۰ھ ہے۔ یہ کتاب تین جلدوں میں ہے۔

---

[1] علیگڑھ کے کتب خانہ جامع مسجد میں اس کا قلمی نسخہ موجود ہے۔

سیرت مغلطائی:[1]

مشہور کتاب ہے اور مصر میں چھپ گئی ہے۔ علامہ عینی نے اس کے ایک حصہ کی شرح لکھی ہے جس کا نام کشف اللثام ہے۔

شرف المصطفیٰ:

حافظ ابو سعید عبد الملک نیشاپوری کی تصنیف ہے، آٹھ جلدوں میں ہے، حافظ ابن حجر اصابہ میں اکثر اس کا حوالہ دیتے ہیں، لیکن جو روایتیں حافظ موصوف نے نقل کی ہیں ان میں بعض نہایت مہمل اور لغو روایتیں ہیں، جس سے قیاس ہوتا ہے کہ مصنف نے رطب و یابس کی کوئی تمیز نہیں رکھی ہے۔

شرف المصطفیٰ:

للحافظ ابن الجوزی۔

الاکتفاء:

فی مغازی المصطفیٰ والخلفاء الثلاثۃ، حافظ ابو ربیع سلیمان بن موسیٰ الکلاعی الاندلسی ۶۳۴ھ کی تصنیف ہے، اکثر کتابوں میں اس کے حوالے آتے ہیں۔

سیرت ابن عبد البر:

ابن عبد البر مشہور محدث اور امام ہیں، اس کتاب کے حوالے کثرۃ آتے ہیں۔

عیون الاثر:

ابن سید الناس کی تصنیف ہے، ابن سید الناس اندلس کے مشہور عالم ہیں ۷۳۴ھ میں وفات پائی، یہ کتاب نہایت متین اور جامع ہے، معتبر کتابوں کو ماخذ قرار دیا ہے اور جس سے جو کچھ نقل کیا ہے سند بھی نقل کی ہے، اس کا قلمی نسخہ (جلد دوم) کلکتہ کے کتب خانہ میں ہے اور ہمارے پیش نظر ہے۔

نور النبراس:

فی سیرۃ ابن سید الناس، عیون الاثر کی شرح ہے، مصنف کا نام ابراہیم بن محمد ہے، یہ کتاب نہایت محققانہ لکھی گئی ہے اور بے شمار معلومات کا گنجینہ ہے، دو ضخیم جلدوں میں ہے اور ندوہ کے کتب خانہ میں اس کا نہایت عمدہ نسخہ موجود ہے۔

سیرت منظوم:

حافظ زین الدین عراقی نے جو حافظ ابن حجر کے استاد تھے نظم میں لکھی ہے، لیکن دیباچہ میں خود لکھ دیا ہے کہ اس میں رطب و یابس سب کچھ ہے۔

---

[1] ان تمام کتابوں کا ذکر کشف الظنون میں سیرت کے عنوان سے ہے۔

مواہب لدنیہ:

مشہور کتاب ہے اور متاخرین کا یہی ماخذ ہے۔ اس کے مصنف قسطلانی ہیں جو بخاری کے مشہور شارح ہیں۔ حافظ ابن حجر کے ہم عصر تھے۔ یہ کتاب اگرچہ نہایت مفصل ہے لیکن ہزاروں موضوع اور ضعیف روایتیں بھی موجود ہیں۔

زرقانی علی المواہب:

یہ مواہب لدنیہ کی شرح ہے اور حقیقت یہ ہے کہ سہیلی کے بعد کوئی کتاب اس جامعیت اور تحقیق سے نہیں لکھی گئی۔ آٹھ ضخیم جلدوں میں ہے اور مصر میں چھپ گئی ہے۔

سیرت حلبی:

مشہور اور متداول ہے۔

صحت ماخذ:

سیرت نبوی کے واقعات جو قلمبند کئے گئے وہ تقریباً ہجرت کے نوے برس کے بعد قلمبند ہوئے اس لئے مصنفین کا ماخذ کوئی کتاب نہ تھی بلکہ اکثر زبانی روایتیں تھیں۔

اس قسم کا موقع جب دوسری قوموں کو پیش آتا ہے یعنی کسی زمانہ کے حالات مدت کے بعد قلمبند کئے جاتے ہیں تو یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے کہ ہر قسم کی بازاری افواہیں قلمبند کر لی جاتی ہیں جن کے راویوں کا نام و نشان تک معلوم نہیں ہوتا، ان افواہوں میں سے وہ واقعات انتخاب کر لئے جاتے ہیں جو قرائن اور قیاسات کے مطابق ہوتے ہیں، تھوڑی دیر کے بعد یہی خرافات ایک دلچسپ تاریخی کتاب بن جاتے ہیں، یورپ کی اکثر تاریخی تصنیفات اسی اصول پر لکھی گئی ہیں۔

لیکن مسلمانوں نے اس فن سیرت کا جو معیار قائم کیا وہ اس سے بہت زیادہ بلند تھا، اس کا پہلا اصول یہ تھا کہ جو واقعہ بیان کیا جائے اس شخص کی زبان سے بیان کیا جائے جو خود شریک واقعہ تھا اور اگر خود نہ تھا تو شریک واقعہ تک تمام راویوں کا نام بہ ترتیب بتایا جائے، اس کے ساتھ یہ بھی تحقیق کیا جائے کہ جو اشخاص سلسلہ روایت میں آئے کون لوگ تھے؟ کیسے تھے؟ کیا مشاغل تھے؟ چال چلن کیسا تھا؟ حافظہ کیسا تھا؟ سمجھ کیسی تھی؟ ثقہ تھے یا غیر ثقہ؟ سطحی الذہن تھے یا دقیقہ رس؟ عالم تھے یا جاہل؟ ان جزئی باتوں کا پتہ لگانا سخت مشکل بلکہ ناممکن تھا، سینکڑوں ہزاروں محدثین نے اپنی عمریں اسی کام میں صرف کر دیں، ایک ایک شہر میں گئے، راویوں سے ملے، ان کے متعلق ہر قسم کے معلومات بہم پہنچائے، جو لوگ ان کے زمانہ میں موجود نہ تھے ان کے دیکھنے والوں سے حالات دریافت کئے، ان تحقیقات کے ذریعہ سے اسماء الرجال (بایوگرافی) کا وہ عظیم الشان فن تیار ہو گیا، جس کی بدولت آج کم از کم لاکھ شخصوں کے حالات معلوم ہو سکتے ہیں اور اگر ڈاکٹر اسپرنگر[۱] کے حسن ظن کا اعتبار کیا جائے تو یہ تعداد پانچ لاکھ تک پہنچ جاتی ہے۔

[۱] ڈاکٹر اسپرنگر جرمنی کے مشہور مستشرق اور فاضل تھے، مدت تک ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں کام کیا، اصابہ انہی کی نگرانی سے طبع ہوئی، اسی اصابہ کے دیباچہ میں صاحب موصوف نے لکھا ہے کہ کوئی قوم دنیا میں ایسی نہیں گزری، نہ آج موجود ہے جس نے مسلمانوں کی طرح اسماء الرجال کا سا عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو، جس کی بدولت آج پانچ لاکھ شخصوں کا حال معلوم ہو سکتا ہے۔

محدثین نے حالات کے بہم پہنچانے میں کسی شخص کے رتبہ اور حیثیت کی پروا نہ کی، بادشاہوں سے لے کر بڑے سے بڑے مقتداؤں تک کی اخلاقی سرائر تک رسائیاں کیں اور ایک ایک کی پردہ دری کی۔

اس سلسلہ میں سینکڑوں تصنیفات تیار ہوئیں جن کی اجمالی کیفیت یہ ہے۔

سب سے پہلے اس فن یعنی راویوں کی جرح و تعدیل میں یحییٰ بن سعید القطان نے ایک کتاب لکھی، وہ اس رتبہ کے شخص تھے کہ امام احمد بن حنبل نے ان کی نسبت لکھا ہے کہ "میری آنکھوں نے ان کا نظیر نہیں دیکھا" ان کے بعد اس فن کو نہایت رواج ہوا اور کثرت سے کتابیں لکھی گئیں جن میں سے چند ممتاز تصنیفات حسب ذیل ہیں

نام مصنف	کیفیت
رجال عقیلی	خاص ضعیف الروایہ لوگوں کے حال میں ہے۔
رجال احمد بن عبداللہ العجلی المتوفی ۲۶۱ھ	اس کتاب کا نام کتاب الجرح والتعدیل ہے۔
رجال امام عبدالرحمن بن حاتم الرازی المتوفی ۳۲۷ھ	بہت ضخیم کتاب ہے۔
رجال امام دارقطنی	مشہور محدث ہیں، یہ کتاب خاص ضعیف الروایہ لوگوں کے حال میں ہے۔
کامل ابن عدی	اس فن کی سب سے مشہور کتاب ہے اور تمام محدثین متاخرین نے اس کو اپنا ماخذ قرار دیا ہے۔

یہ کتابیں قریباً آج نایاب ہیں، لیکن بعد کی تصنیفات جو انہی سے ماخوذ ہیں آج بھی موجود ہیں۔

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ جامع اور مستند کتاب "تہذیب الکمال" ہے جو علامہ مزی (ابوالحجاج یوسف بن الزکی) کی تصنیف ہے جنہوں نے ۷۴۲ھ میں وفات پائی، علاؤ الدین مغلطائی المتوفی ۷۶۲ھ نے تیرہ جلدوں میں اس کا تکملہ لکھا، علامہ ذہبی المتوفی ۷۴۸ھ نے اس کا اختصار کیا اور بہت سے محدثین نے اس کے خلاصے اور ذیل لکھے اور بالآخر حافظ ابن حجر نے ان تمام تصنیفات سے ایک نہایت ضخیم کتاب "تہذیب التہذیب" لکھی جو بارہ جلدوں میں ہے اور آجکل حیدرآباد سے شائع ہوئی ہے۔ مصنف نے کتاب کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ اس کی تصنیف میں آٹھ برس صرف ہوئے ہیں۔ اس سلسلہ کی ایک اور سب سے زیادہ متداول اور مستند کتاب "میزان الاعتدال" ہے جو علامہ ذہبی کی تصنیف ہے، حافظ ابن حجر نے اس کتاب پر اضافہ کیا جس کا نام لسان المیزان ہے۔

اسماء الرجال کی کتابوں میں سے تہذیب الکمال، تہذیب التہذیب، لسان المیزان، تقریب التہذیب، تاریخ کبیر بخاری، تاریخ صغیر بخاری، ثقات ابن حبان، تذکرۃ الحفاظ علامہ ذہبی، مشتبہ النسبہ ذہبی، انساب سمعانی، تہذیب الاسماء ہماری نظر سے گذری ہیں۔

اس اصول تحقیق کی بنیاد خود قرآن مجید نے قائم کردی تھی۔

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْۤا﴾ (حجرات۔۱)

مسلمانو! اگر تمہارے پاس کوئی فاسق خبر لائے تو تم اچھی طرح اس کی تحقیق کرلو۔

حدیث ذیل بھی اسی کی سند ہے۔

﴿كفى بالمرء كذبا ان يحدث بكل ما سمع﴾

آدمی کے جھوٹے ہونے کے لیے کافی دلیل ہے کہ جو کچھ سنے روایت کردے۔

تحقیق واقعات کا دوسرا اصول یہ تھا کہ جو واقعہ بیان کیا جاتا ہے عقل شہادت کے مطابق بھی ہے یا نہیں؟

درایت کی ابتداء

یہ اصول بھی درحقیقت قرآن مجید ہی نے قائم کر دیا تھا۔ حضرت عائشہؓ پر جب منافقین نے تہمت لگائی تو اس طرح اس خبر کو مشہور کیا کہ بعض صحابہ تک مغالطہ میں آ گئے چنانچہ صحیح بخاری اور مسلم میں ہے کہ حضرت حسانؓ بھی قاذفین میں شریک تھے اور اسی بنا پر حد قذف جاری کی گئی۔ قرآن مجید میں بھی اس کی تصریح ہے۔

﴿ان الذين جاءو بالافك عصبة منكم﴾ (نور-۱)

جن لوگوں نے تہمت لگائی وہ تمہارے گروہ میں سے ہیں۔

تفسیر جلالین میں منکم کی تفسیر حسب ذیل کی ہے۔

﴿جماعة من المؤمنين﴾

یعنی یہ تہمت لگانے والے مسلمانوں کا ایک گروہ ہے۔

قرآن مجید کی آیتیں حضرت عائشہؓ کی برأت اور طہارت کے متعلق جو نازل ہوئیں ان میں سے ایک یہ ہے

﴿ولولا اذ سمعتموه قلتم ما يكون لنا ان نتكلم بهذا سبحانك هذا بهتان عظيم﴾ (نور-۲)

اور جب تم نے یہ واقعہ سنا تو یہ کیوں نہیں کہہ دیا کہ ہم کو ایسی بات منہ سے نکالنی مناسب نہیں سبحان اللہ یہ بڑا بہتان ہے۔

عام اصول کی بنا پر اس خبر کی تحقیق کا یہ طریقہ تھا کہ پہلے راویوں کے نام دریافت کئے جاتے پھر دیکھا جاتا کہ وہ ثقہ اور صحیح الروایہ ہیں یا نہیں؟ پھر ان کی شہادت لی جاتی۔ لیکن خدا نے اس آیت میں فرمایا کہ سننے کے ساتھ تم نے کیوں نہیں کہہ دیا کہ یہ بہتان ہے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس قسم کا خلاف قیاس جو واقعہ بیان کیا جائے تو فوراً سمجھ لینا چاہئے کہ غلط ہے۔

اس طرز تحقیق یعنی درایت کی ابتدا خود صحابہؓ کے عہد میں ہو چکی تھی۔

فقہا میں بعض اس بات کے قائل ہیں کہ آگ پر پکی ہوئی چیز کے کھانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے حضرت ابوہریرہؓ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے سامنے جب اس مسئلہ کو آنحضرت ﷺ کی طرف منسوب کیا تو عبداللہ بن عباسؓ نے کہا اگر یہ صحیح ہو تو اس پانی کے پینے سے بھی وضو ٹوٹ جائے گا جو آگ پر گرم کیا گیا ہو[۱] حضرت عبداللہ بن عباسؓ حضرت ابوہریرہؓ کو ضعیف الروایۃ نہیں سمجھتے تھے لیکن چونکہ ان کے نزدیک یہ روایت درایت کے خلاف تھی اس لئے انہوں نے تسلیم نہیں کی اور یہ خیال کیا کہ سمجھنے میں غلطی ہو گئی ہو گی۔

جب حدیثوں کی تدوین شروع ہوئی تو محدثین نے درایت کے اصول بھی منضبط کئے جن میں سے بعض یہ ہیں

۱ جامع ترمذی باب الوضوء۔

﴿قال[1] ابن الجوزي: كل حديث رأيته يخالف المعقول أو يناقض الأصول فاعلم أنه موضوع فلا يتكلف اعتباره أي لا تعتبر رواته ولا تنظر في جرحهم أو يكون مما يدفعه الحس والمشاهدة أو مباينا لنص الكتاب والسنة المتواترة أو الإجماع القطعي حيث لا يقبل شيء من ذلك التأويل أو يتضمن الإفراط بالوعيد الشديد على الأمر اليسير أو بالوعد العظيم على الفعل اليسير وهذا الأخير كثير موجود في حديث القصاص والطرقية ومن ركة المعنى لا تأكلوا القرعة حتى تذبحوها ولذا جعل بعضهم ذلك دليلا على كذب راويه وكل هذا من القرائن في المروي وقد يكون في الراوي كقصة غياث مع المهدي أو انفراده عمن لم يدركه بما لم يوجد عند غيرهما أو انفراده بشيء مع كونه مما يلزم المكلفين علمه وقطع العذر فيه كما قرره الخطيب في أول الكفاية أو بأمر جسيم تتوفر الدواعي على نقله كحصر العدو للحاج عن البيت﴾

ابن جوزی نے کہا ہے کہ جس حدیث کو دیکھو کہ عقل یا اصول مسلمہ کے مخالف ہے تو جان لو کہ وہ موضوع ہے، اس کی نسبت اس بحث کی ضرورت نہیں کہ اس کے راوی معتبر ہیں یا غیر معتبر، اسی طرح سے وہ حدیث قابل قبول نہیں جو محسوسات اور مشاہدہ کے خلاف ہو، یا نص کتاب اور سنت متواترہ اور اجماع قطعی کے خلاف ہو اور تاویل کی گنجائش نہ رکھتی ہو یا وہ حدیث جس میں ذرا سی بات پر سخت عذاب کی دھمکی ہو یا معمولی کام پر بہت بڑے ثواب کا وعدہ ہو، اس قسم کی حدیثیں واعظوں اور صوفیوں کے ہاں بہت پائی جاتی ہیں، یا وہ حدیث جس میں لغویت پائی جائے مثلاً وہ حدیث کہ کدو کو بغیر ذبح کئے نہ کھاؤ، اس لئے بعض محدثین نے حدیث کو راوی کے کذب کی دلیل قرار دیا ہے۔ یہ تمام قرینے خود روایت سے متعلق ہیں اور کبھی یہ قرینے راوی کے متعلق ہوتے ہیں مثلاً غیاث کا واقعہ مہدی کے ساتھ، یا جب کہ راوی کوئی ایسی حدیث بیان کرے جو اور کسی نے بیان نہ کی ہو اور خود راوی جس سے روایت کرتا ہے اس سے ملاقات نہ ہو، یا وہ حدیث جس کو ایک ہی راوی بیان کرتا ہے حالانکہ بات ایسی ہے کہ سب لوگوں کو اس کا مطلع ہونا ضرور تھا جیسا کہ خطیب بغدادی نے کتاب الکفایہ کے شروع میں اس کی تصریح کی ہے، یا وہ روایت جس میں کسی عظیم الشان واقعہ کا ذکر ہے کہ اگر وہ واقع ہوا ہوتا تو سینکڑوں آدمی اس کو بیان کرتے مثلاً یہ کہ دشمن نے حاجیوں کو کعبہ کے حج سے روک دیا۔

اس عبارت کا ماحصل یہ ہے کہ حسب ذیل صورتوں میں روایت اعتبار کے قابل نہ ہوگی، اور اس کے متعلق اس تحقیق کی ضرورت نہیں کہ اس کے راوی معتبر ہیں یا نہیں۔

۱۔ جو روایت عقل کے مخالف ہو۔

۲۔ جو روایت اصول مسلمہ کے خلاف ہو۔

۳۔ محسوسات اور مشاہدہ کے خلاف ہو۔

۴۔ قرآن مجید یا حدیث متواتر یا اجماع قطعی کے خلاف ہو اور اس میں تاویل کی کچھ گنجائش نہ ہو۔

---

[1] فتح المغیث مطبع لکھنؤ صفحہ ۱۱۱ افسوس ہے کہ یہ کتاب نہایت غلط چھپی ہے اس لئے جو عبارت ہم نے نقل کی ہے اس میں بھی غلطیاں ہوں گی تاہم اصل مطلب میں کوئی فرق نہیں آتا۔

۵۔ جس حدیث میں معمولی بات پر سخت عذاب کی دھمکی ہو۔

۶۔ معمولی کام پر بڑے انعام کا وعدہ ہو۔

۷۔ وہ روایت رکیک المعنی ہو مثلاً کدو کو بغیر ذبح کیے نہ کھاؤ۔

۸۔ جو راوی کسی شخص سے ایسی روایت کرتا ہے کہ کسی اور نے نہیں کی ہو اور یہ راوی اس شخص سے نہ ملا ہو۔

۹۔ جو روایت ایسی ہو کہ تمام لوگوں کو اس سے واقف ہونے کی ضرورت ہو باایں ہمہ ایک راوی کے سوا کسی اور نے اس کی روایت نہ کی ہو۔

۱۰۔ جس روایت میں ایسا قابل الحفظ واقعہ بیان کیا گیا ہو کہ اگر وقوع میں آتا تو سینکڑوں آدمی اس کو روایت کرتے باوجود اس کے صرف ایک ہی راوی نے اس کی روایت کی ہو۔

ملا علی قاری نے جو موضوعات (مطبوعہ مجتبائی دہلی صفحہ ۹۲ تا خاتمہ کتاب) کے خاتمہ میں حدیثوں کے نامعتبر ہونے کے چند اصول تفصیل سے لکھے ہیں اور ان کی مثالیں نقل کی ہیں ہم اس کا خلاصہ اس موقع پر نقل کرتے ہیں۔

۱۔ جس حدیث میں فضول یا مہمل باتیں ہوں جو رسول اللہ ﷺ کی زبان سے نہیں نکل سکتیں مثلاً یہ کہ "جو شخص لا الہ الا اللہ کہتا ہے خدا اس کلمہ سے ایک پرند پیدا کرتا ہے جس کے ستر زبانیں ہوتی ہیں، ہر زبان میں ستر ہزار لغت ہوتے ہیں" الخ۔

۲۔ وہ حدیث جو مشاہدہ کے خلاف ہو مثلاً یہ حدیث کہ "بینگن کھانا ہر مرض کی دوا ہے۔"

۳۔ وہ حدیث جو صریح حدیثوں کے مخالف ہو۔

۴۔ جو حدیث واقع کے خلاف ہو مثلاً یہ کہ "دھوپ میں گرم کئے ہوئے پانی سے غسل نہیں کرنا چاہیے کیونکہ اس سے برص پیدا ہوتا ہے"۔

۵۔ وہ حدیث جو انبیاء علیہم السلام کے کلام سے مشابہت نہ رکھتی ہو مثلاً یہ حدیث کہ "تین چیزیں نظر کو تیز کرتی ہیں، سبزہ زار، آب رواں، خوبصورت چہرہ کا دیکھنا"۔

۶۔ وہ حدیثیں جن میں آئندہ واقعات کی پیشین گوئی تعیین تاریخ مذکور ہوتی ہے مثلاً یہ کہ فلاں سنہ اور فلاں تاریخ میں یہ واقعہ پیش آئے گا۔

۷۔ وہ حدیثیں جو طبیبوں کے کلام سے مشابہ ہیں مثلاً یہ کہ "ہریسہ کے کھانے سے قوت آتی ہے" یا یہ کہ "مسلمان شیریں ہوتا ہے اور شیرینی پسند کرتا ہے۔"

۸۔ وہ حدیث جس کے غلط ہونے کے دلائل موجود ہوں مثلاً عوج بن عنق کا قد تین ہزار گز کا تھا۔

۹۔ وہ حدیث جو صریح قرآن کے خلاف ہو مثلاً دنیا کی عمر سات ہزار برس کی ہے کیونکہ اگر یہ روایت صحیح ہو تو ہر شخص بتا دے گا کہ قیامت کے آنے میں اس قدر دن ہے حالانکہ قرآن سے ثابت ہے کہ قیامت کا وقت کسی کو معلوم نہیں۔

۱۰۔ وہ حدیثیں جو خضر علیہ السلام کے متعلق ہیں۔

۱۱۔ جس حدیث کے الفاظ رکیک ہوں۔

خیال رکھا جانا چاہئے کہ سیرت میں کس طرح کی روایتیں ہوتی ہیں صحیح بھی اور غلط بھی۔

یہی وجہ ہے کہ مناقب اور فضائل اعمال میں کثرت سے ضعیف روایتیں شائع ہو گئیں اور بڑے بڑے علماء نے اپنی کتابوں میں ان روایتوں کا درج کرنا جائز رکھا۔ علامہ ابن تیمیہ کتاب التوسل (مطبوعہ مطبع المنار صفحہ ۹۹) میں لکھتے ہیں۔

﴿قد رواه من صنف فی عمل یوم و لیلة کابن السنی و ابی نعیم و فی مثل هذه الکتب احادیث کثیرة موضوعة لا یجوز الاعتماد علیها فی الشریعة باتفاق العلماء﴾

اس حدیث کو ان لوگوں نے روایت کیا ہے جنہوں نے رات دن کے اعمال میں کتابیں تصنیف کی ہیں مثلاً ابن السنی اور ابونعیم اور اس قسم کی کتابوں میں کثرت سے جھوٹی حدیثیں موجود ہیں جن پر اعتماد کرنا جائز نہیں اور اس پر تمام علماء کا اتفاق ہے۔

حاکم نے مستدرک میں یہ حدیث روایت کی ہے کہ جب حضرت آدمؑ سے خطا سرزد ہوئی تو انہوں نے کہا "اے خدا! میں محمد ﷺ کا واسطہ دیتا ہوں کہ میری خطا معاف کر دے۔" خدا نے کہا "تم نے محمد ﷺ کو کیونکر جانا؟" حضرت آدمؑ نے کہا "میں نے سر اٹھا کر عرش کے پایوں پر نظر ڈالی تو یہ الفاظ لکھے ہوئے دیکھے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ اس سے میں نے قیاس کیا کہ تو نے اپنے نام کے ساتھ جس شخص کا نام ملایا ہے وہ ضرور تجھ کو محبوب ترین خلق ہوگا۔" خدا نے کہا "آدم! تم نے سچ کہا اور محمد ﷺ نہ ہوتے تو میں تم کو پیدا بھی نہ کرتا۔" حاکم نے اس حدیث کو نقل کر کے لکھا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ علامہ ابن تیمیہ حاکم کا یہ قول نقل کر کے لکھتے ہیں:

﴿و اما تصحیح الحاکم لمثل هذا الحدیث و امثاله فهذا مما انکره علیه ائمة العلم بالحدیث و قالوا ان الحاکم یصحح احادیث و هی موضوعة مکذوبة عند اهل المعرفة بالحدیث ..... و کذلک احادیث کثیرة فی مستدرکه یصححها و هی عند ائمة اهل العلم بالحدیث موضوعة﴾ [۱]

حاکم کا اس قسم کی حدیثوں کو صحیح کہنا ائمہ حدیث نے اس پر انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ حاکم بہت سی جھوٹی اور موضوع حدیثوں کو صحیح کہتے ہیں۔ اسی طرح حاکم کی مستدرک میں بہت سی حدیثیں ہیں جن کو حاکم نے صحیح کہا ہے حالانکہ وہ ائمہ حدیث کے نزدیک موضوع ہیں۔

علامہ موصوف ایک اور موقع پر ابو الشیخ اصفہانی کی کتاب کا تذکرہ کر کے لکھتے ہیں (صفحہ ۱۰۵ و ۱۰۶)

﴿و فیها احادیث کثیرة قویة صحیحة و حسنة و احادیث کثیرة ضعیفة موضوعة و واهیة و کذلک ما یرویه خیثمة بن سلیمان فی فضائل الصحابة و ما یرویه ابو نعیم الاصبهانی فی فضائل الخلفاء فی کتاب مفرد و فی اول حلیة الاولیاء و ما یرویه ابو بکر الخطیب و ابو الفضل بن ناصر و ابو موسی المدینی و ابو القاسم بن عساکر و الحافظ عبد الغنی

---

۱ کتاب التوسل مطبوعہ منار صفحہ ۷۰ | اختصار کی غرض سے درمیانی عبارت ترک کر دی گئی ہے۔

واكثرهم ممن له معرفة بالحديث ـ ﴾

اور اس میں بہت سی حدیثیں ہیں جو قوی ہیں اور حسن ہیں اور بہت سی ضعیف اور موضوع اور مہمل ہیں اور اسی طرح وہ حدیثیں جو خیثمہ بن سلیمان صحابہؓ کے فضائل میں روایت کرتے ہیں اور وہ حدیثیں جو ابو نعیم اصفہانی نے ایک مستقل کتاب میں خلفاء کے فضائل میں روایت کی ہیں اور حلیۃ الاولیاء کے اول میں اسی طرح وہ روایتیں جو ابوبکر خطیب اور ابوالفضل اور ابو موسیٰ مدینی اور ابن عساکر اور حافظ عبدالغنی وغیرہ اور ان کے پایہ کے لوگ روایت کرتے ہیں۔

غور کرو ابونعیمؒ، خطیب بغدادی، ابن عساکرؒ، حافظ عبدالغنی وغیرہ حدیث اور روایت کے امام تھے، باوجود اس کے یہ لوگ خلفاء اور صحابہؓ کے فضائل میں ضعیف حدیثیں بے تکلف روایت کرتے تھے، اس کی وجہ یہی تھی کہ یہ خیال عام طور پر پھیل گیا تھا کہ صرف حلال و حرام کی حدیثوں میں احتیاط اور تشدد کی ضرورت ہے، ان کے سوا اور روایتوں میں سلسلہ سند نقل کر دینا کافی ہے، تنقید اور تحقیق کی ضرورت نہیں۔

موضوعات ملا علی قاری میں لکھا ہے کہ بغداد میں ایک واعظ نے یہ حدیث بیان کی کہ ''قیامت میں خدا آنحضرت ﷺ کو اپنے ساتھ عرش پر بٹھائے گا'' امام ابن جریر طبری نے سنا تو بہت برہم ہوئے اور اپنے دروازہ پر یہ فقرہ لکھ کر لگا دیا کہ ''خدا کا کوئی ہم نشین نہیں'' اس پر بغداد کے عوام سخت برافروختہ ہوئے اور امام موصوف کے گھر پر اس قدر پتھر برسائے کہ ڈیوڑھی ڈھک گئی۔[1]

اس موقع پر ایک خاص نکتہ لحاظ کے قابل ہے، یہ مسلم ہے کہ حدیث و روایت میں امام بخاری اور مسلم سے بڑھ کر کوئی شخص کامل فن نہیں ہے، اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ان کو جو عقیدت اور خلوص اور شیفتگی تھی، اس کے لحاظ سے بھی وہ تمام محدثین پر ممتاز تھے، باوجود اس کے فضائل و مناقب کے متعلق جس قسم کی مبالغہ آمیز روایتیں بیہقی، ابونعیم، بزاز، طبرانی وغیرہ میں پائی جاتی ہیں، بخاری اور مسلم میں ان کا پتہ نہیں لگتا، بلکہ اس قسم کی حدیثیں جو نسائی، ابن ماجہ، ترمذی وغیرہ میں پائی جاتی ہیں، صحیحین میں وہ بھی مذکور نہیں، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جس قدر تحقیق و تنقید کا درجہ بڑھتا جاتا ہے مبالغہ آمیز روایتیں گھٹتی جاتی ہیں، مثلاً یہ روایت کہ جب آنحضرت ﷺ عالم وجود میں آئے تو ایوان کسریٰ کے ۱۴ کنگرے گر پڑے، آتش کدہ فارس بجھ گیا، بحیرہ طبریہ خشک ہو گیا، بیہقی، ابونعیم، خرائطی، ابن عساکر اور ابن جریر نے روایت کی ہے، لیکن صحیح بخاری، صحیح مسلم بلکہ صحاح ستہ کی کسی کتاب میں اس کا پتہ نہیں۔

سیرت پر جو کتابیں لکھی گئیں وہ زیادہ تر اسی قسم کی کتابوں (طبرانی، بیہقی، ابونعیم وغیرہ سے) ماخوذ ہیں اس لئے ان میں کثرت سے کمزور روایتیں درج ہو گئیں اور اسی بناء پر محدثین کو کہنا پڑا کہ سیر میں ہر قسم کی روایتیں ہوتی ہیں۔

محدثین نے جو اصول قرار دیے تھے سیرت کی روایتوں میں لوگوں نے اکثر نظر انداز کر دیئے، محدثین کا سب سے پہلا اصول یہ ہے کہ روایت کا سلسلہ اصل واقعہ تک کہیں منقطع نہ ہونے پائے، لیکن آنحضرت ﷺ کے حالات ولادت کے متعلق جس قدر روایتیں مذکور ہیں اکثر منقطع ہیں، صحابہؓ میں سے کوئی شخص ایسا نہیں جس کی عمر آنحضرت ﷺ کی ولادت کے وقت روایت کے قابل ہو، سب سے معمر حضرت ابوبکرؓ ہیں اور وہ آنحضرت ﷺ سے عمر میں دو برس کم تھے

1 [illegible]

اسی بنا پر میلاد کے متعلق جس قدر روایتیں ہیں ان میں سے اکثر متصل نہیں اور اسی بنا پر بہت دوراز کار روایتیں پھیل گئیں، مثلاً ابونعیم نے آنحضرت ﷺ کی والدہ ماجدہ کی زبانی روایت کی ہے کہ ”جب آنحضرت ﷺ پیدا ہوئے تو بہت سے پرندے آ کر مکان میں بھر گئے جن کی زمرد کی منقار اور یاقوت کے پر تھے پھر ایک سفید بادل آیا اور آنحضرت ﷺ کو اٹھا لے گیا اور ندا آئی کہ اس بچے کو مشرق و مغرب اور تمام دنیا کی سیر کراؤ کہ سب لوگ پہچان لیں“ [1]

مغازی کا بڑا حصہ امام زہری سے منقول ہے لیکن ان کی اکثر روایتیں جو سیرت ابن ہشام اور طبقات ابن سعد وغیرہ میں مذکور ہیں منقطع ہیں یعنی اوپر کے راویوں کے نام مذکور نہیں۔

۲۔ نہایت تعجب انگیز بات یہ ہے کہ فن سیرت کے بڑے بڑے مصنفین مثلاً امام طبری وغیرہ نے سیرت پر جو کچھ لکھا اس میں اکثر جگہ مستند احادیث کی کتابوں سے کام نہیں لیا۔

بعض واقعات نہایت اہم ہیں، ان کے متعلق حدیث کی کتابوں میں ایسے مفید معلومات موجود ہیں جن سے تمام مشکل حل ہو جاتی ہے لیکن سیرت اور تاریخ میں ان معلومات کا ذکر نہیں مثلاً یہ امر کہ جب آنحضرت ﷺ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے گئے تو لڑائی کا سلسلہ ابتدائی کس کی طرف سے شروع ہوا؟ ایک بحث طلب واقعہ ہے، تمام ارباب سیر اور مورخین کی تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ خود آنحضرت ﷺ نے ابتدا کی لیکن سنن ابی داؤد میں صاف اور صریح حدیث موجود ہے کہ جنگ بدر سے پہلے کفار مکہ نے عبداللہ بن ابی کو خط لکھا کہ ”تم نے محمد کو اپنے شہر میں پناہ دی ہے ان کو نکال دو ورنہ ہم خود مدینہ آ کر تمہارا اور محمد دونوں کا استیصال کر دیں گے۔“ [2] سیرت اور تاریخ کی کتابوں میں یہ واقعہ سرے سے منقول نہیں۔

مصنفین سیرت میں سے بعض لوگوں نے اس نکتہ کو سمجھا اور جب احادیث کی زیادہ چھان بین کی تو ان کو تسلیم کرنا پڑا کہ سیرت کی کتابوں میں بہت سی روایتیں صحیح حدیثوں کے خلاف درج ہو گئی ہیں لیکن چونکہ ان کی تصنیف پھیل چکی تھی اس لیے اس کی اصلاح نہ ہو سکی۔ حافظ ابن حجر ایک موقع پر دمیاطی کا ایک قول نقل کر کے لکھتے ہیں۔

﴿ودل هذا على انه كان يعتقد الرجوع عن كثير مما وقع في اهل السير وخالف الاحاديث الصحيحة وان ذلك كان منه قبل تفقهه منها ولخروج نسخ كتابه وانتشاره لم يتمكن من تغيره﴾ [3]

یہ قول اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اکثر واقعات جن میں دمیاطی نے اہل سیر کی موافقت اور صحیح حدیثوں کی مخالفت کی تھی ان سے رجوع کیا لیکن چونکہ کتاب کے نسخے پھیل گئے تھے اس لیے اس کی اصلاح نہ کر سکے۔

۳۔ سیرت میں اگلوں نے جو کتابیں لکھیں ان سے مابعد کے لوگوں نے جو روایتیں نقل کیں انہی کے نام سے کیں ان کے مستند ہونے کی بنا پر لوگوں نے ان تمام روایتوں کو معتبر سمجھ لیا اور چونکہ اصل کتابیں ہر شخص کو ہاتھ نہیں آ سکتی

---

[1] مواہب لدنیہ میں یہ روایت نقل کی ہے اس میں بے انتہا مبالغہ آمیز باتیں ہیں ہم نے صرف ٹکڑا نقل کر دیا ہے۔

[2] غزوہ بدر کے موقع پر ہم اس حدیث کے اصلی الفاظ نقل کریں گے۔

[3] زرقانی جلد ۳ صفحہ ۱۱۔

تھیں، ان سے لوگ راویوں کا پتہ لگا سکتے اور رفتہ رفتہ یہ روایتیں تمام کتابوں میں داخل ہو گئیں، اس تدلیس کا یہ نتیجہ ہوا کہ مثلاً جو روایتیں واقدی کی کتاب میں مذکور ہیں، ان کو لوگ عموماً غلط سمجھتے ہیں، لیکن انہیں روایتوں کو جب ابن سعد کے نام سے نقل کر دیا جاتا ہے تو لوگ ان کو معتبر سمجھتے ہیں، حالانکہ ابن سعد کی اصلی کتاب ہاتھ آئی تو پتہ لگا کہ ابن سعد نے اکثر روایتیں واقدی ہی سے لی ہیں۔

۴۔ روایت کے متعلق جو اصول منضبط ہوئے صحابہؓ کے متعلق ان سے بعض بعض موقعوں پر کام نہیں لیا گیا، مثلاً اصول روایت کی رو سے رواۃ کے مختلف مدارج ہیں، کوئی راوی نہایت ضابط، نہایت متقی، نہایت فہیم، نہایت دقیقہ رس ہوتا ہے، کسی میں یہ اوصاف کم ہوتے ہیں، کسی میں اور بھی کم ہوتے ہیں، یہ فرق مراتب جس طرح فطرۃً عام راویوں میں پایا جاتا ہے صحابہؓ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں، حضرت عائشہؓ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت ابوہریرہؓ کی روایت پر اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت پر جو تنقیدیں کیں اور جن کا ذکر اوپر گزر چکا اسی بنا پر کیں۔

اختلاف مراتب کی بنیاد پر بڑے بڑے معرکہ آرا مسائل کی بنیاد قائم ہے، مثلاً دو روایتوں میں تعارض پیش آ جائے تو اس بحث کے فیصلہ میں صحیح طریقہ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ایک روایت کے راویوں کا دوسری روایت کے راویوں سے عالی رتبہ ہونا ثابت کر دیا جائے (گو دونوں راوی ثقہ ہیں) اور یہ اس روایت کی ترجیح کا قطعی ذریعہ ہوگا، لیکن صحابہؓ میں آ کر یہ اصول بیکار ہو جاتا ہے، فرض کرو ایک روایت صرف حضرت عمرؓ سے مروی ہے، دوسری کسی بدوی عرب سے مروی ہے جس نے عمر بھر میں صرف ایک دفعہ اتفاقاً آنحضرت ﷺ کو دیکھ لیا تھا تو اب دونوں روایتوں کا رتبہ برابر ہو جاتا ہے، علامہ مازری مشہور محدث ہیں، علامہ نووی شرح صحیح مسلم میں اکثر ان سے استناد کرتے ہیں، انہوں نے اس تعمیم کی مخالفت کی تھی، چنانچہ حافظ ابن حجر نے اصابہ کے دیباچہ (صفحہ ۱۱) میں ان کا یہ قول نقل کیا ہے۔

﴿لسنا نعني بقولنا الصحابة عدول كل من رآه ﷺ يوماً ما او زاره لماماً او اجتمع به لغرض وانصرف عن كثب وانما نعني به الذين لازموه وعزروه ونصروه واتبعوا النور الذي انزل معه اولئك هم المفلحون۔﴾

یہ مقولہ کہ صحابہ سب عادل ہیں، ہم اس سے ہر ایسے شخص کو مراد نہیں لیتے جس نے آنحضرت ﷺ کو اتفاقاً دیکھ لیا یا آنحضرت ﷺ سے کسی غرض کے لئے ملا اور پھر فوراً واپس چلا گیا، بلکہ ہم ان لوگوں کو مراد لیتے ہیں جو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں بہ التزام رہے اور آپ کی امداد کی اور اس نور کی پیروی کی جو آنحضرت ﷺ پر نازل ہوا، یہی لوگ کامیاب ہیں۔

لیکن محدثین نے مازری کے اس قول سے عام مخالفت کی، علامہ مازری نے بے شبہ یہ غلطی کی کہ عدالت کے وصف کو صرف مقربین صحابہؓ سے مخصوص کر دیا، اس بنا پر محدثین کی مخالفت ان سے بجا تھی لیکن اس میں کیا شبہ ہو سکتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ و علیؓ کی روایتیں ایک عام بدوی کی روایت کے برابر نہیں ہو سکتیں، خصوصاً ان روایتوں کے متعلق یہ فرق ضرور لحاظ رکھنا چاہئے جو فقہی مسائل یا دقیق مطالب سے تعلق رکھتی ہیں۔

۵۔ ارباب سیر اکثر واقعات کے اسباب اور علل سے بحث نہیں کرتے نہ ان کی تلاش و تحقیق کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، اگرچہ اس میں شبہ نہیں کہ اس باب میں یورپ کا طریقہ نہایت غیر معتدل ہے، یورپین مورخ ہر واقعہ کی علت

تلاش کرتا ہے اور نہایت دور دراز قیاسات اور احتمالات سے سلسلۂ معلومات پیدا کرتا ہے، اس میں بہت کچھ اس کی خود غرضی اور خاص رنگ نظر کو دخل ہوتا ہے۔ وہ اپنے مقصد کو ایک محور بنا لیتا ہے، تمام واقعات اسی کے گرد گردش کرتے ہیں، بخلاف اس کے اسلامی مؤرخ نہایت سچائی اور انصاف اور خالص بے طرف داری سے واقعات کو ڈھونڈتا ہے، اس کو اس سے کچھ غرض نہیں ہوتی کہ واقعات کا اثر اس کے مذہب، معتقدات پر اور تاریخ پر کیا پڑے گا، اس کا قبلۂ مقصد صرف واقعیت ہوتی ہے، وہ اس پر اپنے معتقدات اور قومیت کو بھی قربان کر دیتا ہے۔

لیکن اس میں حد سے زیادہ احتیاط ہوگئی اس بات سے بچنے کے لئے کہ واقعات رائے سے مخلوط نہ ہو جائیں وہ پاس پاس کے ظاہری اسباب پر بھی نظر نہیں ڈالتا اور ہر واقعہ کو خشک اور ادھورا چھوڑ دیتا ہے، مثلاً اکثر لڑائیوں کو اس طرح شروع کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فلاں قبیلہ پر فلاں وقت فوجیں بھیجیں، لیکن اس کے اسباب کا ذکر مطلق نہیں کرتے جس سے عام ناظرین پر یہ اثر پڑتا ہے کہ کفار پر حملہ کرنے اور ان کو تباہ و برباد کرنے کے لئے کسی سبب اور وجہ کی ضرورت نہ تھی، صرف یہ عام وجہ کافی ہے کہ وہ کافر ہیں، اسی سے مخالفین یہ استدلال کرتے ہیں کہ اسلام تلوار سے پھیلا ہے، حالانکہ زیادہ چھان بین سے ثابت ہوتا ہے کہ جن قبائل پر فوجیں گئیں وہ پہلے سے آمادۂ جنگ اور مسلمانوں پر حملہ کی تیاریاں کر چکے تھے۔

۹۔ یہ لحاظ رکھنا ضرور ہے کہ واقعہ کی نوعیت کے بدلنے سے شہادت اور روایت کی حیثیت کہاں تک بدل جاتی ہے، مثلاً ایک راوی ثقہ ہے، ایک ایسا معمولی واقعہ بیان کرتا ہے جو عموماً پیش آتا ہے اور پیش آ سکتا ہے تو بے تکلف یہ روایت تسلیم کر لی جائے گی، لیکن فرض کرو وہی راوی ایسا واقعہ بیان کرتا ہے جو غیر معمولی ہے، تجربہ عام کے خلاف ہے، گرد و پیش کے واقعات سے مناسبت نہیں رکھتا تو واقعہ چونکہ زیادہ قوی ثبوت کا محتاج ہے اس لئے اب راوی کا معمولی درجۂ وثوق کافی نہیں ہو سکتا، بلکہ اس کو معمولی درجہ سے زیادہ عادل، زیادہ ضابطہ، زیادہ دقیقہ داں ہونا چاہئے۔

مثلاً ایک بحث یہ ہے کہ روایت کرنے کے لئے کسی عمر کی قید ہے یا نہیں؟ اکثر محدثین کا مذہب ہے کہ ۵ برس کا لڑکا حدیث کی روایت کر سکتا ہے، یعنی مثلاً اگر کسی صحابی نے ۵ برس کی عمر میں آنحضرت ﷺ کے کسی قول یا فعل کی روایت کی تو قابل اعتبار ہوگی، محدثین کا اس پر استدلال ہے کہ محمود بن الربیعؓ ایک صحابی تھے، آنحضرت ﷺ کے وفات فرمانے کے وقت وہ پانچ برس کے بچے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے ایک دفعہ اظہار محبت کے طور پر ان کے منہ پر کلی کا پانی ڈال دیا تھا۔ اس واقعہ کو انہوں نے جوان ہو کر لوگوں سے بیان کیا اور سب نے یہ روایت قبول کی، اس سے ثابت ہوا کہ ۵ برس کی عمر کی روایت قبول ہو سکتی ہے۔[1]

اس کے برخلاف بعض محدثین کی رائے ہے کہ کمسن کی روایت قابل حجت نہیں، فتح المغیث میں ہے۔

﴿ولكن قد منع قوم القبول هنا اي في مسئلة الصبي خاصة فلم يقبلوا من تحمل قبل البلوغ لان الصبي مظنة عدم الضبط وعدم تحرجه للشاهدة..... وكذا كان ابن المبارك يتوقف في تحديث الصبي﴾ (کتاب مذکور صفحہ ۱۴۶)

۱؎ یہ پوری بحث فتح المغیث صفحہ ۱۴۶ تا صفحہ ۱۴۸ میں ہے۔

ایک یہ بحث ہے کہ جو صحابہ فقیہ نہ تھے ان کی روایت اگر قیاس شرعی کے خلاف ہو تو واجب العمل ہو گی یا نہیں؟ اس کے متعلق بحرالعلوم امام فخر الاسلام کا مذہب نقل کر کے لکھتے ہیں۔

﴿ و وجه قول الامام فخر الاسلام ان النقل بالمعنى شائع و قلما يوجد النقل بلفظه فان حادثة واحدة قد رويت بعبارات مختلفة ثم ان تلك العبارات ليست مترادفة بل قد يوجد في ذلك المعنى بعبارات متمايزة فاذا كان الراوي غير فقيه احتمل الخطاء في فهم المعنى المراد للشرعي ...ولا يلزم منه نسبة الكذب متعمدا الى الصحابي معاذ الله عن ذلك ﴾ (شرح مسلم جلد دوم صفحہ ۳۳۲)

امام فخر الاسلام کے قول کی وجہ یہ ہے کہ روایت بالمعنی عام طور پر شائع ہے اور بہت کم ہوتا ہے کہ روایت بالفاظ کی جائے کیونکہ ایک ہی واقعہ مختلف الفاظ میں ادا کیا گیا ہے اور یہ الفاظ باہم مترادف بھی نہیں بلکہ اکثر جداگانہ عبارتوں میں مطالب ادا کیے گئے ہیں اس بنا پر جب راوی فقیہ نہ ہوگا تو احتمال ہوگا کہ اس نے مطلب مقصود شرعی کے سمجھنے میں غلطی کی ہو اس سے معاذ اللہ یہ لازم نہیں آتا کہ صحابی کی طرف جھوٹ کی نسبت کی جائے۔

محدثین اس اصول سے کہ "واقعہ جس درجہ کا اہم ہو شہادت بھی اسی درجہ کی اہم ہونی چاہیے" بے خبر نہ تھے۔ امام بیہقی کتاب المدخل میں ابن مہدی کا قول نقل کرتے ہیں۔

﴿ اذا روينا عن النبي ﷺ في الحلال والحرام والاحكام شددنا في الاسانيد و انتقدنا في الرجال و اذا روينا في الفضائل والثواب والعقاب سهلنا في الاسانيد و تسامحنا في الرجال ﴾ (فتح المغیث صفحہ ۱۲۰)

جب ہم آنحضرت ﷺ سے حلال و حرام و احکام کے متعلق حدیث روایت کرتے ہیں تو سند میں نہایت تشدد کرتے ہیں اور راویوں کو پرکھ لیتے ہیں لیکن جب فضائل اور ثواب و عذاب کی حدیثیں آتی ہیں تو ہم سند میں سہل انگاری کرتے اور راویوں کے متعلق چشم پوشی کرتے ہیں۔

امام احمد بن حنبل کا قول ہے۔

﴿ ابن اسحاق رجل تكتب عنه هذه الاحاديث يعني المغازي و نحوها و اذا جاء الحلال و الحرام اردنا قوما هكذا و قبض اصابع يديه الاربع ﴾ (فتح المغیث صفحہ ۱۲۰)

ابن اسحاق اس درجے کے آدمی ہیں کہ مغازی وغیرہ کی حدیثیں ان سے روایت کی جا سکتی ہیں لیکن جب حلال و حرام کے مسائل آئیں تو ہم کو ایسے لوگ درکار ہیں، یہ کہہ کر انہوں نے چاروں انگلیاں بند کر کے دکھلائیں۔

اس سے ثابت ہوا کہ محدثین واقعہ کی اہمیت کی بنا پر راوی کے درجہ کا لحاظ رکھتے تھے۔ اسی بنا پر ابن اسحاق کی نسبت امام ابن حنبل نے یہ تفریق کی کہ "حلال و حرام میں ان کی شہادت معتبر نہیں لیکن مغازی میں ان کا اعتبار ہے"۔ یہ وہی اصول ہے کہ جس درجہ کا واقعہ ہو اسی درجہ کی شہادت ہونی چاہیے۔ وہ یہ کہ واقعہ کے بدلنے سے شہادت کی اہمیت بدل جاتی ہے لیکن واقعہ کی اہمیت احکام فقہیہ کے ساتھ مخصوص نہیں۔

بهذا الذي ابتداء باشاعة ذلك ان يكون من المنافقين كما تقدم ﴾

جو خبریں شائع ہو جاتی ہیں گو ان کے راوی کثرت سے ہوں لیکن اگر ان خبروں کی بنیاد امر حسی یعنی مشاہدہ یا استماع نہ ہو تو ان کا کچھ اعتبار نہیں۔ چنانچہ انصاری نے اور ان صحابہؓ نے جن کو حضرت عمرؓ نے منبر کے پاس دیکھا تھا طلاق کا یقین کر لیا وہ یوں ہوا ہوگا کہ کسی شخص نے آنحضرت ﷺ کو دیکھا کہ آپ نے ازواج مطہراتؓ سے علیحدگی اختیار کر لی ہے اور چونکہ آنحضرت ﷺ کی یہ عادت تھی ⟨?⟩ اس لئے اس نے یہ قیاس کیا کہ آنحضرت ﷺ نے طلاق دے دی اس نے یہ خبر پھیلا دی اور لوگ ایک دوسرے سے نقل کرنے لگے درحقیقت یہ ہے کہ اول جس شخص نے یہ خبر پھیلائی وہ منافق ہوگا۔ (فتح الباری شرح بخاری طبع اول مصر جلد ۹ صفحہ ۲۵۰)

غور کرو مسجد نبوی میں تمام صحابہؓ جمع ہیں اور سب بیان کر رہے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے طلاق دے دی، صحابہؓ کل ثقہ اور عادل ہیں اور ان کی تعداد کثیر اس واقعہ کو بیان کر رہی ہے باوجود اس کے جب تحقیق کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ واقعہ نہیں بلکہ قیاس تھا۔ حافظ ابن حجرؒ نے بڑی جرأت کر کے یہ خیال ظاہر کیا کہ راوی اول منافقین میں سے ہوگا۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کی نسبت بہت سے ایسے واقعات روایتوں میں مذکور ہیں جن میں سے ایک واقعہ افک ہے، ان کی نسبت بھی وہی قیاس ہونا چاہئے جو حافظ ابن حجرؒ نے یہاں ظاہر کیا یعنی یہ کہ منافقین نے ان کی طرف منسوب کر دیئے ہوں گے پھر تمام مسلمانوں میں پھیل گئے۔

۸۔ فن تاریخ و روایت پر جو خارجی اسباب اثر کرتے ہیں ان میں سب سے بڑا قوی اثر حکومت کا ہوتا ہے لیکن مسلمانوں کو ہمیشہ اس پر فخر کا موقع حاصل رہے گا کہ ان کا قلم تلوار سے کبھی نہیں دبا۔ حدیثوں کی تدوین بنو امیہ کے زمانہ میں ہوئی جنہوں نے پورے ۹۰ برس تک سندھ سے ایشیائے کوچک اور اندلس تک مساجد جامع میں آل فاطمہ کی توہین کی اور جمعہ میں سر منبر حضرت علیؓ پر لعن کہلوایا، سینکڑوں ہزاروں حدیثیں امیر معاویہ وغیرہ کے فضائل میں بنوائیں جو بنو امیہ کے زمانہ میں ایک ایک صوبہ کے نام بنام محدثین کو بیان حدیث سے روکا گیا ⟨?⟩ لیکن نتیجہ کیا ہوا؟ عین اسی زمانہ میں محدثین نے علانیہ منادی کر دی کہ یہ سب جھوٹی روایتیں ہیں۔ فن حدیث کو ان قسم کے شائبہ سے پاک ہے ⟨?⟩ اور بنو امیہ اور عباسیہ جو کل خلفاء اور سلاطین مظہر تھے ⟨?⟩ اسی مقام پر نظر آتے ہیں جہاں ان کو ہونا چاہئے تھا۔

ایک دفعہ ایک شاعر نے ہارون الرشید کے دربار میں قصیدہ پڑھا کہ "امیر المومنین! اگر تو آنحضرت ﷺ کے انتقال کے وقت موجود ہوتا تو خلافت کا جھگڑا سرے سے نہ پیدا ہوتا دونوں فریق تیرے ہاتھ پر بیعت کر لیتے"۔ دربار عام دربار میں ایک شخص نے اٹھ کر کہا "تو جھوٹ کہتا ہے امیر المومنین کا باپ (حضرت عباسؓ جو عباسیوں کے مورث اعلیٰ ہیں) وہاں موجود تھا اس کو کس نے پوچھا؟" ہارون الرشید کو بھی اس مستانہ دلیری کے جواب کی تحسین کرنی پڑی۔ ⟨?⟩

تاہم یہ تاثیر مطلقاً بالکل بے اثر نہیں رہ سکتا تھا اس لئے مغازی میں اس کے نشانات پائے جاتے ہیں، تاریخ نگاری کا قدیم طریقہ یہ تھا کہ فتوحات اور ترتیب کارناموں کو نہایت تفصیل سے لکھتے تھے ملکی نظم و نسق اور تمدن و معاشرت کے واقعات یا تو بالکل قلم انداز کر جاتے تھے یا اس طرح پراگندہ اور بے اثر لکھتے تھے کہ ان پر نگاہ نہیں پڑتی تھی۔ اسلام میں جب تالیف و تصنیف کی ابتدا ہوئی تو یہی نمونے پیش نظر تھے اس کا پہلا نتیجہ یہ تھا کہ سیرت کا نام مغازی رکھا گیا جس میں

اور کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

(۲) اسی طرح جب ان کے سامنے یہ حدیث بیان کی گئی کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کشتگان بدر کی نسبت فرمایا کہ میں جو کچھ کہتا ہوں یہ سنتے ہیں، حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ ابن عمر نے غلطی کی[1]۔ اس روایت کے راوی اگرچہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ تھے جو مشہور صحابی ہیں، لیکن حضرت عائشہؓ نے اس بنا پر روایت کی صحت سے انکار کیا کہ ان کے نزدیک یہ روایت قرآن مجید کے خلاف تھی۔

اکثر محدثین نے ان مباحث میں ثابت کیا ہے کہ روایت صحیح ہے اور حضرت عائشہؓ کا اجتہاد جس کی بنا پر انہوں نے روایت سے انکار کیا، صحیح نہیں، ہم کو اس سے بحث نہیں، اس موقع پر صرف یہ بحث ہے کہ اکابر صحابہؓ میں ایسے لوگ بھی تھے جو روایت کو باوجود راوی کے ثقہ ہونے کے اس بنا پر تسلیم نہیں کرتے تھے کہ وہ اصول عقلی یا نقلی کے خلاف ہے۔

(۳) ایک مختلف فیہ مسئلہ یہ ہے کہ عورت کو جب طلاق دے دی جائے تو عدت کے زمانہ تک شوہر پر اس کے کھانے پینے اور رہنے کا انتظام واجب ہے یا نہیں؟ فاطمہ بنت قیس ایک صحابیہ تھیں جن کو ان کے شوہر نے طلاق دے دی تھی، ان کا بیان ہے کہ وہ آنحضرت ﷺ کے پاس گئیں تو آپ نے ان کو نفقہ اور مکان نہیں دلوایا، انہوں نے یہ حدیث حضرت عمرؓ کے سامنے بیان کی، حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ہم خدا کی کتاب اور آنحضرت ﷺ کی سنت کو ایک عورت کے بیان پر نہیں چھوڑ سکتے، جس کی نسبت ہم کو معلوم نہیں کہ اس نے یاد رکھا یا بھول گئی، امام شعبی نے ایک مجلس میں فاطمہ کی یہ روایت بیان کی تو اسود بن یزید نے ان کو کنکر مارا اور کہا کہ تم ایسی حدیث بیان کرتے ہو، پھر حضرت عمرؓ کا مذکورہ بالا قول نقل کیا ہے[2]۔

صحابہؓ کے بعد بھی محدثین میں ایک ایسا گروہ موجود تھا جو عقلی یا اصولی وجوہ پر بعض روایات کے تسلیم کرنے میں تامل کرتا تھا گو ان کے راوی ثقہ اور مستند ہوتے تھے۔

(۱) ایک ضعیف حدیث ہے کہ "جس شخص نے عشق کیا اور پاک دامن رہا اور وفات پائی وہ شہید ہوا" حافظ ابن قیم زاد المعاد میں اس حدیث کو دلائل عقلی سے باطل ثابت کر کے لکھتے ہیں۔

﴿ولو كان اسناد هذا الحديث كالشمس كان غلطاً و وهماً﴾[3]

اگر اس حدیث کی سند آفتاب کی طرح بھی ہوتی تب بھی وہ غلط اور وہم ہوتی۔

(۲) صحیح مسلم، کتاب الجہاد باب الفئی میں روایت ہے کہ حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ حضرت عمرؓ کے پاس آئے، حضرت عباسؓ نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ

﴿اقض بيني وبين هذا الكاذب الآثم الغادر الخائن﴾[4]

میرے اور اس جھوٹے، گنہگار، دغاباز، خائن کے درمیان فیصلہ کیجئے۔

---

[1] صحیح مسلم کتاب الجنائز میں یہ واقعہ متعدد طریقوں سے مذکور ہے۔

[2] صحیح مسلم کتاب الطلاق۔

[3] زاد المعاد جلد ثانی مطبع [illegible]

[4] نووی شرح صحیح مسلم [illegible]

جانوروں پر سوار ہونا ممنوع کیا گیا ہے۔

حافظ ابن حجر نے یہ قول نقل کر کے لکھا ہے کہ "اعتراض کا یہ طریقہ پسندیدہ نہیں ہے اگر سند صحیح ہے تو تاویلات بعید سے جمع ہو سکتی ہیں"۔

(۹) صحیح بخاری میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ایک[1] دفعہ عبداللہ بن ابی کے طرفداروں اور آنحضرت ﷺ کے صحابہؓ میں جھگڑا ہو گیا اس پر یہ آیت اتری۔

﴿وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا﴾ (حجرات-۱)

اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ جائیں تو ان میں صلح کرا دو۔

روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت تک عبداللہ بن ابی اور اس کا گروہ ظاہر میں بھی اسلام نہیں لایا تھا اس بنا پر ابن بطال نے اس حدیث پر اعتراض کیا ہے کہ آیت قرآنی اس واقعہ کے متعلق نہیں ہو سکتی اس لئے کہ آیت میں تصریح ہے کہ جب دونوں گروہ مومن ہوں اور یہاں عبداللہ بن ابی کا گروہ منافقین کا فرقہ تھا۔

حافظ ابن حجر نے اس کا جواب دیا ہے کہ تغلیباً ایسا کہا گیا۔

اس قسم کے اور بہت سے واقعات ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ بہت سے محدثین سلسلۂ سند کے ساتھ یہ بھی دیکھتے تھے کہ دوسرے شواہد اور قرائن بھی اس کے موافق ہیں یا نہیں۔

(۱۰) ایک بڑا امر طلب روایت بالمعنی کا ہے یعنی آنحضرت ﷺ نے یا صحابہؓ نے جو الفاظ فرمائے تھے بعینہٖ وہی ادا کرنے چاہئیں یا ان کا مطلب ادا کر دینا کافی ہے محدثین اس باب میں مختلف الرائے ہیں اور اکثروں نے یہ فیصلہ کیا کہ اگر راوی اپنے الفاظ میں اس طرح مطلب ادا کرتا ہے کہ اصل حقیقت میں فرق نہیں پیدا ہوتا تو الفاظ کی پابندی ضروری نہیں۔ لیکن اس کا فیصلہ کرنا کہ اصل مطلب ادا ہوا یا بدل گیا ایک اجتہادی بات ہے۔ اسی بنا پر بعض محدثین مثلاً عبدالملک بن عمیر، ابو زرعہ، سالم بن جعفر، قادہ اور امام مالک ایک ایک لفظ کی پابندی کرتے تھے[2] لیکن یہ ظاہر ہے کہ سینکڑوں راویوں میں صرف دو چار اشخاص ایسی پابندی کر سکتے تھے اور وہ بھی اس زمانہ میں کہ تحریر کا رواج ہو چکا تھا عام حالت یہی تھی کہ راوی حدیث کے مطلب کو اپنے الفاظ میں بیان کرتے تھے صحیح ترمذی کتاب العلل میں سفیان ثوری کا قول نقل ہے۔

﴿ان قلت لكم انی احدثكم كما سمعت فلا تصدقونی انما هو المعنی۔﴾

اگر میں تم سے یہ کہوں کہ میں جو سنتا ہوں بعینہٖ وہی ادا کر دیتا ہوں تو تم میری بات نہ مانو۔ میں صرف مطلب ادا کرتا ہوں۔

ترمذی نے اسی مضمون کے اور اقوال واثلہ بن الاسقع، محمد بن سیرین، ابراہیم نخعی، حسن بصری، امام شعبی وغیرہ سے نقل کئے ہیں۔

جو صحابہؓ بہت محتاط تھے حدیث کی روایت کے وقت ان کی حالت متغیر ہو جاتی تھی۔

---

۱ صحیح بخاری کتاب الصلح روایت میں جھگڑے کی تفصیل ہے جس سے بعض امور ظاہر ہوتے ہیں

۲ صحیح ترمذی کتاب العلل میں ان لوگوں کے متعلق یہ تصریح مذکور ہے

سنن ابن ماجہ کے دیباچہ میں عمرو بن میمون کا قول نقل کیا ہے کہ میں عبداللہ بن مسعودؓ کی خدمت میں ہر جمعرات کی رات کو حاضر ہوتا تھا میں نے کبھی ان کو یہ کہتے نہیں سنا کہ "آنحضرت ﷺ نے یہ فرمایا" ایک دن ان کی زبان سے یہ لفظ نکل گیا تو دفعۃً سر جھکا لیا پھر میری نظر ان پر پڑی تو دیکھا کہ کھڑے ہیں، قمیص کی گھنڈیاں کھلی ہیں، آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے ہیں، گلے کی رگیں پھول گئی ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے یوں کہا یا یوں یا اس سے کچھ زیادہ یا اس سے کچھ کم یا اس کے مشابہ"۔

امام مالکؒ کا یہ حال تھا کہ جب حدیث روایت کرتے تھے تو خوف زدہ ہو جاتے اور کہتے کہ "آنحضرت ﷺ نے یہ فرمایا تھا یا یوں فرمایا تھا" امام شعبی کہتے ہیں کہ "میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی خدمت میں سال بھر حاضر رہا لیکن میں نے ان کو کبھی حدیث روایت کرتے نہیں دیکھا" سائب بن یزید کہتے ہیں کہ "میں نے سعد بن مالکؓ کے ساتھ مکہ مبارکہ سے مدینہ طیبہ تک سفر کیا لیکن اس تمام راہ میں انہوں نے ایک حدیث بھی آنحضرت ﷺ سے روایت نہیں کی (حالانکہ وہ صحابی تھے) حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے اپنے والد سے پوچھا کہ "میں نے آپ کو اور صحابہؓ کی طرح حدیث روایت کرتے نہیں دیکھا" انہوں نے کہا "میں جب سے اسلام لایا، میں نے کبھی آنحضرت ﷺ کا ساتھ نہیں چھوڑا لیکن میں نے آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) سے سنا ہے کہ جو شخص میری نسبت کوئی جھوٹی روایت بیان کرے تو وہ چاہے کہ اپنا گھر آگ میں بنائے۔[1]

ابن ماجہ نے روایت کی ہے کہ خود آنحضرت ﷺ نے منبر پر ارشاد فرمایا تھا۔

﴿ایاکم و کثرۃ الحدیث عنی[2]﴾

خبردار! مجھ سے زیادہ حدیثیں نہ روایت کرو

اس موقع پر یہ امر خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ اس قسم کی حدیثوں کے قبول کرنے میں جو تامل کیا جاتا ہے اس کو راوی کے ثقہ اور غیر ثقہ ہونے سے تعلق نہیں، مستند اور ثقہ راویوں کی دروغ گوئی کا خیال نہیں ہو سکتا، لیکن ثقہ راوی سے بھی مطلب روایت کے سمجھنے یا ادا کرنے میں غلطی کا ہونا ممکن ہے، اور ثقات کی روایت سے جب کسی موقع پر انکار کیا جاتا ہے تو اسی بنا پر کیا جاتا ہے، حضرت عائشہ صدیقہؓ کے سامنے جب حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی یہ روایت بیان کی گئی۔

﴿ان المیت لیعذب ببکاء الحیّ﴾

مردوں پر نوحہ کیا جائے تو ان پر عذاب کیا جاتا ہے۔

تو حضرت عائشہؓ نے فرمایا۔

﴿انکم لتحدثونی عن غیر کاذبین ولا مکذبین ولکن السمع یخطیٔ﴾[3]

تم لوگ نہ تو جھوٹے ہو نہ تمہارے راوی جھوٹے ہیں لیکن کان غلطی کر جاتا ہے۔

---

1. یہ تمام اقوال صحیح ابن ماجہ دیباچہ کتاب میں مذکور ہیں دیکھو صفحہ ۳ مطبوعہ مطبع انصاری دہلی
2. ابن ماجہ صفحہ ۵
3. صحیح مسلم کتاب الجنائز

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عائشہؓ نے عبداللہ بن عمرؓ کے متعلق فرمایا۔

﴿اما انه لم یکذب ولکنه نسی او اخطا﴾ [1]

ہاں وہ جھوٹ نہیں بولے لیکن بھول گئے یا خطا کی

(۱۱) ایک اور بحث روایت احاد کی ہے، روایت احاد وہ ہے جس کے سلسلہ اسناد میں کہیں صرف ایک راوی رہ جائے اور روایت کے متعلق کوئی دوسرا راوی نہ ہو یا اس کا مؤید نہ ہو۔ اس قسم کی روایت کے تسلیم و انکار اور یقینی و ظنی ہونے کے متعلق اہل فن کا اختلاف ہے۔ معتزلہ روایات احاد کے تسلیم سے قطعاً منکر ہیں لیکن یہ در حقیقت انکار بداہت ہے، ہم روزمرہ واقعات زندگی میں اس قسم کی روایات پر اکثر بلا بحث و اصرار فوراً یقین کر لیتے ہیں، ہم سے ایک شخص آ کر کہتا ہے کہ "زید تم کو بلاتا ہے" اور ہم فوراً اٹھ کر چلے جاتے ہیں، یہ نہیں کہتے کہ یہ خبر احاد ہے اور ہم اسے تسلیم نہیں کرتے۔ معتزلہ کے مقابل میں اکثر محدثین ان کی صحت اور قطعیت کے قائل ہیں، لیکن یہ در حقیقت تفریط ہے، خود صحابہؓ کا طرز عمل اس کے خلاف ہے۔

ایک دفعہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ حضرت عمرؓ کی خدمت میں گئے اور تین دفعہ اجازت طلب کی چونکہ حضرت عمرؓ کسی کام میں مشغول تھے، جواب نہ ملا وہ واپس چلے گئے۔ حضرت عمرؓ نے کام سے فارغ ہو کر ان کو بلا بھیجا اور واپسی کا سبب پوچھا انہوں نے کہا "میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے سنا ہے کہ "تین دفعہ اجازت طلبی کے بعد جواب نہ ملے تو واپس جاؤ" حضرت عمرؓ نے کہا "اس روایت پر گواہ لاؤ ورنہ میں تم کو سزا دوں گا" ابوموسیٰ اشعریؓ نے اس پر شہادت پیش کی تو حضرت عمرؓ نے تسلیم کیا، حضرت عمرؓ خدانخواستہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو غلط گو نہیں جانتے تھے لیکن چونکہ حضرت عمرؓ ہر وقت صحبت میں حاضر رہتے تھے اور انہوں نے یہ حدیث آنحضرت ﷺ سے نہیں سنی تھی، حالانکہ حدیث ایسے امر کے متعلق تھی جو روزانہ پیش آتا ہے، اس لئے حضرت عمرؓ نے واقعہ کی اہمیت کے لحاظ سے صرف ایک شخص کی شہادت کافی نہیں سمجھی۔

حضرت ابوبکرؓ کے سامنے ایک عورت نے جو میت کی دادی ہوتی تھی میراث کا دعویٰ کیا، حضرت ابوبکرؓ نے کہا "قرآن میں دادی کی میراث مذکور نہیں اور نہ آنحضرت ﷺ سے اس باب میں کوئی روایت مجھ کو معلوم ہے"۔ مغیرہ بن شعبہؓ نے شہادت دی کہ آنحضرت ﷺ دادی کو چھٹا حصہ دلایا کرتے تھے، حضرت ابوبکرؓ نے ان کی تنہا شہادت ایسے واقعہ کے متعلق کافی نہیں سمجھی اور جب ایک اور صحابی محمد بن مسلمہؓ نے شہادت دی تب حضرت ابوبکرؓ نے اس عورت کو میراث دلائی۔

اسی طرح جنین کی دیت کے متعلق حضرت عمرؓ نے مغیرہؓ کی تنہا شہادت کافی نہیں سمجھی۔ اس قسم کی اور بہت سی مثالیں ہیں۔

اس بنا پر روایات احاد کے متعلق فقہائے احناف کا اصول ایک حد تک صحیح ہے کہ یہ ظنی الثبوت ہیں، ان سے قطعیت نہیں ثابت ہوتی ہے، اصل یہ ہے کہ روایات عام کی صحت اور عدم صحت یا ظن و قطعیت رواۃ کے ثقہ اور معتبر ہونے کے بعد خود اصل روایت کی اہمیت اور عدم اہمیت پر بھی ہے، ایک شخص جب ہم سے کہتا ہے کہ "زید نے تم کو بلایا ہے" تو

---

[1] مسلم [illegible]

راوی کی ثقاہت و اعتبار کے مسلم ہونے کے بعد ہم کو بھی اس واقعہ کے تسلیم سے انکار نہیں ہوتا لیکن اگر یہی شخص یہ کہتا ہے کہ "تم کو بادشاہ نے آج دربار میں بلایا ہے" تو ہم اس واقعہ کی تسلیم میں پس و پیش کرتے ہیں اور اس کے ثبوت کے لئے دوسروں کی شہادت تلاش کرتے ہیں۔

آنحضرت ﷺ کے متعلق اگر کوئی ثقہ راوی یہ بیان کرتا ہے کہ "آپ ﷺ ایک دوپٹہ اوڑھ کر گھر کے باہر تشریف لائے" تو ہم کو اس کی تسلیم میں عذر نہیں لیکن وہی راوی اگر یہ کہتا ہے کہ "ایک بار آپ برہنہ باہر نکل آئے" (اس قسم کی ایک روایت ہے) تو قطعاً ہم تنہا شہادت اس کے ثبوت کے لئے کافی نہیں سمجھیں گے۔

نتائج مباحث مذکورہ:

گذشتہ صفحات میں ہم نے روایت و حدیث کے متعلق مصنف کتاب کا جو طرز عمل پیش کیا ہے اور علمائے فن حدیث نے جن قواعد و اصول کی تفصیل کی ہے ذیل میں بہ ترتیب نتائج کے طور پر ہم ان کا اعادہ کرتے ہیں۔

(۱) سب سے پہلے واقعہ کی تلاش قرآن مجید میں پھر احادیث صحیحہ میں پھر عام احادیث میں کرنی چاہئے اگر نہ ملے تو روایات سیرت کی طرف توجہ کی جائے۔

(۲) کتب سیرت و تاریخ مستند نہیں ہیں اور ان کی روایات و اسناد کی تنقید لازم ہے۔

(۳) سیرت کی روایتیں باعتبار پایہ صحت احادیث کی روایتوں سے فروتر ہیں اس لئے بصورت اختلاف احادیث کی روایت کو ہمیشہ ترجیح دی جائے گی۔

(۴) بصورت اختلاف روایات احادیث، رواۃ ارباب فقہ و بصیرت کی روایات کو دوسروں پر ترجیح ہو گی۔

(۵) سیرت کے واقعات میں سلسلہ علت و معلول کی تلاش نہایت ضروری ہے۔

(۶) نوعیت واقعہ کے لحاظ سے شہادت کا معیار قائم کرنا چاہئے۔

(۷) روایات میں اصل واقعہ کس قدر ہے اور راوی کی ذاتی رائے اور فہم کا کس قدر جزو شامل ہے؟

(۸) اسباب خارجی کا کس قدر اثر ہے؟

(۹) جو روایت عام مشاہدہ عقلی یا عام اصول مسلمہ اور قرائن حال کے خلاف ہو گی لائق حجت نہ ہو گی

(۱۰) اہم موضوع پر مختلف روایات کی تحقیق و تنقید سے اس کی تسلی کر لینی چاہئے کہ راوی سے ادائے مطلب میں تو غلطی نہیں ہوئی ہے۔

(۱۱) روایات احاد کو موضوع کی اہمیت اور قرائن حال کی مطابقت کے لحاظ سے قبول کرنا چاہئے۔

ان اصول کے تقرر و تعیین کے بعد نظر آ سکتا ہے کہ اسلامی فن روایت اصول روایت کی نگاہ سے کس قدر بلند پایہ ہے؟ علمائے حدیث نے صحیح روایت کے لئے تحقیق و جستجو کی جو جانفشانی کی، کیا دیدہ وری اور تحقیق و تدقیق میں صرف کی ہے کیا اس اہتمام و احتیاط کا دنیا کی دیگر قوموں کے مذہبی یا تاریخی ذخیرہ روایت میں ایک ذرہ نشان بھی موجود ہے؟ کیا یورپ کے سیرت نگاران پیغمبر اسلام میں سے کسی نے بھی اس جانکاہی اور سخت گیری کے ساتھ آنحضرت ﷺ کی لائف کے لئے قلم اٹھایا ہے؟ اور کیا ایک غیر مسلم ان قواعد و اصول کی مراعات کے ساتھ قلم اٹھا بھی سکتا ہے؟[1]

[1] [illegible]

یورپین تصنیفات

آنحضرت ﷺ کی سیرت مبارک پر جو یورپین تصنیفات ہیں ان پر پوری بحث تو کسی اور حصہ میں آئے گی جس میں نہایت تفصیل سے بتایا جائے گا کہ یورپ میں اسلام کے متعلق سب سے پہلے یورپین مصنف بلڈی برٹ سے لے کر جو ۱۱۰۰ء میں موجود تھا آج تک کیا سرمایہ پیدا ہوا ہے؟ ان کا کیا عام انداز ہے؟ ان کی مشترک اور علحدہ الگ الگ غلطیاں کیا ہیں؟ ان کے وسائل معلومات کس درجہ کے ہیں؟ اغلاط کے مشترک اسباب کیا ہیں؟ تعصب اور سوء ظن کا کہاں تک اثر ہے؟ یہاں ہم ان تصنیفات پر صرف ایک اجمالی گفتگو کرتے ہیں کیونکہ اس حصہ میں بھی ہم کو جابجا ان تصنیفات سے کام لینا یا ان سے تعرض کرنا پڑتا ہے۔

یورپ ایک مدت تک اسلام کے متعلق مطلق کچھ نہیں جانتا تھا۔ جب اس نے جاننا چاہا تو مدت دراز تک عجیب حیرت انگیز مفتریہ خیالات اور توہمات میں مبتلا رہا۔ ایک یورپین مصنف لکھتا ہے:

"عیسائیت اسلام کی چھ ابتدائی صدیوں تک اسلام پر نہ تو کچھ غور کر سکی اور نہ کچھ کر سکی، وہ صرف تھرائی اور سہم جاتی تھی لیکن جب تک فرانس میں عرب پیچھے دھکیل دیے گئے تو ان قوموں نے جو ان کے سامنے سے بھاگ رہی تھیں منہ پھیر کر دیکھا جس طرح کہ مویشیوں کا گلہ جب کہ ان کا بھگانے والا کتا دور نکل جاتا ہے۔" [1]

یورپ نے مسلمانوں کو جس طرح جانا اس کو فرانس کا مشہور مصنف ہنری دی کاستری جس کی تصنیف کا عربی زبان میں ترجمہ ہو گیا ہے یوں بیان کرتا ہے:

"وہ تمام قصص اور گیت جو اسلام کے متعلق یورپ میں قرون وسطیٰ میں رائج تھے ہم نہیں سمجھتے کہ مسلمان ان کو سن کر کیا کہیں گے، یہ تمام داستانیں اور نظمیں مسلمانوں کے مذہب کی ناواقفیت کی وجہ سے بغض و عداوت سے بھری ہوئی ہیں، جو غلطیاں اور بدگمانیاں اسلام کے متعلق آج تک قائم ہیں ان کا باعث وہی قدیم معلومات ہیں۔ ہر مسیحی شاعر مسلمانوں کو مشرک اور بت پرست سمجھتا تھا اور حسب ترتیب درجات ان کے تین خدا تسلیم کیے جاتے تھے، ماہوم یا ماہون یا بافومید (یعنی محمد ﷺ) اور اپلین اور تیسرا ترماگان، ان کا خیال تھا کہ محمد نے اپنے مذہب کی بنیاد دعوائے الوہیت پر قائم کی اور سب سے عجیب تر یہ ہے کہ محمد (محمد ﷺ) جو بت شکن اور دشمن اصنام تھا لوگوں کو اپنے طلائی بت کی پرستش کی دعوت دیتا تھا۔"

اسپین میں جب عیسائی مسلمانوں پر غالب آئے اور ان کو مرتد، مطیع یا جلاوطن تک بنا دیا تو مسلمان ہجرت کر آئے اور اپنے بتوں کو انہوں نے توڑ ڈالا، اس عہد کا ایک شاعر لکھتا ہے "لیکن مسلمانوں کا دیوتا جو ایک غار میں تھا اس پر وہ ٹوٹ پڑے اور اس کو بہت لعنت ملامت کیا اور اس کو گالیاں دیں اور اس کے دونوں ہاتھ باندھ کر ایک ستون پر اس کو سولی دی اور اس کو پاؤں سے روندا اور لکڑیوں سے مار مار کر اس کے ٹکڑے کر ڈالے اور ماہوم کو (جو ان کا دوسرا دیوتا تھا) ایک گڑھے میں ڈال دیا اس کو سوروں اور کتوں نے نوچ ڈالا، اس سے زیادہ اس سے پہلے کسی دیوتا کی تحقیر نہیں ہوئی اس کے بعد

---

۱ محمد اینڈ محمڈنزم مسٹر باسورتھ اسمتھ صاحب ترجمہ ایم اے صفحہ ۳۳

(Basworth Smith's Mohammed & Mohammedanism.P 63)

انگلیکن کے نام سے اس کتاب کے حوالے یورپ کی ابتدائی اسلامی تصنیفات میں نہایت کثرت سے آتے ہیں۔

اخیر اٹھارھویں صدی:

یہ وہ زمانہ ہے جب یورپ کی قوت سیاسی اسلامی ممالک میں پھیلنی شروع ہوگئی جس نے ''اورینٹلسٹ'' کی ایک کثیر التعداد جماعت پیدا کر دی جنہوں نے حکومت کے اشارہ سے السنۂ مشرقیہ کے مدارس کھولے، مشرقی کتب خانوں کی بنیادیں ڈالیں، ایشیاٹک سوسائٹیاں قائم کیں، مشرقی تصنیفات کی طبع و اشاعت کے سامان پیدا کئے اور تکمیل تصنیفات کا ترجمہ شروع کیا۔

سب سے پہلے ہولینڈ نے اپنے مقبوضہ جزائر مشرق میں ۱۷۸۱ء میں ایک ایشیاٹک سوسائٹی قائم کی۔ اس کی تقلید میں انگریزوں نے بمقام کلکتہ ۱۷۸۴ء میں جنرل ایشیاٹک سوسائٹی اور ۱۷۸۸ء میں بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی، اس کے بعد ۱۷۹۵ء میں فرانس نے مشرقی زندہ زبانوں (عربی، فارسی، ترکی) کا دارالعلوم قائم کیا، اور آخرکار ان مدارس اور سوسائٹیوں کی تقلید سے تمام ممالک یورپ میں اس قسم کی درسگاہیں اور انجمنیں جاری ہوگئیں، عام یونیورسٹیوں میں عربی زبان کے پروفیسروں اور کتب خانوں کا وجود لازمی سمجھا جانے لگا۔

مسلمانوں کے ہاں عربی زبان میں سیرت و مغازی کی جو کتابیں محفوظ تھیں وہ ایک ایک کرکے باستثنائے چند اٹھارھویں صدی کے اواخر سے لے کر انیسویں صدی کے اختتام تک یورپ میں چھپ گئیں اور ان میں اکثر کا یورپین زبانوں میں ترجمہ ہو گیا، سب سے پہلے ریسک (Reiske) المتوفی ۱۷۷۴ء نے تاریخ ابوالفداء مع ترجمہ لاطینی و حواشی پانچ جلدوں میں شائع کی۔ ۱۸۰۹ء میں کیپٹن اے متھیوس (A.H.Mathews) نے کلکتہ سے مشکوٰۃ المصابیح کا انگریزی میں ترجمہ شائع کیا، ۱۸۵۶ء میں وان کریمر (Von Kramer) نے کلکتہ میں محمد بن عمر واقدی کی کتاب المغازی طبع کرائی، ۱۸۶۰ء میں ابن ہشام کی مشہور تصنیف سیرت الرسول کی گوٹنگن (Cottingen) سے اشاعت کی، اس کے علاوہ اسی مستشرق نے سمہودی کی تاریخ مدینہ اور ابن قتیبہ کی تاریخ معارف طبع کرائی۔ ۱۸۶۴ء میں ڈاکٹر ویل (G.Weil) نے ابن ہشام کا جرمنی میں ترجمہ کیا، ۱۸۷۷ء میں پیرس سے مسعودی کی تاریخ مروج الذہب مع ترجمہ فرانسیسی پروفیسر ڈی مایارڈ نے شائع کی، والہوسن (Wellhausen) نے ۱۸۸۲ء میں واقدی کا جرمن ترجمہ بعنوان ''محمد بہ مدینہ'' برلن سے شائع کیا، ۱۸۸۳ء میں لیڈن سے ہاؤتسما (Houtasma) کے اہتمام سے یعقوبی کی تاریخ دو جلدوں میں چھپی۔ ۱۸۷۹ء سے ۱۸۹۳ء تک چودہ برس کی محنت میں طبری کی مشہور اور نادر الوجود تاریخ بارتھ J.Barth اور نولدیکی (Noldeko) وغیرہ نے شائع کی اور سب سے آخر میں مشہور جرمن مستشرق پروفیسر ساخاؤ (Sachau) کی خاص کوشش اور دیگر سات مستشرقین کی اعانت سے ابن سعد کی عظیم الشان اور نادر الوجود طبقات جس سے زیادہ مبسوط سیرت نبوی میں کوئی تصنیف نہیں، تقریباً ۱۹۰۰ء سے گذشتہ سال تک ایک ایک جلد کرکے لیڈن سے شائع ہوتی رہی۔

ان اصلی تاریخی تصنیفات اور ان کے تراجم کی اشاعت، ممالک اسلامیہ اور یورپ کے تعلقات، مذہبی منافرت کی کمی اور آزادانہ تحقیقات کی خواہش، ان تمام چیزوں نے یورپ میں مصنفین تاریخ اسلام اور سوانح نگاران پیغمبر عرب کا ایک کثیر

واقعہ اور رو پیدا کر دیا۔

جو شخص کا ایک عالم اس غیر مختتم سلسلہ کا ان الفاظ میں اعتراف کرتا ہے:

"محمد کے سوانح نگاروں کا ایک وسیع سلسلہ ہے جس کا ختم ہونا غیر ممکن ہے لیکن اس میں جگہ پانا قابل فخر چیز ہے۔"[1]

ہم اس موقع پر صرف ان تصنیفات کا مختصر سا نقشہ درج کرتے ہیں جو خاص آنحضرت ﷺ کے حالات میں یا اسلام کے اصول و عقائد پر لکھی گئیں اور جن میں سے اکثر ہمارے دفتر تصنیف میں موجود ہیں یا ہم ان سے متمتع ہو چکے ہیں۔

نمبر	نام مصنف	وطن	نام تصنیف یا مضمون	زمانہ تصنیف
۱	ڈاکٹر گی ای (؟)	انگلستان	سیرت محمد (ماخوذ از ابوالفدا)	۱۸۱۵ء
۲	ڈاکٹر وائٹ (باملٹن لیکچر) DTI White	انگلستان	مقابلہ مذہب اسلام اور پیغمبر اسلام	اوائل ۱۸۰۰ء
۳	گاڈ فری ہگنس ایم آر اے ایس God Frey Higgins	انگلستان	اپالوجی	۱۸۲۹ء
۴	ڈاکٹر جے اے مولر J.A.Moller	جرمنی	اسلام	۱۸۴۳ء
۵	گارسن ڈی ٹاسی de Tassy Garcin	فرانس	اصول قرآن	۱۸۴۱ء تا ۱۸۴۲ء
۶	ایڈورڈ لین Edward Lane	انگلستان	انتخابات القرآن	۱۸۴۳ء
۷	ڈاکٹر ویل Weil	جرمنی	ترجمہ و تلخیص ابن ہشام کتاب محمد پیغمبر	۱۸۴۳ء تا ۱۸۴۵ء
۸	کارلائل Carlyle	انگلستان	ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ	۱۸۴۰ء
۹	کوسین ڈی پرسیوال Caussin depergeaal	فرانس	تاریخ عرب	۱۸۴۷ء
۱۰	واشنگٹن ارونگ Irving	انگلستان	سیرت محمد	۱۸۴۹ء
۱۱	ڈاکٹر اسپرنگر Springer	جرمنی	سیرت محمد	۱۸۵۱ء
۱۲	وان کریمر VonremeKr	جرمنی	ترجمہ و تلخیص واقدی	۱۸۵۶ء
۱۳	مضمون نگار نیشنل ریویو	انگلستان	مضمون "محمد"	۱۸۵۹ء
۱۴	ڈوزی Dozy	ہالینڈ	تاریخ اسلام	۱۸۶۱ء
۱۵	مضمون نگار نیشنل ریویو	انگلستان	جزائر عرب	۱۸۶۱ء
۱۶	ڈی لیمن Delane	انگلستان	سیرت محمد	۱۸۶۱ء

[1] ... محمد، دیباچہ صفحہ

کے ذریعے نکال سکتے ہیں لیکن فلان فلان۔

۲۔ عربی زبان اور علم ادب و تاریخ و فلسفہ اسلام کے بہت بڑے ماہر ہیں لیکن مذہبی لٹریچر اور سیرت کے فن سے ناآشنا ہیں ان لوگوں نے سیرت یا مذہب اسلام پر کوئی مستقل تصنیف نہیں لکھی لیکن ضمنی موقعوں پر عربی دانی کے زعم میں اسلام یا شارع اسلام ﷺ کے متعلق نہایت دلیری سے جو کچھ چاہتے ہیں لکھ جاتے ہیں مثلاً جرمن کا مشہور فاضل ساخو جس نے طبقات ابن سعد شائع کی ہے اس کی وسعت معلومات اور عربی دانی سے کون انکار کر سکتا ہے۔ بیرونی کی کتاب الہند کا دیباچہ اس نے جس تحقیق سے لکھا ہے رشک کے قابل ہے لیکن اسی دیباچہ میں اسلامی امور کے متعلق ایسی باتیں لکھ جاتا ہے جس کو پڑھ کر بھول جانا پڑتا ہے کہ یہ وہی محترم شخص ہے جس کو ابھی ہم نے دیکھا تھا۔ نولدیکی (جرمنی) نے قرآن مجید کا خاص مطالعہ کیا ہے لیکن انسائیکلو پیڈیا (جلد ۱۶) میں قرآن پر اس کا جو آرٹیکل ہے جا بجا نہ صرف اس کے تعصب بلکہ اس کی جہالت کے راز پنہاں کی بھی پردہ دری کرتا ہے۔

۳۔ وہ مستشرقین جنہوں نے خاص اسلامی اور مذہبی لٹریچر کا کافی مطالعہ کیا ہے مثلاً پامر صاحب یا مارگولیوس صاحب ان سے ہم بہت کچھ امید کر سکتے تھے لیکن باوجود عربی دانی، کثرت مطالعہ، تفحص کتب کے ان کا یہ حال ہے کہ

ع دیکھتا سب کچھ ہوں لیکن سوجھتا کچھ بھی نہیں

مارگولیوس نے مسند امام احمد بن حنبل کی ۶ ضخیم جلدوں کا ایک ایک حرف پڑھا ہے اور ہم دعویٰ سے کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے زمانہ میں کسی مسلمان کو بھی اس وصف میں اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں ہو سکتا، لیکن پروفیسر موصوف نے آنحضرت ﷺ کی سوانح عمری پر جو کتاب لکھی ہے دنیا کی تاریخ میں اس سے زیادہ کوئی کتاب، کذب و افترا اور تاویل و تعصب کی مثال کے لئے پیش نہیں کر سکتی اس کا اگر کوئی کمال ہے تو یہ ہے کہ سادہ سے سادہ اور معمولی سے معمولی واقعہ کو جس میں برائی کا کوئی پہلو پیدا نہیں ہو سکتا صرف اپنی طباعی کے ذریعے بدمنظر بنا دیتا ہے۔

ڈاکٹر اسپرنگر جرمنی کے مشہور عربی دان ہیں، کئی سال مدرسہ عالیہ کلکتہ کے پرنسپل رہے، لکھنؤ میں آ کر شاہی کتب خانہ کی رپورٹ لکھی جو ہماری نظر سے گزری ہے، حافظ ابن حجر کی کتاب الاصابہ فی احوال الصحابہ اول اول انہی نے تصحیح کر کے کلکتہ میں چھپوائی۔ لیکن جب آنحضرت ﷺ کی سوانح عمری پر ایک مستقل ضخیم کتاب ۳ جلدوں میں لکھی تو ہم حیرت زدہ ہو کر رہ گئے۔[1]

یورپین مصنفوں کی غلط کاریوں کی بڑی وجہ تو وہی ان کا مذہبی اور سیاسی تعصب ہے لیکن بعض وجوہ اور بھی ہیں جن کی بنا پر ہم ان کو معذور رکھ سکتے ہیں۔

۱۔ سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کا تمام تر سرمایہ استناد صرف سیرت و تاریخ کی کتابیں ہیں، مثلاً مغازی واقدی، سیرت ابن ہشام، سیرت محمد بن اسحاق، تاریخ طبری وغیرہ اور یہ ظاہر ہے کہ کوئی غیر مسلم شخص اگر آنحضرت ﷺ کی سوانح عمری مرتب کرنا چاہے گا تو عام قیاس یہی رہبری کرے گا کہ اس کو تصنیفات سیرت کی طرف رجوع کرنا چاہئے

[1] [illegible]

لیکن واقعہ یہ ہے کہ سیرت کی تصنیفات میں سے ایک بھی نہیں جو استناد کے لحاظ سے بلند رتبہ ہو چنانچہ اس کی بحث اوپر گذر چکی مصنفین سیرت سے قطع نظر سیرت کی روایتیں زیادہ تر جن لوگوں سے مروی ہیں مثلاً سیف سری ابن سلمہ ابن شیخ عموماً ضعیف الروایۃ ہیں اس لئے عام اور معمولی واقعات میں ان کی شہادت کافی ہو سکتی ہے لیکن وہ واقعات جن پر مہتم بالشان مسائل کی بنیاد قائم ہے ان کے لئے یہ سرمایہ بیکار ہے۔

آنحضرت ﷺ کی سوانح عمری کے یقینی واقعات وہ ہیں جو حدیث کی کتابوں میں بہ روایات صحیحہ منقول ہیں یورپین مصنفین اس سرمایہ سے بالکل بے خبر ہیں اور ایک آدھ کوئی ہے (مثلاً مارگولیس) تو اولاً وہ اس فن کا ماہر نہیں اور ہو بھی تو تعصب کی ایک چنگاری سینکڑوں خرمن معلومات کو جلانے کے لئے کافی ہے۔

۲۔ دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ یورپ کے اصول تنقیح شہادت اور اصول تنقیح میں سخت اختلاف ہے۔ یورپ اس بات کو بالکل نہیں دیکھتا کہ راوی صادق ہے یا کاذب؟ اس کے اخلاق و عادات کیا ہیں؟ حافظہ کیسا ہے؟ اس کے نزدیک یہ تحقیق و تدقیق نہ تو ممکن ہے نہ ہی ضروری ہے وہ صرف یہ دیکھتا ہے کہ راوی کا بیان بجائے خود قرائن اور واقعات کے تناسب سے مطابقت رکھتا ہے یا نہیں؟ فرض کرو ایک جھوٹے سے جھوٹا راوی ایک واقعہ بیان کرتا ہے جو قرائن موجودہ اور گرد و پیش کے واقعات کے لحاظ سے صحیح معلوم ہوتا ہے بیان بالکل مسلسل ہے اور کہیں سے نہیں اکھڑتا تو یورپ کے مذاق کے موافق واقعہ کی صورت تسلیم کر لی جائے گی۔

بخلاف اس کے مسلمان مورخ اور خصوصاً محدثین اس کی پروا نہیں کرتے کہ خود روایت کی کیا حالت ہے بلکہ سب سے پہلے وہ دیکھتے ہیں کہ "اسمائے رجال" کے دفتر تحقیقات میں اس شخص کا نام ثقہ لوگوں کی فہرست میں درج ہے یا نہیں اگر نہیں ہے تو ان کے نزدیک اس کا بیان بالکل ناقابل اعتنا ہے بخلاف اس کے اگر ثقہ راوی نے کوئی واقعہ بیان کیا تو گو قرائن اور قیاسات کے خلاف ہو اور گو بظاہر عقل کے مطابق بھی نہ ہو لیکن اس کی روایت قبول کر لی جائے گی۔

اس اختلاف اصول نے یورپین تصنیفات پر بہت بڑا اثر پیدا کیا ہے مثلاً اہل یورپ واقدی کے بیان پر سب سے زیادہ اعتماد کرتے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ واقدی کا بیان نہایت مسلسل اور مربوط ہوتا ہے جزئیات کی تمام کڑیاں باہم ملتی چلی جاتی ہیں واقعات میں کہیں خلا نہیں ہوتا جو چیزیں کسی واقعہ کو دلچسپ بنا سکتی ہیں سب موجود ہوتی ہیں۔

لیکن حق یہ ہے کہ یہی باتیں اصلی راز کی پردہ داری کرتی ہیں جو روایتیں سو برس سے زیادہ زمانہ تک محض زبانوں پر رہیں ان میں اس قدر استقصا سے جزئیات ممکن نہیں یہ البتہ ہو سکتا ہے کہ جس طرح تاریخی افسانے لکھے جاتے ہیں چند واقعات کا ذخیرہ سامنے رکھ کر قیاس و قرائن اور معلومات عامہ کے ذریعہ سے ایک سادہ خاکہ کو نقش و نگار سے کامل کر دیا جائے لیکن یہ جرأت صرف واقدی کر سکتا ہے محدثین اس سے معذور ہیں۔

تاہم اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ ہر موقع پر محض راوی کا ثقہ ہونا کافی نہیں۔ ثقات بھی غلطی کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں اس لئے ضرورت ہے کہ درایت کے جو اصول محدثین نے قائم کئے ہیں اور جن کو بعض جگہ وہ بھول جاتے ہیں ان کی نہایت سختی کے ساتھ پابندی کی جائے۔

یورپین تصنیفات کے اصول مشترک:

یورپین مصنفین آنحضرت ﷺ کے اخلاق کے متعلق جو نکتہ چینیاں کرتے ہیں یا ان کی تصنیفات سے جو شکوک و شبہات خود بخود ناظرین کے دل میں پیدا ہوتے ہیں، حسب ذیل ہیں:

(۱) آنحضرت ﷺ کی زندگی مکہ معظمہ تک پیغمبرانہ زندگی ہے لیکن مدینہ جا کر جب زور وقوت حاصل ہوتی ہے تو دفعتاً پیغمبری بادشاہی سے بدل جاتی ہے اور اس کے جو لوازم ہیں یعنی لشکر کشی، قتل، انتقام، خونریزی خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔

(۴) کثرت ازدواج اور عیش پرستی

(۳) مذہب کی اشاعت جبر و زور سے۔

(۴) لونڈی غلام رکھنے کی اجازت اور اس پر عمل۔

(۵) دنیا داروں کی سی حکمت عملی اور بہانہ جوئی۔

اس بنا پر ہماری کتاب کے ناظرین کو تمام واقعات میں اس نکتہ پر نظر رکھنی چاہئے کہ یہ اعتراضات تاریخی تحقیقات کے معیار میں بھی ٹھیک اتر سکتے ہیں یا نہیں؟

اصول تصنیف اور ترتیب:

ہم نے اس کتاب میں جو اصول قائم کئے ہیں اب ان کے بتانے کا وقت آ گیا ہے۔

(۱) سب سے پہلے یہ کہ سیرت کے واقعات کے متعلق جو کچھ قرآن مجید میں مذکور ہے اس کو سب پر مقدم رکھا ہے یہ قطعاً ثابت ہے کہ بہت سے واقعات کے متعلق خود قرآن مجید میں ایسی تصریحات یا اشارے موجود ہیں جن سے نزاعی مباحث کا فیصلہ ہو جاتا ہے لیکن لوگوں نے آیات قرآنی پر اچھی طرح نظر نہیں ڈالی اس لئے وہ مباحث غیر منفصل رہ گئے۔

(۲) قرآن مجید کے بعد حدیث کا درجہ ہے۔ احادیث صحیحہ کے سامنے سیرت کی روایتیں نظر انداز کر دی ہیں جو واقعات بخاری، مسلم وغیرہ میں مذکور ہیں ان کے مقابلہ میں سیرت یا تاریخ کی روایت کی کوئی ضرورت نہیں۔ ارباب سیر کو ایک بڑی غلطی یہ ہوئی ہے کہ وہ واقعات کو کتب حدیث میں ان موقعوں پر ڈھونڈتے ہیں جہاں عنوان اور مضمون کے لحاظ سے ان کو درج ہونا چاہئے اور جب ان کو ان موقعوں پر کوئی روایت نہیں ملتی تو وہ مجبوراً سیر کی روایتوں کو لے لیتے ہیں لیکن چونکہ حدیث میں ہر قسم کے نہایت تفصیلی واقعات ضمنی موقعوں پر روایت میں آجاتے ہیں اس لئے اگر تمام استقرا اور تفحص سے کام لیا جائے تو تمام اہم واقعات میں خود صحاح ستہ کی روایتیں مل جاتی ہیں ہماری اس کتاب کی بڑی خصوصیت یہی ہے کہ بہت سے تفصیلی واقعات ہم نے حدیث کی کتابوں سے ڈھونڈ کر مہیا کئے جو اہل سیر کی نظر سے بالکل اوجھل رہ گئے تھے۔

(۳) روز مرہ کے عام واقعات میں ابن سعد، ابن ہشام اور طبری کی عام روایتیں کافی خیال کی ہیں لیکن جو واقعات کچھ بھی اہمیت رکھتے ہیں ان کے متعلق تنقید اور تحقیق سے کام لیا ہے اور تا امکان کوشش کی ہے کہ ان قاطع

استناد اور حوالے:

تاریخ اور روایت میں حوالہ اور استناد سب سے مقدم چیز ہے اس لئے اس کے متعلق چند ضروری امور بیان کر دینے ضروری ہیں۔

(۱) صرف انہیں کتابوں کا حوالہ دیا ہے جو خود میری نظر سے گزری ہیں۔

(۲) جو واقعات کسی قدر اہم ہیں ان کے متعلق صرف صحیح حدیثوں یا مستند تاریخی روایتوں کا حوالہ دیا ہے لیکن عام واقعات یا غزوات کے متعلق جزئیات کی تفصیل میں صحاح کی کاوش نہیں کی ہے۔

(۳) مطبوعہ کتابوں کے حوالہ میں صفحہ کا نشان بتا دیا گیا ہے قلمی کتابوں کے متعلق تصانیف سیرت کی فہرست جو اوپر گزر چکی ہے اس میں بتا دیا ہے کہ ہمارے استعمال میں کونسا نسخہ تھا۔

﴿ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ ﴾

عرب

وجہ تسمیہ:

عرب کی وجہ تسمیہ کے متعلق مختلف رائیں ہیں، اہل لغت کہتے ہیں کہ اعراب اور عرب کے معنی فصاحت اور زبان آوری کے ہیں اور چونکہ اہل عرب اپنی زبان آوری کے سامنے تمام دنیا کو ہیچ سمجھتے تھے اس لئے انہوں نے اپنے آپ کو "عرب" اور دنیا کی اور تمام قوموں کو عجم (ژولیدہ بیان) کہہ کر پکارا۔

بعض کی رائے ہے کہ عرب اصل میں عربہ تھا قدیم اشعار میں عرب کے بجائے عربہ آیا ہے۔

ورجت ربحة العربات رحلها　　سرقرق مثل ما اكتهب ثقلها

وعربة ارض جد في شر اهلها　　كما جد في شرب النقاخ ظماؤها

وعربة ارض ما يحل حرامها　　من الناس الا اللوذعي الحلاحل

عرب کے معنی سامی زبانوں میں دشت اور صحرا کے ہیں اور چونکہ عرب کا بڑا حصہ دشت و صحرا ہے اس لئے تمام ملک کو عرب کہنے لگے۔

جغرافیہ:

عرب کے حدود اربعہ یہ ہیں۔

مغرب: بحیرہ قلزم

مشرق: خلیج فارس اور بحر عمان

جنوب: بحر ہند

شمال کی حدود بہت مختلف فیہ ہیں، بعض ملک شام حلب اور فرات تک اس کی حدود وسعت دیتے ہیں۔

سینا: کا جزیرہ نما بھی ایک ملحقہ ہے اکثر مصنفین عرب و یورپ اس کو مصر میں شمار کرتے ہیں لیکن جیالوجی کی رو سے وہ عرب سے متعلق ہے۔

عرب:

عرب کی پیمائش باقاعدہ اب تک نہیں ہوئی تاہم اس قدر یقینی ہے کہ وہ جرمنی اور فرانس سے چوگنا زیادہ وسیع ہے طول تقریباً چودہ سو عرض چھ سو میل اور مجموعی رقبہ بارہ لاکھ میل مربع ہے۔

ملک کا بڑا حصہ ریگستان ہے پہاڑوں کا جال تمام ملک میں پھیلا ہوا ہے سب سے بڑا طویل السلسلہ پہاڑ جبل السراۃ ہے جو جنوب میں یمن سے شروع ہو کر شمال میں شام تک چلا گیا ہے اس کی سب سے اونچی چوٹی آٹھ ہزار فٹ بلند ہے بعض حصے زرخیز اور شاداب بھی ہیں۔

چاندی اور سونے کی کانیں کثرت سے ہیں علامہ ہمدانی نے "صفۃ جزیرۃ العرب" میں ایک ایک کان کا نشان

ان میں بعض کے فروع یہ ہیں۔

غطفان	عبس، ذبیان، فزارہ، مرہ
دعمر	تغلب، بکر (؟)
ہوازن	سعد، نصر، جشم، ثقیف، سلول، بنو عامر (عامر کی شاخیں بنو ہلال، بنو نمیر، بنو کعب ہیں)

یہود

بنو قینقاع، بنو نضیر، بنو قریظہ

بنو قحطان و آل اسماعیل نے اسلام سے پہلے متعدد حکومتیں قائم کی تھیں جن کے جستہ جستہ واقعات کہیں کہیں ملتے ہیں

عرب کی قدیم حکومتیں:

کتبوں اور دیگر مورخین کی تصریحوں سے جو کچھ ثابت ہوتا ہے یہ ہے کہ اسلام سے پہلے عرب میں پانچ متمدن سلطنتیں گزری ہیں۔

(۱) معینی	معین یمن میں ایک مقام کا نام ہے جو کسی زمانہ میں سلطنت کا پایہ تخت تھا۔
(۲) سبائی	یعنی قوم سبا۔
(۳) حضر موتی	حضر موت یمن کا مشہور مقام ہے۔
(۴) قتبانی	قتبان عدن میں ایک مقام ہے جو آج کل گمنام ہے۔
(۵) نابتی	حضرت اسماعیلؑ کے ایک بیٹے کا نام نابت تھا۔ یہ سلطنت انہی کی طرف منسوب ہے۔

معینی سلطنت جنوبی عربستان میں تھی اس کے صدر مقامات قرن اور معین تھے کتبوں سے تقریباً پچیس حکمرانوں کا پتہ چلتا ہے محققین یورپ میں اختلاف ہے کہ معینی اور سبائی حکومتیں ہم زمان تھیں یا متقدم و متاخر۔ گلازر کا خیال ہے کہ معینی حکومت بہت متقدم ہے اور حضرت عیسیٰؑ سے پندرہ سو برس قبل موجود تھی لیکن مولر کا بیان ہے کہ کوئی معینی کتبہ آٹھ سو برس قبل مسیح سے پہلے کا نہیں ملتا اس بنا پر سبائی اور معینی دونوں ہم عصر ہیں۔

سبائی دور جیسا کہ کتبوں سے ثابت ہوتا ہے حضرت عیسیٰؑ سے سات سو برس قبل ہے اس سلطنت کا پایہ تخت مآرب تھا اس زمانہ کے لکھے کتبے بہ کثرت موجود ہیں حضرت عیسیٰؑ سے ایک سو پندرہ برس قبل تک اس حکومت کا پتہ چلتا ہے اس دور کے بعد حمیر کا زمانہ ہے حمیر نے مآرب پر قبضہ کر کے اس کو پایہ تخت بنایا۔

قریباً ۱۱۵ قبل مسیح میں حمیر نے سبائی حکومت پر قبضہ کر لیا کتبوں سے ثابت ہوتا ہے کہ حمیر میں چھبیس فرمانروا گزرے حمیر کے بعض کتبوں میں سنہ و سال بھی کندہ ہے ان کے عہد حکومت میں رومی سلطنت نے عرب میں مداخلت کرنے کی کوشش کی تھی لیکن یہ کوشش پہلی بھی تھی اور آخری بھی۔ اے لیس گالس جس نے حضرت عیسیٰؑ سے ۱۸ برس قبل عرب پر چڑھائی کی تھی بالکل ناکامیاب رہا اس کے رہبر دغا بازی سے اس کو صحراؤں لے گئے اور ریگستان میں پہنچ کر اس کا سارا لشکر تباہ ہو گیا۔[1]

---

[1] یہ تمام تفصیل انسائیکلوپیڈیا کے اس آرٹیکل سے ماخوذ ہے جو [illegible] صاحب نے عرب پر لکھا ہے [illegible] اس موقع پر [illegible] پروفیسر کیمبرج [illegible]۔

حمیر نے یہودی مذہب قبول کر لیا تھا اسی زمانہ کے قریب حبشیوں نے عرب کے جنوب میں حکومت قائم کرنی شروع کی اور ایک زمانہ میں حمیریوں کو شکست دے کر اپنی مستقل حکومت قائم کر لی اس عہد کا ایک کتبہ جو آج کل ہاتھ آیا ہے اس پر یہ الفاظ ہیں۔

"رحمان' مسیح اور روح القدس کی قدرت وفضل و رحمت سے اس یادگاری پتھر پر ابرہہ نے کتبہ لکھا جو کہ بادشاہ حبش ارمیس زبی ان کا نائب الحکومت ہے"۔

سبا اور حمیر کی عظمت اور اقتدار اور وسعت فتوحات کی روایتیں عرب میں اس قدر متواتر ہیں کہ ان کے قدر مشترک سے انکار نہیں کیا جا سکتا' اشعار میں بھی کثرت سے واقعات مذکور ہیں۔ عربوں کے خیال کے مواقف سلاطین حمیر نے ایران کے ابتدائی مقامات فتح کر لئے تھے' ذوالقرنین جس کو عوام سکندر کہتے ہیں' اہل عرب کے نزدیک اسی حمیری خاندان کا فرماں روا تھا۔ شاہنامہ میں مذکور ہے کہ کیکاؤس کو شاہ ہاماوران نے گرفتار کر لیا تھا' علامہ ثعلبی نے تاریخ ایران میں (جو اب یورپ میں چھپ کر شائع ہو گئی ہے) لکھا ہے کہ یہ ہاماوران حمیر کا بادشاہ تھا اور ہاماوران دراصل وہی عربی حمیر ہے' علامہ موصوف نے یہ بھی لکھا ہے کہ سودابہ جو کیکاؤس کی زوجہ تھی اور فردوسی کے بیان کے مواقف سیاوش پر عاشق ہو گئی تھی اسی حمیری بادشاہ کی بیٹی تھی اور اس کا اصلی نام سعدی تھا' ایرانیوں نے اپنے تلفظ میں اس کو سودابہ کر لیا تھا۔

یورپ کی تحقیقات حال سے بھی سبا اور حمیر کے اعلیٰ درجہ کے تمدن کا ثبوت ملتا ہے' پروفیسر نولدیکی جرمنی کا مشہور مستشرق لکھتا ہے۔

"ولادت مسیح سے ہزار سال قبل جنوبی و مغربی عرب یعنی یمن جو حمیر اور سبا کا ملک تھا اور جو اپنی بارش گرما کے باعث زراعت کے لئے نہایت موزوں تھا' تمدن کے اس درجہ تک پہنچ چکا تھا کہ اس کے کثیر التعداد کتبات اور شاندار عمارات کے آثار سے آج بھی ہمارے جذبات مدح و ستائش کو تحریک ہوتی ہے اور اہل یونان و روم نے اس کو "دولت مند عرب" کا جو لقب دیا تھا وہ بجا تھا...... تورات میں متعدد عبارتیں ہیں جو سبا کی عظمت و شوکت کی شہادت دیتی ہیں' چنانچہ ملکہ سبا کا "سلیمان" سے ملاقات کا قصہ خاص طرح پر قابل ذکر ہے (۱۔ سلاطین۔ ۱۰ آیت ۱ تا ۱۰)

قوم ثمود کی عمارات سے وادی القریٰ اور حجر کی چٹانوں نے ہم کو روشناس کر دیا ہے' نیز قوم نبات نے جو ثمود سے بہت ملتی جلتی ہے' اپنے تمدن کی ابتدائی تعلیم غالباً انہی سے حاصل کی ہے۔

کتابت کا فن جو سبائیوں نے بہت ابتدائی زمانہ میں شمال سے لیا تھا اب اس کو خود انہوں نے عرب کے کل حصوں میں ہر طرح کے کاروبار میں جاری کر دیا یہاں تک کہ ایک طرف دمشق اور دوسری جانب ابی سینیا تک اس کو پھیلا دیا۔"[1]

نبطی حکومت' جو شام کے حدود سے متصل تھی اور جو قوم ثمود کی مرادف یا ان کی قائم مقام تھی اس کی نسبت فارسٹر صاحب اپنے جغرافیہ میں لکھتے ہیں۔

"ان مختصر بیانات سے معلوم ہوا ہو گا کہ زمانہ قدیم میں نبات کا نام اور اثر نہ صرف ریگستانی اور صحرائی عرب پر مستولی تھا بلکہ حجاز و نجد کے صوبہ ہائے عظیمہ پر بھی حاوی تھا۔ نبطی جہاں ایک طرف منافع تجارت سے بہرہ اندوز ہونے میں کمال رکھتے تھے وہاں دوسری طرف بچے ہوا ساحل کے خطرات جنگ کے لئے بالکل مستعد رہتے تھے' فلسطین و شام میں ان

۱؎ مورخین کی تاریخ عالم جلد ۸ یعنی ہسٹورینز ہسٹری آف ورلڈ تھرڈ آرٹیکل عرب پروفیسر نولدیکی کا لکھا ہوا

﴿وَقَالُوا مَالِ هٰذَا الرَّسُولِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِي فِي الْأَسْوَاقِ﴾

اور کہتے ہیں کہ یہ کیسا رسول ہے کہ کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ (الفرقان ۔۱)

﴿قَالُوا أَبَعَثَ اللَّهُ بَشَرًا رَسُولًا﴾

کہتے ہیں کہ خدا نے آدمی کو پیغمبر بنا کر بھیجا ہے۔ (بنی اسرائیل ۱۱)

ان کا خیال تھا کہ اگر کوئی پیغمبر ہو سکتا ہے تو اس کو فرشتہ ہونا چاہئے جو خواص انسانی سے مبرا ہو۔

لیکن وہ لوگ بت پرست تھے وہ بتوں کو خدا نہیں سمجھتے تھے بلکہ سمجھتے تھے کہ خدا تک پہنچنے کے وسیلے ہیں۔

﴿مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَىٰ﴾ (سورۃ زمر ۔۱، پ ۲۳)

ہم ان بتوں کو صرف اس لئے پوجتے ہیں کہ ہم کو خدا سے قریب کر دیں۔

قبیلہ حمیر جو یمن میں رہتا تھا آفتاب پرست تھا، کنانہ چاند کو پوجتے تھے قبیلہ بنی تمیم دبران کی عبادت کرتا تھا، اسی طرح قیس شعریٰ کی، قبیلہ اسد عطارد کی اور لخم و جذام مشتری کی پرستش کرتے تھے۔

مشہور بتوں اور ان کے پوجنے والوں کے نام حسب ذیل ہیں (بتوں کی تفصیل ملل و نحل میں ہے)۔

نام بت	مقام	قبیلہ جو اس بت کو پوجتا تھا
لات	طائف	ثقیف
عزیٰ	مکہ معظمہ	قریش و کنانہ
مناۃ	مدینہ منورہ	اوس خزرج اور غسان
ود	دومۃ الجندل	کلب
سواع		ہذیل
یغوث		مذحج و قبائل یمن
یعوق	یمن	ہمدان

سب سے بڑا بت ہبل تھا جو کعبہ کی چھت پر منصوب تھا قریش لڑائیوں میں اسی کی جے پکارتے تھے۔

عرب میں بت پرستی کا بانی ایک شخص عمرو بن لحی تھا اس کا اصلی نام ربیعہ بن حارثہ تھا، عرب کا مشہور قبیلہ خزاعہ اسی کی نسل سے ہے۔ عمرو سے پہلے جرہم کعبہ کے متولی تھے عمرو نے لڑ کر جرہم کو مکہ سے نکال دیا اور خود حرم کا متولی ہو گیا۔ وہ ایک دفعہ شام کے کسی شہر میں گیا وہاں کے لوگوں کو بت پوجتے دیکھا تو پوچھا کہ ان کو کیوں پوجتے ہو؟ انہوں نے کہا یہ حاجت روا ہیں، لڑائیوں میں فتح دلاتے ہیں، قحط پڑتا ہے تو پانی برساتے ہیں، عمرو نے چند بت ان سے لے لئے اور لا کر کعبہ کے آس پاس قائم کئے، کعبہ چونکہ عرب کا مرکز تھا اس لئے تمام قبائل میں بت پرستی کا رواج ہو گیا۔ ان میں سب سے قدیم بت مناۃ تھا۔ یہ سمندر کے کنارے قدید کے قریب نصب تھا، اوس و خزرج اور مدینہ کے لوگ یہاں قربانی چڑھاتے تھے اور جب کعبہ کا حج کر کے آتے تھے تو احرام یہیں اتارتے تھے ہذیل اور خزاعہ بھی اس کی پرستش

---

۱ یہ تمام تفصیل ملل و نحل شہرستانی ذکر مذاہب عرب میں ہے۔

۲ یہ تفصیل کتاب الاصنام ابن کلبی میں ہے۔

تعلیم کے لئے متعدد درسگاہیں قائم تھیں جن کو بیت المدراس کہتے تھے حدیث کی کتابوں میں اسی نام سے ان کا ذکر آتا ہے قلعہ خیبر کی تمام آبادی یہودی تھی امراء القیس کا ہمعصر مشہور شاعر سموئیل بن عادیا جس کی وفاداری آج تک عرب میں ضرب المثل ہے یہودی تھا۔

اس کتاب کی روایتیں مکہ معظمہ میں اس قدر رواج پا چکی تھیں کہ آنحضرت ﷺ پر جب قرآن نازل ہوتا تھا اور اس میں بنی اسرائیل کے واقعات مذکور ہوتے تھے تو کفار یہ گمان کرتے تھے کہ کوئی یہودی یا عیسائی آپ کو سکھا جاتا ہے خود قرآن مجید میں ہے۔

﴿وَلَقَدْ نَعْلَمُ أَنَّهُمْ يَقُولُونَ إِنَّمَا يُعَلِّمُهُ بَشَرٌ﴾ (نحل۔ ۱۴)

اور ہم جانتے ہیں کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ محمد کو کوئی آدمی سکھاتا ہے۔

قرآن مجید میں اس خیال کا ابطال بھی کر دیا ہے جس کی تفصیل مناسب موقع پر آئے گی۔

قبیلۂ تمیم مجوسی تھا، زرارہ تمیمی نے جو اس قبیلہ کا رئیس تھا، اسی بنا پر اپنی بیٹی سے شادی کر لی تھی، گو اس پر اس کو ندامت ہوئی، اقرع بن حابس بھی مجوسی تھا۔[1]

مذہب حق:

دین ابراہیمی کا اہم الاصول توحید خالص تھی، زمانہ کے امتداد اور جہالت کے شیوع سے یہ اصول اگرچہ شرک آلودہ ہو گیا تھا، یہاں تک کہ خود خانہ خدا میں بتوں کی پرستش ہوتی تھی، تاہم بالکل ناپید نہیں ہوا تھا، عرب میں کہیں کہیں اس کا دھندلا سا نشان نظر آتا تھا، جو لوگ صاحب بصیرت تھے ان کو یہ منظر نہایت حیرت انگیز معلوم ہوتا تھا کہ انسان عاقل، جماد لاعقل کے سامنے سر جھکائے، اس بنا پر بت پرستی کی برائی کا خیال بعضوں کے دل میں آیا، لیکن اس کا تحقیقی زمانہ آنحضرت ﷺ کی بعثت سے کچھ ہی پہلے شروع ہوتا ہے، ابن اسحاق[2] نے لکھا ہے کہ ایک دفعہ قریش کسی بت کے سالانہ میلہ میں ورقہ بن نوفل، عبید اللہ بن جحش، عثمان بن الحویرث، زید بن عمرو بن نفیل شریک تھے، ان لوگوں کے دل میں دفعۃً یہ خیال آیا کہ یہ کیا بیہودہ پن ہے کہ ہم ایک پتھر کے سامنے سر جھکاتے ہیں جو نہ سنتا ہے، نہ دیکھتا ہے، نہ کسی کا نقصان کر سکتا ہے، نہ کسی کو فائدہ پہنچا سکتا ہے، یہ چاروں قریش کے خاندان سے تھے، ورقہ حضرت خدیجہؓ کے برادر عم زاد تھے، زید حضرت عمرؓ کے چچا تھے، عبید اللہ بن جحش حضرت حمزہؓ کے بھانجے تھے، عثمان عبدالعزیٰ کے پوتے تھے۔

زید دین ابراہیمی کی تلاش میں شام گئے، وہاں یہودی اور عیسائی پادریوں سے ملے، لیکن کسی سے تسکین نہیں ہوئی، اس لئے اس اجمالی اعتقاد پر اکتفا کیا کہ "میں ابراہیم کا مذہب قبول کرتا ہوں"۔ صحیح بخاری میں (باب بنیان الکعبہ سے پہلے) حضرت اسماءؓ (دختر ابوبکر صدیقؓ) سے روایت ہے کہ "میں نے زید کو اس حالت میں دیکھا کہ کعبہ سے پیٹھ لگائے لوگوں سے کہتے تھے اے اہل قریش! تم میں سے کوئی شخص بجز میرے ابراہیمؑ کے دین پر نہیں ہے"۔

عرب میں لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے، زید پہلے شخص ہیں جس نے اس رسم کی مخالفت کی، جب کوئی شخص

---

[1] معارف ابن قتیبہ جلد ا ص ۲۴

[2] سیرت ابن ہشام مطبوعہ مصر ص ۷۶

سلسلہ اسمٰعیلی

یہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ مؤرخین عرب نے عرب کی تین قسمیں کی ہیں:-

عرب کی وہ قدیم قومیں جو بالکل برباد ہو گئیں؛ مثلاً طسم و جدیس وغیرہ۔

خالص عرب جو قحطان کی اولاد ہیں؛ مثلاً اہل یمن، اوس، انصار (اور تیسرا سلسلہ اسمٰعیلی)

حضرت اسمٰعیلؑ جب مکہ میں آباد ہوئے تو حوالی مکہ میں جو جرہم آباد تھے حضرت اسمٰعیلؑ نے اس خاندان میں شادی کی اس سے جو اولاد ہوئی وہ عرب مستعربہ کہلاتی ہے اب عرب کا بڑا حصہ اسی خاندان سے ہے۔

پیغمبر اسلام ﷺ اور خود اسلام کی تمام تر تاریخ اسی اخیر سلسلہ سے وابستہ ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ حضرت اسمٰعیلؑ ہی کے خاندان سے ہیں اور جو شریعت آنحضرت ﷺ کو عنایت ہوئی وہی ہے جو حضرت ابراہیمؑ کو عطا ہوئی تھی قرآن مجید میں ہے۔

﴿مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ مِنْ قَبْلُ وَفِي هَذَا﴾ (حج۔۱۰)

(تمہارے باپ ابراہیم کا مذہب، اسی نے پہلے بھی تمہارا نام مسلم رکھا اور اس قرآن میں بھی)

لیکن یورپ کے بہت سے متعصب مؤرخ سرے سے ان حقائق کے منکر ہیں یعنی نہ حضرت ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ عرب میں آئے نہ انہوں نے کعبہ کی بنیاد ڈالی نہ آنحضرت ﷺ حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد ہیں۔

چونکہ ان مباحث نے مذہبی تعصب کی صورت اختیار کر لی ہے اس لئے یہ توقع مشکل ہے کہ ہم اس بحث کو اس طرح طے کر سکیں گے کہ استدلال کی بنیاد یورپ کے مسلمات پر رکھی جائے۔

جو واقعات مختلف فیہ ہیں بہت ہیں لیکن اصولی امور صرف دو ہیں جن میں دونوں فریق کا کوئی قدر مشترک نظر نہیں آتا۔ یہ اصول جس فریق کے موافق طے ہو جائیں اس کے فروعی جزئیات بھی اسی کے موافق تسلیم کر لینے پڑیں گے۔ اصول مذکورہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ حضرت ہاجرہؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ عرب میں آ کر آباد ہوئے یا نہیں؟

۲۔ حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسحاقؑ کو قربانی کرنا چاہا تھا یا حضرت اسمٰعیلؑ کو؟

حضرت اسمٰعیلؑ کہاں آباد ہوئے؟

یہودی مدعی ہیں کہ حضرت اسحاقؑ ذبیح ہیں۔ اس بنا پر وہ قربانگاہ کا موقع شام بتاتے ہیں۔ لیکن اگر یہ ثابت ہو جائے کہ حضرت اسحاقؑ نہیں بلکہ حضرت اسمٰعیلؑ تھے تو قربانگاہ کے موقع کی نسبت عرب ہی کی روایتیں تسلیم کرنی پڑیں گی اور اس حالت میں تاریخ کی تمام کڑیاں مسلسل ہو جائیں گی۔

توراۃ میں مذکور ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی پہلی اولاد حضرت ہاجرہؑ کے بطن سے ہوئی جس کا نام اسمٰعیلؑ رکھا

۱؎ اس موقع پر بعض مفسرین نے حضرت ابراہیمؑ کو باپ [illegible] ہے [illegible] اتفاقاً [illegible] ہے جیسا کہ [illegible] سے صاف ظاہر ہے۔

۱۔ شریعت سابقہ کی رو سے قربانی صرف اس جانور یا آدمی کی ہو سکتی تھی جو پہلوٹھا بچہ ہو، اسی بنا پر ہابیل نے جن بھیڑوں کی قربانی کی تھی وہ پہلوٹھے بچے تھے۔

خدا نے حضرت موسیٰؑ سے جہاں لاویوں کے متعلق احکام ارشاد فرمائے وہاں فرمایا ہے

﴿ لانّ لی کلّ بکر فی بنی اسرائیل من الناس والبهائم ﴾

کیونکہ بنی اسرائیل میں آدمی اور جانور کا ہر پہلوٹھا بچہ میرے لئے ہے۔ [عدد ۸۔ ۱۷]

۲۔ پہلوٹھے بچے کی افضلیت کسی حالت میں زائل نہیں ہو سکتی، توراۃ میں ہے کہ اگر کسی شخص کی دو بیویاں ہوں، ایک محبوب ہو اور دوسری غیر مرغوب، تو فضیلت اسی اولاد کو ہوگی جو پہلوٹی ہو، گو وہ غیر مرغوب سے ہو۔

﴿ فانّه اوّل قدرته وله حق البکوریة ﴾ [استثنا اصحاح ۲۱ آیت ۱۵ تا ۱۷]

کیونکہ وہ اس کی پہلی قدرت ہے اور اسی کو پہلوٹھا ہونے کا حق ہے۔

۳۔ جو اولاد خدا کی نذر کر دی جاتی تھی اس کو باپ کا ترکہ نہیں ملتا تھا۔ توراۃ میں ہے:۔

﴿ فی ذلک الوقت افرز الرب سبط لاوی لیحملوا تابوت عهد الرب ولکی یقفوا امام الرب لیخدموه ویبارکوا باسمه الی هذا الیوم لاجل ذلک لم یکن للاوی قسم ولا نصیب مع اخوته الرب هو نصیبه ﴾ (توراۃ استثنا ۱۰ آیت ۸، ۹)

تب خدا نے لاوی کی اولاد کو اس لئے مخصوص کر لیا کہ خدا کے عہد کا تابوت اٹھائے اور تاکہ خدا کے آگے کھڑا ہو تاکہ وہ خدا کی خدمت کرے اور اس کے نام سے آج تک برکت دیں، یہی وجہ ہے کہ لاویوں کا اپنے بھائیوں کے ساتھ کوئی حصہ اور ترکہ نہیں، خدا ہی ان کا حصہ ہے۔

۴۔ جو شخص خدا کی نذر کر دیا جاتا تھا وہ سر کے بال چھوڑ دیتا تھا اور معبد کے پاس جا کر منڈاتا تھا، جس طرح آج حج میں احرام کھولنے کے وقت بال منڈاتے ہیں، توراۃ میں ہے:۔

﴿ فها انک تحبلین و تلدین ابناً ولا یعلو موسی راسه لان الصبی یکون نذیراً للّٰه ﴾

اب تو حاملہ ہوگی اور بچہ جنے گی اور اس کے سر پر استرا نہ پھیرا جائے کیونکہ یہ بچہ خدا کے لئے نذر کیا جائے گا۔ [توراۃ قضاۃ اصحاح ۱۳۔ ۵]

۵۔ جو شخص خدا کا خادم بنایا جاتا تھا اس کے لئے "خدا کے سامنے" کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ [توراۃ سفر ملوک ۹۔ ۱۷، ۱۸ و سفر تکوین۔ ۲۷ و اشعیا ۱۔ ۸]

۶۔ حضرت ابراہیمؑ کو بیٹے کی قربانی کا جو حکم ہوا تھا اس میں قید تھی کہ وہ بیٹا قربانی کیا جائے جو اکلوتا ہو اور محبوب ہو۔ [توراۃ تکوین اصحاح ۲۲ آیت ۲]

اب اصل مسئلہ پر غور کرو، لیکن پہلے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی شریعت میں قربانی کرنا اور خدا پر نذر چڑھانا ایک بات تھی یعنی دونوں کے لئے ایک ہی لفظ استعمال کرتے تھے۔

اگر یہ کہا جائے کہ بچہ کو فلاں معبد میں قربانی چڑھا دو تو اس کے یہ معنی تھے کہ وہ اس معبد کی خدمت اور مجاورت

نے کے لیے معبد سے الگ کر دیا جائے لیکن یہ لفظ جب جانوروں کے لیے استعمال کیا جاتا تھا تو حقیقی قربانی کے معنی مراد ہوتے تھے توراۃ میں خدا کی زبان سے مذکور ہے۔

﴿ لا ذ نی کل بکر بی می اسرائیل من آدم و بہیمہ ﴾

کیونکہ بنی اسرائیل میں آدمی اور جانور کا ہر پہلوٹا بچہ میرے لیے ہے۔

اسی اصحاح میں تصریح کے ساتھ مذکور ہے کہ "خدا نے حضرت موسیٰؑ سے کہا کہ تم بنی اسرائیل میں سے لاویوں کو لاؤ اور ان کو خدا کے سامنے پیش کرو کہ خدا کے لیے خاص کر دیئے جائیں اور یہ لوگ دو گایوں کے سر پر ہاتھ رکھ دیں جو قربانی کی جائیں"۔ (اختصاراً)

حضرت ابراہیمؑ کو خواب میں بیٹے کی قربانی کا جو حکم ہوا تھا اس سے بھی یہی مراد تھی کہ بیٹے کو معبد کی خدمت کے لیے نذر چڑھا دیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے پہلے اس خواب کو ظاہری اور حقیقی سمجھا اور اس لیے بعینہٖ اس کی تعمیل کرنی چاہی لیکن بعد میں ظاہر ہوا کہ وہ تمثیلی خواب تھا۔ اس بنا پر حضرت ابراہیمؑ نے بیٹے کو خانۂ خدا کی خدمت کے لیے خاص کر دیا اور جو شرطیں قربانی کی تھیں قائم رکھیں۔

بیان مذکورۂ بالا کے ذہن نشین کرنے کے بعد ذیل کی تقریر پڑھنی چاہئیں۔

(۱) حضرت اسحاقؑ کی ولادت حضرت اسماعیلؑ کے بعد ہے اس بنا پر حضرت اسحاقؑ اکلوتے بیٹے کبھی نہ تھے اور چونکہ قربانی کے لیے اکلوتے بیٹے کی شرط ہے اس لیے حضرت اسحاقؑ کی قربانی کا حکم نہیں ہو سکتا تھا۔

(۲) حضرت اسحاقؑ کو حضرت ابراہیمؑ نے اپنا تمام ترکہ دیا بخلاف اس کے حضرت اسماعیلؑ اور ان کی والدہ کو صرف پانی کی ایک مشک دے کر رخصت کیا، یہ اس بات کا قطعی قرینہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسحاقؑ کو قربانی یعنی معبد پر نذر نہیں چڑھایا تھا۔

(۳) حضرت اسماعیلؑ کے خاندان میں مدت تک یہ رسم قائم رہی کہ لوگ سر کے بال نہیں منڈاتے تھے حج میں احرام کے زمانہ تک جو بال نہیں منڈاتے، یہ اسی حیثیت سے نذر کی یادگار ہے۔

(۴) جو الفاظ قربانی اور نذر چڑھانے کے لیے مطلقاً بائبل میں استعمال کیے جاتے تھے وہ حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسمٰعیلؑ کے لیے استعمال کیے نہ حضرت اسحاقؑ کے لیے، توراۃ میں ہے کہ جب خدا نے حضرت ابراہیمؑ کو حضرت اسحاقؑ کی ولادت کی خوشخبری دی تو حضرت ابراہیمؑ نے کہا۔

﴿ لیت اسمعیل یحیی لفانیک ﴾

کاش اسماعیل تیرے سامنے زندہ رہتا

توراۃ میں جہاں جہاں یہ لفظ استعمال ہوا ہے (سامنے زندہ رہنا) اسی معنوں میں ہوا ہے۔

(۵) حضرت اسماعیلؑ حضرت ابراہیمؑ کی محبوب ترین اولاد تھے توراۃ جو تمام تر حضرت اسحاقؑ کی طرف داری سے بھری ہے اس میں حضرت اسحاقؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کے جو امتیازی خصائص بیان کیے گئے ہیں یہ ہیں کہ حضرت اسحاقؑ خدا کے وعدہ و عہد کا مظہر ہیں اور حضرت اسماعیلؑ دعائے ابراہیمؑ ہیں یعنی حضرت ابراہیمؑ کی دعا اور خواہش سے

مکہ معظمہ

حضرت اسماعیلؑ کی بحث مسکن میں گذر چکا کہ وہ عرب تھا۔ مقام ذبح کی تعیین میں یہ ثابت ہو چکا کہ وادی "مکہ" تھا۔ اس بناء پر مکہ کی نسبت ایک بحث نہایت قدیم زمانہ سے تعلق رکھتی ہے۔

متعصب عیسائی مؤرخ لکھتے ہیں کہ اس شہر کی قدامت کا دعویٰ مسلمانوں کا خاص دعویٰ ہے قدیم تاریخوں میں اس کا نشان نہیں [1] اس بناء پر ہم اس بحث کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ لکھتے ہیں۔

مکہ کا قدیم اور اصلی نام بکہ ہے، قرآن مجید میں بھی آیا ہے۔

﴿ إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا ﴾ (سورۂ آل عمران۔۱۰)

پہلا گھر جو آدمیوں کے لئے بنایا گیا وہ بکہ میں تھا۔

کتاب زبور ۸۴-۶ میں ہے۔

"بکہ کی وادی میں گزرتے ہوئے اسے ایک کنواں بناتے، برکتوں سے معمور کو ڈھانک لیتے، قوت سے قوت تک ترقی کرتے چلے جاتے ہیں"۔

اس عبارت میں بکہ کا جو لفظ ہے وہی مکہ معظمہ ہے، لیکن اگر اس لفظ کو اسم علم کے بجائے مشتق قرار دیں تو اس کے معنی "رونے" کے ہوں گے اور یہی عربی لفظ بکاء ہے، چونکہ یہود و نصاریٰ ہمیشہ مکہ کی وقعت مٹانے کے درپے رہے ہیں اس لئے بہت سے مترجمین نے عبارت مذکورہ میں بکہ کا ترجمہ "رونا" کر دیا ہے، لیکن ہر شخص غور کر سکتا ہے کہ اس حالت میں وادی بکا کے کیا معنی ہوں گے؟ زبور کی عبارت مذکورہ کی اوپر کی آیتوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس نغمہ میں حضرت داؤدؑ نے مکہ معظمہ، مروہ اور قربان گاہ اسماعیلؑ کی نسبت اپنا شوق اور حسرت ظاہر کی ہے۔ اوپر کی عبارت یہ ہے (حضرت داؤدؑ خدا سے کہتے ہیں) "اے فوجوں کے خدا! تیرے مسکن کس قدر شیریں ہیں، میرا نفس خدا کے گھر کا مشتاق بلکہ عاشق ہے...... اے خدا! تیرے قربان گاہ میرے مالک اور میرے خدا ہیں، مبارک ہیں وہ ان لوگوں کو جو تیرے گھر میں بیٹھے ہیں اور تیری تسبیح پڑھتے ہیں"۔ اس کے بعد بکہ والی آیتیں ہیں۔ اب غور کرو حضرت داؤدؑ جس مقام کے پہنچنے کا شوق ظاہر کرتے ہیں وہ اسی مقام پر صادق آ سکتا ہے جس میں حسب ذیل باتیں پائی جائیں۔

(۱) قربانی گاہ ہو۔

(۲) حضرت داؤدؑ کے وطن سے دور ہو کہ وہاں تک سفر کر کے جائیں۔

(۳) وہ وادی بکہ کہلاتا ہو۔

(۴) وہاں مقام مروہ بھی ہو، ان باتوں کو پیش نظر رکھو تو قطعاً یقین ہو جائے گا کہ بکہ وہی مکہ معظمہ اور مروہ وہی

---

[1] مارگولیوس اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ "بہ قدیم خیال کی ادھ سے مسلمانوں نے اپنے مذہبی مرکز کو نہایت قدیم ابتدائی زمانہ کا بتایا ہے لیکن تاریخی روایات سے پتہ چلتا ہے کہ مکہ کی سب سے قدیم آبادی رومیوں کے عہد میں بنی تھی"۔ مارگولیوس نے اس کے ثبوت میں ... کا حوالہ بھی دیا ہے، اس مسئلہ کی اس قدر تفصیل سے ... لیکن اس کا بیان کہ ... ہم نے اصل کتاب میں ظاہر کر دیئے۔

قبائل پر ایک محصول لگا دیا گیا جس سے پردہ تیار کیا جاتا تھا۔ علامہ ازرقی نے لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے بھی یمنی پردہ چڑھایا تھا لیکن اس روایت کے سلسلہ کا ایک راوی واقدی ہے۔[1]

خدا کا گھر سیم وزر کی نقش آرائیوں کا محتاج نہ تھا لیکن دولت اور ملک کی ترقی کے یہ لوازم ہیں اس لئے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ جب خلیفہ ہوئے تو انہوں نے کعبہ کے ستونوں پر سونے کے پتر چڑھائے۔ عبدالملک بن مروان نے اپنے زمانہ میں ۳۶ ہزار اشرفیاں اس کام کے لئے بھیجیں۔ امین الرشید نے ۱۸ ہزار اشرفیاں نذر کیں کہ دروازہ کی چوکھٹ وغیرہ طلائی بنوادی جائے۔ اعلام (تاریخ مکہ) میں عہد بعہد کی طلاکاریوں کی تفصیل لکھی ہے۔ لیکن یہ واقعات عہد نبوت کے بعد کے ہیں جو ہماری کتاب کا موضوع نہیں اور سچ یہ ہے کہ آفتاب پر سونا چڑھانا ضروری بھی نہیں۔

حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی:

خدا کا گھر بن چکا تو ضرورت تھی کہ اس کی تولیت اور خدمت کے لئے کوئی شخص تمام مشاغل سے الگ ہو کر اپنی زندگی اس پر نذر چڑھا دے۔ اس قسم کی نذر کو ابراہیمی شریعت میں قربانی سے تعبیر کرتے تھے۔ تورات میں یہ محاورہ بکثرت آتا ہے۔

جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں انبیاء علیہم السلام پر جو وحی آتی ہے اس کے مختلف انواع ہیں جن میں سے ایک خواب بھی ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری باب بدء الوحی میں ہے کہ آنحضرت ﷺ پر وحی کی جو ابتدا ہوئی خواب سے ہوئی۔ یہ خواب کبھی تمثیلی ہوتا ہے جس طرح حضرت یوسفؑ نے آفتاب و ماہتاب اور ستاروں کو سجدہ کرتے دیکھا تھا بہرحال حضرت ابراہیمؑ کو خواب دکھلایا گیا کہ اپنے بیٹے کو اپنے ہاتھ سے ذبح کر رہے ہیں۔ انہوں نے اس خواب کو حقیقی سمجھا اور بعینہ اس کی تعمیل پر آمادہ ہوئے۔

حضرت ابراہیمؑ کو اپنے استقلال اور جاں نثاری پر اطمینان تھا لیکن یہ تحقیق طلب تھا کہ پانزدہ سالہ نوجوان بھی اپنی گردن پر چھری چلتے دیکھ سکتا ہے یا نہیں؟ بیٹے سے مخاطب ہو کر کہا۔

﴿يٰبُنَيَّ اِنِّىْٓ اَرٰى فِى الْمَنَامِ اَنِّىْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى﴾ (صافات)

بیٹا میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تجھ کو ذبح کر رہا ہوں تو تیری کیا رائے ہے؟

بیٹے نے نہایت استقلال سے جواب دیا۔

يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِىْٓ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ۔ (صافات-۳)

---

1. حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں قباطی کا پردہ چڑھایا جو مصر میں بنتا تھا اس کے بعد معمول ہو گیا کہ ہر خلیفہ اپنے عہد خلافت میں پردہ چڑھاتا تھا بنوامیہ سفید دیبا کا پردہ چڑھاتے تو مامون الرشید ہر سال تین پردے چڑھاتا تھا ذی الحجہ کی ۸ تاریخ کو دیبائے احمر کا، رجب میں قباطی کا، عید الفطر میں دیبائے سفید کا۔ مصر میں جب سلطان صالح ابن سلطان قلاوون بادشاہ ہوا تو مصر کے دو گاؤں پردہ کے مصارف کے لئے وقف کر دیئے جب ترکی خاندان قسطنطنیہ میں حکمران ہوا تو سلطان سلیمان نے چند گاؤں اور اضافہ کر دیئے (اعلام باعلام بیت اللہ الحرام) غلاف کعبہ پر پردہ چڑھانے کی تاریخ تفصیل فتوح البلدان بلاذری اور تاریخ مکہ ازرقی اور معجم البلدان وغیرہ میں ہے ہم نے آخری تصنیف یعنی اعلام کو لیا ہے کہ وہ ان سب کے بعد کی تصنیف اور جامع ہے۔

بابان! آپ کو جو حکم ہوا ہے وہ کر گزریئے خدا نے چاہا تو مجھ کو ثابت قدم پائیں گے۔

اب ایک طرف تو سو سالہ پیر ضعیف ہے جس کو دعا ہائے سحر کے بعد تمنائے نبوت کا ثمرہ دیرینہ حاصل ہوا تھا جس کو وہ تمام دنیا سے زیادہ محبوب رکھتا تھا اب اسی محبوب کے قتل کے لئے اس کی آستینیں چڑھی ہوئی ہیں اور ہاتھ میں چھری ہے۔

دوسری طرف نوجوان بیٹا ہے جس نے بچپن سے آج تک باپ کی محبت آمیز نگاہوں کی گود میں پرورش پائی ہے اور اب باپ ہی کا چھری بدست ہاتھ اس کا قاتل نظر آتا ہے ملائکۂ قدسی تھرا رہے ہیں، عالم کائنات یہ حیرت انگیز تماشا دیکھ رہے ہیں اور انگشت بدنداں ہیں کہ دفعتاً عالم قدس سے آواز آتی ہے:

﴿ یٰۤاِبۡرٰهِیۡمُ قَدۡ صَدَّقۡتَ الرُّءۡیَا ۚ اِنَّا کَذٰلِکَ نَجۡزِی الۡمُحۡسِنِیۡنَ ﴾ [صافات ۳]

ابراہیم! تو نے خواب کو سچ کر دکھایا، ہم نیک بندوں کو اسی طرح کا صلہ دیا کرتے ہیں۔

طفلان ناز بیں کہ جگر گوشۂ خلیل   در زیر تیغ رفت و شہیدش نمی کنند

بیٹے نے جس استقلال جس عزم اور جس جرأت خیز ایثار سے اپنے آپ کو قربانی کے لئے پیش کیا اس کا صلہ یہی تھا کہ یہ رسم (قربانی) قیامت تک دنیا میں اس کی یادگار رہ جائے۔

آمادہ کیا کہ حرم کے مناصب جو عبدالدار کو دیئے گئے واپس لے لئے جائیں، وہ لوگ اس منصب عظیم کے قابل نہیں۔ عبدالدار کے خاندان نے انکار کیا اور جنگ کی تیاریاں شروع کیں بالآخر اس پر صلح ہوگئی کہ عبدالدار سے سقایہ اور رفادہ واپس لے کر ہاشم کو دے دیا جائے۔

ہاشم:

ہاشم نے اپنے فرض کو نہایت خوبی سے انجام دیا، حجاج کو نہایت سیر چشمی سے کھانا کھلاتے تھے، چمڑے کی حوضوں میں پانی بھروا کر زمزم و منیٰ کے پاس سبیل رکھتے تھے، تجارت کو نہایت ترقی دی، قیصر روم سے خط و کتابت کر کے فرمان لکھوایا کہ "قریش جب اس کے ملک میں سامانِ تجارت لے کر جائیں تو ان سے کوئی محصول نہ لیا جائے۔" حبش کے بادشاہ نجاشی سے بھی اسی قسم کا فرمان حاصل کیا۔ چنانچہ اہل عرب جاڑوں میں یمن اور گرمیوں میں شام اور ایشیائے کوچک تک تجارت کے لئے جایا کرتے تھے۔ اس زمانہ میں انگورہ (انقرہ) جو ایشیائے کوچک کا مشہور شہر ہے، قیصر کا پایۂ تخت تھا، تجار قریش انگورہ میں جاتے تو قیصر نہایت عزت اور محبت سے خیر مقدم کرتا تھا۔

''عرب میں راستے محفوظ نہ تھے۔ ہاشم نے مختلف قبائل میں دورہ کر کے قبائل سے یہ معاہدہ کیا کہ قریش کے کاروانِ تجارت کو ضرر نہ پہنچائیں گے جس کے صلہ میں کاروانِ قریش ان قبائل میں ان کی ضرورت کی چیزیں خود لے کر جائے گا اور ان سے خرید و فروخت کرے گا''۔ یہ سبب تھا کہ عرب میں باوجود عام لوٹ مار کے قریش کا قافلہ تجارت ہمیشہ محفوظ رہتا تھا۔[1]

ایک[2] دفعہ مکہ میں قحط پڑا، ہاشم نے اس قحط میں شوربے میں روٹیاں چورا کر کے لوگوں کو کھلائیں، اس وقت سے ان کا نام ہاشم مشہور ہو گیا، عربی زبان میں چورا کرنے کو ہشم کہتے ہیں، جس کا اسم فاعل ہاشم ہے۔

ایک بار تجارت کی غرض سے شام گئے، راستہ میں مدینہ میں ٹھہرے، وہاں سال کے سال بازار لگتا تھا، بازار میں گئے تو ایک عورت کو دیکھا جس کی حرکات و سکنات سے شرافت اور فراست کا اظہار ہوتا تھا، اس کے ساتھ حسین اور شکیل بھی تھی، دریافت سے معلوم ہوا کہ خاندان بنی نجار سے ہے اور سلمیٰ نام ہے۔ ہاشم نے اس سے شادی کی درخواست کی اور اس نے قبول کر لی، غرض نکاح ہو گیا، شادی کے بعد یہ شام کو چلے گئے اور غزہ میں جا کر انتقال کیا، سلمیٰ کو حمل رہ گیا تھا، لڑکا پیدا ہوا، اس کا نام شیبہ رکھا گیا، اس نے قریباً ۸ برس تک مدینہ میں پرورش پائی، ہاشم کے بھائی جن کا نام مطلب تھا، ان کو یہ حالات معلوم ہوئے تو خود مدینہ روانہ ہوئے، وہاں پہنچ کر بھتیجے کی جستجو کی، سلمیٰ نے ان کے آنے کا حال سنا تو بلوا بھیجا، تین دن مہمان رہے، چوتھے دن شیبہ کو ساتھ لے کر مکہ معظمہ روانہ ہوئے، ان کی عمر ۸ برس کی تھی، یہاں آکر ان کا نام عبدالمطلب پڑ گیا۔[3]

عبدالمطلب کے لفظی معنی "مطلب کا غلام" ہیں۔ اس لئے ارباب سیر نے وجہ تسمیہ میں بہت سے اقوال نقل

۱۔ امالی ابو علی قالی

۲۔ طبری صفحہ ۱۰۸۸، ۱۰۸۹ ج ۳

۳۔ دیکھو زرقانی جلد اول ص ۷۵

ہے۔ علامہ ذہبی نے تلخیص المستدرک میں حاکم کا یہ قول نقل کر کے لکھا ہے کہ "میں اس حدیث کے بعض واقعات کو موضوع سمجھتا اور بنایا ہوا خیال کرتا ہوں"۔[1]

(۴) اس روایت میں مذکور ہے کہ حضرت بلالؓ اور ابوبکرؓ بھی اس سفر میں شریک تھے حالانکہ اس وقت بلالؓ کا وجود بھی نہ تھا اور حضرت ابوبکرؓ بچے تھے۔

(۵) اس حدیث کے اخیر راوی ابو موسیٰ اشعریؓ ہیں وہ شریک واقعہ نہ تھے اور اوپر کے راوی کا نام نہیں بتاتے۔ ترمذی کے علاوہ طبقات ابن سعد[2] میں جو طرق مذکور ہیں وہ مرسل یا معضل ہیں یعنی جو روایت مرسل ہے اس میں تابعی جو ظاہر ہے کہ شریک واقعہ نہیں ہے کسی صحابی کا نام نہیں لیتا ہے اور جو روایت معضل ہے اس میں راوی اپنے اوپر کے دو راوی جو تابعی اور صحابی ہیں دونوں کا نام نہیں لیتا ہے۔

(۶) حافظ ابن حجر رواۃ پر جرح کی بنا پر اس حدیث کو صحیح تسلیم کرتے ہیں لیکن چونکہ حضرت ابوبکرؓ اور بلالؓ کی شرکت قطعاً غلط ہے اس لئے مجبوراً اقرار کرتے ہیں کہ اس قدر حصہ غلطی سے روایت میں شامل ہو گیا ہے لیکن حافظ ابن حجر کا یہ ادعا بھی صحیح نہیں کہ اس روایت کے تمام رواۃ قابل سند ہیں عبدالرحمٰن بن غزوان کی نسبت خود انہی حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ "وہ غلطی کرتا تھا اس کی طرف سے اس وجہ سے شبہ پیدا ہوتا ہے کہ اس نے ممالیک کی روایت نقل کی ہے"۔ ممالیک کی ایک روایت ہے جس کو محدثین جھوٹ اور موضوع خیال کرتے ہیں۔[3]

حرب فجار کی شرکت:

عرب میں اسلام کے آغاز تک لڑائیوں کا جو متواتر سلسلہ چلا آتا ہے ان میں یہ جنگ سب سے زیادہ مشہور اور خطرناک ہے۔

یہ لڑائی قریش اور قیس قبیلہ میں ہوئی تھی۔ قریش کے تمام خاندانوں نے اس معرکہ میں اپنی الگ فوجیں قائم کی تھیں آل ہاشم کے علم بردار زبیر بن عبدالمطلب تھے وہ اسی صف میں جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بھی شریک تھے جزر سے دو معرکے ہوئے اول قیس پھر قریش غالب آئے اور بالآخر صلح پر خاتمہ ہوا اس لڑائی میں قریش کا رئیس اور سپہ سالار اعظم حرب بن امیہ تھا جو ابوسفیان کا باپ اور امیر معاویہ کا دادا تھا۔

چونکہ یہ قریش اس جنگ میں برسرحق تھے اور خاندان کے ننگ و نام کا معاملہ تھا اس لئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی شرکت فرمائی لیکن جیسا کہ ابن ہشام نے لکھا ہے آپ نے کسی پر ہاتھ نہیں اٹھایا امام سہیلی نے صاف تصریح کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے خود جنگ نہیں کی ان کے الفاظ یہ ہیں۔

۱؎ [illegible]

۲؎ [illegible]

۳؎ [illegible]

نصرانی نے دعویٰ کیا ہے کہ آپ کے اعتقادات میں جو تغیر ہوا ہے وہ عہد نبوت سے ہوا ہے ورنہ اس سے پہلے آپ ﷺ کا طرز عمل وہی تھا جو آپ کے خاندان اور اہل شہر کا تھا چنانچہ آپ ﷺ نے اپنے پہلے صاحبزادہ کا نام عبدالعزیٰ [1] رکھا تھا اور یہ روایت خود امام بخاری کی تاریخ صغیر میں مذکور ہے لیکن یہ روایت اگر صحیح بھی ہو تو اس سے آنحضرت ﷺ کی نسبت کیونکر استدلال ہو سکتا ہے۔

حضرت خدیجہؓ اسلام سے پہلے بت پرست تھیں انہوں نے یہ نام رکھا ہوگا آنحضرت ﷺ ابھی تک منصب ارشاد پر مامور نہیں ہوئے تھے اس لئے آپ ﷺ نے تعرض نہ فرمایا ہوگا اصل واقعہ یہ ہے کہ یہ روایت فی نفسہ بھی ثابت نہیں اس روایت کا سب سے بڑا ماخذ تاریخ صغیر ہے جو امام بخاری نے تاریخ صغیر میں روایت کیا ہے اس کا پہلا راوی اسمٰعیل ہے جس کا پورا نام اسمٰعیل بن ابی اویس ہے اگرچہ بعض محدثین نے اس کی توثیق کی ہے لیکن اکثر کی رائے حسب ذیل ہے:

معاویہ بن صالح	اسمٰعیل اور اس کا باپ دونوں ضعیف ہیں۔
یحییٰ بن معین	وہ جھوٹ بولتا ہے اور عقل میں ہلکا ہے۔
نسائی	ضعیف اور غیر ثقہ ہے۔
نضر بن سلمہ مروزی	وہ کذاب ہے۔
دارقطنی	میں اس کو صحیح روایت کے لئے پسند نہیں کرتا۔
سیف بن محمد	وہ حدیثیں بناتا ہے۔
سلمہ بن شبیب	مجھ سے اس نے خود اقرار کیا کہ جب کسی بات میں اختلاف ہوتا تھا تو میں ایک حدیث بنا لیتا تھا۔

یہ امر قطعی طور پر ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے نبوت سے پہلے بت پرستی کی برائی شروع کر دی تھی اور جن لوگوں پر آپ کو اعتماد تھا ان کو اس بات سے منع فرماتے تھے [2] (مستدرک حاکم جلد سوم صفحہ ۲)

---

[1] عزیٰ ایک بت کا نام تھا۔

[2] مسٹر مارگولیتھ نے اس کے خلاف ایک حیرت انگیز دعویٰ کیا ہے اور اس کے ثبوت میں جو دلیل دی ہے وہ اس سے زیادہ حیرت انگیز ہے وہ لکھتے ہیں کہ "آنحضرت ﷺ اور خدیجہؓ دونوں سونے سے پہلے ایک بت کی پرستش کیا کرتے تھے جس کا نام عزیٰ تھا" مصنف موصوف نے اس کی سند میں امام احمد بن حنبل کی روایت (جلد ۴ صفحہ ۲۲۲) پیش کی ہے روایت کے الفاظ یہ ہیں۔

﴿حدثني جار لخديجة بنت خويلد انه سمع النبي ﷺ وهو يقول لخديجة اي خديجة والله لا اعبد اللات والعزى والله لا اعبد ابدا قال فتقول خديجة خل اللات خل العزى قال كانت صنمهم التي كانوا يعبدون ثم يضطجعون﴾

"خدیجہ (بنت خویلد) کے ایک ہمسایہ نے بیان کیا کہ میں نے پیغمبر صاحب ﷺ کو حضرت خدیجہؓ سے یہ کہتے سنا کہ اے خدیجہ خدا کی قسم میں لات و عزیٰ کی پرستش نہ کروں گا خدا کی قسم کبھی نہ کروں گا اس پر خدیجہؓ نے کہا چھوڑیئے لات کو چھوڑیئے عزیٰ کو راوی کہتا ہے کہ یہ وہ بت تھے جن کی پرستش اہل عرب سونے سے پہلے کیا کرتے تھے۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ کریں)

جانتے تھے اور توریت و انجیل کے ماہر تھے انہوں نے آنحضرت ﷺ سے واقعہ کی کیفیت سنی تو کہا یہ وہی ناموس ہے جو موسیٰ پر اترا تھا۔

روایت میں ہے کہ آنحضرت ﷺ کو لرزہ پیدا ہوا۔ حضرت خدیجہؓ نے کہا کہ "آپ متردد نہ ہوں خدا آپ کا ساتھ نہ چھوڑے گا" پھر وہ آپ کو ورقہ کے پاس لے گئیں انہوں نے آپ کی نبوت کی تصدیق کی۔

آنحضرت ﷺ کی زبان سے بے شبہ یہ الفاظ نکلے "مجھ کو ڈر ہے" لیکن یہ تردد، ہیبت، یا اضطراب جو کچھ تھا وحی کا اثر (اور نبوت کے بار گراں کی عظمت کا تخیل تھا) آپ نے کیا دیکھا؟ ناموس اعظم نے کیا کہا؟ کیا کیا مشاہدات ہوئے؟ یہ وہ نازک باتیں ہیں جو الفاظ کا تحمل نہیں کر سکتیں۔

صحیح بخاری باب التعبیر میں ہے کہ چند روز تک جب وحی رک گئی تو آنحضرت ﷺ پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ جاتے تھے کہ اپنے آپ کو گرا دیں، دفعتہ حضرت جبریلؑ نظر آتے تھے اور کہتے تھے "اے محمد تم واقعی خدا کے پیغمبر ہو" اس سے آپ کو اس وقت تسکین ہو جاتی تھی لیکن جب پھر وحی کچھ دنوں کے لئے رک جاتی تھی تو پھر آپ کسی پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ جاتے کہ اپنے آپ کو گرا دینا چاہتے تھے اور پھر حضرت جبریلؑ نمایاں ہو کر تسکین دیتے کہ آپ واقعی خدا کے پیغمبر ہیں۔

حافظ ابن حجر نے اس حدیث کے حصہ اول کی شرح میں محققین کا یہ اعتراض نقل کیا ہے کہ "ایک پیغمبر کو نبوت میں کیونکر شک ہو سکتا ہے اور ورقہ کی عیسائی کے تسکین دینے سے کیا تسکین ہو سکتی ہے"۔ پھر ایک مشہور محدث کا یہ جواب نقل کیا ہے کہ "نبوت ایک امر عظیم ہے اس کا تحمل دفعتہ نہیں ہو سکتا اس لئے پہلے آنحضرت ﷺ کو خواب کے ذریعہ سے مانوس کیا گیا پھر جب دفعتہ فرشتہ نظر آیا تو آپ اقتضائے بشریت سے خوف زدہ ہو گئے حضرت خدیجہؓ نے آپ کو تسکین دی پھر جب ورقہ نے تصدیق کی تو آپ کو پورا یقین ہو گیا" محدث مذکور کے الفاظ یہ ہیں

﴿فلما سمع كلامه ايقن بالحق واعترف به﴾

جب آپ نے ورقہ کا کلام سنا تو آپ کو حق کا یقین آ گیا اور آپ نے اس کا اعتراف کیا

محدث مذکور اس کے بعد لکھتے ہیں کہ "وحی بار بار اس لئے رک جاتی تھی کہ آپ رفتہ رفتہ اس کے برداشت کرنے کے قابل ہو جائیں"۔ [1]

لیکن جب کہ ترمذی میں یہ حدیث موجود ہے کہ "نبوت سے پہلے سفر شام میں (بمقام بصریٰ) جس درخت کے نیچے آپ بیٹھے تھے اس کی تمام شاخیں آپ پر جھک آئیں جس سے بحیرا نے آپ کے نبی ہونے کا یقین کیا"۔ صحیح مسلم میں یہ حدیث ہے کہ آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ "میں اس پتھر کو پہچانتا ہوں جو نبوت سے پہلے مجھ کو سلام کیا کرتا تھا"۔ جب کہ صحاح میں موجود ہے کہ "نبوت سے پہلے فرشتوں نے آپ کا سینہ چاک کیا اور نفسانی آلائش نکال کر پھینک دی"۔ تو خود ان روایتوں کے روایت کرنے والے کیونکر کہہ سکتے ہیں کہ فرشتہ کا نظر آنا ایسا واقعہ تھا جس سے آپ اس قدر خوف زدہ ہو جاتے تھے کہ ایک دفعہ تسکین ہو کر بھی بار بار اضطراب ہوتا تھا اور آپ اپنے آپ کو پہاڑ سے گرا دینے کا

[1] فتح الباری شرح صحیح بخاری کتاب التعبیر جلد ۱۲ صفحہ ۳۱۶ مصر۔

دیدار کرتے تھے اور باوجود حضرت جبرائیلؑ کو اطمینان دلانے کی ضرورت ہوئی تھی" یا اور کسی پیغمبر کو بھی ابتدائے وحی میں بھی شک ہوا تھا۔ حضرت موسیٰ نے درخت سے آواز سنی" کہ میں خدا ہوں" تو کیا ان کو کوئی شبہ پیدا ہوا؟

حافظ ابن حجر وغیرہ کی پیروی کرنے کی ہم کو ضرورت نہیں ہم کو پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ خود اصل روایت بہ سند مرفوع متصل ہے یا نہیں؟ یہ روایت امام زہری کے بلاغات میں سے ہے یعنی سند کا سلسلہ زہری تک ختم ہو جاتا ہے اور آگے نہیں بڑھتا، چنانچہ خود شارحین بخاری نے تصریح کر دی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ ایسے عظیم الشان واقعہ کے لئے سند منقطع کافی نہیں۔

آنحضرت ﷺ نے جب فرض نبوت ادا کرنا چاہا تو سخت مشکلیں پیش نظر تھیں اگر آپ کا فرض اسی قدر ہوتا کہ مسیح علیہ السلام کی طرح صرف تبلیغ دعوت پر اکتفا فرمائیں یا حضرت موسیٰؑ کی طرح اپنی قوم کو لے کر مصر سے نکل جائیں تو مشکل نہ تھی۔ لیکن خاتم انبیاء ﷺ کا کام خود سلامت رہ کر عرب، اور نہ صرف عرب بلکہ تمام عالم کو فروغ اسلام سے معمور کر دینا تھا اس لئے نہایت تدبیر اور تدریج سے کام لینا پڑا۔ سب سے پہلا مرحلہ یہ تھا کہ یہ پرخطر راز پہلے کس کے سامنے پیش کیا جائے؟ اس کے لئے صرف وہ لوگ انتخاب کئے جا سکتے تھے جو فیض یاب صحبت رہ چکے تھے جن کو آپ کے اخلاق و عادات کی تمام حرکات و سکنات کا تجربہ ہو چکا تھا، جو پچھلے تجربوں کی بنا پر آپ ﷺ کے صدق دعویٰ کا قطعی فیصلہ کر سکتے تھے۔ یہ لوگ حضرت خدیجہؓ آپ ﷺ کی حرم محترم تھیں۔ حضرت علیؓ تھے جو آپ کی آغوش تربیت میں پلے تھے۔ زیدؓ تھے جو آپ ﷺ کے آزاد کردہ غلام اور بندۂ خاص تھے۔ حضرت ابوبکرؓ تھے جو برسوں سے فیض یاب خدمت تھے۔ سب سے پہلے آپ نے حضرت خدیجہؓ کو یہ پیغام سنایا وہ سننے سے پہلے مومن تھیں۔ پھر اور بزرگوں کی باری آئی اور سب ہمہ تن اعتقاد تھے۔

حضرت ابوبکرؓ دولتمند، صاحب اثر، صاحب الرائے اور فیاض تھے ابن سعد نے لکھا ہے کہ جب وہ ایمان لائے تو ان کے پاس چالیس ہزار درہم تھے۔ قریش ان اوصاف کی وجہ سے مکہ میں ان کا عام اثر تھا اور معززین شہر ان سے ہر بات میں مشورہ لیتے تھے ارباب روایت کا بیان ہے کہ اکابر صحابہؓ میں سے حضرت عثمانؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ فاتح ایران، حضرت طلحہؓ سب انہی کی ترغیب اور ہدایت سے اسلام لائے۔[2] ان کی وجہ سے یہ چرچا چپکے چپکے اور لوگوں میں بھی پھیلا اور مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا ان سابقین اولین میں عمارؓ، خبابؓ بن الارتؓ، حضرت عثمانؓ، عبدالرحمن بن عوفؓ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، طلحہؓ، ارقمؓ، سعید بن زیدؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، عثمان بن مظعونؓ، عبیدہؓ اور صہیبؓ رومی زیادہ ممتاز ہیں۔

لیکن جو کچھ ہوا پوشیدہ طور پر ہوا۔ نہایت احتیاط کی جاتی تھی کہ محرمان خاص کے سوا کسی کو خبر نہ ہونے پائے جب نماز کا وقت آتا تو آنحضرت کسی پہاڑ کی گھاٹی میں چلے جاتے اور وہیں نماز ادا کرتے۔ ابن الاثیر کا بیان ہے کہ چاشت کی نماز آپ ﷺ حرم ہی میں ادا کرتے تھے کیونکہ یہ نماز قریش کے مذہب میں بھی جائز تھی۔[3] ایک دفعہ آپ ﷺ

۱۔ ما بعد اول حصہ میں ان مصنفین کا ذکر [illegible] کیا ہے

۲۔ دیکھو ابن سعد تذکرہ طلحہ طبع مصر جلد ۳۔

۳۔ کامل ابن اثیر ذکر دعوت فصل اول من اسلم۔

کر سب لوگ جن میں ابولہب آپ کا چچا بھی تھا سخت برہم ہو کر اٹھ چلے گئے۔

چند روز کے بعد آپ نے حضرت علیؓ سے کہا کہ دعوت کا سامان کرو۔ یہ درحقیقت تبلیغ اسلام کا پہلا موقع تھا تمام خاندان عبدالمطلب مدعو کیا گیا۔ حمزہؓ، ابوطالب، عباسؓ سب شریک تھے۔ آنحضرت ﷺ نے کھانے کے بعد کھڑے ہو کر فرمایا: "میں وہ چیز لے کر آیا ہوں جو دین اور دنیا دونوں کی کفیل ہے۔ اس بار گراں کے اٹھانے میں کون میرا ساتھ دے گا؟" تمام مجلس میں سناٹا تھا۔ دفعۃً حضرت علیؓ نے اٹھ کر کہا: "گو مجھ کو آشوب چشم ہے، گو میری ٹانگیں پتلی ہیں اور گو میں سب سے نوعمر ہوں تاہم میں آپ کا ساتھ دوں گا۔"[1]

قریش کے لئے یہ ایک حیرت انگیز منظر تھا کہ دو شخص (جن میں ایک سیزدہ سالہ نوجوان ہے) دنیا کی قسمت کا فیصلہ کر رہے ہیں۔ حاضرین کو بے ساختہ ہنسی آ گئی لیکن آگے چل کر زمانہ نے بتایا کہ یہ سرتاپا سچ تھا۔

اب مسلمانوں کی ایک معتد بہ جماعت تیار ہو گئی تھی جن کی تعداد چالیس سے زیادہ تھی۔ آپ نے حرم کعبہ میں جا کر توحید کا اعلان کیا۔ کفار کے نزدیک یہ حرم کی سب سے بڑی توہین تھی اس لئے دفعۃً ایک ہنگامہ برپا ہو گیا اور ہر طرف سے لوگ آپ پر ٹوٹ پڑے۔ آنحضرت ﷺ کے ربیب حضرت حارث بن ابی ہالہ گھر میں تھے، ان کو خبر ہوئی، دوڑے ہوئے آئے اور آنحضرت ﷺ کو بچانا چاہا، لیکن ہر طرف سے ان پر تلواریں پڑیں اور وہ شہید ہو گئے۔ اسلام کی راہ میں یہ پہلا خون تھا جس سے زمین رنگین ہوئی۔[2]

قریش کی مخالفت اور اس کے اسباب:

مکہ کی جو عزت تھی کعبہ کی وجہ سے تھی۔ قریش کا خاندان جو تمام عرب پر مذہبی حکومت رکھتا تھا اور جس کی وجہ سے وہ تمام عرب میں ممتاز تھا بلکہ اہل اللہ یعنی خاندان الٰہی کہلاتے تھے، اس کی صرف یہ وجہ تھی کہ وہ کعبہ کے مجاور اور کلید بردار تھے۔ اس تعلق سے قریش کا کاروبار زیادہ پھیلتا گیا۔ یہاں تک کہ متعدد محکمے اور جداجدا مناصب قائم کئے گئے جن کی تفصیل یہ ہے:[3]

منصب	منصب کی تفصیل	کس خاندان کو کون سا منصب حاصل تھا	آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں کون لوگ ان مناصب پر ممتاز تھے
حجابہ	کعبہ کی کلید برداری اور تولیت		عثمان بن طلحہؓ
رفادہ	غریب حجاج کی خبر گیری	خاندان نوفل	حارث بن عامر
سقایہ	حجاج کے پانی پلانے کا انتظام	خاندان ہاشم	حضرت عباسؓ
مشورہ		خاندان اسد	یزید بن زمعہ بن الاسود

[1] طبری نے تاریخ جلد ۳ صفحہ ۱۱۷۱ اور تفسیر جلد ۱۹ صفحہ ۶۸ میں عبدالغفار بن قاسم اور منہال بن عمرو کے واسطہ سے اس کو روایت کیا ہے۔ پہلا شخص بالکل متروک ہے اور دوسرا مرتبہ میں کم ہے اس لئے یہ روایت میں زور کی حد تک ضعیف بلکہ مجروح ہے۔

[2] اصابہ فی احوال الصحابہ، ذکر حارث بن ابی ہالہ۔

[3] یہ تمام تفصیل عقد الفرید جلد دوم صفحہ ۱۲۱ میں ہے۔

دوسرا سبب:

اسلام کا اصلی فرض اس طلسم کو دفعۃً برباد کر دینا تھا لیکن اس کے ساتھ قریش کی عظمت و اقتدار اور وسیع اثر کا بھی خاتمہ تھا، اس لئے قریش نے شدت سے مخالفت کی، ان میں جن لوگوں کو جس قدر زیادہ نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا، اسی قدر مخالفت میں زیادہ سرگرم تھے۔

قریش کا رئیس اعظم حرب بن امیہ تھا، چنانچہ حرب فجار میں وہی سپہ سالار اعظم تھا۔ لیکن حرب کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا ابوسفیان اس منصب عظیم کے حاصل کرنے کی قابلیت نہیں رکھتا تھا، اس لئے ولید بن المغیرہ نے اپنی لیاقت اور اثر سے ریاست حاصل کی، ابوجہل اس کا بھتیجا تھا اور وہ بھی قریش میں امتیاز رکھتا تھا۔

ابوسفیان گو اپنے باپ کا منصب نہ حاصل کر سکا لیکن بنو امیہ کے خاندان کا سردار وہی تھا۔ خاندان ہاشم میں سب سے زیادہ کبیرالسن ابولہب تھا، جو رسول اللہ ﷺ کا حقیقی چچا تھا۔

قبیلہ سہم میں سب سے زیادہ با اثر عاص بن وائل تھا جو نہایت دولت مند اور کثیر الاولاد تھا۔

قریش کی عنان حکومت انہی رؤساء کے ہاتھ میں تھی، اور یہی لوگ تھے جنہوں نے اسلام کی سخت مخالفت کی۔ قریش کے اور اکابر مثلاً اسود بن مطلب، اسود بن عبد یغوث، نضر بن الحارث، امیہ بن خلف، عقبہ بن ابی معیط انہی لوگوں کے زیر اثر تھے اور اس وجہ سے اعدائے اسلام میں ان کے نام ہر جگہ نمایاں نظر آتے ہیں۔

قریش کا یہ خیال تھا کہ نبوت کا منصب اعظم اگر کسی کو ملتا تو مکہ یا طائف کے کسی رئیس کو ملتا۔

﴿وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ هَٰذَا الْقُرْآنُ عَلَىٰ رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيمٍ﴾ (زخرف ۳۱)

وہ لوگ کہتے ہیں کہ قرآن اگر اترنا تھا تو ان دو شہروں (مکہ و طائف) میں سے کسی رئیس اعظم پر اترتا (یعنی ولید بن مغیرہ یا ابو مسعود ثقفی)

عرب میں ریاست کے لئے دولت اور اولاد سب سے پہلی اور سب سے ضروری شرط تھی، اولاد کی نسبت اکثر وحشی قوموں میں (ہندوستان میں بھی) یہ خیال رہا ہے کہ جو شخص صاحب اولاد نہ ہو وہ عاقبت کی برکات سے محروم رہتا ہے ہندوؤں میں بھی یہ خیال ہے کہ اولاد کے بغیر انسان کو پوری نجات نہیں مل سکتی

قریش میں اوصاف مذکورہ کے لحاظ سے جو لوگ ریاست کا استحقاق رکھتے تھے وہ ولید بن المغیرہ، امیہ بن خلف، عاص بن وائل سہمی اور ابو مسعود ثقفی تھے۔ رسول اللہ ﷺ ان اوصاف سے بالکل خالی تھے، دولت کے اعتبار سے آپ کا دامن پاک تھا اور اولاد ذکور سال دو سال سے زیادہ زندہ نہیں رہی۔

تیسرا سبب:

قریش کو عیسائیوں سے بالطبع نفرت تھی جس کی وجہ یہ تھی کہ ابرہۃ الاشرم (بادشاہ حبش) جو کعبہ کے ڈھانے کو آیا تھا عیسائی تھا، یہی وجہ تھی کہ قریش عیسائیوں کے مقابلہ میں پارسیوں کو زیادہ پسند کرتے تھے، ایران و روم کی جنگ میں ایرانیوں کو فتح ہوئی تو قریش نے نہایت خوشی کا اظہار کیا اور مسلمان غمزدہ ہوئے، چنانچہ یہ آیت اتری

﴿غُلِبَتِ الرُّومُ فِي أَدْنَى الْأَرْضِ وَهُم مِّن بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُونَ فِي بِضْعِ سِنِينَ لِلَّهِ الْأَمْرُ﴾

مِنْ قَبْلُ وَمِنْ بَعْدُ وَيَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُونَ بِنَصْرِ اللّٰهِ ﴿روم: ۱﴾

قریب کے ملک میں رومی مغلوب ہو گئے لیکن یہ لوگ مغلوب ہونے کے بعد چند سال میں پھر غالب آ جائیں گے خدا ہی کو اختیار ہے پہلے بھی اور پیچھے بھی اور تب مسلمان خدا کی مدد سے خوش ہو جائیں گے۔

اسلام اور نصرانیت میں بہت سی باتیں مشترک تھیں سب سے بڑھ کر یہ کہ اس زمانہ میں اسلام کا قبلہ بیت المقدس تھا اور مدینہ منورہ میں بھی ایک مدت تک یہی قبلہ رہا‘ ان اسباب سے قریش کو خیال ہوا کہ آنحضرت ﷺ عیسائیت قائم کرنا چاہتے ہیں۔

چوتھا سبب:

ایک بڑا سبب قبائل کی خاندانی رقابت تھی۔ قریش میں دو قبیلے نہایت ممتاز اور حریف یک دگر تھے بنو ہاشم و بنو امیہ عبدالمطلب نے اپنے زور و اثر سے بنو ہاشم کا پلہ بھاری کر دیا تھا۔ لیکن ان کے بعد اس خاندان میں کوئی صاحب اثر نہیں پیدا ہوا ابو طالب دولت مند نہ تھے عباس دولت مند تھے لیکن فیاض نہ تھے ابولہب بدچلن تھا اس پر بنو امیہ کا اقتدار بڑھتا جاتا تھا۔ آنحضرت ﷺ کی نبوت کو خاندان بنو امیہ اپنے رقیب (ہاشم) کی فتح خیال کرتا تھا اس لئے سب سے زیادہ اسی قبیلہ نے آنحضرت ﷺ کی مخالفت کی‘ بدر کے سوا باقی تمام لڑائیاں ابوسفیان ہی نے برپا کیں اور وہی ان لڑائیوں میں رئیس لشکر رہا۔

عقبہ بن ابی معیط جو سب سے زیادہ آنحضرت ﷺ کا دشمن تھا اور جس نے نماز پڑھنے کی حالت میں آپ کے دوش مبارک پر نجاست کی اوجھ لا کر ڈالی تھی (اموی تھا) بنو امیہ کے بعد جس قبیلہ کو بنو ہاشم کی برابری کا دعویٰ تھا وہ بنو مخزوم تھے ولید بن المغیرہ وہی خاندان کا رئیس تھا اس لئے اس قبیلہ نے بھی آنحضرت ﷺ کی سخت مخالفت کی۔ ابوجہل کی ایک تقریر سے اس بیان کی پوری تصدیق ہوتی ہے‘ ایک دفعہ اخنس بن شریق‘ ابوجہل کے پاس گیا اور کہا کہ ’’محمد کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟‘‘ ابوجہل نے کہا ہم اور بنو عبد مناف (یعنی آل ہاشم) ہمیشہ حریف مقابل رہے انہوں نے مہمان داریاں کیں تو ہم نے بھی کیں انہوں نے خون بہا دیئے تو ہم نے بھی دیئے انہوں نے فیاضیاں کیں تو ہم نے ان سے بڑھ کر کیں یہاں تک کہ جب ہم نے ان کے کاندھے سے کاندھا ملا دیا تو اب بنو ہاشم پیغمبری کے دعویدار ہیں خدا کی قسم ہم اس پیغمبر پر کبھی ایمان نہیں لا سکتے۔[1]

پانچواں سبب:

ایک بڑا سبب یہ تھا کہ قریش میں سخت بداخلاقیاں پھیلی ہوئی تھیں‘ بڑے بڑے ارباب اقتدار نہایت ذلیل بداخلاقیوں کے مرتکب تھے ابولہب جو خاندان ہاشم میں سب سے زیادہ ممتاز تھا اس نے حرم محترم کے خزانہ سے غزال زریں چرا کر بیچ ڈالا تھا[2] اخنس بن شریق جو خاندان بنو زہرہ کا حلیف اور روسائے عرب میں شمار کیا جاتا تھا نمام اور کذاب تھا‘

[1] ابن ہشام صفحہ ۱۰۸ مطبوعہ مصر

[2] حرم میں ایک سونے کا ہرن مدت سے خزانہ میں محفوظ تھا ابولہب نے چرا کر فروخت کر دیا یہ واقعہ معتبر کتابوں میں مذکور ہے ابن قتیبہ نے بھی معارف میں اس کا ذکر کیا ہے۔

بچے تھے اور حرب فجار کے بعد اس قدر رہا جا تا گئے تھے کہ لڑائی کے نام سے ڈرتے تھے۔ قبیلہ پرستی کی وجہ سے لڑائی صرف اتنی سی بات پر شروع ہو جاتی تھی کہ کسی قبیلہ کا کوئی آدمی قتل کر دیا جائے' مقتول کا قبیلہ خود کسی تحقیق کے انتقام کے لئے لڑتا ہوتا تھا اور جب تک بدلا نہ لے لیا جائے نیا ک جھگڑا ختم نہیں ہوتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے قتل پر آمادہ ہوتا قریش کے لئے نہایت آسان تھا لیکن وہ سمجھتے تھے کہ بنو ہاشم خون کا انتقام نہ چھوڑیں گے اور پھر سلسلہ بہ سلسلہ تمام مکہ جنگ میں مبتلا ہو جائے گا' بہت سے لوگ اسلام لا چکے تھے اور قریش کوئی قبیلہ یا بنو ہاشم سے خالی نہ تھا جس میں دو ایک شخص اسلام نہ لا چکے ہوں' اس لئے اسلام اگر جرم تھا تو صرف ایک شخص اس کا مجرم نہ تھا' بلکہ سینکڑوں تھے اور سب کا استیصال کرنا ممکن نہ تھا۔

رؤسائے قریش میں متعدد ایسے تھے جو شریف النفس تھے وہ بد نفسی کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے خیال میں نیک نیتی کی بنا پر مخالفت کرتے تھے' اس بنا پر وہ چاہتے تھے کہ معاملہ صلح و آشتی [1] سے طے ہو جائے۔

غرض جب آنحضرت ﷺ نے اعلان دعوت کیا اور بت پرستی کی علانیہ مذمت شروع کی تو قریش کے چند معززوں نے ابو طالب سے آ کر شکایت کی' ابو طالب نے نرمی سے سمجھا کر رخصت کر دیا۔ لیکن چونکہ بنائے نزاع قائم تھی یعنی آنحضرت ﷺ ادائے فرض سے باز نہ آ سکتے تھے' اس لئے یہ سفارت دوبارہ ابو طالب کے پاس آئی' اس میں تمام رؤسائے قریش یعنی عتبہ بن ربیعہ' شیبہ' ابو سفیان' عاص بن ہشام' ابو جہل' ولید بن مغیرہ' عاص بن وائل وغیرہ شریک تھے' ان لوگوں نے ابو طالب سے کہا کہ تمہارا بھتیجا ہمارے معبودوں کی توہین کرتا ہے' ہمارے آبا و اجداد کو گمراہ کہتا ہے' ہم کو احمق ٹھہراتا ہے' اس لئے یا تو تم بیچ میں سے ہٹ جاؤ یا تم بھی میدان میں آؤ کہ ہم دونوں میں سے ایک کا فیصلہ ہو جائے۔ ابو طالب نے دیکھا کہ اب حالت نازک ہو گئی ہے' قریش اب تحمل نہیں کر سکتے اور میں تنہا قریش کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ آنحضرت ﷺ سے مختصر لفظوں میں کہا کہ "جان عم! مجھ پر اتنا بار نہ ڈال کہ میں اٹھا نہ سکوں"۔ رسول اللہ ﷺ کی ظاہری پشت و پناہ جو کچھ تھے ابو طالب تھے' آنحضرت ﷺ نے دیکھا کہ اب ان کے پائے ثبات میں بھی لغزش ہے' آپ نے آبدیدہ ہو کر فرمایا "خدا کی قسم اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ میں سورج اور دوسرے میں چاند لا کر دے دیں' تب بھی میں اپنے فرض سے باز نہ آؤں گا' خدا اس کام کو پورا کرے گا یا میں خود اس پر نثار ہو جاؤں گا"۔ آپ کی پر اثر آواز نے ابو طالب کو سخت متاثر کیا' رسول اللہ ﷺ سے کہا "جا! کوئی شخص تیرا بال بیکا [2] نہیں کر سکتا"۔

آنحضرت ﷺ بدستور دعوت اسلام میں مصروف ہوئے' قریش اگرچہ آنحضرت ﷺ کے قتل کا ارادہ نہ کر سکے' لیکن طرح طرح کی اذیتیں دیتے تھے' راہ میں کانٹے بچھاتے تھے' نماز پڑھتے میں جسم مبارک پر نجاست ڈال دیتے تھے' بد زبانیاں کرتے تھے' ایک دفعہ آپ حرم میں نماز پڑھ رہے تھے' عقبہ بن ابی معیط نے آپ کے گلے میں چادر لپیٹ کر اس زور سے کھینچی کہ آپ گھٹنوں کے بل گر پڑے' قریش متحیر تھے کہ آپ یہ سب سختیاں کیوں جھیلتے ہیں۔ انسانی دماغ اتنی سخت کوشی اور جانبازی کا مقصد جاہ و دولت اور نام و نمود کی خواہش کے سوا اور کیا کر سکتا ہے' قریش نے بھی یہی خیال کیا۔ اس بنا پر عتبہ بن ربیعہ قریش کی طرف سے آنحضرت ﷺ کے پاس آیا اور کہا "محمد! کیا چاہتے ہو؟ کیا مکہ کی ریاست؟

---

[1] یہ آیت ابو طالب ہی جیسے لوگوں کی شان میں ہے۔ وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْأَوْنَ عَنْهُ یعنی آنحضرت ﷺ کی ایذا رسانی سے لوگوں کو منع کرتے تھے لیکن آپ کے ہمراہ نے ہجرت سے دور بھاگتے تھے"۔ صحابہ اکرام ابو طالب وغیرہ عبدالرزاق" ک"

[2] ابن ہشام صفحہ ۱۴۸۔ ابو جعفر طبری نے بھی تاریخ میں یہ واقعہ اختصار کے ساتھ نقل کیا ہے۔

یا کسی بڑے گھرانے میں شادی؟ کیا دولت کا ذخیرہ؟ ہم یہ سب کچھ مہیا کر سکتے ہیں اور اس پر بھی راضی ہیں کہ کل مکہ تمہارا زیر فرمان ہو جائے لیکن ان باتوں سے باز آؤ"۔

عتبہ کو اس درخواست کی کامیابی کا پورا یقین تھا لیکن ان سب ترغیبات کے جواب میں آپ ﷺ نے قرآن مجید کی چند آیتیں پڑھیں۔

﴿قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ أَنَّمَا إِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ فَاسْتَقِيمُوا إِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوهُ﴾ (حم السجدہ: ۶)

اے محمد کہہ دے کہ میں تمہیں جیسا آدمی ہوں، مجھ پر وحی آتی ہے کہ تمہارا خدا بس ایک خدا ہے، بس سیدھے اسی کی طرف جاؤ اور اسی سے معافی مانگو۔

﴿قُلْ أَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُونَ بِالَّذِي خَلَقَ الْأَرْضَ فِي يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُونَ لَهُ أَندَادًا ذَٰلِكَ رَبُّ الْعَالَمِينَ﴾ (حم السجدہ: ۹)

اے محمد کہہ دے کہ کیا تم لوگ خدا کا انکار کرتے ہو جس نے دو دن میں یہ زمین پیدا کی اور تم خدا کے شریک قرار دیتے ہو، وہی سارے جہان کا پروردگار ہے۔

عتبہ واپس گیا تو وہ عتبہ نہ تھا، اس نے قریش سے جا کر کہہ دیا کہ محمد جو کلام پیش کرتے ہیں وہ شاعری نہیں، کوئی اور چیز ہے، میری رائے یہ ہے کہ تم ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو، اگر وہ کامیاب ہو کر عرب پر غالب آ جائیں گے تو یہ تمہاری ہی عزت ہے ورنہ عرب ان کو خود فنا کر دے گا، لیکن قریش نے یہ رائے نامنظور کی۔

حضرت حمزہؓ اور عمرؓ کا اسلام ۶ نبوی

آنحضرت ﷺ کے اعمام میں سے حضرت حمزہؓ کو آپ سے خاص محبت تھی، وہ آپ سے صرف دو تین برس بڑے تھے اور ساتھ کے کھیلے تھے، دونوں نے ثویبہ کا دودھ پیا تھا اور اس رشتہ سے بھائی بھائی تھے، وہ ابھی تک اسلام نہیں لائے تھے لیکن آپ کی ہر ادا کو محبت کی نظر سے دیکھتے تھے، ان کا مذاق طبیعت سپاہگری اور شکار افگنی تھا، معمول تھا کہ منہ اندھیرے تیر کمان لے کر نکل جاتے، دن دن بھر شکار میں مصروف رہتے، شام کو واپس آتے تو پہلے حرم میں جاتے، طواف کرتے، قریش کے رؤسا صحن حرم میں الگ الگ دربار جما کر بیٹھا کرتے تھے، حضرت حمزہؓ ان لوگوں سے صاحب سلامت کرتے، کبھی کبھی کسی کے پاس بیٹھ جاتے، اس طریقہ سے سب سے یارانہ تھا اور سب لوگ ان کی قدر و منزلت کرتے تھے۔

آنحضرت ﷺ کے ساتھ کفار جس بے دردی سے پیش آتے تھے بیگانوں سے بھی دیکھا نہ جا سکتا تھا، ایک دن ابو جہل نے روبرو آپ کے ساتھ نہایت سخت گستاخیں کیں، ایک کنیز دیکھ رہی تھی، حضرت حمزہؓ شکار سے آئے تو اس نے تمام ماجرا کہا۔ حضرت حمزہؓ غصہ سے بے تاب ہو گئے، تیر و کمان ہاتھ میں لئے حرم میں آئے اور ابو جہل سے کہا "میں مسلمان ہو گیا ہوں"۔

آنحضرت ﷺ کے جوش حمایت میں انہوں نے اسلام کا اظہار تو کر دیا لیکن گھر پر آئے تو متردد تھے کہ آبائی

دین کو دفعتہ کیونکر چھوڑ دوں، تمام دن سوچتے رہے بالآخر غور و فکر کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ دین حق یہی ہے۔ ۱؎ دو ہی چار روز کے بعد حضرت عمرؓ بھی اسلام لائے۔

حضرت عمرؓ کا ستائیسواں ۲؎ سال تھا کہ آفتاب رسالت طلوع ہوا یعنی رسول اللہ ﷺ مبعوث ہوئے حضرت عمرؓ کے گھرانے میں زیدؓ کی وجہ سے توحید کی آواز نامانوس نہیں رہی تھی چنانچہ سب سے پہلے زید کے بیٹے سعیدؓ اسلام لائے۔ حضرت سعیدؓ کا نکاح حضرت عمرؓ کی بہن فاطمہؓ سے ہوا تھا اس تعلق سے فاطمہؓ بھی مسلمان ہو گئیں اسی خاندان میں ایک اور معزز شخص نعیم بن عبداللہؓ نے بھی اسلام قبول کر لیا تھا لیکن حضرت عمرؓ ابھی تک اسلام سے بیگانہ تھے ان کے کانوں میں جب یہ صدا پہنچی تو سخت برہم ہوئے یہاں تک کہ قبیلہ میں جو لوگ اسلام لا چکے تھے ان کے دشمن بن گئے لبینہؓ ان کے خاندان کی کنیز تھی جس نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ اس کو بے تحاشا مارتے اور مارتے مارتے تھک جاتے تو کہتے کہ "دم لے لوں تو پھر ماروں گا" لبینہ کے سوا اور جس جس پر قابو چلتا تھا زدوکوب سے دریغ نہیں کرتے تھے لیکن اسلام کا نشہ ایسا تھا کہ جس کو چڑھ جاتا تھا اترتا نہ تھا ان تمام سختیوں پر ایک شخص کو بھی وہ اسلام سے بددل نہ کر سکے۔ آخر مجبور ہو کر (نعوذ باللہ) خود ذات نبوی کے قتل کا ارادہ کیا تلوار کمر سے لگا سیدھے رسول اللہ ﷺ کی طرف چلے کارکنان قضا نے کہا۔

ع آمد آں یارے کہ ما می خواستیم

راہ میں اتفاقاً نعیم بن عبداللہؓ مل گئے انہوں نے تیور دیکھ کر پوچھا خیر ہے؟ بولے کہ محمد کا فیصلہ کرنے جاتا ہوں انہوں نے کہا "پہلے اپنے گھر کی خبر لو تمہارے بہن اور بہنوئی اسلام لا چکے ہیں" فوراً پلٹے اور بہن کے ہاں پہنچے وہ قرآن پڑھ رہی تھیں ان کی آہٹ پا کر چپ ہو گئیں اور قرآن کے اجزا چھپا لئے لیکن آواز ان کے کانوں میں پڑ چکی تھی بہن سے پوچھا یہ کیا آواز تھی؟ بولیں کچھ نہیں انہوں نے کہا میں سن چکا ہوں تم دونوں مرتد ہو گئے ہو یہ کہہ کر بہنوئی سے دست و گریباں ہو گئے اور جب ان کی بہن بچانے کو آئیں تو ان کی بھی خبر لی یہاں تک کہ ان کا جسم لہولہان ہو گیا۔ لیکن اسلام کی محبت اس سے بالاتر تھی بولیں کہ "عمر جو بن آئے کرو لیکن اسلام اب دل سے نکل نہیں سکتا" ان الفاظ نے حضرت عمرؓ کے دل پر خاص اثر کیا بہن کی طرف محبت کی نگاہ سے دیکھا ان کے جسم سے خون جاری تھا دیکھ کر اور بھی رقت ہوئی فرمایا تم لوگ جو پڑھ رہے تھے مجھ کو بھی سناؤ فاطمہؓ نے قرآن کے اجزا لا کر سامنے رکھ دیئے اٹھا کر دیکھا تو یہ سورۃ تھی

﴿سَبَّحَ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾ (الحدید: ۱)

زمین و آسمان میں جو کچھ ہے خدا کی تسبیح پڑھتا ہے اور وہ غالب اور حکمت والا ہے۔

۱؎ [illegible]

۲؎ [illegible]

ایک ایک لفظ پر ان کا دل مرعوب ہوتا جاتا تھا، یہاں تک کہ جب اس آیت پر پہنچے

﴿ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ﴾ (حدید)

خدا پر اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ۔

تو بے اختیار پکار اٹھے کہ

﴿ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ ﴾

میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی خدا نہیں اور یہ کہ محمد خدا کے پیغمبر ہیں۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ ارقمؓ کے مکان میں جو کوہ صفا کی تلی میں واقع تھا، پناہ گزین تھے۔ حضرت عمرؓ نے آستانہ مبارک پر پہنچ کر دستک دی چونکہ شمشیر بکف گئے تھے صحابہؓ کو تردد ہوا لیکن حضرت امیر حمزہؓ نے کہا "آنے دو، مخلصانہ آیا ہے تو بہتر ہے ورنہ اسی کی تلوار سے اس کا سر قلم کر دوں گا"۔ حضرت عمرؓ نے اندر قدم رکھا تو رسول اللہ ﷺ خود آگے بڑھے اور ان کا دامن پکڑ کے فرمایا "کیوں عمر کس ارادہ سے آیا ہے؟" نبوت کی پر جلال آواز نے ان کو کپکپا دیا، نہایت خضوع کے ساتھ عرض کیا "ایمان لانے کے لئے" آنحضرت ﷺ بے ساختہ اللہ اکبر پکار اٹھے اور ساتھ ہی تمام صحابہؓ نے مل کر اس زور سے اللہ اکبر کا نعرہ مارا کہ مکہ کی تمام پہاڑیاں گونج اٹھیں۔[1]

حضرت عمرؓ کے ایمان لانے سے اسلام کی تاریخ میں نیا دور پیدا ہو گیا، اس وقت تک اگرچہ چالیس پچاس آدمی اسلام لا چکے تھے، عرب کے مشہور بہادر حضرت حمزہ سید الشہداءؓ نے بھی اسلام قبول کر لیا تھا، تاہم مسلمان اپنے فرائض مذہبی علانیہ نہیں ادا کر سکتے تھے اور کعبہ میں نماز پڑھنا تو بالکل ناممکن تھا، حضرت عمرؓ کے اسلام کے ساتھ دفعتہً یہ حالت بدل گئی، انہوں نے علانیہ اسلام ظاہر کیا، کافروں نے اول اول بڑی شدت کی لیکن وہ ثابت قدمی سے مقابلہ کرتے رہے، یہاں تک کہ مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ کعبہ میں جا کر نماز ادا کی۔ ابن ہشام نے اس واقعہ کو عبداللہ بن مسعودؓ کی زبانی ان الفاظ میں روایت کیا ہے۔

﴿ فلما اسلم عمر قاتل قريشاً حتى صلّى عند الكعبة وصلينا معه ﴾

جب عمرؓ اسلام لائے تو قریش سے لڑے یہاں تک کہ کعبہ میں نماز پڑھی اور ان کے ساتھ ہم لوگوں نے بھی پڑھی۔

صحیح بخاری میں ہے کہ جب حضرت عمرؓ اسلام لائے تو ایک ہنگامہ برپا ہو گیا، اتفاق سے عاص بن وائل آ نکلا، اس نے پوچھا کیا ہنگامہ ہے، لوگوں نے کہا عمر مرتد ہو گئے، عاص بن وائل نے کہا "تو خیر میں نے عمر کو پناہ دی"

تعذیب مسلمین

رسوخ، عزم، قوت ارادہ، شدت عمل انسان کے اصلی جوہر ہیں اور داد کے قابل ہیں، لیکن انہی اوصاف کا رخ جب بدل جاتا ہے تو وہ سخت دلی، بے دردی، درندگی اور سفاکی کا مہیب قالب اختیار کر لیتے ہیں۔ اسلام جب آہستہ آہستہ پھیلنا شروع ہوا اور رسول اللہ ﷺ اور اکابر صحابہؓ کو ان کے قبیلوں نے اپنے حصار حفاظت میں لے لیا تو قریش کا غیظ و غضب ہر

---

[1] انساب الاشراف بلاذری، طبقات ابن سعد، اسد الغابہ، ابن عساکر عن علی بن ابی طالبؓ۔

صرف بے کس غریبوں پر ٹوٹا جن کا کوئی یار و مددگار نہ تھا، ان میں کچھ غلام اور کنیزیں تھیں، کچھ غریب الوطن تھے جو وہ ایک پشت سے مکہ میں آ رہے تھے اور کچھ کمزور قبیلوں کے آدمی تھے جو کسی قسم کی عظمت و اقتدار نہیں رکھتے تھے، قریش نے ان کو اس طرح ستانا شروع کیا کہ جور و ستم کی تاریخ میں اس کی مثال پیدا کرنا قریش کی یکتائی کی تحقیر ہے۔

یہ آسان تھا کہ مسلمانوں کے خس و خاشاک سے سرزمین عرب دفعتاً پاک کر دی جاتی، لیکن قریش کا نشہ انتقام اس سے نہیں اتر سکتا تھا، مسلمان اگر اپنے مذہب پر ثابت قدم ہو کر ہلاک کر دیے جاتے تو اس میں جس قدر قریش کی تعریف نکلتی، اس سے زیادہ ان بیکسوں کا صبر و استقلال داد طلب ہوتا، قریش کی شان اس وقت قائم رہ سکتی تھی جب یہ لوگ جادۂ اسلام سے پھر کر پھر قریش کے مذہب میں آ جاتے یا شاید ان کو مسلمانوں کی سخت جانی کا امتحان لینا بھی اس کی بدولت منظور تھا۔

قریش میں ایسے لوگ بھی تھے جن کا دل واقعی اس حالت پر جلتا تھا کہ ان کا مذہب کا بنا بنایا کارخانہ درہم برہم ہوا جاتا ہے، ان کے آباؤ اجداد کی تحقیر کی جاتی ہے، قابل احترام معبودوں کی عظمت مٹی جاتی ہے، یہ لوگ صرف حسرت و افسوس کر کے رہ جاتے تھے اور کہتے تھے کہ چند نوجوانوں کے دماغ میں خلل آ گیا ہے۔ عتبہ، عاص بن وائل وغیرہ اسی قسم کے لوگ تھے لیکن ابوجہل، امیہ بن خلف وغیرہ کا معیار اس سے زیادہ بلند تھا۔

مسلمانوں پر ظلم کے طریقے:

بہرحال قریش نے جو ظلم کے عبرت ناک طریقے شروع کئے جب ٹھیک دوپہر ہو جاتی تو وہ غریب مسلمانوں کو پکڑتے، عرب کی تیز دھوپ، ریتلی زمین کو دوپہر کے وقت جلتا توا بنا دیتی ہے، وہاں ان غریبوں کو لٹا دیتے، چھاتی پر بھاری پتھر رکھ دیتے کہ کروٹ نہ بدلنے پائیں، بدن پر گرم بالو بچھاتے، لوہے کو آگ پر گرم کر کے اس سے داغتے، پانی میں ڈبکیاں دیتے۔[1] یہ مصیبتیں اگرچہ تمام بیکس مسلمانوں پر عام تھیں لیکن ان میں جن لوگوں پر قریش زیادہ مہربان تھے ان کے نام یہ ہیں:

حضرت خبابؓ بن الارت، تمیم کے قبیلہ سے تھے، جاہلیت میں غلام بنا کر فروخت کر دیے گئے تھے۔ ام انمار نے خرید لیا تھا، یہ اس زمانہ میں اسلام لائے جب آنحضرت ﷺ ارقمؓ کے گھر میں مقیم تھے اور صرف چھ سات شخص اسلام لا چکے تھے۔ قریش نے ان کو طرح طرح کی تکلیفیں دیں، ایک دن کوئلے جلا کر زمین پر بچھائے، اس پر چت لٹایا، ایک شخص چھاتی پر پاؤں رکھے رہا کہ کروٹ نہ بدلنے پائیں، یہاں تک کہ کوئلے پیٹھ کے نیچے پڑے پڑے ٹھنڈے ہو گئے، خبابؓ نے مدتوں کے بعد جب یہ واقعہ حضرت عمرؓ کے سامنے بیان کیا تو پیٹھ کھول کر دکھائی کہ برص کے داغ کی طرح بالکل سپید تھی۔[2] حضرت خبابؓ جاہلیت میں لوہاری کا کام کرتے تھے، اسلام لائے تو بعض لوگوں کے ذمہ ان کا بقایا تھا، مانگتے تو جواب ملتا جب تک محمد کا انکار نہ کرو گے ایک کوڑی نہ ملے گی، یہ کہتے کہ نہیں جب تک تم مر کر پھر جی اٹھو۔[3]

۱۔ یہ واقعات ابن سعد نے بلالؓ و صہیبؓ کے حال میں بہ تفصیل لکھے ہیں۔ دیکھو کتاب مذکور جلد ۳ تذکرہ عمارؓ و بلالؓ۔

۲۔ طبقات ابن سعد جلد ۳ تذکرہ خبابؓ۔

۳۔ صحیح بخاری صفحہ ۲۸۹ جلد ۱

"میں نے تجھ کو رحم کی بنا پر نہیں بلکہ اس وجہ سے چھوڑ دیا ہے کہ تھک گیا ہوں" وہ نہایت استقلال سے جواب دیتیں کہ "اگر تم اسلام نہ لاؤ گے تو خدا اس کا انتقام لے گا"۔

حضرت زنیرہؓ حضرت عمرؓ کے گھرانے کی کنیز تھیں اور اس وجہ سے حضرت عمرؓ (اسلام سے پہلے) ان کو جی کھول کر ستاتے تھے ابوجہل نے ان کو اس قدر مارا کہ ان کی آنکھیں جاتی رہیں۔

حضرت نہدیہؓ اور ام عبیسؓ یہ دونوں بھی کنیز تھیں اور اسلام لانے کے جرم میں سخت سے سخت مصیبتیں جھیلتی تھیں

حضرت ابوبکرؓ کے مفاخر فضائل کا یہ پہلا زیب ہے کہ انہوں نے ان مظلوموں میں سے اکثروں کی جان بچائی۔ حضرت بلالؓ، عامر بن فہیرہؓ، لبینہؓ، زنیرہؓ، نہدیہؓ، ام عبیسؓ سب کو بھاری بھاری داموں پر خریدا اور آزاد کر دیا۔ یہ لوگ وہ تھے جن کو قریش نے نہایت سخت جسمانی اذیتیں پہنچائیں لیکن ان سے کم درجہ پر وہ لوگ تھے جن کو طرح طرح سے ستاتے تھے (حضرت عثمانؓ جو کبیر السن اور صاحب جاہ و اعزاز تھے جب اسلام لائے تو دوسروں نے نہیں بلکہ خود ان کے چچا نے رسی سے باندھ کر مارا[1] حضرت ابوذرؓ جو سابق الاسلام ہیں جب مسلمان ہوئے اور کعبہ میں اپنے اسلام کا اعلان کیا تو قریش نے مارتے مارتے ان کو لٹا دیا[2] حضرت زبیر بن العوامؓ جن کا مسلمان ہونے والوں میں پانچواں نمبر تھا جب اسلام لائے تو ان کے چچا ان کو چٹائی میں لپیٹ کر ان کی ناک میں دھواں دیتے تھے[3] حضرت عمرؓ کے چچازاد بھائی سعید بن زیدؓ جب اسلام لائے تو حضرت عمرؓ نے ان کو رسیوں سے باندھ دیا۔[4])

لیکن یہ تمام مظالم یہ جلادانہ بے رحمیاں یہ عبرت خیز سفاکیاں ایک مسلمان کو بھی راہ حق سے برگشتہ نہ کر سکیں۔ ایک نصرانی مورخ نے نہایت سچ لکھا

> "عیسائی اس کو یاد رکھیں تو اچھا ہو کہ محمد کے شمائل نے وہ درجہ شیفتگی کا آپ کے پیرووں میں پیدا کیا جس کو عیسیٰ علیہ السلام کے ابتدائی پیرووں میں تلاش کرنا بے فائدہ ہے...... جب عیسیٰ کو سولی پر لے گئے تو ان کے پیرو بھاگ گئے ان کا نشۂ دینی جاتا رہا اور اپنے مقتدا کو موت کے پنجہ میں گرفتار چھوڑ کر چل دیے۔ ...... برعکس اس کے محمد کے پیرو اپنے مظلوم پیغمبر کے گرد آئے اور آپ کے بچاؤ میں اپنی جانیں خطرہ میں ڈال کر کل دشمنوں پر آپ کو غالب کیا۔[5]

ہجرت حبش ۵ نبوی:

قریش کے ظلم و تعدی کا بادل جب پیہم برس کر نکلا تو رحمت عالم نے جان نثاران اسلام کو ہدایت کی کہ حبش کو

---

1. طبقات ترجمہ عثمان بن عفان
2. بخاری جلد ۱ ص ۵۴۴۔۵۴۵ باب اسلام ابی ذرؓ
3. ریاض النضرۃ محب الطبری
4. بخاری صفحہ ۱۰۲۷۔ اس وقت تک حضرت عمرؓ اسلام نہیں لائے تھے
5. پادری گاڈفری ہیگنس ترجمہ اردو صفحہ ۷۶ و ۷۷ مطبوعہ دہلی ۱۸۷۳ء

ہجرت کر جائیں۔ حبش قریش کی قدیم تجارت گاہ تھا، وہاں کے حالات پہلے سے معلوم تھے اہل عرب حبش کے فرمان روا کو نجاشی [1] کہتے تھے اور اس کے عدل و انصاف کی عام شہرت تھی۔

جاں نثاران اسلام ہر قسم کی تکلیف جھیل سکتے تھے اور ان کا پیمانہ صبر لبریز نہیں ہو سکتا تھا لیکن مکہ میں مراسم فرائض اسلام کا آزادی سے بجا لانا ممکن نہ تھا اس وقت تک حرم کعبہ میں کوئی شخص بلند آواز سے قرآن نہیں پڑھ سکتا تھا۔ عبداللہ بن مسعودؓ جب اسلام لائے تو انہوں نے کہا میں اس فرض کو ضرور ادا کروں گا۔ لوگوں نے منع کیا لیکن وہ باز نہ آئے حرم میں گئے اور مقام ابراہیم کے پاس کھڑے ہو کر سورۂ الرحمن پڑھنی شروع کی۔ کفار ہر طرف ٹوٹ پڑے اور ان کے منہ پر طمانچے مارنے شروع کئے اگرچہ انہوں نے جہاں تک پڑھنا تھا پڑھ کر دم لیا لیکن واپس گئے تو چہرہ پر زخم کے نشان لے کر گئے (حضرت ابوبکرؓ جاہ و اقتدار میں وغیرہ میں قریش سے کم نہ تھے لیکن آواز سے قرآن نہیں پڑھ سکتے تھے اور اسی بنا پر ایک بار ہجرت کے لئے آمادہ ہو گئے۔ [2])

اس کے علاوہ ہجرت سے ایک بڑا مقصد یہ بھی تھا کہ جو شخص اسلام لے کر جہاں جاتا وہاں اسلام کی شعاعیں خود بخود پھیلتی تھیں۔

غرض آنحضرت ﷺ کی ایما سے اول اول گیارہ مرد اور چار عورتوں نے ہجرت کی جن کے نام حسب ذیل ہیں:

۱۔ حضرت عثمانؓ بن عفان — مع اپنی زوجہ محترمہ حضرت رقیہؓ کے جو رسول کریم ﷺ کی صاحبزادی تھیں۔

۲۔ حضرت ابوحذیفہؓ بن عتبہ مع اپنی زوجہ کے جن کا نام حضرت سہلہؓ بنت سہیل تھا — ان کا باپ عتبہ قریش کا مشہور سردار تھا لیکن چونکہ سخت کافر تھا اس لئے ان کو گھر چھوڑنا پڑا۔

۳۔ حضرت زبیر بن العوامؓ — رسول اللہ ﷺ کے پھوپھی زاد بھائی اور مشہور صحابی تھے۔

۴۔ حضرت مصعب بن عمیرؓ — ہاشم کے پوتے تھے۔

۵۔ حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ — مشہور صحابی اور عشرۂ مبشرہ میں شمار کئے جاتے ہیں۔ قبیلہ زہرہ سے تھے اور اس بنا پر آنحضرت ﷺ کے ننھیالی رشتہ دار تھے۔

۶۔ حضرت ابوسلمہؓ [بن عبدالاسد] مخزومیؓ مع اپنی زوجہ حضرت ام سلمہؓ [بنت ابی امیہ] کے — یہ ام سلمہؓ وہی ہیں جو ابوسلمہ کے مرنے کے بعد آنحضرت کے عقد میں آئیں۔ [3]

۷۔ حضرت عثمان بن مظعونؓ — مشہور صحابی ہیں۔

۸۔ عامر بن ربیعہ مع اپنی زوجہ کے جن کا نام حضرت لیلیٰ (بنت ابی حثمہ) تھا۔ — سابقین اولین میں ہیں، بدر میں بھی شریک تھے حضرت عثمانؓ نے خروج میں ان کو مدینہ کا حاکم مقرر کیا تھا (اصابہ)

۱۔ نجاشی حبشی لفظ نجوس کی تعریب ہے جس کے معنی حبشی میں بادشاہ کے ہیں۔ نجاشی کا نام "اصحمہ" تھا۔ (بخاری باب موت النجاشی)

۲۔ طبری صفحہ ۱۱۸۹ جلد ۳

۳۔ [illegible] باب ہجرت حبشہ

۹۔ حضرت ابو سبرہؓ بن ابی رہم نے یا	ان کی ماں برہ آنحضرت ﷺ کی پھوپھی تھیں' یہ سابقین فی الاسلام میں ہیں' حافظ ابن حجر نے اصابہ میں لکھا ہے کہ ہجرت ثانیہ میں گئے۔
۱۰۔ (حضرت) ابو حاطبؓ بن عمرو (حضرت) سہیل بن بیضاء	بدر میں شریک تھے امام زہری کا بیان ہے کہ سب سے پہلے ان ہی نے ہجرت کی ہے (اصابہ)
۱۱۔ (حضرت) عبداللہ بن مسعودؓ	مشہور صحابی اور مجتہدین صحابہ میں داخل ہیں۔

ان لوگوں نے ۵ نبوی ماہ رجب میں سفر کیا۔ حسن اتفاق یہ کہ جب یہ بندرگاہ پر پہنچے تو دو تجارتی جہاز حبش کو جا رہے تھے' جہاز والوں نے سستے کرایہ پر ان کو بٹھا لیا' ہر شخص کو صرف ۵ درہم دینے پڑے۔ قریش کو خبر ہوئی تو بندرگاہ تک تعاقب میں آئے لیکن موقع نکل چکا تھا۔ [2]

عام مؤرخین کا خیال ہے کہ ہجرت انہی لوگوں نے کی جن کا کوئی حامی اور مددگار نہ تھا لیکن فہرست مہاجرین میں ہر درجہ کے لوگ نظر آتے ہیں۔ حضرت عثمانؓ جو امیہ سے تھے جو سب سے زیادہ صاحب اقتدار خاندان تھا۔ متعدد بزرگ مثلاً زبیرؓ اور مصعبؓ خود آنحضرت ﷺ کے خاندان سے ہیں۔ عبدالرحمن بن عوفؓ اور ابو سبرہؓ معمولی لوگ نہ تھے اس بنا پر زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ قریش کا ظلم و ستم بے کسوں پر محدود نہ تھا' بلکہ بڑے بڑے خاندان والے بھی ان کے ظلم و ستم سے محفوظ نہ تھے۔

ایک عجیب بات یہ ہے کہ جو لوگ سب سے زیادہ مظلوم تھے اور جن کو انگاروں کے بستر پر سونا پڑا تھا' یعنی حضرت بلالؓ' عمارؓ' یاسرؓ وغیرہ ان لوگوں کا نام مہاجرین حبش کی فہرست میں نظر نہیں آتا اس لئے یا تو ان کی بے سروسامانی اس حد تک پہنچی تھی کہ سفر کرنا بھی ناممکن تھا یا یہ کہ درد کے لذت آشنا تھے اور اس لطف کو چھوڑ نہ سکتے تھے۔

دلم ز جور تو آسودہ است وی ناہم   کہ غیر بے نہ برد لذت خدنگ ترا

---

1. حبش کے مہاجرین اول کی تعداد اور ان کے تعین میں کسی قدر اختلاف ہے۔ ابن اسحاق نے مردوں میں ان ہی دس آدمیوں کا نام لیا ہے حضرت عبداللہ بن مسعود کے متعلق وہ یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ یہ ہجرت اولیٰ میں نہیں بلکہ ہجرت ثانیہ میں تھے (فتح الباری جلد ۷ صفحہ ۱۴۳) واقدی نے مردوں میں گیارہ صحابیوں کی ہجرت کا ذکر کیا ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے حضرت ابو سبرہؓ اور حضرت ابو حاطبؓ دونوں کو مہاجرین میں شمار کیا ہے اور ابن اسحاق ان میں سے ایک کو تسلیم کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں واقدی سے ایک بڑی فروگذاشت یہ ہوئی کہ انہوں نے گیارہ مردوں کو مہاجرین حبش بتلایا لیکن جب مہاجرین کی فہرست گنائی تو اس میں بارہ آدمیوں کا نام لیا' یعنی حضرت عبداللہ بن مسعود کا بھی اضافہ کیا (زرقانی علی المواہب جلد اول صفحہ ۳۱۳) حافظ ابن حجر نے واقدی کی اس فروگذاشت پر گرفت کی ہے (فتح الباری جلد ۷ ص ۱۴۳) ابن سعد نے انہی تمام مہاجرین کا نام لیا ہے جس کا ذکر واقدی نے کیا ہے (ابن سعد جلد اول صفحہ ۱۳۶) ابن سید الناس نے بھی بروایت زہری بارہ آدمیوں کا ذکر کیا ہے مگر انہوں نے حضرت زبیر کے بجائے حضرت سلیطؓ بن عمرو کا نام لیا ہے (عیون الاثر اول صفحہ ۱۱۵) بعض دوسرے سیرت نگار جو بارہ مرد مہاجرین کو تسلیم کرتے ہیں وہ حضرت حاطب بن عمرو اور حضرت سہیل بن بیضاء کے بجائے حضرت حاطبؓ بن حارث اور حضرت ہاشمؓ بن عمرو کا نام لیتے ہیں (زرقانی اول ص ۳۱۲) اسی طرح ہجرت کرنے والی خواتین میں بعض لوگ حضرت ابو سبرہؓ کی بیوی حضرت ام کلثوم بنت سہیل اور حضور ﷺ کی دایہ حضرت ام ایمنؓ کا اضافہ کرتے ہیں"س"

2. تمام تفصیل طبری میں ہے۔

نجاشی کی حمایت میں مسلمان حبش میں امن و امان سے زندگی بسر کرنے لگے لیکن قریش یہ خبریں سن سن کر پیچ و تاب کھاتے تھے۔ آخر یہ رائے ٹھہری کہ نجاشی کے پاس سفارت بھیجی جائے کہ ہمارے مجرموں کو اپنے ملک سے نکال دو۔ عبداللہ بن ابی ربیعہ اور عمرو بن العاص (فاتح مصر) اس کام کے لئے منتخب ہوئے۔ نجاشی اور اس کے درباریوں میں سے ایک ایک کے لئے گراں بہا تحفے مہیا کیے گئے اور نہایت سروسامان سے یہ سفارت حبش کو روانہ ہوئی۔ یہ سفراء نجاشی سے پہلے درباری پادریوں سے ملے اور ان کی خدمت میں نذریں پیش کیں اور کہا کہ ہمارے شہر کے چند نادانوں نے ایک نیا مذہب ایجاد کیا ہے، ہم نے ان کو نکال دیا تو آپ کے ملک میں بھاگ آئے۔ کل ہم بادشاہ کے دربار میں ان کے متعلق جو درخواست پیش کریں آپ بھی ہماری تائید فرمائیں۔ دوسرے دن سفراء دربار میں گئے اور نجاشی سے درخواست کی کہ ہمارے مجرم ہم کو حوالے کر دیے جائیں۔ درباریوں نے بھی تائید کی۔ نجاشی نے مسلمانوں کو بلا بھیجا اور کہا "تم نے یہ کون سا دین ایجاد کیا ہے جو نصرانیت اور بت پرستی دونوں کے مخالف ہے؟"

مسلمانوں نے اپنی گفتگو کرنے کے لئے حضرت جعفرؓ (حضرت علیؓ کے بھائی) کو انتخاب کیا انہوں نے اس طرح تقریر شروع کی:

"ایہا الملک! ہم لوگ ایک جاہل قوم تھے، بت پوجتے تھے، مردار کھاتے تھے، بدکاریاں کرتے تھے، ہمسایوں کو ستاتے تھے، بھائی بھائی پر ظلم کرتا تھا، قوی لوگ کمزوروں کو کھا جاتے تھے، اس اثناء میں ہم میں ایک شخص پیدا ہوا جس کی شرافت اور صدق و دیانت سے ہم لوگ پہلے سے واقف تھے، اس نے ہم کو اسلام کی دعوت دی اور یہ سکھلایا کہ ہم پتھروں کو پوجنا چھوڑ دیں، سچ بولیں، خونریزی سے باز آئیں، یتیموں کا مال نہ کھائیں، ہمسایوں کو آرام دیں، عفیف عورتوں پر بدنامی کا داغ نہ لگائیں، نماز پڑھیں، روزے رکھیں، زکوٰۃ دیں، ہم اس پر ایمان لائے، شرک اور بت پرستی چھوڑ دی اور تمام اعمال بد سے باز آئے، اس جرم پر ہماری قوم ہماری جان کی دشمن ہو گئی اور ہم کو مجبور کرتی ہے کہ اسی گمراہی میں واپس آ جائیں"۔

نجاشی نے کہا "جو کلام الٰہی تمہارے پیغمبر پر اترا ہے کہیں سے پڑھو"۔ حضرت جعفرؓ نے سورۂ مریم کی چند آیتیں پڑھیں۔ نجاشی پر رقت طاری ہوئی اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے پھر کہا "خدا کی قسم یہ کلام اور انجیل دونوں ایک ہی چراغ کے پرتو ہیں"۔ یہ کہہ کر سفرائے قریش سے کہا "تم واپس جاؤ میں ان مظلوموں کو ہرگز واپس نہ دوں گا"۔

دوسرے دن عمرو بن العاص نے پھر دربار میں رسائی حاصل کی اور نجاشی سے کہا "حضور! آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ یہ لوگ حضرت عیسیٰؑ کی نسبت کیا اعتقاد رکھتے ہیں" نجاشی نے مسلمانوں کو بلا بھیجا کہ اس سوال کا جواب دیں ان لوگوں کو تردد ہوا کہ اگر حضرت عیسیٰؑ کے ابن اللہ ہونے سے انکار کرتے ہیں تو نجاشی عیسائی ہے ناراض ہو جائے گا۔ حضرت جعفرؓ نے کہا کچھ ہو ہم کو سچ بولنا چاہیے۔

---

۱ مسند جلد اول ص ۲۰۲

۲ ابن ہشام نے مصاحب آنحضرت ﷺ [illegible]

غرض یہ لوگ دربار میں حاضر ہوئے' نجاشی نے کہا تم لوگ عیسیٰ بن مریم کے متعلق کیا اعتقاد رکھتے ہو؟ حضرت جعفرؓ نے کہا "ہمارے پیغمبر نے بتایا ہے کہ عیسیٰ خدا کا بندہ اور پیغمبر اور کلمۃ اللہ ہے"۔ نجاشی نے زمین سے ایک تنکا اٹھایا اور کہا واللہ جو تم نے کہا عیسیٰ اس تنکے کے برابر بھی اس سے زیادہ نہیں ہیں[1] بطریق جو دربار میں موجود تھے نہایت برہم ہوئے' نتھنوں سے خرخراہٹ کی آواز آنے لگی نجاشی نے ان کے غصہ کی کچھ پرواہ نہ کی اور قریش کے سفیر بالکل ناکامیاب آئے۔[2]

اسی اثناء میں کسی دشمن نے نجاشی کے ملک پر حملہ کیا' نجاشی اس کے مقابلہ کیلئے خود گیا' صحابہؓ نے مشورہ کیا کہ ہم میں سے ایک شخص جائے اور خبر بھیجتا رہے کہ اگر ضرورت ہو تو ہم بھی نجاشی کی مدد کے لئے آئیں۔ حضرت زبیرؓ اگرچہ سب سے زیادہ کمسن تھے' لیکن انہوں نے اس خدمت کے لئے اپنے کو پیش کیا' مشک کے سہارے دریائے نیل تیر کر رزم گاہ میں پہنچے' ادھر صحابہؓ نجاشی کی فتح کے لئے خدا سے دعا مانگتے تھے' چند روز کے بعد زبیر واپس آئے اور خوشخبری سنائی کہ نجاشی کو خدا نے فتح دی۔[3]

حبش میں کم و بیش ۸۳ مسلمان ہجرت کر کے گئے' چند روز آرام سے گزرنے پائے تھے کہ یہ خبر مشہور ہوئی کہ کفار نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ یہ سن کر اکثر صحابہؓ نے مکہ معظمہ کا رخ کیا لیکن شہر کے قریب پہنچے تو معلوم ہوا کہ یہ خبر غلط ہے۔ اس لئے بعض لوگ واپس چلے گئے اور اکثر چھپ چھپ کر مکہ میں آ گئے۔

یہ روایت طبری اور اکثر تاریخوں میں مذکور ہے اور ممکن ہے کہ صحیح ہو لیکن ان کتابوں میں اس خبر کے مشہور ہونے کی وجہ یہ لکھی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حرم میں ایک دفعہ نماز ادا کی' کفار بھی موجود تھے جب آپ نے یہ آیت پڑھی۔

---

1. مستدرک حاکم ج ۲ ص ۳۱۰ کتاب التفسیر "س"
2. مارگولیوس صاحب نے ہجرت حبش کی بھی بڑی نازک اور دوراز فکر وجہ تلاش کر کے پیدا کی ہے فرماتے ہیں کہ "جب محمدؐ نے دیکھا کہ قریش سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے اور یہ پہلے سنا تھا کہ کعبہ کے گرانے کیلئے ابرہہ الاشرم جو آیا تھا وہ حبش ہی کا تھا اس لئے انہوں نے چاہا کہ بادشاہ حبش سے سازش کر کے اس کو مکہ پر حملہ کرنے کی ترغیب دیں تا کہ قریش کا زور ٹوٹ جائے' اسی غرض سے ہجرت کا بہانہ کر کے اپنے اصحاب کو حبش بھیجا' لیکن پھر سمجھے کہ نجاشی اگر مکہ میں آیا تو خود مکہ پر قابض ہو جائے گا' مجھ کو کیا ہاتھ آئے گا۔ اس بنا پر اس ارادے سے باز رہے"۔ یہ بالکل بے ثبوت بات ہے۔ صاحب موصوف کو حضرت جعفرؓ کی تقریر و مکالمت میں اس بنا پر شک ہے کہ نجاشی عربی زبان سے ناواقف تھا حالانکہ اس زمانہ میں (اولاً تو) عربی زبان عام طور سے حبش میں بے تکلف لوگ کچھ سمجھتے تھے کہ یہ دونوں زبانیں باہم نہایت قریب ہیں' ثانیاً درباروں میں ترجمان ہوتے تھے جیسا کہ ابوسفیان اور قیصر روم کے باہمی مکالمہ میں مذکور ہے بخاری باب بدء الوحی"۔ "س"
3. یہ تمام واقعات مسند ابن حنبل جلد ا صفحہ ۲۰۲ میں مذکور ہیں' ابن ہشام نے بھی تفصیل سے لکھے ہیں لیکن طبری اور ابن سعد نے حضرت جعفرؓ اور نجاشی کی تقریر کا ذکر نہیں کیا۔ امام ابن حنبل اور ابن ہشام کا سلسلہ روایت یہ ہے محمد بن اسحاق' زہری' ابوبکر بن عبدالرحمن بن حارث بن ہشام مخزومی' ام سلمہ۔ یہ سب روات ثقہ ہیں اور سب سے اخیر راوی حضرت ام سلمہؓ جو رسول اللہ ﷺ کی زوجہ محترمہ اور خود اس واقعہ میں شریک تھیں' وہ اس وقت تک آنحضرت ﷺ کے عقد میں نہیں آئی تھیں بلکہ اپنے پہلے شوہر ابوسلمہ بن عبدالاسد کے ساتھ حبش میں ہجرت کر کے گئی تھیں' مورخ یعقوبی نے بھی بہ تفصیل یہ واقعہ لکھا ہے۔

﴿ومناة الثالثة الاخرى﴾

تو شیطان نے آپ کی زبان سے یہ الفاظ نکلوا دیئے

﴿تلک الغرانیق العلی وان شفاعتهن لترتجى﴾

یعنی یہ بت معظم و محترم ہیں اور ان کی شفاعت مقبول ہے۔

اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے سجدہ کیا اور تمام کفار نے آپ کی متابعت کی (اس روایت کا آخری حصہ کہ چند کافروں کے سوا تمام جن وانس نے حضور ﷺ کے ساتھ ایک دفعہ سجدہ کیا صحیح ہے جیسا کہ صحیح بخاری باب[1] میں ہے [آیہ فاسجدوا للہ واعبدوا] مذکور ہے مگر باقی) قصہ بے ہودہ اور ناقابل ذکر ہے اور اکثر ارباب محدثین محققین قاضی عیاض، علامہ عینی، حافظ منذری، علامہ نووی[2] نے اس کو باطل اور موضوع لکھا ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ بہت سے محدثین نے اس روایت کو بہ سند نقل کیا ہے ان میں طبری، ابن ابی حاتم، ابن المنذر، ابن مردویہ، ابن اسحاق، موسیٰ بن عقبہ، ابو معشر[3] شہرت عام رکھتے ہیں اس سے بڑھ کر تعجب یہ ہے کہ حافظ ابن حجر کو جن کے کمال فن حدیث پر زمانہ کا اتفاق ہے اس روایت کی صحت پر اصرار ہے چنانچہ لکھتے ہیں۔[4]

﴿وقد ذكرنا ان ثلاثة اسانيد منها على شرط الصحيح وهى مراسيل يحتج بمثلها من يحتج بالمراسيل﴾

ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ اس روایت کی تین سندیں صحیح کی شرط کے موافق ہیں اور یہ روایتیں مرسل ہیں اور ان سے وہ لوگ استدلال کر سکتے ہیں جو مرسل روایتوں کے قائل ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ کفار کی عادت تھی کہ جب آنحضرت ﷺ قرآن مجید کی تلاوت کرتے تو شور مچاتے اور اپنی طرف سے ملا دیتے، قرآن مجید کی آیت ذیل میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔

﴿لا تسمعوا لهذا القرآن والغوا فيه لعلكم تغلبون﴾ (حم سجدہ)

اس قرآن کو نہ سنو اور اس میں گڑبڑ کر دو شاید تم غالب آؤ۔

قریش کا معمول تھا کہ جب کعبہ کا طواف کرتے تو یہ فقرے کہتے جاتے۔[5]

﴿واللات والعزى ومناة الثالثة الاخرى فانهن الغرانيق العلى وان شفاعتهن لترتجى﴾

لات اور عزیٰ اور تیسرے بت منات کی قسم یہ معزز بت ہیں اور ان کی شفاعت کی امید ہے۔

[1] کتاب التفسیر سورۂ نجم

[2] دیکھو زرقانی و مواہب لدنیہ و شفائے قاضی عیاض و عینی شرح بخاری تفسیر سورۂ نجم و شرح مسلم، علامہ نووی کے یہ الفاظ ہیں
لا یصح فیہ شئ لا من جھۃ النقل ولا من جھۃ العقل اور علامہ عینی لکھتے ہیں فلا صحۃ لہ نقلا ولا عقلا

[3] دیکھو مواہب لدنیہ و زرقانی واقعہ ہجرت حبشہ

[4] زرقانی بر مواہب جلد اول صفحہ ۳۴۳

[5] معجم البلدان لفظ عزیٰ

کہ ابوبکرؓ نماز میں چپکے جو چاہیں پڑھیں، آواز سے قرآن پڑھتے ہیں تو ہماری عورتوں اور بچوں پر اثر پڑتا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے چند روز پابندی اختیار کی لیکن پھر انہوں نے گھر کے پاس ایک مسجد بنائی اور اس میں خضوع و خشوع کے ساتھ بہ آواز قرآن پڑھتے تھے، وہ نہایت رقیق القلب تھے، قرآن پڑھتے تو بے اختیار روتے، عورتیں اور بچے ان کو دیکھتے اور متاثر ہوتے۔ قریش نے ابن الدغنہ سے شکایت کی، اس نے حضرت ابوبکرؓ سے کہا کہ اب میں تمہاری حفاظت کا ذمہ دار نہیں ہو سکتا، حضرت ابوبکرؓ نے کہا "مجھ کو خدا کی حفاظت بس ہے میں تمہاری جوار سے استعفیٰ دیتا ہوں"۔[1]

محرم ۷ نبوی، شعب ابوطالب میں محصور ہونا:

قریش دیکھتے تھے کہ اس روک ٹوک پر بھی اسلام کا دائرہ پھیلتا جاتا ہے، عمرؓ اور حمزہؓ جیسے لوگ ایمان لا چکے، نجاشی نے مسلمانوں کو پناہ دی، سفراء بے نیل و مرام واپس آئے، مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، اس لئے اب یہ تدبیر سوچی کہ آنحضرت ﷺ اور آپ کے خاندان کو محصور کر کے تباہ کر دیا جائے۔ چنانچہ تمام قبائل نے ایک معاہدہ مرتب کیا کہ کوئی شخص خاندان بنی ہاشم سے قرابت کرے گا نہ ان کے ہاتھ خرید و فروخت کرے گا، نہ ان سے ملے گا، نہ ان کے پاس کھانے پینے کا سامان جانے دے گا، جب تک وہ محمد ﷺ کو قتل کے لئے حوالہ نہ کر دیں۔[2] یہ معاہدہ منصور بن عکرمہ نے لکھا اور کعبہ پر آویزاں کیا گیا۔

ابوطالب مجبور ہو کر تمام خاندان بنی ہاشم کے ساتھ شعب ابی طالب[3] میں پناہ گزیں ہوئے۔ تین سال تک بنو ہاشم نے اس حصار میں بسر کی۔ یہ زمانہ ایسا سخت گذرا کہ طلح کے پتے کھا کھا کر رہتے تھے، حدیثوں میں جو صحابہؓ کی زبان سے مذکور ہے کہ ہم طلح کی پتیاں کھا کھا کر بسر کرتے تھے، اسی زمانہ کا واقعہ ہے، چنانچہ سہیلی نے روض الانف میں تصریح کی ہے، حضرت سعد وقاصؓ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ رات کو سوکھا ہوا چمڑا ہاتھ آ گیا، میں نے اس کو پانی سے دھویا پھر آگ پر بھونا اور پانی میں ملا کر کھایا۔[4]

ابن سعد نے روایت کی ہے کہ بچے جب بھوک سے روتے تھے تو باہر آواز آتی تھی، قریش سن سن کر خوش ہوتے تھے لیکن بعض رحمدلوں کو ترس بھی آتا تھا، ایک دن حکیم بن حزام نے جو حضرت خدیجہؓ کا بھتیجا تھا، تھوڑے سے گیہوں اپنے غلام کے ہاتھ حضرت خدیجہؓ کے پاس بھیجے، راہ میں ابوجہل نے دیکھ لیا اور چھین لینا چاہا، اتفاق سے ابوالبختری کہیں سے آ گیا، وہ اگرچہ کافر تھا لیکن اس کو رحم آیا اور کہا کہ ایک شخص اپنی پھوپھی کو کچھ کھانے کے لئے بھیجتا ہے تو کیوں روکتا ہے۔

مسلسل تین برس تک آنحضرت ﷺ اور تمام آل ہاشم نے یہ مصیبتیں جھیلیں، بالآخر دشمنوں ہی کو رحم آیا اور خود

1. یہ پوری تفصیل صحیح بخاری باب ہجرت مدینہ میں ہے۔
2. اس معاہدہ کا ذکر طبری نے اور ابن سعد وغیرہ نے تفصیل سے کیا ہے، لیکن یہ الفاظ کہ "وہ محمد کو قتل کیلئے حوالہ کر دیں" صرف مواہب لدنیہ میں مذکور ہیں۔
3. یہ پہاڑ کا ایک درہ تھا جو خاندان بنو ہاشم کا موروثی تھا۔
4. روض الانف۔

کسی کی طرف سے اس معاہدہ کے توڑنے کی تحریک ہوئی۔ ہشام عامری خاندان بنو ہاشم کا قریبی رشتہ دار اور اپنے قبیلہ میں ممتاز تھا۔ وہ چوری چھپے بنو ہاشم کو غلہ وغیرہ بھیجتا رہتا تھا۔ ایک دن وہ زہیر کے پاس جو عبدالمطلب کے نواسے تھے، گیا اور کہا "کیوں زہیر! تم کو یہ پسند ہے کہ تم کھاؤ پیو ہر قسم کا لطف اٹھاؤ اور تمہارے ماموں کو ایک دانہ تک نصیب نہ ہو؟" زہیر نے کہا "کیا کروں تنہا ہوں، ایک شخص بھی میرا ساتھ دے تو میں ظالمانہ معاہدہ کو پھاڑ کر پھینک دوں"۔ ہشام نے کہا "میں موجود ہوں"۔ دونوں مل کر مطعم بن عدی کے پاس گئے، ابوالبختری ابن ہشام، زمعہ بن الاسود نے بھی ساتھ دیا۔ دوسرے دن سب مل کر حرم میں گئے۔ زہیر نے سب لوگوں کو مخاطب کر کے کہا "اے اہل مکہ! یہ کیا انصاف ہے! ہم لوگ آرام سے زندگی بسر کریں اور بنو ہاشم کو آب و دانہ نصیب نہ ہو، خدا کی قسم جب تک یہ ظالمانہ معاہدہ چاک نہ کر دیا جائے گا میں باز نہ آؤں گا"۔ ابوجہل برابر سے بولا "ہرگز اس معاہدہ کو کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا"۔ زمعہ نے کہا "تو جھوٹ کہتا ہے۔ جب یہ لکھا گیا تھا اس وقت بھی ہم راضی نہ تھے"۔ غرض مطعم نے ہاتھ بڑھا کر دستاویز چاک کر دی۔ مطعم بن عدی، عدی بن قیس، زمعہ بن الاسود، ابوالبختری، زہیر سب ہتھیار باندھ کر بنو ہاشم کے پاس گئے اور ان کو درہ سے نکال لائے۔[1] بقول ابن سعد یہ ۱۰ نبوی کا واقعہ ہے۔ اسی زمانہ میں معراج واقع ہوئی جس کی تفصیل تیسرے حصہ میں آئے گی۔ اسی زمانہ میں نماز پنجگانہ فرض ہوئی۔

۱۰ نبوی، حضرت خدیجہؓ اور ابوطالب کی وفات:

آنحضرت ﷺ اب شعب ابی طالب سے نکلے تھے اور چند روز قریش کے جور و ظلم سے امان ملی تھی کہ ابوطالب اور حضرت خدیجہؓ کا انتقال ہو گیا۔

ابوطالب کی وفات کے وقت آنحضرت ﷺ ان کے پاس تشریف لے گئے۔ ابوجہل اور عبداللہ بن ابی امیہ پہلے سے موجود تھے۔ آپ نے فرمایا "مرتے مرتے لا الہ الا اللہ کہہ لیجئے کہ میں خدا کے ہاں آپ کے ایمان کی شہادت دوں"۔ ابوجہل اور ابن ابی امیہ نے کہا "ابوطالب! کیا تم عبدالمطلب کے دین سے پھر جاؤ گے؟" بالآخر ابوطالب نے کہا "میں عبدالمطلب کے دین پر مرتا ہوں"۔ پھر آنحضرت ﷺ کی طرف خطاب کر کے کہا "میں وہ کلمہ کہہ دیتا لیکن قریش کہیں گے کہ موت سے ڈر گیا"۔ آپ ﷺ نے فرمایا "میں آپ کے لئے دعائے مغفرت کروں گا جب تک کہ خدا مجھ کو اس سے منع نہ کرے"۔[2]

یہ بخاری اور مسلم کی روایت ہے۔ ابن اسحاق کی روایت ہے کہ مرتے وقت ابوطالب کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ حضرت عباسؓ نے (جو اس وقت تک کافر تھے) کان لگا کر سنا تو آنحضرت ﷺ سے کہا "تم نے جس کلمہ کے لئے کہا تھا ابوطالب وہی کہہ رہے ہیں"۔[3]

اس بنا پر ابوطالب کے اسلام کے متعلق اختلاف ہے۔ لیکن چونکہ بخاری کی روایت صحیح مانی جاتی ہے اس

1. یہ تفصیل ابن ہشام، طبری وغیرہ میں مذکور ہے۔ اخیر واقعہ صرف ابن سعد نے بیان کیا ہے۔
2. صحیح بخاری باب الجنائز و صحیح مسلم، ابوطالب کا اخیر فقرہ مسلم میں ہے بخاری میں نہیں۔
3. ابن ہشام جلد ۱ صفحہ ۱۴۶

لئے محدثین زیادہ تر ان کے کفر ہی کے قائل ہیں۔

لیکن محدثانہ حیثیت سے بخاری کی یہ روایت چنداں قابل حجت نہیں کہ اخیر راوی مسیب ہیں جو فتح مکہ میں اسلام لائے اور ابوطالب کی وفات کے وقت موجود نہ تھے۔ اسی بنا پر علامہ عینی نے اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے کہ "روایت مرسل ہے"۔ ابن اسحاق نے سلسلہ روایت میں عباس بن عبداللہ بن معبد اور عبداللہ بن عباس ہیں۔ یہ دونوں ثقہ ہیں لیکن بیچ کا ایک راوی یہاں بھی رہ گیا ہے' اس بنا پر دونوں روایتوں کے درجہ استناد میں چنداں فرق نہیں۔ [۲]

ابوطالب نے آنحضرت ﷺ کے لئے جو جاں نثاریاں کیں' اس سے کون انکار کر سکتا ہے؟ وہ اپنے جگر گوشوں تک کو آپ پر نثار کرتے تھے۔ آپ کی محبت میں تمام عرب کو اپنا دشمن بنا لیا۔ آپ کی خاطر محصور ہوئے' فاقے اٹھائے' شہر سے نکالے گئے' تین تین برس تک آب و دانہ بند رہا' کیا یہ محبت' یہ جوش' یہ جاں نثاریاں سب ضائع جائیں گی؟

ابوطالب آنحضرت ﷺ سے ۳۵ برس عمر میں بڑے تھے' رسول اللہ ﷺ کو ان سے نہایت محبت تھی' ایک دفعہ وہ بیمار پڑے' آنحضرت ﷺ ان کی عیادت کے لئے گئے تو انہوں نے کہا' بھتیجے! جس خدا نے تجھ کو پیغمبر بنا کر بھیجا ہے اس سے دعا نہیں مانگتا کہ مجھ کو اچھا کر دے"۔ آپ نے دعا کی اور وہ اچھے ہو گئے' آنحضرت ﷺ سے کہا خدا تیرا کہنا مانتا ہے آپ نے فرمایا کہ "آپ بھی اگر خدا کا کہنا مانیں تو وہ بھی آپ کا کہنا مانے"۔ [۳]

ابوطالب کی وفات کے چند ہی روز بعد حضرت خدیجہؓ نے بھی وفات پائی۔ بعض روایتوں میں ہے کہ انہوں نے ابوطالب سے پہلے انتقال کیا۔ اب آپ کے مددگار اور غمگسار دونوں اٹھ گئے۔ صحابہؓ خود اپنی حالت میں مبتلا تھے' یہی زمانہ ہے جو اسلام کا سخت ترین زمانہ ہے' اور خود آنحضرت ﷺ اس سال کو عام الحزن (سال غم) فرمایا کرتے تھے۔ [۴] حضرت خدیجہؓ نے رمضان ۱۰ نبوی میں وفات کی' ان کی عمر ۶۵ برس کی تھی' مقام حجون میں دفن کی گئیں' آنحضرت ﷺ خود ان کی قبر میں اترے۔ اس وقت تک نماز جنازہ شروع نہیں ہوئی تھی۔ [۵]

۱۔ عینی کتاب الجنائز جلد ۴ صفحہ ۲۰۰ "س"

۲۔ مصنف کے اس نظریے سے مجھے اتفاق نہیں ہے اس لئے کہ بخاری کی روایت کے آخری راوی حضرت مسیبؓ ہیں جو صحابی ہیں' ظاہر ہے کہ صحابی کی روایت کسی صحابی ہی سے ہو گی اس لئے مراسیل صحابہ حجت ہیں اور ابن اسحاق کی روایت منقطع ہے اور بیچ کا راوی صحابی نہیں ہے' خود ابن اسحاق بھی استناد کا اعلیٰ درجہ نہیں رکھتے اس لئے دونوں روایتوں کو یکساں نہیں قرار دیا جا سکتا۔ علاوہ ازیں حضرت مسیبؓ کی اس روایت کی تائید میں خود حضرت عباسؓ کی وہ روایت ہے جو اسی مسیب والی روایت سے اوپر صحیح بخاری میں موجود ہے' جس میں ذکر ہے کہ حضرت عباسؓ نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! آپ کے چچا (ابوطالب) کو آپ سے کیا فائدہ پہنچا کہ وہ آپ کی حفاظت کرتے تھے اور آپ کے لئے آپ کے دشمنوں سے برسر پرخاش رہتے تھے' فرمایا وہ دوزخ کی آگ میں صرف ٹخنے تک ہیں مگر اس کا اثر بھی دماغ تک پہنچ جاتا ہے' اگر میں نہ ہوتا تو وہ دوزخ کے سب سے نیچے طبقہ میں ہوتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ خود حضرت عباسؓ کے علم میں تھا کہ ان کا خاتمہ توحید کے اقرار پر نہیں ہوا' اسی مضمون کی روایت حضرت ابوسعید خدریؓ سے بھی ہے جو صحیح بخاری باب قصہ ابی طالب میں اسی موقع پر موجود ہے۔ "س"

۳۔ اصابہ فی تمییز الصحابہ ذکر ابوطالب

۴۔ مواہب لدنیہ　　۵۔ یہ تفصیل ابن سعد میں ہے

سامنے پیش لائے گئے۔

مطعم نے کفر کی حالت میں غزوۂ بدر سے پہلے وفات کی، حضرت حسانؓ جو دربار رسالت کے شاعر تھے انہوں نے مرثیہ لکھا، زرقانی نے یہ مرثیہ بعینہ نقل کیا ہے[1] سب نے زور لکھا ہے کہ اس میں کچھ مضائقہ نہیں مطعم کا یہ کام بے شبہ مدح کا مستحق تھا، لیکن آج کل کے مسلمان حضرت حسانؓ اور زرقانی سے زیادہ شیفتۂ اسلام ہیں، اس لئے معلوم نہیں حضرت حسانؓ کا یہ شعر آج بھی پسند کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

قبائل کا دورہ:

آنحضرت ﷺ کا معمول تھا جب حج کا زمانہ آتا تھا اور عرب کے قبائل ہر طرف سے آ کر مکہ کے آس پاس اترتے تو آپ ایک ایک قبیلہ کے پاس جاتے اور تبلیغ اسلام فرماتے، عرب میں مختلف مقامات پر میلے لگتے تھے، جن میں دور دور کے قبائل آتے تھے، آپ ان میلوں میں جاتے اور اسلام کی تبلیغ فرماتے۔

ان میلوں میں سے عکاظ جو اہل عرب کا قومی اور علمی دنگل تھا، اور مجنہ اور ذوالمجاز کا، مؤرخین نے خاص طور پر نام لیا ہے، قبائل عرب میں سے بنو عامر، محارب، فزارہ، غسان، مرہ، حنیفہ، سلیم، عبس، بنو نصر، کندہ، کلب، حارث بن کعب، عذرہ، حضارمہ، مشہور قبائل ہیں۔[3] ان سب قبائل کے پاس آپ ﷺ تشریف لے گئے لیکن ابولہب ہر جگہ ساتھ ساتھ جاتا اور جب آپ کسی مجمع میں تقریر کرتے تو برابر سے کہتا کہ "دین سے پھر گیا ہے اور جھوٹ کہتا ہے"۔[4]

بنی حنیفہ یمامہ میں آباد تھے، ان لوگوں نے نہایت سختی کے ساتھ جواب[5] دیا۔ مسیلمہ کذاب جس نے آگے چل کر نبوت کا دعویٰ کیا اسی قبیلہ کا رئیس تھا۔

قبیلہ ذہل بن شیبان کے پاس جب آپ ﷺ گئے تو حضرت ابوبکرؓ بھی ساتھ تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے مفروق سے کہا "تم نے اس پیغمبر کا تذکرہ سنا ہے؟ وہ یہی ہیں"۔ مفروق نے آنحضرت ﷺ کی طرف رخ کر کے کہا "برادر قریش! تم کیا تعلیم کرتے ہو؟" آپ نے فرمایا "خدا ایک ہے اور میں اس کا پیغمبر ہوں" اور یہ آیتیں پڑھیں۔

﴿قُلْ تَعَالَوْا أَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ أَلَّا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ مِنْ إِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ ذَٰلِكُمْ وَصَّاكُمْ بِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ﴾ (الانعام: ۱۵۱)

کہہ دو کہ آؤ میں تمہیں سناؤں کہ خدا نے کیا چیز تم پر حرام کی ہے، یہ کہ خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، اور والدین کی

---

1. ابن سعد صفحہ ۱۴۲ کی تمام تفصیل مواہب لدنیہ سے ماخوذ کی گئی ہے جو ابن اسحاق کی روایت ہے۔ تعجب ہے کہ ابن ہشام نے یہ حالات قلم انداز کئے ہیں۔
2. زرقانی جلد اول صفحہ ۳۱۶۔
3. ابن سعد نے ان تمام قبائل کا ذکر کیا ہے۔
4. مستدرک حاکم جلد اول صفحہ ۱۵ کتاب الایمان۔
5. ابن ہشام۔

خدمت بجا لاؤ، اور اپنے بچوں کو افلاس کے خیال سے قتل نہ کرو، ہم تم کو اور ان کو دونوں کو روزی دیں گے۔ فحش باتوں کے پاس نہ جاؤ، وہ ظاہر ہوں یا پوشیدہ اور آدمی کی جان، جس کو خدا نے حرام کیا ہے، ناحق ہلاک نہ کرو۔

اس قبیلہ کے رؤسا مفروق، مثنیٰ اور ہانی بن قبیصہ تھے اور وہ سب اس موقع پر موجود تھے۔ ان لوگوں نے کلام کی تحسین کی لیکن کہا کہ "مدتوں کا خاندانی دین دفعۃً چھوڑ دینا زود اعتقادی ہے۔ اس کے علاوہ ہم کسریٰ کے زیر اثر ہیں اور معاہدہ ہو چکا ہے کہ ہم اور کسی کے اثر میں نہ آئیں گے"۔ آپ نے ان کی راست گوئی کی تحسین کی اور فرمایا کہ "خدا اپنے دین کی آپ مدد کرے گا"۔ ۱

قبیلہ بنو عامر کے پاس گئے تو ایک شخص نے جس کا نام (بحیرہ بن) فراس تھا۔ آپ ﷺ کی تقریر سن کر کہا "یہ شخص مجھ کو ہاتھ آ جائے تو میں تمام عرب کو مسخر کر لوں" پھر آپ ﷺ سے پوچھا کہ "اگر ہم تمہارا ساتھ دیں اور تم اپنے مخالفوں پر غالب آ جاؤ تو تمہارے بعد ریاست ہم کو ملے گی؟" آپ ﷺ نے فرمایا "سب خدا کے ہاتھ ہے" اس نے کہا "ہم اپنا سینہ عرب کا آماجگاہ بنائیں اور حکومت غیروں کے ہاتھ آئے، ہم کو یہ غرض نہیں۔ ۲

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ایذا رسانی:

اسباب مذکورہ بالا کی بنا پر قریش نے آنحضرت ﷺ کی سخت مخالفت کی اور چاہا کہ آپ ﷺ کو اس قدر ستائیں کہ آپ مجبور ہو کر تبلیغ اسلام سے دست بردار ہو جائیں، سوء اتفاق یہ کہ جو کفار آپ کے ہمسایہ تھے یعنی ابوجہل، ابولہب، اسود بن عبد یغوث، ولید بن مغیرہ، امیہ بن خلف، نضر بن حارث، منبہ بن حجاج، عقبہ بن ابی معیط، حکم بن ابی العاص سب قریش کے سربرآوردہ رؤسا تھے اور یہی سب سے بڑھ کر آپ کے دشمن ۳ تھے۔ یہ لوگ آنحضرت ﷺ کی راہ میں کانٹے بچھاتے، نماز پڑھتے وقت ہنسی اڑاتے، سجدہ میں آپ کی گردن پر اوجھڑی لا کر ڈال دیتے، گلے میں چادر لپیٹ کر اس زور سے کھینچتے کہ گردن مبارک میں بدھیاں پڑ جاتیں۔ (آپ کی روحانی قوت اثر کو دیکھ کر لوگ جادوگر کہتے، دعوائے نبوت کو سن کر مجنوں کہتے، باہر نکلتے تو شریر لڑکے پیچھے پیچھے غول باندھ کر چلتے، نماز جماعت میں قرآن زور سے پڑھتے تو قرآن، قرآن کے لانے والے (رسول ﷺ) اور قرآن کے اتارنے والے (خدا) کو گالیاں دیتے۔) ۴

ایک دفعہ آپ ﷺ حرم میں نماز پڑھ رہے تھے، رؤسائے قریش بھی موجود تھے، ابوجہل نے کہا "کاش اس وقت کوئی جاتا اور اونٹ کی اوجھ نجاست سمیت اٹھا لاتا کہ جب محمد سجدہ میں جاتے تو ان کے گردن پر ڈال دیتا" عقبہ نے کہا "یہ خدمت میں انجام دیتا ہوں" چنانچہ اوجھ لا کر آپ کی گردن پر ڈال دی، قریش مارے خوشی کے ایک دوسرے پر گرے پڑتے تھے، کسی نے جا کر حضرت فاطمہ کو خبر کی، وہ اگرچہ اس وقت صرف پانچ چھ برس کی تھیں لیکن جوش محبت سے دوڑی

۱ روض الانف بحوالہ قاسم بن ثابت۔

۲ طبری ج ۳ ص ۱۲۰۵ "ن"۔

۳ ابن سعد جلد اول صفحہ ۱۳۲۔

۴ مسند امام احمد بن حنبل جلد ۱ صفحہ ۲۰۴۔

۵ صحیح بخاری ص ۶۹۶۔

رسانی سے تنگ آ کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں عرض کی کہ آپ ان کے حق میں بددعا کیوں نہیں فرماتے؟ تو آپ ﷺ کا چہرہ سرخ ہو گیا اور فرمایا کہ "تم سے پہلے جو لوگ گزرے ہیں ان کے سر پر آرے چلائے جاتے اور چیر ڈالے جاتے تھے تاہم وہ اپنے فرض سے باز نہ آتے۔ خدا اس کام کو پورا کرے گا یہاں تک کہ شتر سوار صنعاء سے حضرموت تک سفر کرے گا اور اس کو خدا کے سوا کسی کا ڈر نہ ہوگا"۔ کیا یہ پیشین گوئی حرف بحرف پوری نہیں ہوئی؟ ۱؎

(پچھلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ)

قرآن مجید کی صداقت خود بخود واضح ہوتی ہے۔ چند سال پہلے انجیل برنباس کا نسخہ دریافت ہوا تھا اس میں بائبل سے زیادہ صراحت و وضاحت کے ساتھ یہ حقیقت بیان کی ہے کہ حضرت عیسیٰ کو سولی نہیں دی گئی تھی بلکہ ان کی شبیہ یہودا اسکریوطی مصلوب ہوا تھا، حال ہی میں انجیل کا ایک اور نسخہ دریافت ہوا ہے جو [illegible] کی طرف منسوب ہے اس میں بالکل صاف الفاظ میں یہ لکھا ہے کہ حضرت مسیح کو سولی دینے سے پہلے آسمان پر اٹھا لیا گیا تھا۔ (الحق، [illegible] ۱۹۷۰ء) [illegible]

۱؎ صحیح بخاری [illegible]

انصار نے مدینہ اور اطراف مدینہ میں کثرت سے چھوٹے چھوٹے قلعے بنا لئے۔ اوس اور خزرج ایک مدت تک باہم متحد رہے لیکن پھر عرب کی فطرت کے موافق خانہ جنگیاں شروع ہو گئیں اور سخت خونریز لڑائیاں ہوئیں، سب سے اخیر لڑائی میں جس کو بعاث کہتے ہیں ایسے زور کا معرکہ ہوا کہ دونوں خاندانوں کے تمام نامور لڑ کر مر گئے انصار اب اس قدر ضعیف ہو گئے کہ انہوں نے قریش کے پاس سفارت بھیجی کہ ہم کو حلیف بنا لیجئے لیکن ابو جہل نے معاملہ درہم برہم کر دیا۔

انصار گو بت پرست تھے چونکہ یہود سے میل جول تھا اس لئے نبوت اور کتب آسمانی سے کان آشنا تھے یہود سے گو انصار ایک گونہ رقابت رکھتے تھے لیکن ان کے علمی فضل و کمال کے معترف تھے یہود نے مدینہ میں جو علمی مدارس قائم کئے تھے اور جن کو بیت المدارس کہتے تھے (بخاری وغیرہ میں نام مذکور ہے[1]) ان میں تورات کی تعلیم ہوتی تھی، انصار جاہل تھے اس لئے ان پر یہود کے علمی تفوق کا خواہ مخواہ اثر پڑتا تھا یہاں تک کہ انصار میں سے جس کے اولاد نہیں جیتی تھی وہ منت مانتا تھا کہ بچہ زندہ رہے گا تو یہودی بنا دیا جائے گا۔[2]

یہودی عموماً یقین رکھتے تھے کہ ایک پیغمبر ابھی اور آنے والا ہے اس بنا پر انصار بھی ایک پیغمبر موعود کے نام سے آشنا تھے۔

انصار میں ایک شخص سوید بن صامت جو شاعری اور جنگ آوری میں ممتاز تھا اس کو امثال لقمان کا نسخہ ہاتھ آ گیا تھا جس کو وہ کتاب آسمانی سمجھتا تھا وہ ایک دفعہ حج کو گیا آنحضرت ﷺ نے اس کے حالات سنے تو خود اس کے پاس تشریف لے گئے اس نے امثال لقمان پڑھ کر سنائے آپ نے فرمایا "میرے پاس اس سے بھی بہتر چیز ہے"۔ یہ کہہ کر قرآن مجید کی چند آیتیں پڑھیں سوید نے تحسین[3] کی اگرچہ وہ مدینہ واپس آ کر جنگ بعاث میں مارا گیا لیکن اسلام کا معتقد ہو چکا تھا۔

سوید شجاعت اور شاعری دونوں میں کمال رکھتا تھا، ایسے شخص کو اہل عرب "کامل" کہتے تھے اور اسی بنا پر سوید اسی لقب سے پکارا جاتا تھا[4] سوید کے سوا اب اسلام کا اثر انصار پر پڑ چلا تھا۔

اوس اور خزرج کے معرکوں میں اوس کو جب شکست ہوئی تو اوس کے لوگ قریش کے پاس گئے کہ خزرج کے مقابلہ میں ان کو حلیف بنائیں اس سفارت میں ایاس بن معاذ بھی تھے۔ رسول اللہ ﷺ کو ان لوگوں کا آنا معلوم ہوا تو آپ ان کے پاس تشریف لے گئے اور قرآن مجید کی چند آیتیں پڑھ کر سنائیں ایاس نے ساتھیوں سے کہا کہ "خدا کی قسم جس غرض کے لئے آئے ہو یہ کام اس سے بھی بہتر ہے" لیکن قافلہ سالار یعنی ابو الحیسر نے سنگریزے اٹھا کر ان کے منہ پر

---

[1] بخاری ج ۲ ص ۱۰۲۴ کتاب الاکراہ باب فی بیع المکرہ ونحوہ فی الحق وغیرہ "س"

[2] کتب تفسیر میں لا اکراہ فی الدین کی تفسیر دیکھو

[3] اسد الغابہ ابن کثیر ج ۲ ص ۳۷۸ "س"

[4] سوید کا ذکر ابن ہشام میں ہے لیکن روض الانف میں زیادہ تفصیل ہے اصابہ میں بھی اس کا حال ہے لیکن نسب میں اختلاف ہے اور امثال لقمان کا ذکر نہیں ہے طبری میں بھی سوید کا حال اور قصیدے کے اشعار مذکور ہیں، دیکھو صفحہ ۱۳۰۸۔

مار دیں اور کہا کہ "ہم اس کام کے لئے نہیں آئے" اس کے بعد بعاث کا معرکہ پیش آ گیا اور ایاس آنحضرت ﷺ کی ہجرت سے پہلے انتقال کر گئے۔ لوگوں کا بیان ہے کہ مرتے وقت ایاس کی زبان پر تکبیر جاری تھی۔[1]

انصار کے اسلام لانے کی ابتدا ۱۰ نبوی:

جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے آنحضرت ﷺ کا معمول تھا کہ حج کے زمانہ میں روسائے قبائل کے پاس جا کر تبلیغ اسلام فرمایا کرتے تھے اس سال (رجب ۱۰ نبوی) میں بھی آپ متعدد قبائل کے پاس تشریف لے گئے، عقبہ کے پاس جہاں اب مسجد العقبہ ہے، خزرج کے چند اشخاص آپ کو نظر آئے، آپ نے ان سے نام و نسب پوچھا، انہوں نے کہا "خزرج" آپ نے دعوت اسلام دی اور قرآن مجید کی آیتیں سنائیں، ان لوگوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کہا "دیکھو یہود ہم سے اس اولیت میں بازی نہ لے جائیں"۔ یہ کہہ کر سب نے ایک ساتھ اسلام قبول کیا[2] یہ چھ شخص تھے جن کے نام حسب ذیل ہیں:۔[3]

---

[1] طبری اور اصابہ میں یہ واقعہ تفصیل سے مذکور ہے، اصابہ میں لکھا ہے کہ ایاس کا حال امام بخاری نے تاریخ کبیر میں لکھا ہے۔ البدایہ والنہایہ ابن کثیر ج ۳ ص ۱۴۸ "س"

[2] مدینہ منورہ کے یہ حضرات جو پہلے پہل اسلام لائے بعض مصنفین سیرت نے ان کے اس قبول اسلام کے واقعہ کا تذکرہ بیعت عقبہ اولیٰ کے عنوان سے کیا ہے۔ یہ عنوان کتب سیرت کے ناظرین کے لئے اس وقت پریشانی کا موجب بن جاتا ہے جب وہ دوسری کتابوں (مثلاً مستدرک حاکم ج ۳ ص ۴۴۲ ابن کثیر علی حاشیہ فتح البیان ج ۹ ص ۲۲۳) میں دیکھتے ہیں کہ بیعت عقبہ اولیٰ میں بارہ آدمی تھے۔ اسی اختلاف روایت کے سبب سے بعض مصنفین سیرت بیعت عقبہ ثانیہ میں بارہ آدمی اور بعض ۷۳ آدمی بتلاتے ہیں حالانکہ اصل صورت یہ ہے کہ چھ یا آٹھ آدمی جو شروع شروع میں اسلام لائے ان کے واقعہ قبول اسلام کا عنوان بیعت عقبہ اولیٰ نہیں بلکہ ابتدائے اسلام انصار ہونا چاہیے اور دوسرے سال جبکہ گیارہ یا بارہ آدمی حاضر خدمت ہوئے ہیں یہ بیعت عقبہ اولیٰ ہے[1] (سیرت حلبیہ) حضرت عبادہ بن الصامت نے صراحت فرمایا ہے کہ کنا اثنا عشر فی العقبۃ الاولیٰ من الاسلام المقبل[2] (مستدرک ج ۳ صفحہ ۴۴۲ حیدرآباد دکن) اس روایت میں حضرت عبادہ الاسلام المقبل میں بیعت عقبہ اولیٰ کا ہونا فرماتے ہیں اور اس میں گیارہ آدمیوں کے ہونے کی صراحت فرماتے ہیں اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس سے پہلے جو لوگ آ کر اسلام قبول کر چکے تھے اس کا تعلق بیعت عقبہ اولیٰ سے نہیں ہے۔

جن لوگوں نے انصار کے ابتدائے اسلام کے واقعہ کا نام بیعت عقبہ اولیٰ رکھا ہے وہ تین بیعت عقبہ کا عنوان دیتے ہیں۔ یعنی ایک یہ بیعت عقبہ اولیٰ دوسری وہ بیعت عقبہ جس میں گیارہ یا بارہ آدمی اسلام لائے اور تیسری وہ بیعت عقبہ جس میں ۷۳ افراد مشرف بہ اسلام ہوئے اور یہ تینوں واقعے ایک ایک سال کے فصل سے حج کے موسم میں پیش آئے اور جن لوگوں نے انصار کے ابتدائے اسلام کے واقعہ کو صرف ابتدائے اسلام انصار کے عنوان سے ذکر کیا ہے انہوں نے گیارہ آدمیوں والی بیعت کو بیعت عقبہ اولیٰ اور ۷۳ آدمیوں والی بیعت کو بیعت عقبہ ثانیہ کے عنوان سے ذکر کیا ہے (ملاحظہ ہو تاریخ خمیس اول صفحہ ۳۰۶، ۳۱۲ تا ۳۱۳ و زرقانی علی المواہب ج ۱ ص ۳۰۶ تا ۳۱۷) "س"

[3] یہ واقعات تمام تاریخوں میں مذکور ہیں، ہم نے زرقانی کو پیش نظر رکھا ہے کیونکہ اس نے تمام مختلف روایتیں جمع کر دی ہیں ان [illegible] تعداد میں بعضوں نے آٹھ بیان کی ہے اسعد بن زرارہ اور ابو الہیثم کا پہلے سے مسلمان ہونا ابن سعد نے طبقات میں لکھا ہے۔ دیکھو کتاب [illegible] انصار بدر میں صفحہ ۲۲

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ کریں)

۱۔ ابوالہیثم بن تیہان

۲۔ ابوامامہ اسعد بن زرارہ (صحابہ میں سب سے پہلے انہی نے احد میں وفات پائی۔)

۳۔ عوف بن حارث (بدر میں وفات پائی)۔

۴۔ رافع بن مالک بن عجلان (اس وقت تک جس قدر قرآن اتر چکا تھا آنحضرت ﷺ نے ان کو عنایت فرمایا، جنگ احد میں شہید ہوئے۔)

۵۔ قطبہ بن عامر بن حدیدہ (تینوں عقبات میں شریک رہے)

۶۔ جابر بن عبداللہ (بن رئاب) (یہ مشہور صحابی حضرت جابر بن عبداللہ بن عمروؓ کے علاوہ تھے بدر وغیرہ میں شریک تھے۔)

بیعت عقبہ اولیٰ ۱۱ نبوی:

دوسرے سال بارہ شخص مدینہ منورہ سے آئے اور بیعت کی، اس کے ساتھ اس بات کی بھی خواہش کی کہ احکام اسلام کے سکھانے کے لئے کوئی معلم ان کے ساتھ کر دیا جائے۔ آنحضرت ﷺ نے مصعب بن عمیرؓ کو اس خدمت پر مامور فرمایا۔ مصعبؓ ہاشم بن عبد مناف کے پوتے اور سابقین اسلام میں سے تھے غزوۂ بدر میں لشکر کی علمبرداری کا منصب انہی کو ملا تھا۔ وہ مدینہ میں آ کر اسعد بن زرارہؓ کے مکان پر ٹھہرے جو مدینہ کے نہایت معزز رئیس تھے روزانہ معمول تھا کہ انصار کے ایک ایک گھر کا دورہ کرتے، لوگوں کو اسلام کی دعوت دیتے اور قرآن مجید پڑھ کر سناتے، روزانہ ایک دو نئے آدمی اسلام قبول کرتے، رفتہ رفتہ مدینہ سے قبا تک گھر گھر اسلام پھیل گیا۔ صرف خطمہ، وائل، واقف کے چند گھرانے باقی رہ گئے۔ ابن سعد نے طبقات میں یہ واقعات تفصیل سے لکھے ہیں۔

قبیلہ اوس کے سردار حضرت سعد بن معاذؓ تھے۔ قبیلہ پر ان کا یہ اثر تھا کہ ہر کام میں ان کے اشاروں پر چلتے تھے۔ مصعبؓ نے جب ان کے پاس جا کر اسلام کی دعوت دی تو انہوں نے پہلے نفرت ظاہر کی لیکن جب مصعبؓ نے قرآن مجید کی چند آیتیں پڑھیں تو پتھر موم تھا۔ ان کا اسلام لانا تمام قبیلہ اوس کا اسلام قبول کر لینا تھا۔

بیعت عقبہ ثانیہ ۱۳ نبوی:

اگلے سال بہتر (۷۲) شخص حج کے زمانہ میں آئے اور اپنے ساتھیوں سے (جو بت پرست تھے) چھپ کر مقام منیٰ (عقبہ) میں آنحضرت ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اس موقع پر حضرت عباسؓ بھی جو اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے آنحضرت ﷺ کے ساتھ تھے۔ انہوں نے انصار سے خطاب کر کے کہا "گروہ خزرج! محمد اپنے خاندان میں معزز اور محترم ہیں۔ دشمنوں کے مقابلہ میں ہم ہمیشہ ان کے سینہ سپر رہے، اب وہ تمہارے پاس جانا چاہتے ہیں۔ اگر مرتے دم تک ان کا ساتھ دے سکو تو بہتر ورنہ ابھی سے جواب دے دو۔"

(پچھلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ)

واقدی کا بیان ہے کہ اسعد بن زرارہ اس واقعہ سے پہلے مکہ میں جا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لا چکے تھے۔ (بعضوں نے ابوالہیثم بن تیہان کی جگہ عقبہ بن عامر بن نابی کا نام لکھا ہے اور بعض نے جابر بن رئاب کے بجائے عبادہ بن صامت کو جگہ دی ہے"ب"

بیعت کی خبر پہنچی، انہوں نے تعجب کیا کہ "ایسا ہوتا تو ہم سے کیونکر چھپ سکتا تھا"۔

مدینہ میں اسلام کو پناہ حاصل ہوئی تو آنحضرت ﷺ نے صحابہؓ کو اجازت دی کہ مکہ سے ہجرت کر جائیں۔ قریش کو معلوم ہوا تو انہوں نے روک ٹوک شروع کی لیکن چوری چھپے لوگوں نے ہجرت شروع کر دی۔ رفتہ رفتہ کل صحابہ چلے گئے، صرف آنحضرت ﷺ، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ رہ گئے یا وہ لوگ جو مفلسی سے مجبور تھے، وہ مدت تک نہ جا سکے، یہ آیت انہی کی شان میں ہے۔

﴿وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا﴾ (نساء آیت ۱۰)

کمزور مرد، عورتیں اور بچے جو یہ کہتے ہیں کہ اے خدا! ہم کو اس شہر سے نکال کہ یہاں کے لوگ ظالم ہیں۔

صبح کو قریش کی آنکھیں کھلیں تو پلنگ پر آنحضرت ﷺ کے بجائے حضرت علیؓ تھے، ظالموں نے آپ کو پکڑا اور حرم میں لے جا کر تھوڑی دیر محبوس رکھا اور چھوڑ دیا۔[1] پھر آنحضرت ﷺ کی تلاش میں نکلے، ڈھونڈتے ڈھونڈتے غار کے دہانہ تک آ گئے۔ آہٹ پا کر حضرت ابوبکرؓ غمزدہ ہوئے اور آنحضرت ﷺ سے عرض کی کہ "اب دشمن اس قدر قریب آ گئے ہیں کہ اگر اپنے قدم پر ان کی نظر پڑ جائے تو ہم کو دیکھ لیں گے" آپ ﷺ نے فرمایا۔

﴿لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا﴾ [التوبہ]

گھبراؤ نہیں، خدا ہمارے ساتھ ہے۔

مشہور ہے کہ جب کفار غار کے قریب آ گئے تو خدا نے حکم دیا، دفعۃً ببول کا درخت اگا اور اس کی ٹہنیوں نے پھیل کر آنحضرت ﷺ کو چھپا لیا، ساتھ ہی دو کبوتر آئے اور گھونسلہ بنا کر انڈے دیئے، حرم کے کبوتر انہی کبوتروں کی نسل سے ہیں۔ اس روایت کو مواہب لدنیہ میں تفصیل سے نقل کیا ہے اور زرقانی نے بزار وغیرہ سے اس کے ماخذ بتائے ہیں، لیکن یہ تمام سند اضعف الطرق ہیں۔ اس روایت کا اصل راوی عون بن عمرو ہے، اس کی نسبت امام فن رجال یحییٰ بن معین کا قول ہے "لاشیء" یعنی "ہیچ ہے"، امام بخاری نے کہا ہے کہ "وہ منکر الحدیث اور مجہول ہے"۔ اس روایت کا ایک اور راوی ابو مصعب مکی ہے، وہ مجہول الحال ہے۔ چنانچہ علامہ ذہبیؒ نے میزان الاعتدال میں عون بن عمرو کے حال میں یہ تمام اقوال نقل کئے ہیں اور خود اس روایت کا بھی ذکر کیا ہے۔[2]

بہرحال چوتھے دن آپ غار سے نکلے، عبداللہ بن اریقط ایک کافر جس پر اعتماد تھا رہنمائی کے لئے اجرت پر مقرر کر لیا گیا، وہ آگے آگے راستہ بتاتا جاتا تھا۔ ایک رات دن برابر چلے گئے۔ دوسرے دن دوپہر کے وقت دھوپ سخت ہو گئی تو حضرت ابوبکرؓ نے چاہا کہ رسول اللہ ﷺ سایہ میں آرام فرما لیں، چاروں طرف نظر ڈالی، ایک چٹان کے نیچے سایہ نظر آیا، سواری سے اتر کر زمین جھاڑی، پھر اپنی چادر بچھا دی، آنحضرت ﷺ نے آرام فرمایا تو تلاش میں نکلے کہ کہیں کچھ کھانے کو مل جائے تو لائیں۔ پاس ہی ایک چرواہا بکریاں چرا رہا تھا، اس سے کہا کہ ایک بکری کا تھن گرد و غبار سے صاف کر دے، پھر اس کے ہاتھ صاف کرائے اور دودھ دوہا، برتن کے منہ پر کپڑا لپیٹ دیا کہ گرد نہ پڑنے پائے، دودھ لے کر آنحضرت ﷺ کے پاس آئے اور تھوڑا سا پانی ملا کر پیش کیا، آپ نے پی کر فرمایا کہ "کیا ابھی چلنے کا وقت نہیں آیا؟" آفتاب ڈھل چکا تھا، اس لئے آپ وہاں سے روانہ ہوئے۔[3]

قریش نے اشتہار دیا تھا کہ جو شخص محمد ﷺ یا ابوبکرؓ کو گرفتار کر کے لائے گا، اس کو ایک خون بہا کے برابر (یعنی سو اونٹ) انعام دیا جائے گا، سراقہ بن جعشم[4] نے سنا تو انعام کے لالچ میں تلاش میں نکلا، عین اس حالت میں کہ آپ روانہ ہو رہے

---

1. تاریخ طبری جلد ۳ صفحہ [illegible]
2. [illegible]
3. یہ پوری تفصیل [illegible]
4. سراقہ بعد کو مسلمان ہو گئے اور جب ایران فتح ہوا اور کسریٰ کے زیورات غنیمت میں آئے تو حضرت عمرؓ نے انہی کو وہ زیورات پہنا کر [illegible] پیشین گوئی کا تماشا دکھایا۔

تھا اس نے آپ ﷺ کو دیکھ لیا اور گھوڑا دوڑا کر قریب آ گیا لیکن گھوڑے نے ٹھوکر کھائی وہ گر پڑا ترکش سے فال کے تیر نکالے کہ حملہ کرنا چاہئے یا نہیں؟ جواب میں "نہیں" نکلا لیکن سو اونٹوں کا گراں بہا معاوضہ ایسا نہ تھا کہ تیر کی بات مان لی جاتی، دوبارہ گھوڑے پر سوار ہوا اور آگے بڑھا۔ اب کی بار گھوڑے کے پاؤں گھٹنوں تک زمین میں دھنس گئے گھوڑے سے اتر پڑا اور پھر فال دیکھی اب بھی وہی جواب تھا لیکن مکرر تجربہ نے اس کی ہمت پست کر دی اور یقین ہو گیا کہ یہ کچھ اور آثار ہیں۔ آنحضرت ﷺ کے پاس آ کر قریش کے اشتہار کا واقعہ سنایا اور درخواست کی کہ مجھ کو امن کی تحریر لکھ دیجئے۔ حضرت ابوبکرؓ کے غلام عامر بن فہیرہؓ نے چمڑے کے ایک ٹکڑے پر فرمان امن لکھ دیا۔[1]

حسن اتفاق یہ کہ حضرت زبیرؓ شام سے تجارت کا سامان لے کر آ رہے تھے انہوں نے آنحضرت ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ کی خدمت میں چند بیش قیمت کپڑے پیش کئے جو اس بے سروسامانی میں غنیمت تھے۔

ابن سعد نے طبقات میں اس مقدس سفر کی تمام منزلیں گنائی ہیں۔ اگرچہ عرب کے نقشوں میں آج ان کا نشان نہیں ملتا، تاہم عقیدت مند صرف نام سے لذت یاب ہو سکتے ہیں، قرار، ثنیۃ المرۃ، لقف، مدلجہ، مرجح، حداید، اذاخر، رابغ (یہ مقام آج بھی حجاج کے رستے میں آتا ہے یہاں آپ ﷺ نے مغرب کی نماز پڑھی) ذوسلم، عثانیہ، قاحہ، عرج، جدوات، رکوبہ، عقیق، جثجاثہ۔

تشریف آوری کی خبر مدینہ میں پہلے ہی پہنچ چکی تھی تمام شہر ہمہ تن چشم انتظار تھا، معصوم بچے فخر اور جوش میں کہتے تھے کہ "پیغمبر آ رہے ہیں"۔ لوگ ہر روز تڑکے سے نکل نکل کر شہر کے باہر جمع ہوتے اور دوپہر تک انتظار کر کے حسرت کے ساتھ واپس چلے جاتے، ایک دن انتظار کر کے واپس جا چکے تھے کہ ایک یہودی نے قلعہ سے دیکھا اور قرائن سے پہچان کر پکارا کہ "اہل عرب لو تم جس کا انتظار کرتے تھے وہ آ گیا"۔ تمام شہر تکبیر کی آواز سے گونج اٹھا، انصار ہتھیار سجا سجا کر بیتابانہ گھروں سے نکل آئے۔

مدینہ منورہ سے تین میل کے فاصلہ پر جو بالائی آبادی ہے اس کو عالیہ اور قباء کہتے ہیں۔ یہاں انصار کے بہت سے خاندان آباد تھے ان میں سب سے زیادہ ممتاز عمرو بن عوف کا خاندان تھا اور کلثوم بن الہدم خاندان کے افسر تھے۔ آنحضرت ﷺ یہاں پہنچے تو تمام خاندان نے جوش مسرت میں اللہ اکبر کا نعرہ مارا۔ یہ فخر ان کی قسمت میں تھا کہ میزبان دو عالم ﷺ نے انہی کی مہمانی قبول کی انصار ہر طرف سے جوق در جوق آتے اور جوش عقیدت کے ساتھ سلام عرض کرتے۔[2]

اکابر صحابہؓ جو آنحضرت ﷺ سے پہلے مدینہ میں آ چکے تھے وہ بھی انہی کے گھر میں اترے تھے چنانچہ حضرت ابوعبیدہؓ، مقدادؓ، خبابؓ، سہیلؓ، صفوانؓ، عیاضؓ، عبداللہ بن مخرمہؓ، وہبؓ بن سعد، معمرؓ بن ابی سرح، عمیرؓ بن عوف اب تک انہی کے مہمان تھے۔[3] جناب امیرؓ آنحضرت ﷺ کے روانہ ہونے کے تین دن بعد مکہ سے چلے تھے وہ بھی

---

1. صحیح بخاری باب ہجرۃ النبی ﷺ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پریشانی میں بھی دوات قلم ساتھ رہتا تھا۔
2. صحیح بخاری صفحہ ۵۵۵ و طبقات ابن سعد ہجرت نبوی صفحہ ۱۵۸
3. ابن سعد تذکرہ کلثوم بن ہدم

گئے اور چند دن مقیم رہے۔ تمام مؤرخین اور ارباب سیر لکھتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے یہاں صرف چار دن قیام فرمایا لیکن صحیح بخاری میں چودہ دن ہے اور یہی قرین قیاس ہے۔

یہاں آپ ﷺ کا پہلا کام مسجد کا تعمیر کرنا تھا۔ حضرت کلثوم کی ایک افتادہ زمین تھی جہاں کھجوریں سکھائی جاتی تھیں، یہیں دست مبارک سے مسجد کی بنیاد ڈالی یہی مسجد ہے جس کی شان میں قرآن مجید میں ہے۔

﴿لَمَسْجِدٌ أُسِّسَ عَلَى التَّقْوَىٰ مِنْ أَوَّلِ يَوْمٍ أَحَقُّ أَنْ تَقُومَ فِيهِ ۚ فِيهِ رِجَالٌ يُحِبُّونَ أَنْ يَتَطَهَّرُوا ۚ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِينَ﴾ (توبہ-۱۳)

وہ مسجد جس کی بنیاد پہلے ہی دن پرہیزگاری پر رکھی گئی ہے وہ اس بات کی زیادہ مستحق ہے کہ تم اس میں کھڑے ہو، اس میں ایسے لوگ ہیں جن کو صفائی بہت پسند ہے اور خدا صاف رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

مسجد کی تعمیر میں مزدوروں کے ساتھ آپ ﷺ خود بھی کام کرتے تھے بھاری بھاری پتھروں کے اٹھانے کے وقت جسم مبارک خم ہو جاتا تھا۔ عقیدت مند آتے اور عرض کرتے ''ہمارے ماں باپ آپ پر فدا ہوں آپ چھوڑ دیں ہم اٹھائیں گے'' آپ ان کی درخواست قبول فرماتے لیکن پھر اسی وزن کا دوسرا پتھر اٹھا لیتے۔[1]

عبداللہ بن رواحہ شاعر تھے وہ بھی مزدوروں کے ساتھ شریک تھے اور جس طرح مزدور کام کرنے کے وقت تھکن مٹانے کو گاتے جاتے ہیں وہ یہ اشعار پڑھتے جاتے تھے:

أَفْلَحَ مَنْ يُعَالِجُ الْمَسَاجِدَا	وہ کامیاب ہے جو مسجد تعمیر کرتا ہے
وَيَقْرَأُ الْقُرْآنَ قَائِمًا وَقَاعِدًا	اور اٹھتے بیٹھتے قرآن پڑھتا ہے۔
وَلَا يَبِيتُ اللَّيْلَ عَنْهُ رَاقِدًا	اور رات کو جاگتا رہتا ہے۔

آنحضرت ﷺ بھی ہر ہر قافیہ کے ساتھ آواز ملاتے جاتے تھے۔[2]

تاریخ میں آپ کا داخلہ اسلام کے دور جدید کی ابتدا ہے اس لئے مؤرخین نے اس تاریخ کو زیادہ اہتمام کے ساتھ محفوظ رکھا ہے۔ اکثر مؤرخین کا اتفاق ہے کہ یہ آٹھ ربیع الاول ۱۳ نبوی (مطابق ۲۰ ستمبر ۶۲۲ء) تھی۔ (محمد بن) موسیٰ خوارزمی نے لکھا ہے کہ جمعرات کا دن اور فارسی ماہ تیر کی چوتھی تاریخ اور رومی ماہ ایلول ۹۳۳ سکندری کی دسویں تاریخ تھی۔[3] مؤرخ یعقوبی نے ہیئت دانوں سے یہ زائچہ نقل کیا ہے۔

آفتاب	برج سرطان میں	۲۳ درجہ ۹ دقیقہ پر
زحل	برج حوت میں	۳ درجہ

1. وفاء الوفاء بحوالہ طبرانی کبیر جلد اول صفحہ ۱۹۰
2. وفاء الوفاء جلد اول صفحہ ۱۸۱ مصر
3. یعقوبی تاریخ جلد دوم صفحہ ۴۱ [illegible]

حضرت ابو ایوب کا مکان دو منزلہ تھا، انہوں نے بالائی منزل پیش کی لیکن آپ ﷺ نے زائرین کی آسانی کے لئے نیچے کا حصہ پسند فرمایا۔ ابو ایوب دونوں وقت آپ کی خدمت میں کھانا بھیجتے اور آپ ﷺ جو چھوڑ دیتے ابو ایوب اور ان کی زوجہ کے حصہ میں آتا، کھانے میں جہاں آنحضرت ﷺ کی انگلیوں کا نشان پڑا ہوتا ابو ایوب تبرکاً وہیں انگلیاں ڈالتے۔

ایک دن اتفاق سے بالائی منزل میں پانی کا برتن ٹوٹ گیا، اندیشہ ہوا کہ پانی بہہ کر نیچے جائے اور آنحضرت ﷺ کو تکلیف ہو، گھر میں اوڑھنے کا صرف ایک لحاف تھا، حضرت ابو ایوب نے اس کو ڈال دیا کہ پانی جذب ہو کر رہ جائے۔[1]

آنحضرت ﷺ نے سات مہینہ تک یہیں قیام فرمایا۔ اس اثناء میں جب مسجد نبوی اور آس پاس کے حجرے تیار ہو گئے تو آپ نے نقل مکانی فرمائی، تفصیل آگے آتی ہے۔

مدینہ میں آ کر آپ نے حضرت زید (اور اپنے غلام ابو رافع) کو دو اونٹ اور پانچ سو درہم دے کر بھیجا کہ مکہ جا کر صاحبزادیوں اور حرم نبوی کو لے آئیں، حضرت ابوبکر نے اپنے بیٹے عبداللہ کو لکھا کہ وہ بھی اپنی ماں اور بہنوں کو لے کر چلے آئیں۔ آنحضرت ﷺ کی صاحبزادیوں میں سے رقیہ حضرت عثمان کے ساتھ حبش میں تھیں۔ حضرت زینب کو ان کے شوہر نے آنے نہ دیا۔ لہٰذا صرف حضرت فاطمہ زہرا (اور حضرت ام کلثوم) اور حضرت سودہ (زوجہ محترمہ نبوی) کو لے کر آئے، حضرت عائشہ اپنے بھائی عبداللہ کے ساتھ آئیں۔[2]

مسجد نبوی اور ازواج مطہرات کے حجروں کی تعمیر:

مدینہ میں قیام کے بعد سب سے پہلا کام ایک خانہ خدا کی تعمیر تھی، اب تک یہ معمول تھا کہ جہاں نماز کا وقت آ جاتا آپ ﷺ نماز پڑھا کرتے تھے۔ مع دولت کدہ کے قریب خاندان نجار کی زمین تھی جس میں کچھ قبریں تھیں، کچھ کھجور کے درخت تھے، آپ ﷺ نے ان لوگوں کو بلا کر فرمایا "میں یہ زمین بہ قیمت لینا چاہتا ہوں"، وہ بولے کہ "ہم قیمت لیں گے لیکن آپ ﷺ سے نہیں بلکہ خدا سے"۔ چونکہ اصل میں وہ زمین دو یتیم بچوں کی تھی آپ ﷺ نے خود ان یتیموں کو بلا بھیجا۔ ان یتیم بچوں نے بھی اپنی زمین نذر کرنی چاہی لیکن آپ ﷺ نے گوارا نہ کیا۔ حضرت ابو ایوب نے قیمت ادا کی، قبریں

(پچھلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ)

"کہ میرے ناقہ کو چھوڑ دو وہ خدا کی طرف سے مامور ہے" چنانچہ حضرت ابو ایوب کے گھر کے سامنے جا کر بیٹھ گیا، اس لئے آپ نے انہی کے گھر پر قیام فرمایا۔ لیکن صحیح مسلم باب الہجرت میں ہے کہ جب لوگوں میں آپ ﷺ کی میزبانی کے متعلق جھگڑا ہوا تو آپ نے فرمایا کہ "میں بنو نجار کے ہاں اتروں گا جو عبدالمطلب کے ماموں ہیں"، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے عمداً ایسا کیا تھا، حضرت ابو ایوب اسی خاندان سے تھے، امام بخاری نے تاریخ صغیر میں تصریح کی ہے کہ ابو ایوب کے گھر اترنا اسی قرابت کی وجہ سے تھا۔

1. اصابہ تذکرہ ابو ایوب، مستدرک حاکم بحوالہ [illegible]
2. ابن سعد جز نساء صفحہ ۴۲
3. ابو داؤد باب بناء المسجد

جاتا تھا، آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش کی۔ آنحضرت ﷺ نے قبول فرما کر اپنی دایہ ام ایمنؓ کو دے دی اور خود فقر و فاقہ اختیار فرمایا۔

اذان کی ابتداء:

اسلام کے تمام عبادات کا اصلی مرکز وحدت و اجتماع ہے۔ اس وقت تک کسی خاص علامت کے نہ ہونے کی وجہ سے نماز جماعت کا کوئی انتظام نہ تھا۔ لوگ وقت کا اندازہ کر کے آتے تھے اور نماز پڑھتے تھے۔ آنحضرت ﷺ کو یہ پسند نہ تھا آپ نے ارادہ فرمایا کہ کچھ لوگ مقرر کر دیئے جائیں جو وقت پر لوگوں کو گھروں سے بلا لائیں لیکن اس میں زحمت تھی۔ صحابہؓ کو بلا کر مشورہ کیا لوگوں نے مختلف رائیں دیں۔ کسی نے کہا نماز کے وقت مسجد پر ایک علم کھڑا کر دیا جائے لوگ دیکھ دیکھ کر آتے جائیں گے آپ نے یہ طریقہ پسند نہ فرمایا۔ عیسائیوں اور یہودیوں کے ہاں اعلان نماز کے جو طریقے ہیں وہ بھی آپ کی خدمت میں عرض کئے گئے لیکن آپ نے حضرت عمرؓ کی رائے پسند کی اور حضرت بلالؓ کو حکم دیا کہ اذان دیں۔ [1] اس سے ایک طرف تو نماز کی اطلاع عام ہو جاتی تھی، دوسری طرف دن میں پانچ دفعہ دعوت اسلام کا اعلان ہو جاتا تھا۔

صحاح ستہ کی بعض کتابوں میں ہے کہ اذان کی تجویز عبداللہ بن زیدؓ نے پیش کی تھی جو انہوں نے خواب میں دیکھی تھی۔ ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ کو بھی خواب میں توارد ہوا۔ لیکن صحیح بخاری کی روایت کے مقابلہ میں کسی اور روایت کو ترجیح نہیں دی جا سکتی۔ [2]

بخاری میں صاف تصریح ہے کہ آنحضرت ﷺ کے سامنے بوق اور ناقوس کی تجویزیں پیش کی گئیں لیکن حضرت عمرؓ نے اذان کی تجویز پیش کی اور آپ ﷺ نے اس کے مطابق حضرت بلالؓ کو بلا کر اذان کا حکم دیا۔ خواب کا ذکر نہیں۔

مواخاۃ:

مہاجرین مکہ معظمہ سے بالکل بے سروسامان آئے تھے۔ گو ان میں دولت مند اور خوشحال بھی تھے لیکن کافروں سے چھپ کر نکلے تھے اس لئے کچھ نہ ساتھ لا سکے تھے۔

۱۔ صحیح بخاری مطبوعہ مصر باب بدء الاذان۔

۲۔ ابوداؤد میں یہ واقعہ، بخاری باب بدء الاذان میں بخاری کی روایت کے مطابق ذکر نہیں۔

۳۔ یہ روایت صحیح بخاری کے علاوہ صحیح مسلم، نسائی، ترمذی میں بھی ہے۔ لیکن تمام روایات کو اور علماء کی تحقیقات کو سامنے رکھنے سے سچی صورت یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت عمرؓ نے جو صورت پیش کی تھی وہ اذان کی نہ تھی بلکہ صرف یہ تھی کہ ایک روایت میں ہے کہ الصلوٰۃ جامعۃ پکار کر نماز کا اعلان کر دے۔ آنحضرت ﷺ نے خود بھی اور بعض صحابہ نے بھی خواب میں اذان کے موجودہ الفاظ کے ساتھ اذان کو خواب میں دیکھا اور آنحضرت ﷺ نے اس کو منجانب اللہ سمجھ کر قبول فرمایا اور اسی کے مطابق اذان ... [illegible]

سنہ ۷ھ میں جو خیبر جب بلاد فتح ہوئے اور ان کی زمین اور نخلستان قبضہ میں آئے تو آنحضرت ﷺ نے انصار کو بلا کر فرمایا "کہ مہاجرین نادار ہیں، اگر تمہاری مرضی ہو تو تمہارے مقبوضات تم ان کو دے دیے جائیں اور تم اپنے نخلستان واپس لے لو" انصار نے عرض کی کہ نہیں وہ سے نخلستان بھائیوں ہی کے قبضہ میں رہنے دیجئے اور نئے بھی انہی کو عنایت فرما دیجئے۔ [۱]

دنیا انصار کے اس ایثار پر ہمیشہ ناز کرے گی لیکن یہ بھی دیکھو کہ مہاجرین نے کیا کیا؟ حضرت سعد بن الربیعؓ نے جب حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کو ایک ایک چیز کا جائزہ دے کر نصف لے لینے کی درخواست کی تو انہوں نے کہا "خدا یہ سب آپ کو مبارک کرے مجھ کو صرف بازار کا راستہ بتا دیجئے"۔ انہوں نے قینقاع کا جو مشہور بازار تھا راستہ بتا دیا۔ انہوں نے جا کر کچھ گھی کچھ پنیر خریدا اور شام تک خرید و فروخت کی۔ چند روز میں اتنا سرمایہ ہو گیا کہ شادی کر لی۔ رفتہ رفتہ ان کی تجارت کو یہ ترقی ہوئی کہ خود ان کا قول تھا کہ خاک پر ہاتھ ڈالتا ہوں تو سونا بن جاتی ہے۔ ان کا اسباب تجارت سات سات سو اونٹوں پر لد کر آتا تھا اور جس دن مدینہ میں پہنچتا تمام شہر میں دھوم مچ جاتی تھی۔ [۲]

بعض صحابہؓ نے دکانیں کھول لیں، حضرت ابوبکرؓ کا کارخانہ سنح میں تھا جہاں وہ کپڑے کی تجارت کرتے تھے۔ [۳] حضرت عثمانؓ جو قینقاع کے بازار میں کھجور کی خرید و فروخت کرتے تھے [۴] حضرت عمرؓ بھی تجارت میں مشغول ہو گئے تھے [۵] اور شاید ان کی اس تجارت کی وسعت ایران تک پہنچ گئی تھی [۶] دیگر صحابہؓ نے بھی اسی قسم کی چھوٹی بڑی تجارت شروع کر دی تھی۔ صحیح بخاری میں روایت ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ پر لوگوں نے جب کثرت روایت کی بنا پر اعتراض کیا کہ اور صحابہؓ تو اس قدر روایت نہیں کرتے تو انہوں نے کہا "اس میں میرا کیا قصور ہے دیگر صحابہؓ بازار میں تجارت کرتے تھے اور میں رات دن بارگاہ نبوت میں حاضر رہتا تھا"۔ پھر جب خیبر فتح ہوا تو تمام مہاجرین نے یہ نخلستان انصار کو واپس کر دیے۔ صحیح مسلم باب الجہاد میں ہے۔

﴿ان رسول الله ﷺ لما فرغ من قتال اهل خيبر و انصرف الى المدينة رد المهاجرون الى الانصار منائحهم التي كانوا منحوهم من ثمارهم﴾

آنحضرت ﷺ جب جنگ خیبر سے فارغ ہو کے مدینہ واپس آئے تو مہاجرین نے انصار کے عطیے جو نخلستان کی صورت میں تھے واپس کر دیے۔

---

۱ فتوح البلدان مطبوعہ یورپ صفحہ ۲۱۔

۲ صحیح بخاری میں دو مختلف موقعوں پر یہ واقعہ مذکور ہے۔ کتاب البیوع اور باب کیف آخی النبی ﷺ، باب اخاء النبی ﷺ بین المہاجرین والانصار، باب الولیمہ ولو بشاۃ" میں۔

۳ اسد الغابہ جلد ۳ صفحہ ۲۲۳ و صفحہ ۲۱۶ وغیرہ میں یہ واقعہ مذکور ہے۔

۴ ابن سعد جلد ۳ صفحہ ۱۳۰۔

۵ مسند امام احمد بن حنبل جلد ۱ صفحہ ۲۳۔

۶ مسند ابن حنبل جلد ۲ صفحہ ۲۰۰۔

۷ مسند ابن حنبل جلد ۲ صفحہ ۳۴۳۔

مہاجرین کے لئے مکانات کا یہ انتظام ہوا کہ انصار نے اپنے گھروں کے آس پاس جو افتادہ زمینیں تھیں ان کو دے دیں اور جن کے پاس زمین نہ تھی انہوں نے اپنے مسکونہ مکانات دے دیئے سب سے پہلے حارثہؓ بن نعمان نے اپنی زمین پیش کی جو زیادہ تر مسجد نبوی کے عقب میں آباد ہوئے عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے یہاں ایک قطعہ (جس کو آج بھی بہتا زیادہ موزوں ہوگا) اتروایا حضرت زبیر بن العوامؓ کو ایک وسیع زمین (ہاتھ آئی) حضرت عثمانؓ، مقدادؓ، حضرت عبیدؓ کو انصار نے اپنے مکانات کے پہلو میں زمینیں دیں۔ [1] مواخات کے رشتے سے جو لوگ آپس میں بھائی بھائی بنے ان میں سے بعض حضرات کے نام یہ ہیں۔ [2]

مہاجرین	انصار
حضرت ابوبکرؓ	حضرت خارجہؓ بن زید انصاری
حضرت عمرؓ	حضرت عتبانؓ بن مالک انصاری
حضرت عثمانؓ	حضرت اوسؓ بن ثابت انصاری
حضرت ابوعبیدہ بن جراحؓ	حضرت سعدؓ بن معاذ انصاری
حضرت زبیرؓ بن العوام	حضرت سلامہؓ بن وقش
حضرت مصعبؓ بن عمیر	حضرت ابوایوبؓ انصاری
حضرت عمار بن یاسرؓ	حضرت حذیفہؓ بن یمان
حضرت ابوذر غفاریؓ	حضرت منذرؓ بن عمرو
حضرت سلمان فارسیؓ	حضرت ابودرداءؓ
حضرت بلالؓ	حضرت ابورویحہؓ
حضرت ابوحذیفہؓ بن عتبہ بن ربیعہ	حضرت عباد بن بشرؓ
حضرت سعیدؓ بن زید بن عمرو بن نفیل	حضرت ابی بن کعبؓ

مواخات کا رشتہ بظاہر ایک عارضی ضرورت کے لئے قائم کیا گیا کہ بے خانماں مہاجرین کا چند روزہ انتظام ہو جائے لیکن درحقیقت یہ عظیم الشان اغراض اسلامی کی تکمیل کا سامان تھا۔

اسلام تہذیب اخلاق و تکمیل فضائل کی شہنشاہی ہے اس سلطنت کیلئے وزراء ارباب تدبیر، سپہ سالاران لشکر اور تعلیم کے لوگ درکار تھے شرف صحبت کی برکت سے مہاجرین میں اولوالعزم بزرگوں کا ایک گروہ تیار ہو چکا تھا اور ان میں یہ وصف پیدا ہو چکا تھا کہ ان کی درسگاہ تربیت سے اور ارباب استعداد بھی تربیت پا کر نکلیں اس بنا پر جن لوگوں میں رشتہ اخوت قائم کیا گیا ان میں اس بات کا لحاظ رکھا گیا کہ استاد اور شاگرد میں وہ تعلق موجود ہو جو تربیت پذیری کے لئے ضرور ہے تفحص اور استقصاء سے معلوم ہوگا کہ جو شخص جس کا بھائی بنایا گیا دونوں میں یہ اتحاد مذاق ملحوظ رکھا گیا اور

۱ [illegible]

۲ [illegible]

درخواست کی کہ میرے ہاتھوں میں چکی پیستے پیستے نیل پڑ گئے ہیں مجھ کو ایک کنیز عنایت ہو تو فرمایا کہ "یہ نہیں ہو سکتا کہ تم کو دوں اور صفہ والے بھوک سے مریں"۔[1] راتوں کو یہ لوگ عبادت کرتے اور قرآن مجید پڑھا کرتے۔ ان سب کے ایک معلم مقرر تھا، ان کے پاس جا کر پڑھتے۔[2] اسی بنا پر ان میں سے اکثر "قاری" کہلاتے تھے۔ اشاعت اسلام کے لیے کہیں بھیجنا ہوتا تو یہ لوگ بھیجے جاتے تھے، غزوہ بئر معونہ میں انہی میں سے ستر آدمی اسلام سکھانے کے لیے بھیجے گئے تھے۔

ان کی تعداد گھٹتی اور بڑھتی رہتی تھی۔ مجموعی تعداد ۴۰۰ تک پہنچی تھی لیکن کبھی ایک زمانہ میں اس قدر تعداد یکجا نہیں ہوئی۔ صفہ میں اس قدر گنجائش بھی نہ تھی۔[3] ان لوگوں کا مفصل[4] حال ابن الاعرابی احمد بن محمد البصری المتوفی ۳۴۰ھ (جو ابن منده کے استاد تھے) نے ایک الگ تصنیف میں لکھا ہے۔ سلمی نے بھی ان کے حالات میں ایک الگ کتاب لکھی ہے۔

مدینہ کے یہود اور ان سے معاہدہ:

مؤرخین عرب کا بیان ہے کہ مدینہ کے یہود نسلاً یہودی تھے اور اس تقریب سے عرب میں آئے تھے کہ حضرت موسیٰؑ نے ان کو عمالقہ کے مقابلہ کے لیے بھیجا تھا لیکن بہ روئے قرائن سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ یہود کو تمام دنیا میں پھیلے لیکن انہوں نے اپنے نام کہیں نہیں بدلے۔ آج بھی وہ جہاں ہیں اسرائیلی نام رکھتے ہیں۔ بخلاف اس کے عرب کے یہودیوں کے نام نضیر، قینقاع، مرحب، حارث وغیرہ ہوتے تھے جو خالص عربی نام ہیں۔ یہود عموماً بزدل اور دون ہمت ہوتے ہیں چنانچہ حضرت موسیٰؑ نے ان سے لڑنے کے لیے کہا تو بولے:

﴿فَاذْهَبْ أَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا هَاهُنَا قَاعِدُونَ﴾ (مائدہ)

تم اپنے خدا کے ساتھ جاؤ لڑو۔ ہم یہاں بیٹھے رہیں گے۔

بخلاف اس کے مدینہ کے یہود نہایت دلیر، شجاع اور بہادر تھے۔ ان قرائن کلی کے علاوہ ایک بڑے مؤرخ (یعقوبی) نے صاف تصریح کی ہے کہ قریظہ اور نضیر عرب تھے جو یہودی بن گئے تھے۔

﴿ثم كانت وقعة بني النضير وهم فخذ من جذام الا انهم تهودوا وكذلك قريظة﴾

پھر بنو نضیر کا معرکہ ہوا۔ یہ قبیلہ جذام کا ایک خاندان تھا لیکن یہودی ہو گیا تھا اور اسی طرح قریظہ بھی۔[6]

مؤرخ مسعودی نے بھی کتاب الاشراف والتنبیہ[7] میں ایک روایت لکھی ہے کہ "یہ جذام کے قبیلہ سے تھے

---

1. زرقانی جلد ۷ صفحہ ۵۲ مطبوعہ مصر ذکر اصحاب صفہ و مسجد نبویؐ۔
2. مسند ابن حنبل جلد ۳ صفحہ ۱۳۷۔
3. حافظ سیوطی نے دو صفحہ کا ایک رسالہ اصحاب صفہ کے نام سے لکھا ہے اس میں ۱۰۱ آدمیوں کے نام بہ ترتیب حروف تہجی گنائے ہیں۔
4. اصحاب صفہ کے حالات بخاری باب المغازی وغیرہ اور صحیح مسلم میں جستہ جستہ مذکور ہیں۔ زرقانی نے ان کتابوں سے سب کو یکجا کر دیا ہے۔ ہم نے یہ واقعات بخاری و مسلم کے علاوہ زرقانی ہی کے حوالے سے لکھے ہیں۔ (آخر مسند ابن حنبل جلد ۳ صفحہ ۱۳۷ میں بھی ہیں)
5. مسٹر مارگولیوتھ نے یہود کے متعلق تفصیل سے تحقیقات کی ہے جن کا ماحصل یہ ہے کہ ... اس نئی آبادی میں ایک دو خاندان اصلی یہودی بھی تھے مگر جو عرب یہودی ہوتے گئے وہ بھی ان میں شامل ہوتے گئے۔
6. یعقوبی جلد ۲ صفحہ ۴۹۔
7. مطبوعہ یورپ صفحہ ۲۴۷۔

کسی زمانہ میں عمالقہ سے اور ان کی بت پرستی سے بیزار ہو کر حضرت موسیٰ پر ایمان لا کے اور شام سے نقل مکان کر کے حجاز چلے آئے۔

یہ تین قبیلے تھے جو قینقاع، بنو نضیر اور قریظہ مدینہ کے اطراف میں آباد تھے اور مضبوط برج اور قلعے بنا لئے تھے۔

انصار کے جو دو قبیلے تھے یعنی اوس اور خزرج ان میں باہم جو خونریز معرکہ ہوا تھا (جنگ بعاث) اس نے انصار کا زور بالکل توڑ دیا تھا۔ یہود اس مقصد کو ہمیشہ پیش نظر رکھتے تھے کہ انصار باہم کبھی متحد نہ ہونے پائیں۔

ان اسباب کی بنا پر جب آنحضرت ﷺ مدینہ میں تشریف لائے تو پہلا کام یہ تھا کہ مسلمانوں اور یہودیوں کے تعلقات واضح اور منضبط ہو جائیں۔ آپ نے انصار اور یہود کو بلا کر حسب ذیل شرائط پر ایک معاہدہ لکھوایا جس کو دونوں فریق نے منظور کیا۔ یہ معاہدہ ابن ہشام میں پورا مذکور ہے جس کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) خون بہا اور فدیہ کا جو طریقہ پہلے سے چلا آتا تھا اب بھی قائم رہے گا۔
(۲) یہود کو مذہبی آزادی حاصل ہوگی اور ان کے مذہبی امور سے کوئی تعرض نہ کیا جائے گا۔
(۳) یہود اور مسلمان باہم دوستانہ برتاؤ رکھیں گے۔
(۴) یہود یا مسلمانوں کو کسی سے لڑائی پیش آئے گی تو ایک فریق دوسرے کی مدد کرے گا۔
(۵) کوئی فریق قریش کو امان نہ دے گا۔
(۶) مدینہ پر کوئی حملہ ہوگا تو دونوں فریق شریک یک دگر ہوں گے۔
(۷) کسی دشمن سے اگر ایک فریق صلح کرے گا تو دوسرا بھی شریک صلح ہوگا لیکن مذہبی لڑائی اس سے مستثنیٰ ہوگی۔

واقعات متفرقہ:

اس سال انصار میں سے دو نہایت معزز شخصوں نے جو حلقۂ خاص میں تھے وفات پائی، حضرت کلثوم بن ہدم اور اسعد بن زرارہ۔ کلثوم وہ شخص ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب قبا میں تشریف لائے تو انہی کے مکان میں ٹھہرے تھے۔ اکثر بڑے بڑے صحابہؓ بھی انہی کے گھر اترے تھے۔ اسعد بن زرارہ ان چھ شخصوں میں ہیں جنہوں نے سب سے پہلے مکہ میں جا کر آنحضرت ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اور ابن سعد کی روایت کے موافق ان چھ شخصوں میں جس نے سب سے پہلے بیعت کے لئے ہاتھ بڑھایا تھا اسعد تھے۔ یہ فخر بھی انہی کو حاصل ہے کہ سب سے پہلے انہی نے مدینہ میں آ کر جمعہ کی نماز قائم کی۔

چونکہ یہ قبیلۂ بنی نجار کے نقیب تھے اس لئے ان کی وفات کے بعد اس قبیلہ نے آنحضرت ﷺ سے درخواست کی کہ ان کے بجائے کوئی شخص اس منصب پر مقرر کیا جائے۔ چونکہ یہ احتمال تھا کہ کوئی شخص مقرر ہوگا تو اوروں کو رشک ہوگا اس لئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "میں خود تمہارا نقیب ہوں"۔[1] چونکہ آپ کی ننہال اسی قبیلہ میں تھی اس لئے اور قبائل کو رشک اور منافسہ کا موقع نہ تھا۔

حضرت اسعدؓ کی وفات کا آنحضرت ﷺ کو نہایت صدمہ ہوا۔ منافقین اور یہود نے یہ طعنہ دینا شروع کیا کہ

۱؎ طبری ص ۱۲۶۱ تا ۱۲۶۲

۲ھ

تحویل قبلہ و آغاز غزوات

(اس سال سے اسلام کی زندگی میں دو عظیم الشان واقعات پیدا ہوتے ہیں، ایک یہ کہ اسلام اپنے لئے ایک خاص قبلہ قرار دیتا ہے جو اب تک کروڑوں قلوب کا مرکز ہے، دوسرا یہ کہ دشمنانِ اسلام اب مخالفت کے لئے تلوار اٹھاتے ہیں اور مسلمان اس کی مدافعت کے لئے تیار ہوتے ہیں۔)

تحویل قبلہ، شعبان ۲ھ:

ہر گروہ، ہر قوم اور ہر مذہب کے لئے ایک خاص امتیازی شعار ہوتا ہے جس کے بغیر اس قوم کی مستقل ہستی قائم نہیں ہو سکتی۔ اسلام نے یہ شعار قبلۂ نماز قرار دیا جو اصل مقصد کے علاوہ اور بہت سے حکم و اسرار کا جامع ہے۔ اسلام کا خاص اور نمایاں وصف مساوات عام، جمہوریت اور توحید عمل ہے یعنی تمام مسلمان یک دل اور ہم آہنگ نظر آئیں، مذہب اسلام کا رکن اعظم نماز ہے، جس سے ہر روز پانچ وقت کام پڑتا ہے، نماز کی اصلی صورت یہ ہے کہ جمعیت اور افراد کثیر کے ساتھ ادا کی جائے، لیکن اس طرح کہ ہزاروں لاکھوں اشخاص کی منفرد ہستیاں سمٹ کر ایک ہستی بن جائے۔ اسی بنا پر نماز باجماعت میں ایک امام ہوتا ہے کہ مقتدیوں کی ایک ایک حرکت اس کے اشاروں سے وابستہ ہوتی ہے، اس لئے ضرور ہے کہ سب کا مرجع عمل بھی ایک نظر آئے، یہی اصول ہے جس کی بنا پر نماز کے لئے ایک قبلہ قرار پایا اور اسی شعار کا دائرہ اس قدر وسیع کیا گیا کہ اس قبلہ کی طرف رُخ کرنا ہی کفر کے دائرے سے نکل آنا ہے، اب صرف یہ بحث باقی تھی کہ قبلہ کس سمت قرار دیا جائے، یہودی اور عیسائی بیت المقدس کو قبلہ سمجھتے تھے کیونکہ ان کی قومی اور مذہبی ہستی بیت المقدس سے وابستہ تھی لیکن حضرت ابراہیمؑ بت شکن کے جانشین کے لئے صرف کعبہ قبلہ ہو سکتا تھا، جو اس موحد اعظم کی یادگار اور توحید خالص کا سب سے بڑا مظہر ہے۔

رسول اللہ ﷺ جب تک مکہ میں تشریف رکھتے تھے دو ضرورتیں ایک ساتھ درپیش تھیں۔ ملت ابراہیمی کی تاسیس و تجدید کے لحاظ سے کعبہ کی طرف رُخ کرنے کی ضرورت تھی، لیکن یہ مشکل تھی کہ قبلہ کی جو اصلی غرض ہے یعنی امتیاز اور اختصاص، وہ نہیں حاصل ہوتی تھی، کیونکہ مشرکین اور کفار بھی کعبہ ہی کو اپنا قبلہ سمجھتے تھے، اس بنا پر آنحضرت ﷺ مقام ابراہیم کے سامنے نماز ادا کرتے تھے جس کا رُخ بیت المقدس کی طرف تھا۔ اس طرح دونوں قبلے سامنے آ جاتے تھے۔ مدینہ میں دو گروہ آباد تھے، مشرکین جن کا قبلہ کعبہ تھا اور اہل کتاب جو بیت المقدس کی سمت نماز ادا کرتے تھے، شرک کے مقابلہ میں یہودیت اور نصرانیت دونوں کو ترجیح تھی اس لئے آنحضرت ﷺ نے ایک مدت یعنی تقریباً ۱۶ مہینے تک بیت المقدس کی طرف نماز ادا کی لیکن جب مدینہ میں اسلام زیادہ پھیل گیا تو اب کوئی ضرورت نہ تھی کہ اصل قبلہ کو چھوڑ کر دوسری طرف رُخ کیا جاتا، اس بنا پر یہ آیت اتری اور دفعۃً قبلہ بدل گیا۔[1]

---

۱ اس مضمون میں جس قدر واقعات ہیں وہ صحیح بخاری باب حدیث قبلہ نماز اور فتح الباری شرح صحیح بخاری سے ماخوذ ہیں۔

سلسلۂ غزوات[1]

کیا عجیب بات ہے کہ ارباب سیر مغازی کی داستان جس قدر زیادہ وسعت اور بلند آہنگی سے بیان کرتے ہیں یورپ اسی قدر اس کو زیادہ شوق سے نقل کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ یہ داستان اور پھیلتی جائے کیونکہ اس کو اسلام کے جور و ستم کا جو مرقع آراستہ کرنا ہے اس کے نقش و نگار کے لئے ابر کے چند قطرے نہیں بلکہ چشمہ ہائے خون درکار ہیں۔

یورپ کے تمام مؤرخوں نے سیرت نبوی کو اس انداز میں لکھا ہے کہ وہ لڑائیوں کا ایک مسلسل سلسلہ ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ لوگ زبردستی مسلمان بنائے جائیں۔ لیکن یہ خیال چونکہ واقع کے خلاف سرتاپا غلط ہے اس لئے مغازی کی ابتداء سے پہلے ضرور ہے کہ اس بحث کا فیصلہ کیا جائے۔

عام خیال یہ ہے کہ اسلام جب تک مکہ میں تھا مصائب گوناگوں کی آماجگاہ تھا۔ مدینہ میں آ کر اس کی قسمتیں دوسری ہو گئیں مگر یہ خیال صحیح نہیں، مکہ میں جو مصیبت تھی گو سخت تھی لیکن یکجا اور منفرد تھی، مدینہ میں آ کر وہ متعدد اور گوناگوں ہو گئی۔ مکہ کل ایک قوم تھا، یہاں انصار کے ساتھ یہود بھی تھے جو عادات، خصائل، مذہب اور ریاست میں انصار سے بالکل مختلف اور ان کے حریف مقابل تھے۔ اس پر ایک تیسری قسم (منافقین) کا اضافہ ہوا جو مار آستین ہونے کی وجہ سے دونوں سے زیادہ خطرناک تھے۔ مکہ اگر قابو میں آ جاتا تو حرم کی وسعت اثر کی وجہ سے تمام عرب کی گردنیں خم ہو جاتیں۔ لیکن مدینہ کا اثر چار دیواری تک محدود تھا۔ مدینہ اب تک بیرونی خطرات سے بالکل مطمئن تھا لیکن رسول اللہ ﷺ کی قیام گاہ ہونے نے اس کو قریش کے غیظ و غضب کا آماجگاہ بنا دیا۔

آنحضرت ﷺ جب مکہ سے چلے آئے تو چند ہی روز کے بعد قریش نے عبداللہ بن ابی کو جو اتفاقاً ہجرت کے قبل رئیس الانصار تھا اور انصار نے اس کی تاجپوشی کی شاہانہ رسم ادا کرنے کے لئے تیاری کر لی تھی،[2] خط لکھا جس کے الفاظ یہ تھے۔

﴿انکم آویتم صاحبنا وانا نقسم باللہ لتقاتلنه او لتخرجنه او لنسیرن الیکم باجمعنا حتی نقتل مقاتلتکم و نستبیح نساءکم﴾ (سنن ابو داؤد مطبع مجتبائی جلد ۲ باب خبر النضیر)

تم نے ہمارے آدمی کو اپنے ہاں پناہ دی ہے ہم اللہ کی قسم کھاتے ہیں کہ یا تو تم لوگ ان کو قتل کر ڈالو یا مدینہ سے نکال دو ورنہ ہم سب لوگ تم پر حملہ کر دیں گے اور تم کو گرفتار کر کے تمہاری عورتوں پر تصرف کریں گے۔

جب آنحضرت ﷺ کو یہ خبر معلوم ہوئی تو آپ عبداللہ کے پاس تشریف لے گئے اور اس کو سمجھایا کہ "کیا تم خود اپنے بیٹوں اور بھائیوں سے لڑو گے"۔ چونکہ انصار اکثر مسلمان ہو چکے تھے اس لئے عبداللہ اس نکتہ کو سمجھا اور قریش کے حکم کی تعمیل نہ کر سکا۔ بدر کے بعد پھر قریش نے اسی مضمون کا خط لکھا چنانچہ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

۱۔ غزوات کا سلسلہ چونکہ یہاں سے شروع ہوتا ہے اور جس قسم کے حقائق سے غزوات پیش آئے ان سے واقف ہونے کے لئے ہم نے ایک مستقل عنوان قائم کیا ہے یہ واقعات متفرق طور پر پہلے سے وہ اوراق میں ملے ہوئے تھے۔ لیکن یہ عنوان الگ طرح سے اسی واقعہ سے نکلتا ہے کہ ایک وقت تمام غزوات پر نظر ڈالی جائے اس لئے ہم نے اس کو تمام غزوات سے مقدم لکھا ہے۔ ناظرین اسی سے ابتدا فرمائیں۔

۲۔ بخاری باب التسلیم فی مجلس فیہ اخلاط من المسلمین والمشرکین ج ۲

صحیح بخاری باب الجہاد میں ہے کہ ایک دفعہ آپ نے فرمایا کہ "آج کوئی اچھا آدمی پہرہ دیتا"۔ چنانچہ سعد بن ابی وقاصؓ نے ہتھیار لگا کر رات بھر پہرہ دیا تب آپ نے آرام فرمایا۔ اس سے بڑھ کر حاکم کی روایت ہے جس کے یہ الفاظ ہیں:

﴿عن ابی بن کعب قال لما قدم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و اصحابہ المدینۃ و آوتھم الانصار رمتھم العرب عن قوس واحدۃ و کانوا لا یبیتون الا بالسلاح ولا یصبحون الا فیہ﴾[1]

آنحضرت ﷺ اور صحابہؓ جب مدینہ آئے اور انصار نے ان کو پناہ دی تو تمام عرب ایک ساتھ ان سے لڑنے کو آمادہ ہو گئے صحابہؓ صبح تک ہتھیار باندھ کر سوتے تھے۔

مؤرخین مغازی کی ابتدا انہی واقعات سے کرتے ہیں کہ اسی سال اللہ نے جہاد کی اجازت دی لیکن ایک دقیقہ سنج انہی کی تصریحات سے پیدا کر سکتا ہے کہ اصل واقعہ کیا تھا صاحب لدنیہ اور زرقانی میں لکھا ہے کہ اللہ نے ۱۲ صفر ۲ھ میں جہاد کی اجازت دی اس کی سند میں امام زہری کا قول نقل کیا ہے۔

﴿اول آیۃ نزلت فی الاذن بالقتال اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا وَ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْرٌ﴾ (زرقانی بحوالہ نسائی جلد ا صفحہ ۳۶۶)

پہلی آیت جو قتال کی اجازت میں نازل ہوئی وہ یہ ہے اُذِنَ لِلَّذِیْنَ الخ یعنی جن سے لڑائی کی جاتی ہے (مسلمان) ان کو بھی اب لڑنے کی اجازت دی جاتی ہے کیونکہ ان پر ظلم کیا جا رہا ہے اور اللہ ان کی مدد پر یقیناً قادر ہے۔

تفسیر ابن جریر میں ہے کہ قتال کے متعلق سب سے پہلے جو آیت نازل ہوئی وہ یہ ہے:

﴿وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ﴾ (بقرہ۔۱۹۰)

خدا کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں۔

لیکن غور سے دیکھو کہ دونوں آیتوں میں انہی لوگوں سے لڑنے کی اجازت ہے جو پہلے مسلمانوں سے لڑتے آئے ہیں اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان درحقیقت لڑنے پر مجبور کیے جاتے تھے۔

بہر حال واقعہ یہ ہے کہ مدینہ میں آکر آنحضرت ﷺ کا سب سے پہلا کام حفاظت خود اختیاری کی تدبیر تھی، نہ صرف اپنی اور مہاجرین کی بلکہ انصار کی بھی کیونکہ اس جرم میں کہ انصار نے مسلمانوں کو پناہ دی ہے قریش نے مدینہ کی بربادی کا فیصلہ کر لیا اور اپنے تمام حلیف قبائل عرب میں یہ آگ بھڑکا دی تھی اس بنا پر آپ نے دو تدبیریں اختیار کیں اول یہ کہ قریش کی شامی تجارت جو ان کا ذریعہ معاش تھی بند کر دی جائے تاکہ وہ صلح پر مجبور ہو جائیں اور یاد ہوگا کہ سعد بن معاذؓ نے مکہ میں ابوجہل کو اسی کی دھمکی دی تھی۔ دوسرے یہ کہ مدینہ کے قرب و جوار کے جو قبائل ہیں ان سے امن کا معاہدہ ہو جائے۔

بدر سے پہلے جو مہمیں بھیجی گئیں:

غرض ان حالات کی بنا پر غزوۂ بدر سے پہلے سو سو پچاس پچاس کی ٹکڑیاں مکہ کی طرف روانہ کی جانے لگیں۔ ان ابواء کی مہم سے پہلے جو صفر ۲ھ میں واقع ہوئی اور جس میں آپ ﷺ نے خود شرکت فرمائی تھی ارباب سیر نے تین مہموں کا ذکر کیا ہے جن کو

---

[1] لباب فی اسباب النزول للسیوطی سورۂ نور آیت وعد اللہ الذین آمنوا۔ مستدرک حاکم میں بھی یہ روایت مذکور ہے۔

ان کی زبان میں "سریہ" کہتے ہیں سریۂ حمزہؓ، سریۂ عبیدہ بن حارثؓ، سریۂ سعد بن وقاصؓ، لیکن ان میں سے کسی مہم میں کوئی کشت وخون نہیں ہوا، یا بیچ بچاؤ ہو گیا یا بچ کر نکل گئے۔ ارباب سیر نے ان سرایا کا مقصد یہ بتایا ہے کہ یہ قریش کے تجارتی قافلوں کو چھیڑنے کے لئے بھیجے جاتے تھے یعنی حضرت سعدؓ کی تحدید کے مطابق ان کی شامی تجارت کو بند کرنا مقصود تھا۔ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ صحابہ کو غارت گری کی تعلیم دی جاتی تھی لیکن یہ الزام کس قدر جہالت پر مبنی ہے کہ اول تو اسلام کی شریعت میں یہ سخت تر گناہ ہے ثانیاً واقعہ کیا بتاتا ہے؟ کیا ان میں سے کسی مہم میں بھی یہ مذکور ہے کہ صحابہؓ نے قافلہ کا مال لوٹ لیا؟ حاشا اگر ان سرایا کا مقصد جنگ اور ذرائع اطلاع ہوتا تھا تو قریش کے قافلۂ تجارت کے سوا یہ مقصد کہیں اور نہیں حاصل ہو سکتا تھا؟

جہینہ:

اطراف کے جن قبائل کے پاس معاہدہ کے لیے مہمیں بھیجی گئیں ان میں سب سے پہلے جہینہ کا قبیلہ ہے۔ جہینہ کا قبیلہ مدینہ سے تین منزل پر آباد تھا اور ان کا کوہستان دور تک پھیلا ہوا تھا ان سے معاہدہ ہوا کہ وہ قریشیوں سے یکساں ۱؎ تعلقات رکھیں گے یعنی دونوں سے الگ رہیں گے۔

صفر ۲ھ میں آپ ساٹھ مہاجرین کے ساتھ مدینہ سے نکلے اور ابواء تک گئے (جس کے قریب ہی غزوہ ابوا یا غزوۂ ودان واقع ہوا) اور جہاں آپ ﷺ کی والدہ ماجدہ کا مزار ہے۔ ابواء کا صدر مقام فرع ہے جو ایک وسیع قصبہ ہے اور جہاں قبیلہ حریث آباد ہے اور جو مدینہ سے تقریباً ۸ منزل (۸۰ میل) ہے یہ مدینہ کی آخری سرحد ہے۔ ان اطراف میں قبیلہ بنو ضمرہ آباد تھا اور یہ نواح ان کی حدود حکومت میں داخل تھے۔ یہاں آپ نے چند روز قیام کر کے بنو ضمرہ سے معاہدہ کیا جن کا سردار مخشی بن عمرو ضمری تھا۔ معاہدہ کے یہ الفاظ تھے۔

﴿هذا كتاب من محمد رسول الله ﷺ لبني ضمرة انهم آمنون على اموالهم وانفسهم وان لهم النصر على من رامهم الا ان يحاربوا في دين الله مابل بحر صوفة وان النبي اذا دعاهم لنصره اجابوه الخ﴾ (زرقانی عن ابن سعد، زرقانی جلد ۱ صفحہ ۳۹۰)

یہ محمد رسول اللہ ﷺ کی تحریر ہے بنو ضمرہ کے لئے ان لوگوں کا جان اور مال محفوظ رہے گا اور جو شخص ان پر حملہ کرے گا اس کے مقابلہ میں ان کی مدد کی جائے گی بجز اس صورت کے کہ یہ لوگ مذہب کے مقابلہ میں لڑیں اور پیغمبر ﷺ جب ان کو مدد کے لئے بلائیں گے تو یہ مدد کو آئیں گے۔

تمام محدثین مغازی کی ابتدا اسی واقعہ سے کرتے ہیں اور امام بخاری نے بھی اسی کو اولین غزوات قرار دیا ہے۔

تقریباً ایک مہینہ کے بعد کرز بن جابر فہری نے جو مکہ کے رؤسا میں تھا ۲؎ مدینہ کی چراگاہ پر حملہ کیا اور آنحضرت ﷺ کے مویشی لوٹ لے گیا۔ اس کا تعاقب کیا گیا لیکن وہ بچ کر نکل گیا تھا۔ (کرز بعد کو مسلمان ہوئے اور فتح مکہ میں شہید

۱؎ اس واقعہ کا ذکر مؤرخین نے مستقل طور پر نہیں کیا بلکہ جہاں سب سے پہلے سریۂ حمزہؓ کا ذکر کیا ہے وہاں مجدی بن عمرو جہنی (رئیس قبیلہ) کی نسبت لکھا ہے کان موادعا للفریقین جمیعا یعنی آپ نے دونوں فریق سے صلح کر رکھی تھی۔

۲؎ معاہدۂ کرز فہری

حالانکہ خود انہوں نے تصریح کی ہے کہ غزوۂ بدر اور تمام لڑائیاں جو قریش سے پیش آئیں سب کا سبب یہی حضرمی کا قتل ہے علامہ طبری لکھتے ہیں۔[1]

﴿وكان الذي هاج وقعة بدر وسائر الحروب التي كانت بين رسول الله ﷺ وبين مشركي قريش فيما قال عروة بن الزبير ما كان من قتل واقد بن عبدالله السهمي عمرو بن الحضرمي﴾

اور جس چیز نے بدر کے واقعہ کو ابھارا اور وہ تمام لڑائیاں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مشرکین قریش میں پیش آئیں سب کا سبب یہی تھا کہ واقد تمیمی نے حضرمی کو قتل کر دیا تھا۔

چونکہ غزوۂ بدر تمام غزوات کی اصلی بنیاد ہے اس لئے ہم پہلے اس واقعہ کی اصلی صورت کو نکھار کر بہ تفصیل سے اس کے متعلق گفتگو کریں گے۔

1. طبری صفحہ ۱۲۸۴

غرض ۱۲ رمضان ۲ھ کو آپ تقریباً تین سو جاں نثاروں کے ساتھ شہر سے نکلے، ایک میل چل کر فوج کا جائزہ لیا، جو کم عمر تھے واپس کر دیئے گئے کہ ایسے پُرخطر موقع پر بچوں کا کام نہیں۔ عمیرؓ بن ابی وقاصؓ ایک کمسن بچے تھے جب ان سے واپسی کو کہا گیا تو رو پڑے، آخر آنحضرت ﷺ نے اجازت دے دی۔ عمیر کے بھائی سعد بن ابی وقاصؓ نے کمسن سپاہی کے گلے میں تلوار حمائل کی۔[1] اب فوج کی کل تعداد ۳۱۳ تھی جس میں ساٹھ مہاجر اور باقی انصار تھے۔ چونکہ غیبت کی حالت میں منافقین اور یہودیوں کی طرف سے اطمینان نہ تھا اس لئے ابولبابہ بن عبدالمنذر کو مدینہ کا حاکم مقرر فرمایا اور حکم دیا کہ مدینہ کو واپس جائیں۔ عالیہ [مدینہ کی بالائی آبادی] پر عاصم بن عدی کو مقرر فرمایا۔ ان انتظامات کے بعد آپ بدر کی طرف بڑھے جو مدینہ سے اسّی میل ہے۔ آمد کی خبر تھی دو خبر رساں بسبسہ اور عدی آگے روانہ کر دیئے گئے تھے کہ قریش کی نقل و حرکت کی خبر لائیں۔ روحا، منصرف، ذات اجذال، معلات، اثیل سے گزرتے ہوئے ۱۷ رمضان کو بدر کے قریب پہنچے۔ خبر رسانوں نے خبر دی کہ قریش وادی کے دوسرے سرے تک آ گئے ہیں۔ آنحضرت ﷺ یہیں رک گئے اور فوج بھی اتر پڑی۔

مکہ معظمہ سے قریش بڑے سروسامان سے نکلے تھے۔ ہزار آدمی کی جمعیت تھی سو سواروں کا رسالہ تھا، روسائے قریش سب شریک تھے۔ ابولہب مجبوری کی وجہ سے نہ آ سکا تھا اس لئے اپنی طرف سے اس نے قائم مقام بھیج دیا تھا، رسد کا یہ انتظام تھا کہ امرائے قریش یعنی عباس بن مطلب، عتبہ بن ربیعہ، حارث بن عامر، نضر بن الحارث، ابوجہل، امیہ وغیرہ وغیرہ باری باری ہر روز دس دس اونٹ ذبح کرتے اور لوگوں کو کھلاتے[2] تھے۔ عتبہ بن ربیعہ جو قریش کا سب سے معزز رئیس تھا فوج کا سپہ سالار تھا۔

قریش کو بدر کے قریب پہنچ کر جب معلوم ہوا کہ ابوسفیان کا قافلہ خطرہ کی زد سے نکل گیا ہے تو قبیلۂ زہرہ اور عدی کے سرداروں نے کہا "اب لڑنا ضروری نہیں" لیکن ابوجہل نے نہ مانا۔ زہرہ اور عدی کے لوگ واپس چلے گئے باقی فوج آگے بڑھی۔ قریش چونکہ پہلے پہنچ گئے تھے انہوں نے مناسب موقعوں پر قبضہ کر لیا تھا، بخلاف اس کے مسلمانوں کی طرف چشمہ یا کنواں تک نہ تھا۔ زمین ایسی ریتلی تھی کہ اونٹوں کے پاؤں ریت میں دھنس دھنس جاتے تھے۔ حضرت حباب بن منذرؓ نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں عرض کی کہ جو مقام انتخاب کیا گیا ہے وحی کی رو سے ہے یا فوجی تدبیر ہے؟ ارشاد ہوا کہ "وحی نہیں ہے" حضرت حبابؓ نے کہا "تو بہتر ہوگا کہ آگے بڑھ کر چشمہ پر قبضہ کر لیا جائے اور آس پاس کے کنوئیں بیکار کر دیئے جائیں"۔[3] آپ ﷺ نے یہ رائے پسند فرمائی اور اسی پر عمل کیا گیا۔ تائید ایزدی اور حسن اتفاق سے مینہ برس گیا جس سے گرد جم گئی اور جابجا پانی کو روک کر چھوٹے چھوٹے حوض بنا لئے گئے کہ وضو اور غسل کے کام آئیں۔ اسی احسان کا اللہ نے قرآن مجید میں بھی ذکر کیا ہے۔

---

۱ ابن سعد صفحہ ۹۔

۲ منتخب کنز العمال جلد ۵ بحوالہ ابن عساکر وغیرہ۔

۳ معارف ابن قتیبہ (باب ۱۲۱) و مستدرک حاکم ... قریش کی تعداد ... سیرت ابن اسحاق بحوالہ ابن ہشام صفحہ ... وغیرہ۔

۴ ابن ہشام۔

﴿ وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُم مِّنَ السَّمَاءِ مَاءً لِّيُطَهِّرَكُم بِهِ ﴾ (انفال۔۱۱)

اور جبکہ اللہ نے آسمان سے پانی برسایا کہ تم کو پاک کرے۔

پانی پر اگرچہ قبضہ کر لیا گیا لیکن ساقی کوثر کا فیض عام تھا اس لئے دشمنوں کو بھی پانی لینے کی عام اجازت تھی۔[1] یہ رات کا وقت تھا، تمام صحابہؓ نے کمر کھول کھول کر رات بھر آرام کیا۔ لیکن صرف ایک ذات تھی (ذات نبوی) جو صبح تک بیدار اور مصروف دعا رہی، صبح ہوئی تو لوگوں کو نماز کیلئے آواز دی بعد نماز جہاد پر وعظ فرمایا۔[2]

قریش جنگ کے لئے بیتاب تھے تاہم کچھ نیک دل بھی تھے جن کے دل خونریزی سے لرزتے تھے ان میں حکیم بن حزام (جو آگے چل کر اسلام لائے) نے سردار فوج عتبہ سے جا کر کہا "آپ چاہیں تو آج کا دن آپ کی نیک نامی کی ابدی یادگار رہ جائے"۔ عتبہ نے کہا کیونکر؟ حکیم نے کہا "قریش کا جو کچھ مطالبہ ہے وہ صرف حضرمی کا خون ہے۔ وہ آپ کا حلیف تھا آپ اس کا خون بہا ادا کر دیجئے" عتبہ نیک نفس آدمی تھا اس نے نہایت خوشی سے منظور کیا۔ لیکن چونکہ ابوجہل کا اتفاق رائے ضروری تھا پس حکیم عتبہ کا پیغام لے کر گئے۔ ابوجہل ترکش سے تیر نکال کر پھیلا رہا تھا۔ عتبہ کا پیغام سن کر بولا "ہاں عتبہ کی ہمت نے جواب دے دیا"۔ عتبہ کے فرزند ابو حذیفہؓ اسلام لا چکے تھے اور اس معرکہ میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ آئے تھے۔ اس بنا پر ابوجہل نے یہ بدگمانی کی کہ عتبہ اس لئے لڑائی سے جی چراتا ہے کہ اس کے بیٹے پر آنچ نہ آئے۔

ابوجہل نے حضرمی کے بھائی ابو عامر کو بلا کر کہا "دیکھتے ہو! تمہارا خون بہا تمہاری آنکھ کے سامنے آ کر نکلا جاتا ہے"۔ عامر نے عرب کے دستور کے مطابق کپڑے پھاڑ ڈالے اور گرد اڑا کر واعمراہ واعمراہ کا نعرہ مارنا شروع کیا اس واقعہ نے تمام فوج میں آگ لگا دی۔ عتبہ نے ابوجہل کا طعنہ سنا تو غیرت سے سخت برہم ہوا اور کہا میدان جنگ بتا دے گا کہ نامردی کا داغ کون اٹھاتا ہے۔ یہ کہہ کر مغفر مانگا لیکن اس کا سر اس قدر بڑا تھا کہ کوئی مغفر اس کے سر پر ٹھیک نہ اترا۔ مجبوراً سر سے کپڑا لپیٹا اور لڑائی کے ہتھیار سجائے۔

چونکہ آنحضرت ﷺ اپنے ہاتھ کو خون سے آلودہ کرنا پسند نہیں فرماتے تھے۔ صحابہؓ نے میدان کے کنارے ایک چھپر کا سائبان تیار کیا کہ آپ اس میں تشریف رکھیں۔ سعدؓ بن معاذ دروازہ پر تیغ بکف کھڑے ہوئے کہ کوئی ادھر نہ بڑھنے پائے۔ اگرچہ بارگاہ الٰہی سے فتح و نصرت کا وعدہ ہو چکا تھا عناصر عالم آمادہ مدد تھے، ملائکہ کی فوجیں ہمرکاب تھیں، تاہم عالم اسباب کے لحاظ سے آپ نے اصول جنگ کے مطابق فوجیں مرتب کیں، مہاجرین کا علم مصعبؓ بن عمیر کو عنایت فرمایا، خزرج کے علمبردار حضرت حبابؓ بن منذر اور اوس کے حضرت سعدؓ بن معاذ مقرر ہوئے۔

صبح ہوتے ہوتے آپ نے صف آرائی شروع کی دست مبارک میں ایک تیر تھا اس کے اشارہ سے صفیں قائم کرتے تھے کہ کوئی شخص تل بھر آگے یا پیچھے نہ بڑھنے پائے۔ لڑائی میں شور و غل عام بات ہے لیکن منع کر دیا گیا کہ کسی کے منہ سے آواز تک نہ نکلنے پائے۔ اس موقع پر بھی عجیب دشمن کی عظیم الشان تعداد مقابل تھی اور مسلمانوں کی طرف ایک آدمی

[1] ابن ہشام جلد ۲ ص ۱۹

[2] منتخب کنز العمال غزوہ بدر بروایت مسند ابن حنبل و ابن ابی شیبہ

حضرت زبیرؓ نے اس معرکہ میں کئی کاری زخم اٹھائے شانہ پر ایک زخم تھا اتنا گہرا تھا کہ اچھے ہو جانے پر اس میں انگلی چلی جاتی تھی چنانچہ ان کے بیٹے (عروہ) بچپن میں ان زخموں سے کھیلا کرتے تھے۔ جس تلوار سے لڑ رہے تھے وہ لڑتے لڑتے دندانہ دار ہو گئی تھی چنانچہ جب عبداللہ بن زبیرؓ شہید ہوئے تو عبدالملک نے عروہ سے کہا تم زبیرؓ کی تلوار پہچان لو گے؟ انہوں نے کہا ہاں۔ عبدالملک نے پوچھا کیونکر؟ بولے کہ بدر کے معرکہ میں اس میں دندانے پڑ گئے تھے۔ عبدالملک نے تصدیق کی اور یہ مصرع پڑھا۔ بهن فلول من قراع الكتائب۔ عبدالملک نے تلوار عروہ کو واپس دی انہوں نے اس کی قیمت لگوائی تو تین ہزار قیمت ہوئی اس کے قبضہ پر چاندی کا کام تھا۔[1]

اب عام جنگ شروع ہو گئی مشرکین اپنے بل بوتے پر لڑ رہے تھے لیکن ادھر سرور عالم ﷺ سربسجود ہو کر صرف خدا کی قوت کا سہارا ڈھونڈ رہے تھے۔

ابوجہل کی شرارت اور دشمنی اسلام کا عام چرچا تھا۔ انصار میں سے معوذؓ اور معاذؓ دو بھائیوں نے عہد کیا تھا کہ یہ شقی جہاں نظر آ جائے گا یا اس کو مار لیں گے یا خود مٹ جائیں گے۔ حضرت عبدالرحمنؓ بن عوف کا بیان ہے کہ میں صف میں تھا کہ دفعۃً مجھ کو دائیں بائیں دو نوجوان نظر آئے ایک نے مجھ سے کان میں پوچھا کہ ابوجہل کہاں ہے؟ میں نے کہا برادر زادے! ابوجہل کو پوچھ کر کیا کرے گا؟ بولا کہ میں نے اللہ سے عہد کیا ہے کہ ابوجہل کو جہاں دیکھ لوں گا یا قتل کر دوں گا یا خود لڑ کر مارا جاؤں گا۔ میں جواب نہیں دینے پایا تھا کہ دوسرے نوجوان نے بھی مجھ سے کان میں یہی باتیں کہیں میں نے دونوں کو اشارہ سے بتایا کہ ابوجہل وہ ہے بتانا تھا کہ دونوں باز کی طرح جھپٹے اور ابوجہل خاک پر تھا یہ دونوں جوان معوذؓ اور معاذؓ عفراء کے بیٹے تھے۔[2] ابوجہل کے بیٹے عکرمہ نے عقب سے آ کر معاذؓ کے بائیں شانہ پر تلوار ماری جس سے بازو کٹ گیا لیکن تسمہ باقی رہ گیا۔ معاذؓ نے عکرمہ کا تعاقب کیا وہ بچ کر نکل گیا۔ معاذؓ اسی حالت میں لڑتے رہے لیکن ہاتھ کے لٹکنے سے زحمت ہوتی تھی ہاتھ کو پاؤں کے نیچے دبا کر کھینچا کہ تسمہ بھی الگ ہو گیا اور اب وہ آزاد تھے۔

آنحضرت ﷺ نے لڑائی سے پہلے ارشاد فرمایا تھا کہ کفار کے ساتھ جو لوگ آئے ہیں ان میں ایسے بھی لوگ ہیں جو خوشی سے نہیں بلکہ قریش کے جبر سے آئے ہیں۔ ان لوگوں کے نام بھی آپ نے بتا دیئے تھے ان میں ابوالبختری بھی تھا مجذر انصاری کی نظر ابوالبختری پر پڑی۔ مجذر نے کہا چونکہ رسول اللہ ﷺ نے تیرے قتل سے منع فرمایا ہے اس لئے تجھ کو چھوڑ دیتا ہوں ابوالبختری کے ساتھ اس کا ایک رفیق بھی تھا۔ ابوالبختری نے کہا اس کو بھی؟ مجذر نے کہا "نہیں"۔ ابوالبختری نے کہا تو میں تنہا تو بنات عرب کا یہ طعنہ نہیں سن سکتا کہ ابوالبختری نے اپنی جان بچانے کے لئے رفیق کا ساتھ چھوڑ دیا۔ یہ کہہ کر ابوالبختری نے یہ رجز پڑھا اور مجذر پر حملہ آور ہوا اور مارا گیا:

﴿لن یسلم ابن حرۃ زمیله حتی یموت او یری سبیله﴾

شریف زادہ اپنے رفیق کو چھوڑ نہیں سکتا جب تک کہ مر نہ جائے یا اپنا راستہ نہ دیکھ لے۔

عتبہ اور ابوجہل کے مارے جانے سے قریش کا پائے ثبات اکھڑ گیا اور فوج میں بے دلی چھا گئی

---

[1] یہ پوری تفصیل صحیح بخاری غزوہ بدر کے ذکر میں ہے۔

[2] مسلم کی روایت میں معاذ اور معوذ بن عفراء ہے۔

تیر نے گو نہایت ترتیب سے صفیں درست کی تھیں۔ مسلمان رات کو اطمینان سے سوئے صبح اٹھے تو تازہ دم تھے بخلاف اس کے کفار بے اطمینانی کی وجہ سے رات کو سو نہ سکے تھے۔

تاہم یہ اسباب تھے ان کا اثر جو کچھ ہو اور جو کچھ تھا تائید الٰہی سے تھا۔ قریش اور مسلمانوں کی فوج کا باہم مقابلہ کر کے نظر آئے گا کہ ظاہری نظر میں مسلمانوں کی فتح کی کوئی شکل نہ تھی قریش کی فوج میں بڑے بڑے نامور تھے جو تنہا تمام فوج کی رسد کا سامان کرتے تھے مسلمانوں کے پاس کچھ نہ تھا قریش کی تعداد ایک ہزار تھی مسلمان صرف ۳۰۰ تھے قریش میں سو سوار تھے مسلمانوں کی فوج میں صرف دو گھوڑے تھے مسلمانوں میں بہت کم سپاہی تمام ہتھیاروں سے لیس تھے اور ہو قریش کا ہر سپاہی آہن میں غرق تھا

بایں ہمہ خاتمہ جنگ پر معلوم ہوا کہ مسلمانوں میں سے صرف ۱۴ شخصوں نے شہادت پائی جن میں ۶ مہاجر اور باقی انصار تھے لیکن دوسری طرف قریش کی اصلی طاقت ٹوٹ گئی رؤسائے قریش جو شجاعت میں نامور اور قبائل کے سپہ سالار تھے ایک ایک کر کے مارے گئے ان میں شیبہ، عتبہ، ابوجہل، ابوالبختری، زمعہ بن الاسود، عاص بن ہشام، امیہ بن خلف، منبہ بن الحجاج قریش کے سرتاج تھے قریباً ۷۰ آدمی قتل اور اسی قدر گرفتار ہوئے اسیران جنگ میں سے عقبہ اور نضر بن حارث قتل کر دیئے گئے باقی گرفتار ہو کر مدینہ میں آئے ان میں حضرت عباسؓ، حضرت عقیل (حضرت علیؓ کے بھائی) اور ابوالعاص (آنحضرت ﷺ کے داماد) بھی تھے۔

لڑائیوں میں آنحضرت ﷺ کا معمول تھا کہ جہاں کوئی لاش نظر آتی تھی تو آپ اس کو زمین میں دفن کرا دیتے[1] لیکن اس موقع پر کشتوں کی تعداد زیادہ تھی اس لئے ایک ایک کا الگ الگ دفن کرنا مشکل تھا ایک وسیع کنواں تھا تمام لاشیں آپ نے اس میں ڈلوا دیں لیکن امیہ کی لاش پھول کر اس قابل نہیں رہی تھی کہ جگہ سے ہلائی جائے اس لئے وہیں خاک میں دبا دی گئی۔

اسیران جنگ جب مدینہ میں آنحضرت ﷺ کے سامنے آئے تو حضرت سودہؓ (آنحضرت ﷺ کی زوجہ محترمہ) بھی تشریف رکھتی تھیں۔ ان قیدیوں میں ان کے عزیز سہیل بن عمرو بھی تھے ان پر نگاہ پڑی تو بے ساختہ بول اٹھیں کہ تم نے عورتوں کی طرح خود بیڑیاں پہن لیں، یہ نہ ہو سکا کہ لڑ کر مر جاتے۔[2] اسیران جنگ دو دو چار چار صحابہ کو تقسیم کر دیئے گئے اور ارشاد ہوا کہ آرام کے ساتھ رکھے جائیں، صحابہؓ نے ان کے ساتھ یہ برتاؤ کیا کہ ان کو کھانا کھلاتے تھے اور خود کھجوریں کھا کر رہ جاتے تھے۔ ان قیدیوں میں ابو عزیز بھی تھے جو حضرت مصعب بن عمیرؓ کے بھائی تھے ان کا بیان ہے کہ مجھ کو جن انصاریوں نے اپنے گھر میں قید کر رکھا تھا جب صبح یا شام کا کھانا لاتے تو روٹی میرے سامنے رکھ دیتے اور خود کھجوریں اٹھا لیتے، مجھ کو شرم آتی اور میں روٹی ان کے ہاتھ میں دے دیتا لیکن وہ ہاتھ بھی نہ لگاتے اور مجھ کو واپس دے دیتے اور یہ اس بنا پر تھا کہ آنحضرت ﷺ نے تاکید کی تھی کہ قیدیوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے۔[3]

---

[1] روض الانف۔

[2] ابن ہشام۔

[3] طبری صفحہ ۱۳۳۷۔

اسلام کے دوستوں سے جس شدت کے ساتھ عداوت تھی اسی شدت سے وہ اب دشمنانِ اسلام کے دشمن تھے یہاں پہنچ کر انہوں نے اسلام کی دعوت کو پھیلایا اور ایک مجمع کثیر کو اس روشنی سے منور کر دیا۔[1]

غزوۂ بدر کا بیان قرآن میں:

اس غزوہ کو دیگر غزوات پر جو امتیازات حاصل ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ خداوند نے اپنے کلام پاک میں اس کا مفصل ذکر کیا ہے اور ایک خاص سورہ (انفال) کو بدر کے واقعات و حکم کی تفصیل اور بعض مسائل متعلقہ بدر کی توضیح کے لئے مخصوص کر دیا ہے۔ واقعات کی اصل حقیقت جاننے کے لئے آسمان کے نیچے اس سے زیادہ کوئی ماخذ موجود نہیں۔

(۱) ﴿ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيمَانًا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ ۔ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا لَّهُمْ دَرَجَاتٌ عِندَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ كَمَا أَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِن بَيْتِكَ بِالْحَقِّ وَإِنَّ فَرِيقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ لَكَارِهُونَ يُجَادِلُونَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَأَنَّمَا يُسَاقُونَ إِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنظُرُونَ وَإِذْ يَعِدُكُمُ اللَّهُ إِحْدَى الطَّائِفَتَيْنِ أَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّونَ أَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُونُ لَكُمْ وَيُرِيدُ اللَّهُ أَن يُحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهِ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكَافِرِينَ لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُونَ إِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ أَنِّي مُمِدُّكُم بِأَلْفٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُرْدِفِينَ وَمَا جَعَلَهُ اللَّهُ إِلَّا بُشْرَىٰ وَلِتَطْمَئِنَّ بِهِ قُلُوبُكُمْ وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِندِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ إِذْ يُغَشِّيكُمُ النُّعَاسَ أَمَنَةً مِّنْهُ وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُم مِّنَ السَّمَاءِ مَاءً لِّيُطَهِّرَكُم بِهِ وَيُذْهِبَ عَنكُمْ رِجْزَ الشَّيْطَانِ وَلِيَرْبِطَ عَلَىٰ قُلُوبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْأَقْدَامَ إِذْ يُوحِي رَبُّكَ إِلَى الْمَلَائِكَةِ أَنِّي مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِينَ آمَنُوا سَأُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوا فَوْقَ الْأَعْنَاقِ وَاضْرِبُوا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ شَاقُّوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَمَن يُشَاقِقِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَإِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ذَٰلِكُمْ فَذُوقُوهُ وَأَنَّ لِلْكَافِرِينَ عَذَابَ النَّارِ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوهُمُ الْأَدْبَارَ وَمَن يُوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهُ إِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ أَوْ مُتَحَيِّزًا إِلَىٰ فِئَةٍ فَقَدْ بَاءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ وَمَأْوَاهُ جَهَنَّمُ ۔ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ فَلَمْ تَقْتُلُوهُمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ قَتَلَهُمْ وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ ۔ وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِينَ مِنْهُ بَلَاءً حَسَنًا إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ذَٰلِكُمْ وَأَنَّ اللَّهَ مُوهِنُ كَيْدِ الْكَافِرِينَ إِن تَسْتَفْتِحُوا فَقَدْ جَاءَكُمُ الْفَتْحُ وَإِن تَنتَهُوا فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَإِن تَعُودُوا نَعُدْ وَلَن تُغْنِيَ عَنكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْئًا وَلَوْ كَثُرَتْ وَأَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُؤْمِنِينَ ﴾ (انفال۔۲تا۱۹)

مومن وہ ہیں کہ جب اللہ کا نام لیا جائے تو ان کے دل دہل جائیں اور جب اس کی آیتیں پڑھ کر سنائی جائیں تو ان کا

[1] [illegible]

فَاثْبُتُوا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ وَاَطِيعُوا اللّٰهَ وَرَسُولَهٗ وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا
وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ وَاصْبِرُوا اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِينَ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ
بَطَرًا وَّرِئَآءَ النَّاسِ وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ ﴾ (انفال، ۴۱:۴۷)

[۲] جان لو کہ جو مال غنیمت ملے تو اس کا پانچواں حصہ اللہ کے لئے اور اس کے رسول کے لئے اہل قرابت کے لئے یتیموں کے لئے مسکینوں کے لئے اور مسافروں کے لئے ہے اگر اللہ پر تم ایمان لا چکے ہو اور حق و باطل میں فرق کر دینے والے دن میں (یعنی بدر میں) اللہ نے اپنے بندہ پر جو (کچھ) اتارا اس کو مان چکے جب دونوں فوجیں آمنے سامنے آگئی تھیں اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے جب تم قریب کے میدان میں اور قریش کی فوج دور کے میدان میں اور قافلہ تم سے نیچے تھا اگر تم ایک دوسرے سے وقت مقرر کر کے آتے تو وقت میں اختلاف ہو جاتا لیکن اللہ نے یہ اس لئے کر دیا تا کہ جو ہونے والا تھا اللہ اس کو کر دے تا کہ جس کو مرنا ہو وہ بھی دلیل دیکھ کے مرے اور جس کو زندہ رہنا ہے وہ بھی دلیل دیکھ کے زندہ رہے اور بے شک اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے یاد کرو جب اللہ تم کو جنگ کی حالت میں ان کو تھوڑا دکھا رہا تھا اگر زیادہ کر کے دکھاتا تو تم سست پڑ جاتے اور باہم جھگڑنے لگتے لیکن خدا نے محفوظ رکھا وہ سینوں کے بھید سے واقف ہے اور جب تمہاری نظر میں اللہ ان کو تھوڑا دکھا رہا تھا اور تم کو ان کی نگاہ میں تا کہ جو ہونے والا ہے اللہ اس کو پورا کرے اور اللہ ہی کی طرف تمام معاملے پھرتے ہیں۔ مسلمانو! جب کسی دستہ فوج سے مقابلہ آ پڑے تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو بکثرت یاد کیا کرو تا کہ کامیاب ہو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور جھگڑا نہ کرو ورنہ سست پڑ جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی مستقل رہو اللہ مستقل لوگوں کے ساتھ ہے اور ان لوگوں (یعنی قریش) کی طرح نہ بنو جو اپنے گھروں سے مغرورانہ نمائش اور دکھاوے کے ساتھ اور اللہ کی راہ سے لوگوں کو روکتے ہوئے نکلے اور اللہ ان کے تمام کاموں کو گھیرے ہوئے ہے۔

(۳) ﴿ مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُونَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ تُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا
وَاللّٰهُ يُرِيدُ الْاٰخِرَةَ وَاللّٰهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ
عَظِيمٌ فَكُلُوا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا وَّاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّمَنْ
فِيٓ اَيْدِيكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰى اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِي قُلُوبِكُمْ خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّآ اُخِذَ مِنْكُمْ
وَيَغْفِرْ لَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ وَاِنْ يُّرِيدُوا خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ فَاَمْكَنَ مِنْهُمْ وَاللّٰهُ
عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴾ (انفال، ۶۷:۷۱)

پیغمبر کے لئے یہ مناسب نہ تھا کہ اس کے پاس قیدی ہوں تا آنکہ خوب زمین میں خونریزی نہ کر لے تم دنیا کی دولت چاہتے ہو (قیدی ہوں گے تو فدیہ ہاتھ آئے گا) اور اللہ آخرت چاہتا ہے اور اللہ غالب اور دانا ہے اگر اللہ کی تقدیر پہلے نہ ہو چکی ہوتی تو تم نے جو قیدیوں سے لے لیا اس پر تم کو بڑا سخت عذاب پہنچتا اب جو کچھ تم کو غنیمت میں ملا کھاؤ وہ حلال و طیب ہے اور اللہ سے ڈرو، بے شبہ اللہ بخشنے والا مہربان ہے اے پیغمبر تمہارے ہاتھ میں جو قیدی ہیں ان سے کہو کہ اللہ اگر تمہارے دلوں میں کچھ نیکی دیکھے گا تو تم سے جو لیا گیا ہے اس سے بہتر تم کو عطا کرے گا اور تمہیں معاف کرے گا وہ بخشنے اور مہربانی والا ہے اور اگر یہ قیدی تم سے خیانت کرنا چاہتے ہیں تو اس سے پہلے اللہ کے ساتھ خیانت

﴿ وَإِنَّ فَرِيقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ لَكَارِهُونَ ﴾ (انفال۔۱۰)
اور مسلمانوں کا ایک گروہ تو ناخوش تھا۔

عموماً ارباب سیر اور محدثین نے تصریح کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے انصار کی رضامندی جو خاص طور پر دریافت کی اس کی وجہ یہ تھی کہ انصار نے ابتدا میں جب آپ کے ہاتھ پر بیعت کی تو صرف یہ اقرار لیا تھا کہ "جب کوئی دشمن خود مدینہ پر چڑھ آئے گا تو ہم مقابلہ کریں گے" یہ اقرار نہ تھا کہ مدینہ سے باہر نکل کر بھی لڑیں گے لیکن واقعات کے بعد اب زیر بحث یہ ہے کہ "یہ واقعات کہاں پیش آئے"؟ ارباب سیر لکھتے ہیں کہ جب آپ مدینہ سے نکلے تو صرف قافلۂ تجارت پر حملہ کرنا مقصود تھا، دو چار منزل چل کر معلوم ہوا کہ قریش فوجیں لے کر چلے آتے ہیں، اس وقت آپ نے مہاجرین اور انصار کو جمع کیا اور ان کا عندیہ دریافت فرمایا، یہیں آگے کے واقعات بھی پیش آئے۔ لیکن کتب سیر و تاریخ اور تمام دیگر شہادتوں سے بالاتر ایک اور چیز ہمارے پاس موجود ہے (قرآن) جس کے آگے ہم سب کو گردن جھکا دینی چاہئے۔

﴿ كَمَا أَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِن بَيْتِكَ بِالْحَقِّ وَإِنَّ فَرِيقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ لَكَارِهُونَ يُجَادِلُونَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَمَا تَبَيَّنَ كَأَنَّمَا يُسَاقُونَ إِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنظُرُونَ وَإِذْ يَعِدُكُمُ اللَّهُ إِحْدَى الطَّائِفَتَيْنِ أَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّونَ أَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُونُ لَكُمْ وَيُرِيدُ اللَّهُ أَن يُحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهِ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكَافِرِينَ ﴾ (انفال پارہ ۹ آیت ۵۔۷)

جس طرح تجھ کو تیرے خدا نے تیرے گھر سے حق پر نکالا درآنحالیکہ مسلمانوں کا ایک گروہ اس کو پسند نہیں کرتا تھا یہ لوگ حق کے ظاہر ہونے کے پیچھے تجھ سے اس بات میں جھگڑا کرتے تھے گویا کہ موت کی طرف ہنکائے جا رہے ہیں اور موت کو آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور جب اللہ تم سے یہ وعدہ کرتا تھا کہ دو جماعتوں میں کوئی جماعت تم کو ہاتھ آئے گی اور تم یہ چاہتے تھے کہ بے کھٹکے والی جماعت تم کو ہاتھ آئے اور اللہ یہ چاہتا تھا کہ حق کو اپنی باتوں سے قائم کر دے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے۔

(۱) ترکیب نحوی کے لحاظ سے وانّ میں جو واؤ ہے حالیہ ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ مسلمانوں کا ایک گروہ جو لڑائی سے جی چراتا تھا یہ موقع تھا جب آپ مدینہ سے نکل رہے تھے نہ کہ مدینہ سے نکل کر جب آپ آگے بڑھے کیونکہ واؤ حالیہ کے لحاظ سے خروج من البیت اور اس گروہ کے جی چرانے کا وقت اور زمانہ ایک ہی ہونا چاہئے۔

(۲) آیت مذکورہ میں بہ تصریح مذکور ہے کہ یہ جس وقت کا واقعہ ہے اس وقت دو گروہ سامنے تھے ایک کاروان تجارت اور ایک قریش کی فوج جو مکہ سے آ رہی تھی۔ ارباب سیر کہتے ہیں کہ آیت قرآنی میں جو اس وقت کا واقعہ مذکور ہے جب آنحضرت ﷺ بدر کے قریب پہنچ چکے تھے لیکن بدر کے قریب پہنچ کر تو کاروان تجارت بچ سلامت نکل گیا تھا اس وقت یہ کیونکر صحیح ہو سکتا ہے کہ دونوں میں سے ایک کا وعدہ ہے اس لئے یہ بالکل ظاہر ہے کہ قرآن مجید کے نص کے مطابق یہ واقعہ اس وقت کا ہونا چاہئے جب دونوں گروہ کے ہاتھ آنے کا احتمال ہو سکتا ہو اور یہ صرف وہ وقت ہو سکتا ہے جب آنحضرت ﷺ مدینہ میں تھے اور دونوں فریق کی خبریں آ رہی تھیں کہ ادھر ابوسفیان کاروان تجارت لے کر چلا ہے اور

بجز معذوروں کے وہ لوگ جو بیٹھ رہے اور وہ لوگ جو اللہ کی راہ میں اپنے مال اور جان سے جہاد کرتے ہیں برابر نہیں ہو سکتے اللہ نے مجاہدین کو جو مال اور جان سے جہاد کرتے ہیں درجہ میں فضیلت دی ہے۔

صحیح بخاری میں اس آیت کے متعلق حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ وہ لوگ جو بدر میں نہیں شریک ہوئے اور وہ جو شریک ہوئے دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ صحیح بخاری میں یہ بھی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو پہلے غیر اولی الضرر کا جملہ نہ تھا یہ آیت سن کر عبداللہ بن ام مکتومؓ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنے نابینا ہونے کا عذر کیا اس پر آیت میں یہ جملہ نازل ہوا "غیر اولی الضرر" یعنی "معذوروں کے سوا" یہ صاف اس بات کی دلیل ہے کہ مدینہ ہی میں معلوم ہو گیا تھا کہ قافلہ پر حملہ کرنا نہیں بلکہ لڑنا اور جان دینا ہے۔

(۲) کفار قریش چونکہ لڑنے کے لئے بدر میں آئے ان کی نسبت قرآن مجید میں ہے۔

﴿ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَرِئَاءَ النَّاسِ وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ﴾ (انفال)

اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جو اپنے گھروں سے مغرورانہ نمائش اور خدا کی راہ سے روکتے ہوئے نکلے۔

اگر قریش صرف قافلہ تجارت کے بچانے کے لئے نکلتے تو اللہ یہ نہیں کہتا کہ وہ اظہار شان اور دکھاوے کے لئے اللہ کی راہ سے لوگوں کو روکتے ہوئے نکلے" اس میں اظہار شان اور دکھاوے سے کیا بات تھی اور اللہ کی راہ سے لوگوں کو روکنا کیا تھا؟ چونکہ حقیقت میں وہ مدینہ پر حملہ کرنے کے لئے نکلے تھے جس سے مقصود اپنے زور اور قوت کا اعلان اور اشاعت اسلام کی ترقی کا انسداد تھا اس لئے اللہ نے اس کو غرور و نمائش اور صد عن سبیل اللہ کہا۔

قرآن مجید کے بعد احادیث نبوی کا درجہ ہے احادیث کی متعدد کتابوں میں غزوۂ بدر کا مفصل و مجمل ذکر ہے لیکن کعب بن مالک والی حدیث کے سوا اور کسی حدیث میں یہ تصریح نظر سے نہیں گزری کہ آنحضرت ﷺ بدر میں قریش کے قافلہ تجارت کے لوٹنے کے لئے نکلے تھے۔

کعبؓ بن مالک کی حدیث متعدد وجوہ سے قابل بحث ہے۔

حضرت کعبؓ کی حدیث یہ ہے۔

﴿ عن عبداللہ بن کعب قال کعب لم اتخلف عن رسول اللہ ﷺ فی غزوۃ غزاھا الا غزوۃ تبوک غیر انی کنت تخلفت فی غزوۃ بدر ولم یعاتب احد تخلف عنھا انما خرج النبی ﷺ یرید عیر قریش حتی جمع اللہ بینھم وبین عدوھم علی غیر میعاد ﴾

کعب کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو چھوڑ کر کسی غزوہ سے پیچھے نہیں رہا بجز غزوۂ تبوک کے، ہاں غزوۂ بدر میں بھی شریک نہ تھا اور جو اس میں شریک نہ ہوا اس پر کچھ عتاب نہیں ہوا کیونکہ آنحضرت ﷺ قریش کے قافلے کے لئے نکلے تھے خدا نے دفعتاً قریش کو اچانک مقابل کر دیا۔

اس کے برخلاف حضرت انسؓ کی حدیث ہے جو صحیح مسلم میں ہے۔

(۱) ﴿ عن انس ان رسول اللہ ﷺ شاور حین بلغہ اقبال ابی سفیان قال فتکلم ابو بکر

فاعرض عنہ ثم تکلم عمر فاعرض عنہ فقام سعدؓ بن عبادۃ فقال ایانا ترید یا رسول اللہ والذی نفسی بیدہ لو امرتنا ان نخیضھا البحر لا خضناھا ولو امرتنا ان نضرب اکبادھا الی برک الغماد لفعلنا قال فندب رسول اللہ ﷺ الناس فانطلقوا حتی نزلوا بدرا ﴾

حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ کو جب ابوسفیان کے آنے کی خبر معلوم ہوئی تو آپ نے مشورہ طلب کیا حضرت ابوبکرؓ بولے لیکن آپ نے توجہ نہ فرمائی پھر حضرت عمرؓ بولے آپ نے ان کی طرف بھی توجہ نہ کی پھر حضرت سعدؓ بن عبادہ کھڑے ہوئے اور کہا یا رسول اللہ! کیا آپ کا روئے خطاب ہم انصار کی طرف ہے خدا کی قسم اگر دریا میں سواری ڈالنے کا آپ حکم دیں تو ہم ڈال دیں گے اگر برک الغماد تک جانے کا حکم ہو تب بھی ہم کریں گے حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ اس کے بعد آپ نے لوگوں کو شرکت جنگ کی دعوت دی لوگ نکل پڑے اور بدر پہنچے۔

(۲) ﴿ ووردت علیھم روایا قریش وفیھم غلام اسود لبنی الحجاج فاخذوہ فکان اصحاب رسول اللہ ﷺ یسئلونہ عن ابی سفیان واصحابہ فیقول مالی علم بابی سفیان ولکن ھذا ابو جھل وعتبۃ وشیبۃ وامیۃ بن خلف فاذا قال ذلک ضربوہ فقال نعم انا اخبرکم ھذا ابو سفیان فاذا ترکوہ فقال مالی بابی سفیان من علم ھذا ابو جھل ... رسول اللہ ﷺ قائم یصلی فلما رای ذلک انصرف قال والذی نفسی بیدہ لتضربوہ اذا صدقکم وتترکوہ اذا کذبکم ﴾ (صحیح مسلم باب غزوۂ بدر)

اور (پہلے) قریش کا ہراول دستہ آ گیا اس میں بنی حجاج کا ایک حبشی غلام تھا مسلمانوں نے اس کو گرفتار کر لیا اور اس سے ابوسفیان کا حال پوچھنے لگے وہ کہتا تھا مجھے ابوسفیان کی خبر نہیں لیکن یہ ابوجہل، عتبہ، شیبہ، امیہ بن خلف آ رہے ہیں جب وہ یہ کہتا تو لوگ اس کو مارتے تو وہ کہتا اچھا ابوسفیان کا پتا بتاتا ہوں تب اس کو چھوڑ دیتے تو پھر پوچھتے تو وہ کہتا مجھ کو ابوسفیان کی خبر نہیں لیکن ابوجہل، عتبہ، شیبہ، امیہ بن خلف وغیرہ سامنے قریش آ رہے ہیں لیکن جب وہ یہ کہتا تب بھی اس کو مارتے۔ آنحضرت ﷺ نماز میں مشغول تھے آپ نے یہ دیکھ کر فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے جب وہ سچ کہتا ہے تو تم اس کو مارتے ہو اور جب جھوٹ بولتا ہے تو چھوڑ دیتے ہو۔

حدیث کے پہلے ٹکڑے سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب ابوسفیان کے آنے کا حال معلوم ہوا اسی وقت آپ نے مہاجرین وانصار سے مشورہ کیا اور انصار سے اعانت کی خواہش کی اور یہ مطلقاً ثابت ہے کہ ابوسفیان کی آمد کا حال مدینہ ہی میں معلوم ہو چکا تھا اس بنا پر یہ تحقیقی طور پر ثابت ہو گیا کہ اس غزوہ کی شرکت کے لئے آپ ﷺ نے انصار سے مدینہ ہی میں خواہش کی تھی ورنہ اگر بدر پہنچ کر یہ معاملہ پیش آتا جیسا کہ کتب سیرت میں مذکور ہے تو اس وقت انصار وہاں کہاں ہوتے؟ اور نیز اسی ٹکڑے میں مذکور ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مشورہ کے بعد لوگوں کو شرکت کی دعوت دی حالانکہ ارباب سیرت کے مطابق واقعہ یہ ہونا چاہئے کہ انصار معاہدہ اور معمول سابق کے خلاف شرکت کے لئے نکلے۔ آنحضرت ﷺ نے پھر ان کا عندیہ دریافت فرمایا اور اس کے بعد شرکت کے لئے آمادہ کیا۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ ایک بے جوڑ بات ہے۔

حدیث کے دوسرے ٹکڑے سے بوضاحت تمام ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کو وحی کے ذریعہ سے یا کسی اور طریقے سے یہ پہلے ہی سے معلوم تھا کہ تجارتی قافلہ کا نہیں بلکہ جنگی فوج کا مقابلہ ہے۔ گو عام لوگوں کو یہ معلوم نہ ہو۔ اس حدیث میں ایک گروہ کو جو کھٹکا ہے کہ اگر پہلے صرف ابوسفیان کا آنا معلوم ہوا تھا اور قریش کے حملہ کی خبر نہ تھی تو آنحضرت ﷺ اس اصرار اور سروسامان سے کیوں اجتماع کا اہتمام فرماتے؟ اس لئے ابوسفیان کی آمد کے بجائے موقع کا اقتضا یہ ہے کہ یہ ہو کہ "جب مشرکین مکہ کی آمد کی خبر معلوم ہوئی" چنانچہ اسی واقعہ کو انہیں الفاظ کے ساتھ امام احمد بن حنبل نے مسند میں ابن ابی شیبہ نے مصنف[1] میں ابن جریر نے تاریخ[2] میں اور بیہقی نے دلائل میں روایت کیا ہے اور اس کو "صحیح" کہا ہے اور اس کے راوی معرکہ بدر کے ہیرو اسد اللہ علیؓ بن ابی طالب ہیں۔

﴿عن علي قال لما قدمنا المدينة أصبنا من ثمارها فاجتويناها وأصابنا بها وعك وكان النبي ﷺ يتخبر عن بدر فلما بلغنا أن المشركين قد أقبلوا سار رسول الله ﷺ إلى بدر وبدر بئر فسبقنا المشركين إليها﴾ (اس کے بعد بدر کے تمام واقعات و جزئیات مذکور ہیں)

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ جب ہم مدینہ آئے تو وہاں کے پھل کھانے کو ملے جو ہمارے موافق مزاج نہ تھے اس سے ہم لوگ بیمار ہو گئے آنحضرت ﷺ بدر کا پتا کرتے تھے، جب ہم کو خبر ملی کہ مشرکین آ رہے ہیں تو رسول اللہ ﷺ بدر کو چلے بدر ایک کنواں کا نام ہے، ہم لوگ مشرکین سے پہلے پہنچ گئے۔

اس میں صاف تصریح ہے کہ مشرکین مکہ کے حملہ کی خبر سن کر آپ نکلے تھے اور بدر کا قصد فرمایا تھا اس پوری حدیث میں ابوسفیان کے قافلہ تجارت کا ذکر تک نہیں ہے۔ ان قطعی نصوص کے بعد اگرچہ کسی اور استدلال کی ضرورت نہیں لیکن بغرض مزید اطمینان کے حسب ذیل واقعات پر لحاظ کرنا چاہیے۔

(۱) آنحضرت ﷺ نے اس سے پہلے قریش کے قافلوں پر حملہ کرنے کے لئے جس قدر سرایا بھیجے اور جن میں شریک تیس آدمی سے زیادہ کی جمعیت نہ تھی ان میں بھی کسی انصاری کو نہیں بھیجا۔ ارباب سیر اس خاص امر کو بہ تصریح لکھتے ہیں اور اس تصریح کی اس لئے ضرورت سمجھتے ہیں کہ انصار نے بیعت کے وقت مدینہ سے باہر نکلنے کا اقرار نہیں کیا تھا۔ اس بنا پر اگر اس دفعہ بھی مدینہ سے نکلنے کے وقت صرف قافلہ تجارت پر حملہ کرنا مقصود ہوتا تو انصار ساتھ نہ ہوتے، حالانکہ اس واقعہ میں انصار کی تعداد مہاجرین سے زیادہ تھی یعنی کل فوج ۳۰۵ تھی جن میں ۷۴ مہاجرین اور باقی سب انصار تھے۔

یہ بات بھی قطعی دلیل ہے کہ جس وقت مدینہ سے آپ ﷺ نکلے یہ خبر آ چکی تھی کہ قریش مدینہ پر آ رہے ہیں، اسی بنا پر آپ ﷺ نے انصار کو مخاطب کیا کیونکہ معاہدۂ بیعت کے موافق اب انصار سے کام لینے کا وقت آ چکا تھا۔

(۳) مکہ سے جو قافلہ تجارت کے لئے شام کو جایا کرتا تھا مدینہ کے پاس سے ہو کر گزرتا تھا، مدینہ سے مکہ تک

---

۱ جلد اول صفحہ ۱۱۷۔

۲ منتخب کنز العمال غزوۂ بدر۔

۳ جلد ۳ ص ۱۲۹۹۔

بے شک اس کو کیونکر چھوڑ سکتا ہوں"۔ چنانچہ قرعہ اندازی ہوئی اور سعدؓ کے نام قرعہ نکلا، سعدؓ شریک جنگ ہو کر شہید ہوئے۔

اس سے صاف ثابت ہے کہ قافلہ لوٹنا نہیں بلکہ جہاد پیش نظر تھا اور لوگوں کو دولت شہادت کے حاصل ہونے کی آرزو تھی۔

غزوۂ بدر کا اصلی سبب:

عرب کا عام قاعدہ تھا کہ جب کسی قبیلہ کا کوئی آدمی کسی طریقہ سے کسی کے ہاتھ سے قتل ہو جاتا تھا تو ایک سخت ہنگامۂ کارزار قائم ہو جاتا تھا، دونوں طرف تلواریں اٹھ آتی تھیں اور خون کی ندیاں بہہ جاتی تھیں، یہ لڑائیاں صدیوں تک قائم رہتی تھیں، قبیلے کے قبیلے کٹ جاتے تھے تاہم یہ سلسلہ بند نہیں ہوتا تھا، عرب جیسے پڑھے نہ تھے تاہم مقتول کا نام کاغذ پر درج ہو کر خاندان میں وراثتاً چلا آتا تھا، بچوں کو یہ نام یاد کرایا جاتا تھا کہ بڑے ہو کر اس خون کا انتقام لینا ہے۔ داحس اور بسوس کی قیامت خیز لڑائیاں جو چالیس چالیس برس تک قائم رہیں اور جن میں ہزاروں لاکھوں جانیں برباد ہو گئیں اسی بنا پر ہوئی تھیں۔ عربی زبان میں اس انتقام کو ثار کہتے ہیں اور یہ عرب کی قومی تاریخ کا سب سے بڑا اہم نقطہ ہے۔

جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں عبداللہ بن جحشؓ کے واقعہ میں عمرو بن حضرمی قتل ہو گیا تھا، حضرمی عتبہ بن ربیعہ کا حلیف تھا جو تمام قریش کا سردار تھا، بدر اور تمام غزوات کا سلسلہ اسی خون کا نتیجہ تھا، عروہ بن زبیرؓ (حضرت عائشہؓ کے بھانجے) نے اس واقعہ کی تصریح بیان کی ہے۔

﴿وكان الذي هاج وقعة بدر وسائر الحروب التي كانت بين رسول الله ﷺ وبين مشركي قريش فيما قال عروة بن الزبير ما كان من قتل واقد[1] بن عبد الله التميمي عمرو بن الحضرمي﴾ (تاریخ طبری ص ۱۲۸۴)

جس چیز نے غزوۂ بدر اور دیگر وہ تمام لڑائیاں پیدا کیں جو آنحضرت ﷺ اور مشرکین عرب کے درمیان واقع ہوئیں وہ جیسا کہ عروہ بن زبیرؓ کا بیان ہے عمرو بن حضرمی کا قتل کیا جانا ہے جس کو واقد بن عبداللہ تمیمی نے قتل کر دیا تھا۔

ایک عام غلطی جس نے اس واقعہ کو بحث طلب میں غلطی پیدا کر دی ہے یہ ہے کہ سب سے پہلے جو لڑائی کفار سے ہوئی وہ بدر کی جنگ سمجھی جاتی ہے حالانکہ اس سے پہلے لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا، عروہ بن زبیرؓ نے غزوۂ بدر کے متعلق عبدالملک کو جو خط لکھا تھا اس کے چند فقرے یہ ہیں۔

﴿ان ابا سفيان بن حرب اقبل من الشام في قريب من سبعين راكبا من قبائل قريش فذكروا رسول الله ﷺ واصحابه وقد كانت الحرب بينهم فقتلت قتلى وقتل ابن الحضرمي في ناس بنخلة واسرت اسارى من قريش ...... وكانت تلك الوقعة هاجت

[1] [illegible] حضرت عمرؓ کے بھانجے اور آنحضرت ﷺ کے خاص صحابی تھے، واقدی کا قول ہے کہ واقد بن عبداللہ حضرت عمرؓ کے خاندان کے حلیف تھے، حضرت عمرؓ کے آغاز خلافت تک زندہ رہے۔ دیکھو طبقات ابن سعد ترجمہ واقد بن عبداللہ۔

الحرب بین رسول اللہ ﷺ و بین قریش و اول ما اصاب به بعضهم بعضا من الحرب۔
و ذلک قبل مخرج ابی سفیان و اصحابه الی الشام ﴾ (طبری صفحہ ١٢٨٥)

ابوسفیان بن حرب تقریباً ستر سوار کے ساتھ شام سے آ رہا تھا' یہ لوگ کل قریش تھے' آنحضرت ﷺ اور صحابہ سے اس کا تذکرہ ہوا اور دونوں فریق میں لڑائی شروع ہو گئی تھی اور ادھر کے چند لوگ جن میں ابن حضرمی بھی تھا' مارے جا چکے تھے اور کچھ قید بھی ہو چکے تھے...... اور یہی واقعہ ہے جس نے آنحضرت ﷺ اور قریش میں جنگ برپا کر دی تھی اور یہ سب سے پہلا واقعہ تھا جس میں دونوں فریق نے ایک دوسرے کو صدمہ پہنچایا اور یہ لڑائی ابوسفیان کی روانگی شام سے پہلے وقوع میں آ چکی تھی۔

اس میں تصریح ہے کہ ابوسفیان جب شام کو روانہ بھی نہیں ہوا تھا اسی وقت لڑائی شروع ہو چکی تھی۔ غزوۂ بدر ابوسفیان کی واپسی شام کے بعد واقع ہوا ہے۔ اصل واقعہ کی تحقیق کا سب سے بڑا اصلی ذریعہ یہ ہے کہ خود حریفان جنگ کی شہادت بہم پہنچائی جائے' اس قسم کی شہادتیں بہت کم ہاتھ آ سکتی ہیں لیکن خوش قسمتی سے یہاں اس قسم کی شہادت موجود ہے۔ حکیم بن حزام (حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے) غزوۂ بدر میں شریک تھے اور اس وقت تک کافر تھے' وہ عمر میں آنحضرت ﷺ سے پانچ برس بڑے تھے۔ گو زمانہ جاہلیت میں آنحضرت ﷺ سے نہایت محبت رکھتے تھے اور نبوت کے بعد بھی یہ محبت قائم رہی تاہم فتح مکہ تک ایمان نہیں لائے۔ وہ رؤسائے قریش میں سے تھے' حرم کا ایک بڑا منصب یعنی رفادہ انہی کے ہاتھ میں تھا' دارالندوہ کے مہتمم اور مالک بھی وہی[1] تھے اور مروان بن حکم کے زمانہ خلافت تک زندہ رہے۔ ایک دفعہ وہ مروان سے ملنے گئے' مروان نے نہایت تعظیم و تکریم کی' صدر مجلس سے اٹھ کر ان کے پاس آ بیٹھا اور کہا بدر کا واقعہ بیان کیجئے' انہوں نے واقعہ کے ابتدائی حالات بیان کر کے کہا کہ جب ہماری فوجیں میدان میں اتریں تو میں عتبہ کے پاس گیا اور میں نے اس سے یہ کہا۔

﴿ یا ابا الولید هل لک ان تذهب بشرف هذا الیوم مابقیت' قال افعل ماذا؟ قلت انکم لاتطلبون من محمد الا دم ابن الحضرمی و هو حلیفک فتحمل دیته فترجع بالناس ﴾[2]

اے ابوالولید! کیا تم یہ چاہتے ہو کہ تم عمر بھر کے لئے ساری نیک نامی تم ہی کو ہاتھ آئے؟ عتبہ نے کہا کیونکر؟ میں نے کہا تم لوگ (یعنی قریش) محمد ﷺ سے ابن حضرمی کے خون کے سوا اور کچھ نہیں چاہتے اور وہ تمہارا حلیف تھا' اس لئے تم اس کا خون بہا ادا کر دو کہ سب لوگ واپس چلے جائیں۔

عتبہ نے یہ تجویز پسند کی لیکن ابوجہل نے نہ مانا اور حضرمی کے بھائی عامر حضرمی کو بلا کر کہا' خون کا بدلا سامنے ہے' غیرت ہے تو قوم سے مدد مانگ' عامر عرب کے دستور کے موافق ننگا ہو گیا اور پکارا[3]

واعمراہ واعمراہ ہائے عمرو (حضرمی) ہائے عمرو!

آغاز جنگ کے وقت سب سے پہلے جو شخص میدان جنگ میں نکلا وہ یہی عامر حضرمی تھا۔

---

١ اصابہ تذکرہ حکیم بن حزام

٢ طبری صفحہ ١٣١٢ اور سیرت ابن ہشام مطبوعہ مصر "غزوۂ بدر" میں

٣ پوری تفصیل طبری صفحہ ١٣١٢ تا ١٣١٣ میں ہے۔

لے یہ سب سرمایہ حضرت فاطمہ زہراؓ کی نذر کیا۔ حضرت علیؓ اب تک آنحضرت ﷺ ہی کے پاس رہتے تھے۔ شادی کے بعد ضرورت ہوئی کہ الگ گھر لیں۔ حضرت حارثہؓ بن نعمان انصاری کے متعدد مکانات تھے جن میں سے وہ کئی آنحضرت ﷺ کو نذر کر چکے تھے۔ حضرت فاطمہؓ نے آنحضرت ﷺ سے کہا۔ ان ہی سے کوئی اور مکان دلوا دیجئے۔ آپ نے فرمایا کہ کہاں تک؟ اب ان سے کہتے شرم آتی ہے۔ حضرت حارثہؓ نے سنا تو دوڑے آئے کہ حضور میں اور میرے پاس جو کچھ ہے سب آپ کا ہے۔ اللہ کی قسم میرا جو مکان آپ لے لیتے ہیں مجھ کو اس سے زیادہ خوشی ہوتی ہے کہ وہ میرے پاس رہ جائے۔ غرض انہوں نے اپنا ایک مکان خالی کر دیا۔ حضرت فاطمہؓ اس میں اٹھ گئیں۔

شہنشاہ کونین ﷺ نے سیدۂ عالم کو جو جہیز دیا وہ بان کی چارپائی، چمڑے کا گدا جس کے اندر روئی کے بجائے کھجور کے پتے تھے، ایک چھاگل، ایک مشک، دو چکیاں اور دو مٹی کے گھڑے تھے۔

حضرت فاطمہؓ جب نئے گھر میں جا چکیں تو آنحضرت ﷺ ان کے پاس تشریف لے گئے، دروازہ پر کھڑے ہو کر اذن مانگا، پھر اندر آئے، ایک برتن میں پانی منگوایا، دونوں ہاتھ اس میں ڈالے اور حضرت علیؓ کے سینہ و بازوؤں پر پانی چھڑکا، پھر حضرت فاطمہؓ کو بلایا، وہ شرم سے لڑکھڑاتی آئیں، ان پر بھی پانی چھڑکا اور فرمایا کہ میں نے اپنے خاندان میں سب سے افضل ترشخص سے تمہارا نکاح کیا ہے۔[1]

واقعات متفرقہ ۲ھ

(مورخین کے بیان کے مطابق اسی سال رمضان مبارک کے روزے فرض ہوئے، صدقہ عید الفطر کا حکم بھی اسی سال سے جاری ہوا۔ پہلے آپ نے ایک خطبہ دیا جس میں اس صدقہ کے فضائل بیان فرمائے۔ پھر صدقہ کا حکم دیا۔

عید الفطر کی نماز با جماعت عید گاہ میں بھی اسی سال ادا فرمائی اس سے پہلے عید کی نماز نہیں ہوتی تھی۔

ارباب سیر کی ترتیب کے مطابق غزوۂ بنی قینقاع کا ذکر بھی اسی سال کے واقعات میں ہونا چاہئے تھا لیکن تسلسل واقعہ کی بنا پر وہ آگے مذکور ہوگا۔)

---

[1] یہ پوری تفصیل طبقات ابن سعد و اصابہ سے ماخوذ ہے۔

سے نکل کر فوج کا جائزہ لیا گیا، اور جو لوگ کمسن تھے واپس کر دیئے گئے، ان میں حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت براء بن عازبؓ، حضرت ابو سعید خدریؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت عرابہ اوسیؓ بھی تھے، لیکن جوش کا یہ ذوق تھا کہ نوجوانوں میں سے جب رافعؓ بن خدیج سے کہا گیا کہ تم کمسن ہو، لوٹ جاؤ تو وہ انگوٹھوں کے بل تن کر کھڑے ہو گئے کہ قد اونچا نظر آئے؛ چنانچہ ان کی یہ ترکیب چل گئی اور وہ لے لئے گئے۔ حضرت سمرہؓ ایک نوجوان جوان کے ہم سن تھے، انہوں نے یہ دلیل پیش کی کہ میں رافع کو کشتی میں پچھاڑ لیتا ہوں اس لئے اگر ان کو اجازت ملتی ہے تو مجھ کو بھی ملنی چاہیے، دونوں کا مقابلہ کرایا گیا اور سمرہؓ نے رافع کو زمین پر دے مارا، اس بنا پر ان کو اجازت مل گئی۔

آنحضرت ﷺ نے احد کو پشت پر رکھ کر صف آرائی کی، حضرت مصعبؓ بن عمیر کو علم عنایت کیا، حضرت زبیرؓ بن العوام رسالے کے افسر مقرر ہوئے، حضرت حمزہؓ کو اس حصہ فوج کی کمان ملی جو زرہ پوش نہ تھے، پشت کی طرف احتمال تھا کہ دشمن ادھر سے آئیں، اس لئے پچاس تیر اندازوں کا ایک دستہ متعین فرمایا اور حکم دیا کہ گو لڑائی فتح ہو جائے تاہم وہ جگہ سے نہ ہٹیں، حضرت عبداللہ بن جبیرؓ ان تیر اندازوں کے افسر مقرر ہوئے۔

قریش کو بدر میں تجربہ ہو چکا تھا اس لئے انہوں نے نہایت ترتیب سے صف آرائی کی، میمنہ پر خالد بن ولید کو مقرر کیا، میسرہ عکرمہ کو دیا جو ابوجہل کے فرزند تھے، سواروں کا دستہ صفوان بن امیہ کی کمان میں تھا جو قریش کا مشہور رئیس تھا، تیر اندازوں کے دستے الگ تھے جن کا افسر عبداللہ بن ابی ربیعہ تھا، طلحہ علمبردار تھا، دو سو گھوڑے کوتل رکاب میں تھے کہ ضرورت کے وقت کام آئیں۔

سب سے پہلے طبل جنگ کے بجائے خاتونان قریش دف پر اشعار پڑھتی ہوئی بڑھیں، جن میں کشتگان بدر کا ماتم اور انتقام خون کے رجز تھے، ہند (ابوسفیان کی بیوی) آگے آگے اور چودہ عورتیں ساتھ ساتھ تھیں، اشعار یہ تھے۔

نحن بنات طارق	ہم آسمان کے تاروں کی بیٹیاں ہیں
نمشی علی النمارق	ہم قالینوں پر چلنے والیاں ہیں
ان تقبلوا نعانق	اگر تم بڑھ کر لڑو گے تو ہم تم سے گلے ملیں گی
او تدبروا نفارق	اور پیچھے قدم ہٹایا تو ہم تم سے الگ ہو جائیں گی

لڑائی کا آغاز اس طرح ہوا کہ ابو عامر جو مدینہ کا ایک مقبول عام شخص تھا اور مدینہ چھوڑ کر مکہ میں آباد ہو گیا تھا، ڈیڑھ سو آدمیوں کے ساتھ میدان میں آیا، اسلام سے پہلے زہد اور پارسائی کی بنا پر تمام مدینہ اس کی عزت کرتا تھا۔ چونکہ اس کو خیال تھا کہ انصار جب اس کو دیکھیں گے تو رسول اللہ ﷺ کا ساتھ چھوڑ دیں گے، میدان میں آ کر پکارا "مجھ کو پہچانتے ہو؟ میں ابو عامر ہوں" انصار نے کہا "ہاں او بدکار! ہم تجھ کو پہچانتے ہیں، اللہ تیری آرزو بر نہ لائے"۔

---

۱ طبری جلد ۳ صفحہ ۱۳۹۱ میں طبری کی روایت ہے لیکن بعض دوسری روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت رافعؓ کو اجازت مل جانے کی یہ وجہ تھی کہ وہ اس زمانہ ہی میں تیر اندازی میں کمال رکھتے تھے۔ حضور ﷺ کو جب یہ حال معلوم ہوا تو ان کو شرکت کی اجازت دے دی۔ (ابن ہشام اور زرقانی و اصابہ، زرقانی جلد ۲ صفحہ ۲۰ و ابن کثیر جلد ۴ صفحہ ۱۳)

۲ طبری صفحہ ۱۳۹۴۔

قریش کا علمبردار طلحہ صف سے نکل کر پکارا "کیوں مسلمانو! تم میں کوئی ہے کہ یا مجھ کو جلد دوزخ میں پہنچا دے یا خود میرے ہاتھوں بہشت میں پہنچ جائے"۔[1] علی مرتضیٰؓ نے صف سے نکل کر کہا "میں ہوں" یہ کہہ کر تلوار ماری اور طلحہ کی لاش زمین پر تھی۔ طلحہ کے بعد اس کے بھائی عثمان نے جس کے پیچھے عورتیں اشعار پڑھتی آتی تھیں، علم ہاتھ میں لیا اور رجز پڑھتا ہوا حملہ آور ہوا۔

﴿ انّ على اهل اللواء حقا ان يخضب الصعدة او تندقا ﴾

علم برداروں کا فرض ہے کہ نیزہ کو خون میں رنگ دے یا وہ ٹکرا کر ٹوٹ جائے۔

حضرت حمزہؓ مقابلہ کو نکلے اور شانہ پر تلوار ماری کہ کمر تک اتر آئی، ساتھ ہی ان کی زبان سے نکلا کہ "میں ساقی حجاج کا بیٹا ہوں"۔

اب عام جنگ شروع ہوگئی۔ حضرت حمزہؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابودجانہؓ فوجوں کے دل میں گھس گئے اور صفیں کی صفیں صاف کر دیں۔ حضرت ابودجانہ عرب کے مشہور پہلوان تھے۔ آنحضرت ﷺ نے دست مبارک میں تلوار لے کر فرمایا "کون اس کا حق ادا کرتا ہے؟" اس سعادت کے لئے دفعتہ بہت سے ہاتھ بڑھے لیکن یہ فخر حضرت ابودجانہؓ کے نصیب میں تھا۔ اس غیر متوقع عزت نے ان کو بادۂ شجاعت سے مست کر دیا۔ سر پر سرخ رومال باندھا اور اکڑتے تنتے ہوئے فوج سے نکلے۔ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "یہ چال اللہ کو سخت ناپسند ہے لیکن اس وقت پسند ہے"۔ حضرت ابودجانہؓ فوجوں کو چیرتے، لاشوں پر لاشے گراتے بڑھتے چلے جاتے تھے یہاں تک کہ ہند سامنے آ گئی، اس کے سر پر تلوار رکھ کر اٹھا لی کہ رسول اللہ ﷺ کی تلوار اس قابل نہیں کہ عورت پر آزمائی جائے۔

حضرت حمزہؓ دو دستی تلوار مارتے جاتے تھے اور جس طرف بڑھتے تھے صفیں کی صفیں صاف ہو جاتی تھیں۔ اسی حالت میں سباع غبشانی سامنے آ گیا، پکارے کہ "او ختانۃ النساء کے بچے! کہاں جاتا ہے؟" یہ کہہ کر تلوار ماری۔ وہ خاک پر ڈھیر تھا۔

وحشی جو ایک حبشی غلام تھا اور جس سے جبیر بن مطعم اس کے آقا نے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ حضرت حمزہؓ کو قتل کر دے تو آزاد کر دیا جائے گا، وہ حضرت حمزہؓ کی تاک میں تھا۔ حضرت حمزہؓ برابر آئے تو اس نے چھوٹا سا نیزہ جس کو حربہ کہتے ہیں اور جو حبشیوں کا خاص ہتھیار ہے پھینک کر مارا جو ناف میں لگا اور پار ہو گیا۔ حضرت حمزہؓ نے اس پر حملہ کرنا چاہا لیکن لڑکھڑا کر گر پڑے اور روح پرواز کر گئی۔[2]

کفار کے علمبردار لڑ لڑ کر قتل ہو جاتے تھے، تاہم علم گرنے نہیں پاتا تھا۔ ایک کے گرنے سے پہلے دوسرا جانباز بڑھ کر علم کو ہاتھ میں لے لیتا تھا۔ ایک شخص نے جس کا نام صواب تھا جب علم ہاتھ میں لیا تو کسی نے بڑھ کر اس زور سے تلوار ماری کہ دونوں ہاتھ کٹ کر گر پڑے، لیکن وہ قومی علم کو اپنی آنکھوں سے خاک پر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ علم کے گرنے کے

1. یہ کل بیانات طبری کے سلسلۂ بیان سے لئے گئے ہیں۔
2. صحیح بخاری باب قتل حمزہ رضی اللہ عنہ

ساتھ مینہ کے بل زمین پر گرا اور علم کو سینہ سے دبا لیا' اسی حالت میں یہ کہتا ہوا مارا گیا کہ' میں نے اپنا فرض ادا کر دیا' ۔ [1]
علم دیر تک خاک پر پڑا رہا۔ آخر ایک بہادر خاتون (عمرہ بنت علقمہ) دلیرانہ بڑھی اور علم کو ہاتھ میں لے کر بلند کیا' یہ دیکھ کر ہر
طرف سے قریش سمٹ آئے اور اکھڑے ہوئے پاؤں پھر جم گئے۔

ابو عامر کفار کی طرف سے لڑ رہا تھا' لیکن اس کے صاحبزادے حضرت حنظلہؓ اسلام لا چکے تھے' انہوں نے آنحضرت ﷺ سے باپ کے مقابلہ میں لڑنے کی اجازت مانگی' لیکن رحمت عالم نے یہ گوارا نہ کیا کہ بیٹا باپ پر تلوار اٹھائے' حضرت حنظلہؓ نے کفار کے سپہ سالار (ابو سفیان) پر حملہ کیا اور قریب تھا کہ ان کی تلوار ابوسفیان کا فیصلہ کر دے' دفعتۃً پہلو سے شداد بن الاسود نے جھپٹ کر ان کے وار کو روکا اور ان کو شہید کر دیا' تمام لڑائی کا پلہ مسلمانوں ہی کی طرف تھا' علمبرداروں کے قتل اور حضرت علیؓ اور حضرت ابو دجانہؓ کے پے در پے حملوں سے فوج کے پاؤں اکھڑ گئے' بہادر نازنینیں جو رجز سے دلوں کو ابھار رہی تھیں' بدحواسی کے ساتھ پیچھے ہٹیں اور مطلع صاف ہو گیا' لیکن ساتھ ہی مسلمانوں نے لوٹ شروع کر دی۔ یہ دیکھ کر تیر انداز جو پشت پر متعین کئے گئے تھے وہ بھی غنیمت کی طرف جھکے۔

حضرت عبداللہؓ بن جبیر نے بہت روکا لیکن وہ رک نہ سکے' تیر اندازوں کی جگہ خالی دیکھ کر خالد نے عقب سے حملہ کیا' عبداللہؓ بن جبیر چند جانبازوں کے ساتھ جم کر لڑے لیکن سب کے سب شہید ہو گئے۔ اب راستہ صاف تھا' خالد نے سواروں کے دستے کے ساتھ نہایت بے جگری سے حملہ کیا۔ لوگ لوٹنے میں مصروف تھے' مڑ کر دیکھا تو تلواریں برس رہی تھیں' بدحواسی میں دونوں فوجیں اس طرح باہم مل گئیں کہ خود مسلمان مسلمانوں کے ہاتھ سے مارے گئے' حضرت مصعب بن عمیرؓ جو آنحضرت ﷺ سے صورت میں مشابہ اور علم بردار تھے' ابن قمیہ نے ان کو شہید کر دیا اور غل مچ گیا کہ آنحضرت ﷺ نے شہادت پائی۔ اس آواز سے عام بدحواسی پھیل گئی' بڑے بڑے دلیروں کے پاؤں اکھڑ گئے' بدحواسی میں اگلی صفیں پچھلی صفوں پر الٹ پڑیں اور دوست دشمن کی تمیز نہ رہی' حضرت حذیفہؓ کے والد (یمان) اس کشمکش میں آ گئے اور ان پر تلواریں برس پڑیں' حضرت حذیفہؓ چلاتے رہے کہ میرے باپ ہیں' لیکن کون سنتا تھا' غرض وہ شہید ہو گئے اور حضرت حذیفہؓ نے ان کے قاتلوں کے لیے کہا مسلمانو! اللہ تم کو بخش دے۔ [2] رسول اللہ ﷺ نے مڑ کر دیکھا تو صرف گیارہ جانثار پہلو میں تھے جن میں جناب علی مرتضیٰؓ' حضرت ابوبکرؓ' حضرت سعد بن ابی وقاصؓ' حضرت زبیر بن العوامؓ' حضرت ابو دجانہؓ اور حضرت طلحہؓ کا نام بہ تخصیص معلوم ہے' صحیح بخاری میں یہ روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ صرف حضرت طلحہؓ اور حضرت سعدؓ رہ گئے تھے۔ اس قیل و قال اور اضطراب میں' کثرتوں نے تو بالکل ہمت ہار دی' لیکن جانبازوں کا بھی زور نہیں چلتا تھا' جو جہاں تھا وہیں گھر کر رہ گیا تھا' آنحضرت ﷺ کی کسی کو خبر نہ تھی' حضرت علیؓ تلوار چلاتے اور دشمنوں کی صفیں الٹتے جاتے تھے' لیکن نگاہیں جس کو ڈھونڈتی تھیں (یعنی رسول اللہ ﷺ) کا پتہ نہ تھا' حضرت انسؓ کے چچا حضرت انس بن نضرؓ لڑتے لڑتے موقع سے آگے نکل گئے' دیکھا تو حضرت عمرؓ نے مایوس ہو کر ہتھیار پھینک دیئے ہیں' پوچھا یہاں کیا کرتے ہو؟ بولے' اب لڑ کر کیا

[1] ابن ہشام و طبری جلد نمبر ۳ صفحہ ۱۴۰۱

[2] صحیح بخاری غزوۂ احد صفحہ ۵۸۰۔

[3] صحیح بخاری غزوۂ احد صفحہ ۵۸۱۔

کر لیا، رسول اللہ ﷺ نے تو شہادت پائی"۔ حضرت انس بن نضرؓ نے کہا "ان کے بعد ہم زندہ رہ کر کیا کریں گے" یہ کہہ کر فوج میں گھس گئے اور لڑ کر شہادت پائی۔ لڑائی کے بعد جب ان کی لاش دیکھی گئی تو اسی [۸۰] سے زیادہ تیر، تلوار اور نیزے کے زخم تھے، کوئی شخص پہچان نہ سکا، ان کی بہن نے انگلی دیکھ کر پہچانا۔[1]

جان نثاران خاص برابر لڑتے جاتے تھے لیکن نگاہیں سرور عالم ﷺ کو ڈھونڈتی تھیں۔ سب سے پہلے حضرت کعب بن مالکؓ کی نظر پڑی، چہرہ مبارک پر مغفر تھا لیکن آنکھیں نظر آتی تھیں۔ حضرت کعبؓ نے پہچان کر پکارا "مسلمانو! رسول اللہ ﷺ یہ ہیں"۔ یہ سن کر ہر طرف سے جان نثار ٹوٹ پڑے۔ کفار نے اب ہر طرف سے ہٹ کر اسی رخ پر زور دیا، دل کا دل ہجوم کر کے بڑھتا تھا لیکن ذوالفقار کی بجلی سے یہ بادل پھٹ پھٹ کر رہ جاتا تھا۔ ایک دفعہ ہجوم ہوا تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا "کون مجھ پر جان دیتا ہے؟" حضرت زیاد بن سکنؓ پانچ انصاری لے کر اس خدمت کے ادا کرنے کے لئے بڑھے اور ایک ایک نے جانبازی سے لڑ کر جانیں فدا کر دیں۔[2] حضرت زیادؓ کو یہ شرف حاصل ہوا کہ آنحضرت ﷺ نے حکم دیا کہ ان کا لاشہ قریب لاؤ، لوگ اٹھا کر لائے، کچھ کچھ جان باقی تھی، قدموں پر منہ رکھ دیا اور اسی حالت میں جان دی۔[3]

بچہ ناز رفتہ باشد زجہاں نیازمندے   کہ بوقت جاں سپردن بسرش رسیدہ باشی

ایک بہادر مسلمان اس عالم میں بھی بے پروائی کے ساتھ کھڑا کھجوریں کھا رہا تھا، اس نے بڑھ کر پوچھا کہ "یا رسول اللہ! اگر میں مارا گیا تو کہاں ہوں گا؟" آپ نے فرمایا "جنت میں"۔ اس بشارت سے بے خود ہو کر وہ اس طرح ٹوٹ پڑا کہ مارا گیا۔[4]

عبداللہ بن قمیہ جو قریش کا مشہور بہادر تھا صفوں کو چیرتا پھاڑتا آنحضرت ﷺ کے قریب آ گیا اور چہرہ مبارک پر تلوار ماری جس کے صدمہ سے مغفر کی دو کڑیاں چہرہ مبارک میں چبھ کر رہ گئیں۔ چاروں طرف سے تلواریں اور تیر برس رہے تھے، یہ دیکھ کر جان نثاروں نے آپ کو اپنے حلقہ میں لے لیا۔ حضرت ابو دجانہؓ جھک کر سپر بن گئے، اب جو تیر آتے تھے ان کی پیٹھ پر آتے تھے۔ حضرت طلحہؓ نے تلواروں کو ہاتھ پر روکا، ایک ہاتھ کٹ کر گر پڑا، بے درد ستمگار رحمت عالم ﷺ پر تیر برسا رہے تھے اور آپ کی زبان پر یہ الفاظ تھے۔

﴿رب اغفر قومی فانھم لا یعلمون﴾[5]

اے اللہ! میری قوم کو بخش دے وہ جانتے نہیں۔

حضرت ابو طلحہؓ جو حضرت انسؓ کے علاتی باپ تھے مشہور تیرانداز تھے۔ انہوں نے اس قدر تیر برسائے کہ دو

---

۱ یہ تمام ارباب سیر کی روایت ہے۔ بخاری میں یہ واقعہ ہے لیکن حضرت عمرؓ کا نام نہیں۔

۲ [illegible]

۳ صحیح مسلم غزوۂ احد میں ہے کہ سات انصاری تھے اور سب نے باری باری جانیں فدا کیں۔

۴ بخاری غزوۂ احد صفحہ [illegible]

۵ صحیح مسلم [illegible]

تھیں کلائیں ان کے ہاتھ میں ٹوٹ ٹوٹ کر رہ گئیں' انھوں نے اپنے سپر سے آنحضرت ﷺ کے چہرہ پر اوٹ کر لیا تھا کہ آپ پر کوئی وار نہ آنے پائے' آپ بھی گردن اٹھا کر دشمنوں کی فوج کی طرف دیکھتے تو عرض کرتے کہ آپ گردن نہ اٹھائیں ایسا نہ ہو کہ کوئی تیر لگ جائے' یہ میرا سینہ سامنے ہے۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ جو مشہور تیرانداز تھے' اس وقت آپ کے رکاب میں حاضر تھے' آنحضرت ﷺ نے اپنا ترکش ان کے آگے ڈال دیا اور فرمایا' تم پر میرے ماں باپ قربان' تیر مارتے جاؤ۔ [1]

اسی حالت میں آپ کی زبان سے حسرت کے لہجہ میں یہ لفظ نکلا "وہ قوم کیا فلاح پا سکتی ہے جو اپنے پیغمبر کو زخمی کرتی ہے" بارگاہ خداوندی میں یہ الفاظ ناپسند آئے اور یہ آیت اتری۔

﴿ لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ ﴾

تم کو اس معاملہ میں کچھ اختیار نہیں

چنانچہ صحیح بخاری غزوۂ احد میں یہ واقعہ مذکور ہے۔

رسول اللہ ﷺ ثابت قدموں کے ساتھ پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گئے کہ دشمن ادھر نہیں آ سکتے تھے' ابوسفیان نے دیکھ لیا' فوج لے کر پہاڑی پر چڑھا' لیکن حضرت عمرؓ اور چند صحابہؓ نے پتھر برسائے جس سے وہ آگے نہ بڑھ سکا۔ [3]

آپ کی وفات کی خبر مدینہ میں پہنچی تو اخلاص شعار نہایت بے تابی کے ساتھ دوڑے' جناب فاطمہ زہراؓ نے آکر دیکھا تو ابھی تک چہرہ مبارک سے خون جاری ہے' حضرت علیؓ سپر میں بھر کر پانی لائے' جناب سیدہ دھوتی تھیں لیکن خون تھمتا نہ تھا' بالآخر چٹائی کا ایک ٹکڑا جلایا اور زخم پر رکھ دیا' خون فوراً تھم گیا۔ [4]

ابوسفیان سامنے کی پہاڑی پر چڑھا اور پکارا کہ "یہاں محمد ہیں؟" آپ نے حکم دیا کہ کوئی جواب نہ دے' ابوسفیان نے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کا نام لے کر پکارا اور جب کچھ آواز نہ آئی تو پکار کر بولا' سب مارے گئے' حضرت عمرؓ سے ضبط نہ ہو سکا بول اٹھے "او دشمن خدا! ہم سب زندہ ہیں۔"

ابوسفیان نے کہا

اعل ہبل [5] اے ہبل تو اونچا رہ۔

صحابہ نے آنحضرت ﷺ کے حکم سے کہا

اللہ اعلیٰ و اجل اللہ اونچا اور بڑا ہے۔

ابوسفیان نے کہا

---

۱ صحیح بخاری غزوۂ احد صفحہ ۵۸۵

۲ صحیح بخاری غزوۂ احد صفحہ ۵۸۵

۳ طبری ص ۱۴۱۱، ۱۴۱۲

۴ صحیح بخاری غزوۂ احد جلد ۲ صفحہ ۵۸۳

۵ ہبل بت کا نام

لنا العزی ولا عزی لکم ہمارے پاس عزیٰ ہے تمہارے پاس نہیں

صحابہ نے کہا۔

اللہ مولانا ولا مولیٰ لکم خدا ہمارا آقا ہے اور تمہارا کوئی آقا نہیں۔

ابوسفیان نے کہا آج کا دن بدر کے دن کا جواب ہے۔ فوج کے لوگوں نے مردوں کے ناک کان کاٹ لئے ہیں، میں نے یہ حکم نہیں دیا تھا لیکن مجھ کو معلوم ہوا تو مجھ کو رنج بھی نہیں ہوا۔

آنحضرت ﷺ نے مستورات اور بچوں کو حضرت یمانؓ اور حضرت ثابتؓ کی حفاظت میں مدینہ کے پاس کے قلعوں میں بھیج دیا تھا، ان لوگوں کو شکست کی خبر معلوم ہوئی تو سب کو چھوڑ کر احد کی طرف بڑھے۔ حضرت ثابتؓ مشرکوں کے ہاتھ سے مارے گئے۔ حضرت یمانؓ کو مسلمان ہجوم عام میں پہچان نہ سکے، ان پر تلواریں برس پڑیں، ان کے صاحبزادے حضرت حذیفہؓ نے ہر چند "ہاں ہاں" کہا اور بتایا کہ "میرے باپ ہیں" لیکن ہنگامہ میں کون سنتا تھا، حضرت حذیفہؓ یہ کہہ کر رہ گئے کہ "مسلمانو! اللہ تمہارے اس گناہ کو بخش دے"۔ آنحضرت ﷺ نے حضرت یمانؓ کا خون بہا مسلمانوں کی طرف سے ادا کرنا چاہا لیکن حضرت حذیفہؓ نے معاف کر دیا۔ ابن ہشام میں یہ واقعہ بہ تفصیل مذکور ہے، صحیح بخاری میں بھی ہے لیکن مختصر ہے۔

خاتونان قریش نے انتقام بدر کے جوش میں مسلمانوں کی لاشوں سے بھی بدلہ لیا، ان کے ناک کان کاٹ لئے۔ ہندہ (امیر معاویہؓ کی ماں) نے ان پھولوں کا ہار بنایا اور اپنے گلے میں ڈالا، حضرت حمزہؓ کی لاش پر گئی اور ان کا پیٹ چاک کر کے کلیجہ نکالا اور چبا گئی لیکن گلے سے اتر نہ سکا اس لئے اگل دیا۔ تاریخوں میں ہندہ کا لقب جو جگر خوار لکھا جاتا ہے اسی بنا پر لکھا جاتا ہے۔ ہندہ فتح مکہ میں ایمان لائی لیکن جس طرح ایمان لائی وہ عبرت خیز ہے، تفصیل آگے آئے گی۔

اس غزوہ میں اکثر خاتونان اسلام نے بھی شرکت کی۔ حضرت عائشہؓ اور حضرت ام سلیمؓ جو حضرت انسؓ کی ماں تھیں زخمیوں کو پانی پلاتی تھیں۔ صحیح بخاری میں حضرت انسؓ سے منقول ہے کہ میں نے حضرت عائشہؓ اور حضرت ام سلیمؓ کو دیکھا کہ پائینچے چڑھائے ہوئے مشک بھر بھر کر لاتی تھیں اور زخمیوں کو پانی پلاتی تھیں، مشک خالی ہو جاتی تھی تو پھر جا کر بھر لاتی تھیں۔[2] ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت ام سلیطؓ نے بھی جو حضرت ابوسعید خدریؓ کی ماں تھیں یہی خدمت انجام دی۔[3]

یہی وہ وقت تھا جب کافروں نے عام حملہ کر دیا تھا اور آپ کے ساتھ صرف چند جاں نثار رہ گئے تھے۔ ام عمارہؓ آنحضرت ﷺ کے پاس پہنچیں اور اپنا سینہ سپر کر دیا۔ کفار جب آپ پر بڑھتے تھے تو تیر اور تلوار سے روکتی تھیں۔ ابن قمیہ جب دفعتاً آنحضرت ﷺ کے پاس پہنچ گیا تو حضرت ام عمارہؓ نے بڑھ کر روکا، چنانچہ کندھے پر زخم آیا اور غار پڑ گیا

---

[1] ہندہ کا لقب ہے لفظی معنی جگر خوار کے ہیں۔

[2] یہ تمام تفصیل بخاری غزوۂ احد کے ذکر میں ہے

[3] صحیح بخاری کتاب المغازی غزوۂ احد۔

واقعات متفرقہ ۳ھ

اس سال یعنی ۳ھ حضرت امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ولادت ہوئی رمضان کی پندرھویں تاریخ تھی اسی سال آنحضرت ﷺ نے حضرت حفصہؓ سے جو حضرت عمرؓ کی صاحبزادی تھیں اور غزوۂ بدر کے زمانہ میں بیوہ ہوگئی تھیں نکاح کیا اسی سال حضرت عثمانؓ نے آنحضرت ﷺ کی صاحبزادی ام کلثومؓ سے شادی کی۔

وراثت کا قانون بھی اسی سال نازل ہوا اب تک وراثت میں ذوی الارحام (وہ حصہ دار جو ماں، بہن یا لڑکیوں کی طرف سے منسوب ہوں) کا کوئی حصہ نہ تھا ان کے حقوق کی بھی تعیین کی گئی مشرکہ کا نکاح مسلمان سے اب تک جائز تھا اس سال اس کی بھی تحریم نازل ہوئی۔

سنہ ۴ھ

سلسلۂ[1] غزوات و سرایا

تمام قبائل عرب بجز چند کے اسلام کے دشمن تھے۔ دشمنی زیادہ تر اس بنا پر تھی کہ ہر قبیلہ بت پرستی کو اپنا دینی اور آبائی مسلک سمجھتا تھا جبکہ اسلام اسی کو مٹانا چاہتا تھا۔ اس کے ساتھ قریش کا اثر تمام عرب پر تھا۔ حج کے زمانہ میں تمام قبائل مکہ میں جمع ہوتے تھے اور قریش ان کو اسلام کی دشمنی پر ابھارتے تھے۔ ایک اور بڑا سبب یہ تھا کہ تمام قبائل کی وجہ معاش لوٹ اور غارت گری تھا جبکہ اسلام اس سے نہ صرف قولاً بلکہ عملاً بھی روکتا تھا۔ اس لئے وہ چاہتے تھے کہ اگر اسلام قائم ہو گیا تو ہمارے ذرائع معاش بند ہو جائیں گے۔ تاہم بدر کی فتح نے ایک عام رعب بٹھا دیا تھا جس کی وجہ سے تمام قبیلے اپنی اپنی جگہ خاموش بیٹھ گئے۔ لیکن احد کی شکست نے حالت بدل دی اور دوبارہ تمام قبائل فتنہ انگیز کھڑے ہو گئے۔ سیرت نبوی میں سرایا (چھوٹی چھوٹی لڑائیاں) کا جو ایک وسیع سلسلہ پھیلا ہوا نظر آتا ہے یہ اسی زنجیر کی کڑیاں ہیں۔ عام مؤرخوں نے اگرچہ اپنی عادت کے موافق ان لڑائیوں کے ذکر میں ان کے اسباب سے بحث نہیں کی لیکن ابن سعد نے طبقات میں اور اوروں نے قریباً ہر واقعہ کا سبب لکھ دیا ہے یعنی کسی خاص قبیلے نے مدینہ پر چڑھائی کا ارادہ کیا اور آنحضرت ﷺ نے مدافعت کے لئے فوجیں بھیجیں۔

سریۂ ابی سلمہؓ:

سب سے پہلے محرم ۴ھ میں طلیحہ بن خویلد نے اپنے قبیلہ کو جو نجد کے کوہستانی علاقہ قطن میں رہتا تھا مدینہ پر حملہ کرنے کے لئے آمادہ کیا۔ آنحضرت ﷺ کو خبر ہوئی تو آپ نے حضرت ابو سلمہؓ کو ایک سو پچاس مہاجرین اور انصار کے ساتھ اس طرف روانہ کیا۔ یہ خبر سن کر ان کی جماعت منتشر ہو گئی۔[2]

سریۂ ابن انیسؓ:

اس کے بعد محرم ۴ھ میں سفیان بن خالد جو قبیلہ لحیان کا تھا اور جو کوہستان عرنہ کا رئیس تھا مدینہ پر حملہ کا قصد کیا۔ اس کے مقابلہ کے لئے آپ ﷺ نے عبداللہ بن انیسؓ کو بھیجا جنہوں نے بلطائف الحیل سے موقع پا کر حملہ کیا اور سفیان کو قتل کر دیا۔[3]

---

[1] غزوہ و سریہ میں جو فرق ہے اس کی تصریح علمائے سیرت کی تصنیف سے ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ جس مہم میں آنحضرت ﷺ خود شریک ہوتے وہ غزوہ کے نام سے موسوم ہے اور جس مہم کو بغیر شرکت کے بھیج دیے جاتے تھے وہ سریہ کہلاتا تھا۔

[2] ابن سعد صفحہ ۳۵ (جزو مغازی) کی اصل عبارت یہ ہے: بلغ رسول اللہ ﷺ ان طلیحۃ و سلمۃ ابنا خویلد قد سارا فی قومھما ومن اطاعھما یدعوانھم الی حرب رسول اللہ ﷺ

[3] طبقات ابن سعد صفحہ ۳۶ اصل عبارت یہ ہے: وذلک انہ بلغ رسول اللہ ﷺ ان سفیان بن خالد الھذلی ثم اللحیانی قد جمع الجموع لرسول اللہ ﷺ

واقعۂ رجیع:

انہی دنوں عضل اور قارہ جو دو مشہور قبیلے ہیں ان کے چند آدمی آنحضرت ﷺ کے پاس آئے کہ ہمارے قبیلے نے اسلام قبول کر لیا ہے، چند لوگوں کو ہمارے ہاں بھیجئے کہ اسلام کے احکام اور عقائد سکھائیں۔ آپ نے دس اشخاص ساتھ کر دیئے جن کے سردار عاصم بن ثابتؓ تھے۔ یہ لوگ جب مقام رجیع پر پہنچے جو عسفان اور مکہ کے وسط میں ہے تو ان غداروں نے بدعہدی کی اور قبیلہ ہذیلیان کو اشارہ کیا کہ ان کا کام تمام کر دیں۔ ہذلیان دو سو آدمی لے کر جن میں ایک سو تیر انداز تھے ان لوگوں کے تعاقب میں چلے اور ان کے قریب آ گئے۔ ان دس آدمیوں نے بڑھ کر ایک ٹیلے پر پناہ لی۔ تیر اندازوں نے ان سے کہا کہ "اتر آؤ ہم تم کو امان دیتے ہیں"۔ حضرت عاصمؓ نے کہا "میں کافر کی پناہ میں نہیں آتا"، یہ کہہ کر خدا سے خطاب کیا کہ "اپنے پیغمبر کو خبر پہنچا دے"۔ غرض لڑے اور سات آدمیوں کے ساتھ تیر اندازوں کے ہاتھوں شہید ہوئے[1] قریش نے چند آدمیوں کو بھیجا کہ عاصم کے بدن سے گوشت کا ایک ٹکڑا کاٹ لائیں کہ ان کی شناخت ہو۔ قدرت خداوندی نے شہید مسلم کی یہ تحقیر گوارا نہ کی، شہد کی مکھیوں نے لاش پر پردہ ڈال دیا، قریش ناکام لوٹ گئے۔ لیکن دو اشخاص نے حضرت خبیبؓ اور زیدؓ نے کافروں کے وعدہ پر اعتماد کیا اور ٹیلے سے اتر آئے۔ کافروں نے بدعہدی کر کے ان کی مشکیں کس لیں اور مکہ میں لے جا کر بیچ ڈالا۔ حضرت خبیبؓ نے جنگ احد میں حارث بن عامر کو قتل کیا تھا اس لئے ان کو حارث کے لڑکوں نے خرید لیا کہ باپ کے بدلہ میں قتل کریں گے[2] چند روز اسی کے گھر میں رہے۔ ایک دن حارث کی نواسی کو کھلا رہے تھے اتفاق سے ہاتھ میں چھری تھی۔[3] بچی کی ماں اتفاقاً کہیں سے آ گئی، دیکھ کر حضرت خبیبؓ کے ہاتھ میں ننگی چھری ہے، کانپ اٹھی۔ حضرت خبیبؓ نے کہا "کیا تو یہ سمجھی کہ میں اس کو قتل کر دوں گا؟ ہمارا یہ کام نہیں"۔ خاندان حارث ان کو حرم کے حدود سے باہر لے گئے اور قتل کرنا چاہا۔ انہوں نے دو رکعت نماز پڑھنے کی اجازت مانگی۔ لوگوں نے اجازت دی۔ انہوں نے دو رکعت نماز پڑھ کر کہا "دیر تک نماز پڑھنے کو جی چاہتا تھا لیکن تم کو خیال ہوگا کہ موت سے ڈرتا ہوں"۔ پھر یہ اشعار پڑھے۔

وما ان ابالی حین اقتل مسلماً	جب میں اسلام کے لئے قتل کیا جا رہا ہوں
علی ای شق کان للّٰہ مصرعی	تو مجھ کو اس کی پروا نہیں کہ کس پہلو پر قتل کیا جاؤں گا
وذلک فی ذات الالٰہ وان یشاء	یہ جو کچھ ہے خالصاً اللہ کے لئے ہے، وہ چاہے گا تو
یبارک علی اوصال شلو ممزع	جسم کے ان پارہ پارہ ٹکڑوں پر برکت نازل کرے گا

[1] بخاری کتاب المغازی میں اس موقع پر صرف تیسرے بزرگ کا ذکر کیا ہے ان کا نام نہیں لکھا ہے۔ ابن اسحاق نے ان کا نام حضرت عبداللہ بن طارق لکھا ہے۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ اسی موقع پر شہید کر دیئے گئے لیکن دوسری روایتوں میں ہے کہ ان سے آگے چل کر مکہ کے راستے میں بمقام مرالظہران کی شہادت کا واقعہ پیش آیا۔ زرقانی جلد ۲ صفحہ ۷۸ "س"

[2] حارث کے بیٹے ابو سروعہ جنھوں نے حضرت خبیبؓ کو شہید کیا تھا بعد کو مسلمان ہوئے اور شرف صحابیت سے سرفراز ہوئے زرقانی جلد ۲ صفحہ ۷۸ "س"

[3] صحیح بخاری میں نواسہ لکھا ہے۔ "س"

اسی زمانہ سے دستور ہے کہ کسی کو قتل کرتے ہیں تو مقتول پہلے دو رکعت نماز ادا کر لیتا ہے [1] (اور یہ مستحب سمجھا جاتا ہے [2]) دوسرے صاحب حضرت زید تھے ان کو صفوان بن امیہ نے قتل کے ارادہ سے خرید اتھا ان کے قتل کے وقت قریش کے معزز سردار تماشا دیکھنے آئے تھے جن میں ابوسفیان بھی تھا جب قاتل نے تلوار ہاتھ میں لی تو ابوسفیان نے کہا "سچ کہنا اس وقت تمہارے بدلے محمد قتل کیے جائیں تو کیا تم اس کو اپنی خوش قسمتی نہ سمجھتے؟" بولے اللہ کی قسم میں تو اپنی جان کو اس کے برابر بھی عزیز نہیں رکھتا کہ رسول اللہ ﷺ کے تلووں میں کانٹا چبھ جائے" صفوان کے غلام نسطاس نے ان کی گردن ماردی۔

ان لڑائیوں کا سلسلہ یہودی لڑائیوں سے مل جاتا ہے اور چونکہ یہود کے واقعات اور ان کی سرگزشت تاریخ اسلام سے کوئی گوں تعلقات رکھتی ہے اس لئے ہم ان کے واقعات مستقل حیثیت سے لکھتے ہیں اور اس غرض کے لئے کسی قدر ہم کو پچھلے زمانہ کی طرف واپس آنا پڑے گا۔

واقعات متفرقہ ۴ھ:

اسی سال شعبان میں حضرت حسینؓ کی ولادت ہوئی۔ اسی سال ازواج مطہراتؓ میں سے حضرت زینبؓ بنت خزیمہ نے انتقال فرمایا جن سے اسی سال نکاح بھی ہوا تھا۔

اسی سال آنحضرت ﷺ نے حضرت زید بن ثابتؓ کو حکم دیا کہ وہ عبرانی زبان لکھنا پڑھنا سیکھ لیں اور فرمایا کہ مجھ کو یہود پر اطمینان نہیں۔ تاریخوں میں لکھا ہے کہ حضرت زیدؓ نے صرف پندرہ دن میں عبرانی زبان سیکھ لی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ میں عبرانی زبان سے لوگ بہت کچھ آشنا تھے۔

اسی سال شوال میں آنحضرت ﷺ نے حضرت ام سلمہؓ سے نکاح فرمایا۔

اسی سال یہودیوں نے آپ کے سامنے ایک یہودی کا مقدمہ پیش کیا اور آپ نے توراۃ کے مطابق رجم کا حکم دیا (تفصیل ان واقعات کی دوسرے حصوں میں آئے گی)۔

بعض مورخوں کے نزدیک شراب کی حرمت کا حکم بھی اسی سال نازل ہوا لیکن اس میں روایتیں نہایت مختلف ہیں پوری تحقیق احکام شریعہ کے ذکر میں آئے گی۔

---

[1] طبری صفحہ ۱۴۳۵ و طبقات ابن سعد، مغازی جزء ثانی واقعہ رجیع، بخاری غزوہ رجیع سے لئے گئے ہیں، تخریج بخاری فکان خبیب ہو سن لکل مسلم قتل صبرا و صلی رکعتین عند القتل۔

[2] اس نماز کے استحباب کی اصلی وجہ یہ ہے کہ جب آنحضرت ﷺ کو حضرت خبیبؓ کے اس فعل کی اطلاع ملی تو آپ ﷺ نے اس کو پسند فرمایا (شرح میر کبیر سرخسی اول صفحہ ۱۵۰) آنحضرت ﷺ کے اس استحسان نے اس نماز کو استحباب کا درجہ دے دیا (اصول فقہ کی اصطلاح میں اس صورت میں کو تقریر رسول اللہ ﷺ کہتے ہیں یعنی حضور ﷺ کے سامنے کوئی فعل کیا گیا ہو یا حضور ﷺ کی عدم موجودگی میں کیا گیا ہو اور حضور ﷺ کو اس کی اطلاع ملی ہو مگر آپ نے اس پر انکار نہ فرمایا ہو تو اس سے بھی اس فعل کا مسنون و مستحب یا جائز ہونا سمجھا جائے گا۔ "س")

[3] نسطاس نے بعد کو اسلام قبول کیا۔ زرقانی جلد ۲ صفحہ ۸۱ "س"

ان باتوں میں سے ایک بھی ان کے معتقدات اور مزعومات کے خلاف نہ تھی لیکن ان تمام مراتب اور اظہار لطف و مدارات کا جو صلہ ملا وہ یہ تھا کہ انہوں نے ہر طرح سے اسلام کی خانہ براندازی کا عزم کر لیا۔ اسلام کی عظمت اور وقار کم کرنے کیلئے مشرکوں سے کہتے تھے کہ مذہب میں مسلمانوں سے تو تم ہی اچھے ہو۔

﴿وَيَقُولُونَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا هَٰؤُلَاءِ أَهْدَىٰ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا﴾ (نساء)

اور کافروں کی نسبت کہتے ہیں کہ مسلمانوں سے یہ زیادہ ہدایت یافتہ ہیں۔

مذہب اسلام کی بے اعتباری پھیلانے کے لئے یہاں تک آمادہ ہوئے کہ مسلمان ہو کر پھر مرتد ہو جائیں تا کہ لوگوں کو خیال ہو کہ اگر یہ مذہب سچا ہوتا تو اس کو قبول کر کے کوئی کیوں چھوڑ دیتا۔

﴿وَقَالَتْ طَائِفَةٌ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ آمِنُوا بِالَّذِي أُنْزِلَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوا آخِرَهُ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ﴾ (آل عمران۔ رکوع ۸)

اور اہل کتاب میں سے ایک گروہ کہتا ہے کہ مسلمانوں پر جو اترا ہے اس پر صبح کو ایمان لاؤ اور شام کو اس سے پھر جاؤ، شاید کہ وہ لوگ (مسلمان) بھی پھر جائیں۔

ان باتوں کے علاوہ اسلام کی بربادی کی کلی تدبیریں اختیار کیں۔ وہ یہ جانتے تھے کہ مسلمانوں کو جو قوت ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ انصار کے دو قبیلے "اوس" اور "خزرج" جو باہم لڑتے بھڑتے رہتے تھے اسلام نے ان کو باہم متحد کر دیا ہے۔ ان دونوں کو اگر پھر لڑا دیا جائے تو اسلام خود بخود فنا ہو جائے گا۔ عرب میں پچھلی کینہ آوریوں کو تازہ کر دینا نہایت آسان کام تھا۔ ایک دفعہ دونوں قبیلوں کے بہت سے آدمی ایک جلسہ میں بیٹھ کر بات چیت کر رہے تھے چند یہودیوں نے اس صحبت میں جا کر جنگ بعاث کا تذکرہ چھیڑا یہ وہ لڑائی تھی جس میں انصار کے یہ دونوں قبیلے آپس میں لڑے تھے اور اسی لڑائی نے ان کی تمام قوت برباد کر دی تھی۔ اس لڑائی کے تذکرہ نے دونوں کو پرانے واقعے یاد دلائے اور دفعۃً عداوت کی دبی ہوئی آگ بھڑک اٹھی۔ لعن و طعن سے گزر کر تلواریں کھنچ گئیں۔ حسن اتفاق سے آنحضرت ﷺ کو خبر ہو گئی آپ نے فوراً موقع پر پہنچ کر وعظ و پند سے دونوں فریق کو ٹھنڈا کیا۔ اس پر یہ آیت اتری۔[1]

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ تُطِيعُوا فَرِيقًا مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ يَرُدُّوكُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ كَافِرِينَ﴾ [آل عمران آیت ۱۰۰]

مسلمانو! اگر تم اہل کتاب کے بعض لوگوں کا کہنا مانو گے تو وہ تم کو ایمان لانے کے بعد پھر کافر بنا دیں گے۔

منافقین کا ایک گروہ پہلے سے موجود تھا جو اگرچہ بظاہر مسلمان ہو گیا تھا لیکن درحقیقت اسلام کا سخت دشمن تھا۔ اس گروہ کا سردار عبداللہ بن ابی بن سلول تھا۔ یہودیوں نے اس کو نہایت آسانی سے در پردہ ملا لیا اور ان کے ساتھ مل کر سازش شروع کی۔ اتفاق یہ کہ عبداللہ بن ابی پہلے سے بنی قینقاع کا حلیف اور ہم پیمان تھا۔

قریش نے بدر سے پہلے عبداللہ بن ابی کو لکھا تھا کہ مسلمانوں کو نکال دو ورنہ ہم آ کر تمہارا استیصال کر دیں گے۔ لیکن جب اس میں کامیابی نہیں ہوئی جس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے تو بدر کے بعد انہوں نے یہود کو خط لکھا

---

[1] اسباب النزول واحدی بلفظہ و ابن جریر مطبوعہ مصر جلد ۴ صفحہ ۸۸

ان کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا کہ "اللہ سے ڈرو، ایسا نہ ہو کہ تم پر بھی بدر والوں کی طرح عذاب آ جائے" یہ بولے کہ "ہم قریش نہیں ہیں، ہم سے معاملہ پڑے گا تو ہم دکھا دیں گے کہ لڑائی اس کا نام ہے"۔ چونکہ ان کی طرف سے نقضِ عہد اور اعلان جنگ ہو گیا تھا مجبور ہو کر آنحضرت ﷺ نے لڑائی کی، وہ قلعہ بند ہوئے، پندرہ دن تک محاصرہ رہا، بالآخر اس پر راضی ہوئے کہ رسول اللہ ﷺ جو فیصلہ کریں گے ان کو منظور ہو گا، عبداللہ بن ابی ان کا حلیف تھا اس نے آنحضرت ﷺ سے درخواست کی کہ وہ جلاوطن کر دیئے[1] جائیں، غرض وہ اذرعات میں جو شام کے علاقہ میں ہے جلاوطن کر دیئے گئے یہ سات سو شخص تھے جن میں تین سو زرہ پوش تھے، یہ شوال ۲ھ کا واقعہ ہے۔

قتل کعب بن اشرف ربیع الاول ۳ھ:

یہودیوں میں کعب بن اشرف ایک مشہور شاعر تھا، اس کا باپ اشرف قبیلۂ طے سے تھا۔ مدینہ میں بنو نضیر کا حلیف ہو کر اس نے اس قدر عزت و اعتبار پیدا کیا کہ ابو رافع ابن ابی الحقیق جو یہود کا مقتدا اور تاجر الحجاز جس کا خطاب[2] تھا اس کی لڑکی سے شادی کی۔ کعب[3] اس کے بطن سے پیدا ہوا، اس دو طرفہ رشتہ داری کی بنا پر کعب یہود اور عرب سے برابر کا تعلق رکھتا تھا اور شاعری کی وجہ سے تمام عرب پر اس کا عام اثر تھا۔ رفتہ رفتہ دولت مندی کی وجہ سے تمام یہودیانِ عرب کا رئیس بن گیا، یہودی علماء اور پیشوایانِ مذہب کی تنخواہیں مقرر کیں، آنحضرت ﷺ جب مدینہ میں تشریف لائے اور علمائے یہود اس سے ماہوار لینے آئے تو اس نے ان لوگوں سے آنحضرت ﷺ کے متعلق رائے دریافت کی اور جب اپنا ہم خیال بنا لیا تب ان کے مقررہ وظیفے جاری کئے۔[4]

اس کو اسلام سے سخت عداوت تھی، بدر کی لڑائی میں سرداران قریش مارے گئے تو اس کو نہایت صدمہ ہوا۔ تعزیت کے لئے مکہ گیا۔ کشتگان بدر کے پردرد مرثیے جن میں انتقام کی ترغیب تھی لوگوں کو جمع کر کے نہایت درد سے پڑھتا اور روتا اور رلاتا تھا۔ ابن ہشام نے ان واقعات کے ساتھ وہ اشعار بھی نقل کئے ہیں۔ اگرچہ اس قسم کے اشعار اکثر مصنوعی ہیں تاہم جہاں تک اس زمانہ کی زبان معلوم ہوتی ہے ہم ایک دو شعر نقل کرتے ہیں۔

طحنت رحی بدر لمهلك اهله	جنگ بدر کی چکی نے اہل بدر کو پیس ڈالا۔
ولمثل بدر تستهل وتدمع	ہر ایسے واقعات کے لئے رونا پیٹنا چاہئے۔
كم قد اصيب به من ابيض ماجد	کتنے شریف سپید رنگ جن سے
ذي بهجة تاوي اليه الضيع	بیکس اہل حاجت پناہ لیتے تھے مارے گئے۔

مدینہ میں واپس آیا تو آنحضرت ﷺ کی ہجو میں اشعار کہنا اور لوگوں کو آنحضرت ﷺ کے برخلاف برانگیختہ

---

۱ تمام ارباب سیر کے الفاظ سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ ان کو قتل کرنا چاہتے تھے عبداللہ بن ابی نے اصرار سے بچا لئے لیکن صحیح بخاری وغیرہ میں جس طرح یہ واقعہ مذکور ہے اس سے اس خیال کی غلطی ثابت ہوتی ہے۔

۲ صحیح بخاری باب قتل کعب بن الاشرف۔

۳ الخمیس صفحہ ۴۰۸

۴ زرقانی [illegible]

اپنی بیویاں گرو رکھو"۔ حضرت محمد بن مسلمہؓ نے کہا "تمہارے اس حسن و جمال کے سبب سے ہم کو اپنی بیویوں پر وفاداری کا یقین نہیں"۔ اس نے کہا "اچھا اپنے بچوں کو گرو رکھو"۔ انہوں نے کہا "اس سے تو تمام عرب میں ہماری بدنامی ہوگی ہم اپنے ہتھیار گرو رکھیں گے اور تم جانتے ہو آج کل ان کی کس قدر ضرورت ہے۔"[1]

صحیح بخاری میں جو روایت ہے اس میں قتل کا واقعہ اس طرح منقول ہے کہ ان لوگوں نے دوستانہ طریقہ سے اس کو گھر سے باہر بلایا، پھر بال سونگھنے کے بہانہ سے اس کی چوٹی پکڑی اور قتل کر ڈالا۔[2] لیکن روایت میں یہ مذکور نہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ان باتوں کی اجازت دی تھی۔ اس وقت تک عرب میں ان طریقوں سے قتل کرنا معیوب بات نہ تھی۔ آگے چل کر نہایت مفصل طور سے ایک مستقل عنوان میں یہ بحث آئے گی کہ آنحضرت ﷺ نے کس طرح تدریج کے ساتھ عرب کے ان طریقوں کی اصلاح کی۔

غزوۂ بنو نضیر ربیع الاول ۴ھ:

حضرت عمرو بن امیہؓ نے قبیلۂ عامر کے دو آدمی قتل کر دیئے تھے اور ان کا خون بہا اب تک واجب الادا تھا اور جس کا ایک حصہ معاہدہ کی رو سے یہود بنی نضیر پر واجب الادا تھا۔ اس کے مطالبہ[3] کے لئے آنحضرت ﷺ بنو نضیر کے پاس تشریف لے گئے انہوں نے قبول کیا۔ لیکن در پردہ یہ سازش کی کہ ایک شخص چپکے سے بالاخانہ پر چڑھ کر آنحضرت ﷺ پر پتھر گرا دے۔ اتفاق سے اس وقت آپ بالاخانہ کی دیوار کے سایہ میں کھڑے تھے۔ عمرو بن جحاش ایک یہودی اس ارادہ سے کوٹھے پر چڑھا۔ آپ کو ان کے ارادہ کا حال معلوم ہو گیا اور آپ فوراً مدینہ واپس چلے آئے۔[4]

اوپر گذر چکا ہے کہ قریش نے بنو نضیر کو لکھا بھیجا تھا کہ محمد کو قتل کر دو ورنہ ہم خود آ کر تمہارا بھی استیصال کر دیں گے۔ بنو نضیر پہلے سے اسلام کے دشمن تھے۔ قریش کے پیغام نے ان کو اور زیادہ آمادہ کیا۔ بنو نضیر نے آنحضرت ﷺ کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ تیس آدمیوں کو لے کر آئیں، ہم بھی اپنے احبار لے کر آئیں گے۔ آپ کا کلام سن کر اگر ہمارے احبار آپ کی تصدیق کریں گے تو ہم کو بھی عذر نہ ہوگا۔ چونکہ وہ بغاوت کی تیاری کر چکے تھے آپ ﷺ نے کہلا بھیجا کہ جب تک تم ایک معاہدہ لکھ دو، میں تم پر اعتماد نہیں کر سکتا۔ لیکن وہ اس پر راضی نہ ہوئے آپ یہود بنی قریظہ کے

---

1. زرقانی جلد ۲ صفحہ ۱۰ و صحیح بخاری (قتل کعب بن اشرف) "س"
2. صحیح بخاری باب قتل کعب بن اشرف (کتاب المغازی) "س"
3. بنو نضیر سے آنحضرت ﷺ نے دیت کے متعلق جو گفتگو کی اس کی دو تشریحیں کی گئی ہیں۔ ایک تشریح تو وہ ہے جس کو مصنف نے اختیار فرمایا ہے دوسری تشریح یہ ہے کہ حضور ﷺ نے بنو نضیر سے جو گفتگو فرمائی تھی اس کا اصل موضوع یہ تھا کہ قبیلہ عامر کو دیت کس طرح ادا کی جائے اور ان کے یہاں دیت کا دستور کیا ہے؟ بنو نضیر اور قبیلہ عامر کے تعلقات باہم اچھے تھے اس لئے ان سے اس معاملہ میں گفتگو قرین قیاس ہے۔ (سیرت حلبیہ جلد ۲ صفحہ ۲۶۴) "س"
4. یہ روایت ابن ہشام وغیرہ میں مذکور ہے زرقانی نے موسیٰ بن عقبہ کی مغازی سے جو کہ قریب معاصر ہیں یہ عبارت نقل کی ہے وكانوا قد دسوا الى قريش في قتاله فحضوهم على القتال ودلوهم على العورة (زرقانی صفحہ ۷۹ جلد ۲) یعنی ان لوگوں نے قریش سے در پردہ سازش کر کے ان کو آمادہ جنگ کیا اور ان کو کمزوری کا موقع بتائے۔

پاس تشریف لے گئے اور ان سے تجدید معاہدہ کی درخواست کی انہوں نے تجدید کی، بنو نضیر کے لئے یہ نظیر موجود تھی کہ ان کے برادران دینی نے معاہدہ لکھ دیا ہے لیکن وہ کسی طرح معاہدہ کرنے پر راضی نہ ہوئے۔[1] بالآخر انہوں نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیغام بھیجا کہ آپ تین آدمی لے کر آئیں ہم بھی تین عالم ساتھ لے کر آتے ہیں یہ علماء اگر آپ پر ایمان لائیں گے تو ہم بھی لائیں گے۔ آپ نے منظور فرمایا لیکن راہ میں آپ کو ایک صحیح ذریعہ سے معلوم ہوا کہ یہود تلواریں باندھ کر تیار ہیں کہ جب آپ تشریف لائیں تو آپ کو قتل کر دیں۔[2]

بنو نضیر کی سرکشی کے مختلف اسباب تھے۔ وہ نہایت مضبوط قلعوں میں پناہ گزین تھے جن کا فتح کرنا آسان نہ تھا اس کے ساتھ عبداللہ بن ابی نے کہلا بھیجا تھا کہ "تم اطاعت نہ کرنا، بنو قریظہ تمہارا ساتھ دیں گے اور میں دو ہزار آدمی لے کر تمہاری اعانت کروں گا"۔ قرآن مجید میں ہے۔

﴿أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ نَافَقُوا يَقُولُونَ لِإِخْوَانِهِمُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَئِنْ أُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ وَلَا نُطِيعُ فِيكُمْ أَحَدًا أَبَدًا وَإِنْ قُوتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ﴾ (سورۂ حشر۔۲)

تم نے دیکھا! منافق اپنے کافر بھائیوں سے کہتے ہیں کہ تم نکلے تو ہم بھی تمہارے ساتھ نکلیں گے اور ہم تمہارے باب میں کسی کا کہنا نہ مانیں گے اور اگر تم سے کوئی لڑا تو ہم بھی تمہاری مدد کو آئیں گے۔

لیکن بنو نضیر کے تمام خیالات غلط نکلے، بنو قریظہ نے ان کا ساتھ نہیں دیا اور منافق اعدائے اسلام کے مقابلہ میں نہیں آ سکتے تھے۔

آنحضرت ﷺ نے پندرہ دن تک ان کا محاصرہ کیا قلعے کے گرد جو ان کے نخلستان تھے ان کے چند درخت کٹوا دیئے۔ سہیلی نے روض الانف میں لکھا ہے کہ سب نخلستان نہیں کاٹا گیا بلکہ صرف لینہ جو ایک خاص قسم کی کھجور ہے اور عرب کی عام غذا نہیں ہے اس کے درخت کٹوا دیئے گئے تھے قرآن مجید میں بھی اس کا ذکر ہے۔

﴿مَا قَطَعْتُمْ مِنْ لِينَةٍ أَوْ تَرَكْتُمُوهَا قَائِمَةً عَلَى أُصُولِهَا فَبِإِذْنِ اللَّهِ وَلِيُخْزِيَ الْفَاسِقِينَ﴾ (سورۂ حشر۔۱)

تم نے لینہ کے جو درخت کاٹے اور جس قدر قائم رہنے دیئے سب اللہ کے حکم سے تھا تاکہ اللہ فاسقوں کو رسوا کرے۔

ممکن ہے کہ درختوں کے جھنڈ سے کمین گاہ کا کام لیا جاتا ہو اس لئے وہ صاف کرا دیئے گئے کہ محاصرہ میں کوئی

---

[1] یہ تمام تفصیل سنن ابی داؤد میں (ذکر النضیر، کتاب الخراج والامارۃ "س ن") ہے تعجب ہے کہ ارباب سیرت ابوداؤد کی اس روایت سے بالکل بےخبر ہیں۔

[2] فتح الباری قصہ غزوۂ بنو نضیر جلد ۷ صفحہ ۲۵۵۔ فتح الباری میں یہ روایت ابن مردویہ سے نقل کی ہے اور لکھا ہے کہ اس کی سند صحیح ہے۔ بخاری سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ بنو نضیر نے آنحضرت ﷺ کے ساتھ اس قسم کی عیاری کا ارادہ کیا تھا چنانچہ بخاری میں ترجمۃ الباب یہ ہے باب حدیث بنی النضیر و مخرج رسول اللہ الیہم فی دیۃ الرجلین وما ارادوا من الغدر برسول اللہ ﷺ۔

پھر حائل نہ ہو۔[1]

بالآخر یہود اس شرط پر راضی ہوئے کہ جس قدر مال و اسباب اونٹوں پر لے جا سکیں لے جائیں اور مدینہ سے باہر نکل جائیں، چنانچہ سب گھروں کو چھوڑ چھوڑ کر نکل گئے ان میں سے معزز رؤسا مثلاً سلام بن ابی الحقیق، کنانہ بن الربیع، حیی بن اخطب خیبر چلے گئے وہاں لوگوں نے ان کا اس قدر احترام کیا کہ خیبر کا رئیس تسلیم کر لیا۔[2] اس واقعہ کو اس غرض سے یاد رکھنا چاہیے کہ یہی غزوۂ خیبر کی داستان کا دیباچہ ہے۔

بنو نضیر اگرچہ وطن چھوڑ کر نکلے تھے لیکن اس شان سے نکلے کہ جشن کا دھوکا ہوتا تھا، اونٹوں پر سوار تھے، ساتھ ساتھ باجا بجتا جاتا تھا، مطربہ عورتیں دف بجاتی اور گاتی تھیں، عروہ بن الورد عبسی مشہور شاعر کی بیوی کو یہود نے خرید لیا تھا، وہ بھی ساتھ ساتھ تھی۔ اہل مدینہ کا بیان ہے کہ اس سر و سامان کی سواری کبھی ان کی نظر سے نہیں گزری تھی۔[3] ہتھیاروں کا ذخیرہ جو ان لوگوں نے چھوڑا اس میں پچاس زرہیں، پچاس خود اور تین سو چالیس تلواریں تھیں۔ ان کے جانے کے بعد یہ جھگڑا پیش آیا کہ انصار کی وہ اولادیں جنہوں نے یہودی مذہب اختیار کر لیا تھا اور یہودی ان کو اتحاد مذہب کی وجہ سے ساتھ لیے جاتے تھے انصار نے ان کو روک لیا کہ ہم ان کو نہ جانے دیں گے۔ اس پر قرآن مجید کی یہ آیت اتری۔

﴿ لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ ﴾

یعنی مذہب میں زبردستی نہیں ہے۔

ابوداؤد نے کتاب الجہاد باب "فی الاسیر یکرہ علی الاسلام" کے عنوان کے نیچے اس واقعہ کو حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت سے نقل کیا ہے۔

[1] مصنف کے اس خیال کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ امام احمد کے نزدیک درخت وغیرہ میدان جنگ میں اسی وقت کاٹے جاتے ہیں جب کہ کاٹے بغیر چارہ نہ ہو۔ محدثین نے امام احمد کا یہ قول اسی واقعہ کے ضمن میں لکھا ہے۔ ترمذی نے اس موقع پر یہ بھی لکھا ہے کہ اسحاق کا قول ہے کہ دشمن کے درختوں (کی آتش زنی) بھی مدافعت میں آ سکتی ہے اور جائز ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان حضرات کے نزدیک یہ اس موقع پر درخت کا کاٹنا جنگی ضرورت کا اقتضا تھا۔ (ترمذی جلد اول صفحہ ۱۹۱)

[2] طبری صفحہ ۱۴۵۳

[3] یہ تفصیل طبری میں ہے صفحہ ۱۴۵۴

۵ھ

غزوۂ مریسیع، واقعۂ افک و غزوۂ احزاب

قریش اور یہود کی متفقہ سازش نے اب مکہ سے لے کر مدینہ تک آگ لگا دی، جس قدر قبائل تھے سب نے مدینہ پر حملہ کی تیاریاں شروع کر دیں، سب سے پہلے انمار اور ثعلبہ نے یہ ارادہ کیا، لیکن آنحضرت ﷺ کو خبر ہوگئی، محرم ۵ھ کو آپ مدینے سے چار سو صحابہؓ کو لے کر نکلے اور ذات الرقاع تک تشریف لے گئے، لیکن آپ کی آمد سن کر وہ پہاڑوں میں بھاگ گئے۔[۱]

ربیع الاول ۵ھ میں یہ خبر آئی کہ دومۃ الجندل میں کفار کی ایک عظیم الشان فوج جمع ہو رہی ہے، آنحضرت ﷺ ایک ہزار کی جمعیت لے کر مدینے سے نکلے، ان کو خبر ہوئی تو وہ بھاگ گئے۔

غزوۂ مریسیع[۲] یا بنی مصطلق، شعبان ۵ھ

خزاعہ ایک قبیلہ تھا جو قریش کا حلیف اور ہم عہد تھا۔ قریش کو ایک زمانہ میں یہ خیال آیا کہ ہم ابراہیمؑ کی نسل سے ہیں اس لئے ہم کو اوروں سے ہر بات میں ممتاز ہونا چاہئے۔ حج کا ایک جزو رکن عرفات کے میدان میں قیام کرنا ہے چونکہ یہ میدان حرم کی حدود سے باہر ہے، سو قریش نے یہ قاعدہ قرار دیا کہ لوگ عرفات جائیں لیکن ہم کو عرفات کے بجائے مزدلفہ میں ٹھہرنا چاہئے جو حدود حرم کے اندر ہے، اسی قسم کی اور امتیازی باتیں قائم کیں، ان خصوصیتوں کی بنا پر اپنا لقب حمس رکھا، لیکن اس قدر فیاضی کی کہ جو لوگ ان پابندیوں کو قبول کر لیتے تھے ان کو بھی یہ لقب دے دیتے تھے اور ان سے رشتہ ناتہ کرتے تھے، قبیلہ خزاعہ[۳] کو بھی یہ شرف عطا کیا تھا۔

خزاعہ کا ایک خاندان بنو المصطلق کہلاتا تھا، وہ مقام مریسیع میں جو مدینہ منورہ سے ۹ منزل ہے آباد تھا، اس خاندان کا رئیس حارث بن ابی ضرار تھا، اس نے قریش کے اشارہ سے یا خود مدینہ پر حملہ کی تیاریاں شروع کیں، آنحضرت ﷺ کو یہ خبر ہوئی تو مزید تحقیقات کے لئے زیدؓ بن خصیب کو بھیجا، انہوں نے واپس آ کر خبر کی تصدیق کی۔ آپ نے صحابہ کو تیاری کا حکم دیا، ۲ شعبان کو فوجیں مدینہ سے روانہ ہوئیں، مریسیع میں خبر پہنچی تو حارث کی جمعیت منتشر ہوگئی اور وہ خود بھی کسی طرف نکل گیا، لیکن مریسیع میں جو لوگ آباد تھے انہوں نے صف آرائی کی اور دیر تک جم کر تیر برساتے رہے، مسلمانوں

---

۱ ابن سعد غزوۂ ذات الرقاع صفحہ ۴۳، بخاری سے ظاہر ہوتا ہے کہ غزوۂ ذات الرقاع خندق کے بعد واقع ہوا، صلوٰۃ الخوف سب سے پہلے اسی غزوہ میں ادا کی گئی۔

۲ ابن اسحاق نے جس کی پیروی طبری و ابن ہشام نے کی ہے اس غزوہ کو ۶ھ میں ذکر کیا ہے، موسیٰ بن عقبہ کی روایت ہے کہ ۵ھ میں واقع ہوا، امام بخاری نے بھی صحیح میں اس اختلاف کا ذکر کیا ہے لیکن غلطی سے ۵ھ کے بجائے ابن عقبہ کی طرف ۴ھ کی نسبت کی ہے، علامہ ابن حجر نے فتح الباری (جلد ۷ صفحہ ۳۳۲) میں نقل کیا کہ موسیٰ بن عقبہ اور بہتوں کی روایتوں سے ۵ھ ثابت ہوتا ہے، ابن سعد نے بھی ۵ھ ہی لکھا ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھو فتح الباری۔

۳ یہ واقعات ابن ہشام نے تفصیل سے لکھے ہیں۔

نے دفعتہً ایک ساتھ حملہ کیا تو ان کے پاؤں اکھڑ گئے ۱۰ آدمی مارے گئے اور باقی گرفتار ہو گئے جن کی تعداد تقریباً ۶۰۰ تھی غنیمت میں دو ہزار اونٹ اور پانچ ہزار بکریاں ہاتھ آئیں۔

یہ ابن سعد کی روایت ہے، صحیح بخاری[1] اور صحیح مسلم[2] میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے بنو المصطلق پر اس حالت میں حملہ کیا کہ وہ بالکل بے خبر اور غافل تھے اور اپنے مویشیوں کو پانی پلا رہے تھے۔ ابن سعد[3] نے اس روایت کو بھی نقل کیا ہے لیکن لکھا ہے کہ پہلی روایت زیادہ صحیح ہے۔ اس پر حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں لکھا کہ صحیحین کی روایت پر ترجیح نہیں ہو سکتی، لیکن واقعہ یہ ہے کہ صحیحین کی روایت بھی اصول حدیث کے رو سے قابل حجت نہیں کہ اس روایت کا سلسلہ نافع تک پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے اور جنگ میں شریک ہونا تو ایک طرف نافع نے آنحضرت ﷺ کو دیکھا بھی نہ تھا اس لئے یہ روایت مصطلح محدثین میں منقطع ہے۔[4]

یہ لڑائی بہت معمولی لڑائی تھی لیکن اتفاق سے بعض شرارت پسندوں سے ایسے واقعات پیش آئے جن کی وجہ سے اس لڑائی کو خاص عنوان سے ترتیب دیا جاتا ہے۔ اس جنگ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ غنیمت کے لالچ سے بہت سے منافقین بھی فوج میں داخل ہو گئے تھے۔ یہ بہ باطن ہر موقع پر فتنہ پردازی کی کوشش کرتے۔ ایک دن چشمہ سے پانی لینے پر ایک مہاجر اور انصاری میں جھگڑا ہو گیا۔ انصاری نے عرب کے قدیم طریقہ پر یا للانصار، کا نعرہ مارا (انصاری کی جے) مہاجر نے بھی یا للمہاجرین کے نعرہ سے جواب دیا۔ نعرے سن کر قریش و انصار نے تلواریں کھینچ لیں اور قریب تھا کہ جنگ چھڑ جائے لیکن چند لوگوں نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔ عبداللہ بن ابی جو رئیس المنافقین تھا اس کو موقع ہاتھ آیا، انصار سے مخاطب ہو کر کہا "تم نے یہ خود سری کی ان مہاجرین کو تم نے بلا کر لاتا کر دیا کہ اب وہ خود تم سے برابر کا مقابلہ کرتے ہیں، وقت اب بھی ہاتھ سے نہیں گیا ہے تم دستگیری سے ہاتھ اٹھا لو تو وہ خود یہاں سے نکل جائیں گے"۔

یہ واقعہ لوگوں نے آنحضرت ﷺ سے آ کر کہا، حضرت عمرؓ بھی موجود تھے غصہ سے بیتاب ہو گئے اور عرض کی کہ کسی کو ارشاد ہو اس منافق کی گردن اڑا دے، آپ نے فرمایا کہ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ "محمد اپنے ساتھ والوں کو قتل کر دیا کرتے ہیں"۔[5]

یہ عجیب بات ہے کہ عبداللہ بن ابی جس درجہ کا منافق اور دشمن اسلام تھا اس کے صاحبزادے جن کا نام بھی عبداللہ تھا اسی قدر اسلام کے جان نثار تھے، آنحضرت ﷺ کی ناراضی کی بنا پر یہ خبر مشہور ہو گئی تھی کہ آپ عبداللہ بن ابی کے

---

[1] باب العتق۔

[2] کتاب الجہاد والسیر۔

[3] طبقات ابن سعد جلد مغازی صفحہ ۴۶۔

[4] معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے صرف آغاز سند کو ملاحظہ فرما کر اس روایت کو منقطع قرار دیا ہے ورنہ متن حدیث کے بعد تصریح ہے "حدثني هذا الحديث عبدالله بن عمر وكان في ذلك الجيش" یعنی نافع نے اس روایت کو حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے سنا جو اس لڑائی میں شریک تھے (مسلم کتاب الجہاد، بخاری کتاب العتق) اس تصریح کے بعد یہ روایت منقطع نہیں باقی رہتی ہے۔" (س)

[5] صحیح بخاری تفسیر سورۂ منافقون۔

قتل کا حکم دینے والے ہیں، یہ سن کر وہ خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ دنیا جانتی ہے کہ میں باپ کا کس قدر خدمت گزار ہوں لیکن اگر یہ مرضی ہے تو مجھ ہی کو حکم ہو، میں ابھی ان کا سر لا کر حاضر کر دیتا ہوں، ایسا نہ ہو کہ آپ کسی دوسرے کو حکم دیں اور میں غیرت و محبت کے جوش میں آ کر قاتل کو قتل کر دوں۔ آپ ﷺ نے اطمینان دلایا کہ قتل کی بجائے میں ان پر مہربانی کروں گا۔ [1] یہ ارشاد اس طرح پورا ہوا کہ جب وہ مرا تو کفن کے لئے آپ نے خود پیراہن مبارک عنایت فرمایا اور جنازہ کی نماز پڑھائی، حضرت عمرؓ نے دامن تھام لیا کہ منافق کے جنازہ کی نماز پڑھتے ہیں لیکن دریائے کرم کا بہاؤ کون روک سکتا تھا۔

حضرت جویریہؓ کا واقعہ:

لڑائی میں جو لوگ گرفتار ہوئے ان میں حضرت جویریہؓ بھی تھیں، جو حارث بن ابی ضرار کی صاحبزادی تھیں۔ ابن اسحاق کی روایت ہے جو بعض حدیث کی کتابوں میں بھی ہے کہ تمام اسیران جنگ لونڈی غلام بنا کر تقسیم کر دیئے گئے، حضرت جویریہؓ حضرت ثابت بن قیسؓ کے حصہ میں آئیں۔ انہوں نے حضرت ثابتؓ سے درخواست کی کہ مکاتبت کر لو یعنی مجھ سے کچھ روپیہ لے کر چھوڑ دو، حضرت ثابت نے منظور کیا، حضرت جویریہؓ کے پاس روپیہ نہ تھا، چاہا کہ لوگوں سے چندہ مانگ کر یہ رقم ادا کر دیں۔ آنحضرت ﷺ کے پاس بھی آئیں، حضرت عائشہؓ بھی وہاں موجود تھیں۔

ابن اسحاق نے حضرت عائشہؓ کی زبانی روایت کی ہے جو بعینہٖ ان کی ذاتی رائے ہے کہ چونکہ حضرت جویریہؓ نہایت شیریں ادا تھیں، میں نے ان کو آنحضرت ﷺ کے پاس جاتے دیکھا تو کھٹکی کہ آنحضرت ﷺ پر بھی ان کے حسن و جمال کا وہی اثر ہوگا جو مجھ پر ہوا، غرض وہ آنحضرت ﷺ کے پاس گئیں۔ آپ نے فرمایا اگر اس سے بہتر برتاؤ تمہارے ساتھ کیا جائے تو قبول کرو گی؟ انہوں نے پوچھا وہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا تمہاری طرف سے میں روپیہ ادا کر دوں اور تم کو اپنی زوجیت میں لے لوں۔ جویریہؓ نے کہا میں نے منظور کیا۔ [2] آپ نے تنہا وہ تمام رقم ادا کر دی اور ان سے شادی کر لی۔

یہ ابن اسحاق کی روایت ہے جو ابن ہشام اور ابوداؤد دونوں میں موجود ہے لیکن دوسرے طریق روایت میں اس سے زیادہ واضح بیان مذکور ہے۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ حضرت جویریہؓ کا باپ (حارث) رئیس عرب تھا، حضرت جویریہؓ جب گرفتار ہوئیں تو حارث آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آیا اور کہا کہ میری بیٹی کنیز نہیں بن سکتی، میری شان اس سے بالاتر ہے، آپ اس کو آزاد کر دیں۔ آپ نے فرمایا "کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ خود حضرت جویریہؓ کی مرضی پر چھوڑ دیا جائے"۔ حارث نے جا کر حضرت جویریہؓ سے کہا کہ محمد نے تیری مرضی پر رکھا ہے، دیکھنا مجھ کو رسوا نہ کرنا۔ انہوں نے کہا "میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں رہنا پسند کرتی ہوں"۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ان سے شادی کر لی۔

---

[1] یہ تمام واقعات نہایت تفصیل سے ابن سعد و طبری نے لکھے ہیں اور کچھ بخاری کے مختلف ابواب میں بھی مذکور ہیں۔

[2] ابوداؤد کتاب العتاق

یہ روایت حافظ ابن حجر نے اصابہ میں ابن مندہ سے نقل کر کے لکھا ہے کہ "اس کی سند صحیح ہے" ابن سعد میں بھی یہ روایت مذکور ہے یعنی ابن سعد نے طبقات میں یہ روایت بھی کی ہے کہ حضرت جویریہؓ کے والد نے ان کا زر فدیہ ادا کیا اور جب وہ آزاد ہو گئیں تو آنحضرت ﷺ نے ان سے نکاح کیا۔

اس نکاح کا اثر:

حضرت جویریہؓ سے جب آپ ﷺ نے نکاح کیا تو تمام اسیران جنگ جو اہل فوج کے حصہ میں آ گئے تھے دفعتاً رہا کر دیے گئے کہ فوج نے کہا کہ جس خاندان میں رسول اللہ ﷺ نے شادی کر لی وہ غلام نہیں ہو سکتا۔[1]

واقعۂ افک:

واقعۂ افک یعنی حضرت عائشہؓ پر منافقین نے جو تہمت لگائی تھی وہ اسی لڑائی سے واپسی میں پیش آیا تھا۔ احادیث اور سیر کی کتابوں میں اس واقعہ کو نہایت تفصیل سے نقل کیا ہے۔ لیکن جس واقعہ کی نسبت قرآن مجید میں صاف مذکور ہے کہ سننے کے ساتھ لوگوں نے یہ کیوں نہیں کہہ دیا کہ "بالکل افترا ہے" اس کو تفصیل کے ساتھ لکھنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ البتہ اس واقعہ سے یہ اندازہ کرنا چاہیے کہ کھلا جھوٹ اور بیہودہ خبر بھی کس طرح پھیل جاتی ہے۔ یہ خبر اصل میں منافقین نے مشہور کی تھی لیکن بعض مسلمان بھی دھوکے میں آ گئے جن کو تہمت لگانے کی سزا دی گئی جیسا کہ صحیح مسلم وغیرہ میں مذکور ہے۔

آج کل کے عیسائی مورخوں نے بھی قدیم منافقوں کی طرح اس واقعہ کو اس جوش مسرت سے لکھا ہے کہ خود بخود ان کے قلم میں روانی آ گئی ہے۔ لیکن ہم ان سے قطع بحث بھی کر سکتے تھے۔ یہ تمام لڑائیاں اس عام جنگ کا پیش خیمہ تھیں جو تمام عرب اور یہود متفقہ قوت سے کرنا چاہتے تھے اور جس کو جنگ احزاب کہتے ہیں۔

غزوۂ احزاب یعنی تمام عرب کی متحدہ جنگ، ذوالقعدہ ۵ھ:

بنو نضیر جو مدینہ سے نکل کر خیبر پہنچے تو انہوں نے ایک نہایت عظیم الشان سازش شروع کی ان کے رؤسا میں سے سلام بن ابی الحقیق، حیی بن اخطب، کنانہ بن الربیع وغیرہ مکۂ معظمہ گئے اور قریش سے مل کر کہا "اگر ہمارا ساتھ دو تو اسلام کا استیصال کیا جا سکتا ہے" قریش اس کے لئے پہلے سے تیار تھے قریش کو آمادہ کر کے یہ لوگ قبیلۂ غطفان کے پاس

---

[1] سنن ابی داؤد کتاب العتاق باب فی بیع المکاتب اذا فسخت المکاتبة ۱۲ "ن"

[2] طبری میں سلسلۂ غزوۂ خندق عن عروة ... رسول اللہ ﷺ ... [illegible] (جلد ۳ صفحہ ۱۴۶۳) احادیث کی سب سے قدیم و معتبر کتاب مغازی موسیٰ بن عقبہ ہے۔ حافظ ابن حجر نے فتح الباری جلد ۷ صفحہ ۳۰۱ غزوۂ احزاب کے ذکر میں اس کی یہ عبارت نقل کی ہے خرج حیی بن اخطب بعد قتل بنی النضیر الی مکة یحرض المشرکین علی حرب رسول اللہ ﷺ وخرج کنانة بن الربیع بن ابی الحقیق یسعی فی بنی غطفان ویحضهم علی قتال رسول اللہ ﷺ علی ان لهم نصف ثمر خیبر فاجابه عیینة بن حصن ... الی ذلك وکتبوا الی حلفائهم من بنی اسد فاقبل الیهم طلیحة ... ومن اطاعه

وَبَلَغَتِ الْقُلُوبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّونَ بِاللَّهِ الظُّنُونَا ۝ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُونَ وَزُلْزِلُوا زِلْزَالًا شَدِيدًا ﴾ [سورۂ احزاب ۔ ۲]

جبکہ دشمن اوپر کی طرف اور نشیب کی طرف سے آ پڑے اور جب آنکھیں پتھرا گئی تھیں اور کلیجے منہ کو آ گئے اور تم خدا کی نسبت طرح طرح کے گمان کرنے لگے تب مسلمانوں کی جانچ کا وقت آ پہنچا اور وہ سخت زلزلے میں ڈال دیے گئے

فوج اسلام میں منافقوں کی تعداد بھی شامل تھی جو بظاہر مسلمانوں کے ساتھ تھے لیکن موسم کی سختی، رسد کی قلت، متواتر فاقے، راتوں کی بے خوابی، دشمنوں کی فوجوں کا ہجوم ایسے اتفاقات تھے جنہوں نے ان کا پردہ فاش کر دیا۔ آ کر آنحضرت ﷺ سے اجازت مانگنی شروع کی کہ ہمارے گھر محفوظ نہیں ہم کو شہر واپس چلے جانے کی اجازت دی جائے:

﴿ يَقُولُونَ إِنَّ بُيُوتَنَا عَوْرَةٌ وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ إِنْ يُرِيدُونَ إِلَّا فِرَارًا ﴾ (احزاب ۔ ۲)

کہتے ہیں کہ ہمارے گھر کھلے پڑے ہیں اور وہ کھلے نہیں پڑے، ان کو بھاگنا مقصود ہے۔

لیکن جاں نثاران اسلام کا طلائے اخلاص اسی کسوٹی پر آزمانے کے قابل تھا:

﴿ وَلَمَّا رَأَى الْمُؤْمِنُونَ الْأَحْزَابَ قَالُوا هَٰذَا مَا وَعَدَنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَصَدَقَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَمَا زَادَهُمْ إِلَّا إِيمَانًا وَتَسْلِيمًا ﴾ [احزاب ۔ ۳]

جب مسلمانوں نے قبائل کی فوجیں دیکھیں تو بول اٹھے کہ یہ وہی ہے جس کا وعدہ اللہ نے اور اس کے رسول نے کیا تھا اور اللہ اور اس کا رسول دونوں سچے تھے اور اس بات سے ان کے یقین اور اطاعت گزاری اور بھی بڑھ گئی۔

قریباً ایک مہینہ تک اس سختی سے محاصرہ قائم رہا کہ آنحضرت ﷺ اور صحابہؓ پر تین تین فاقے گزر گئے۔ ایک دن صحابہؓ نے بے تاب ہو کر آنحضرت ﷺ کے سامنے اپنے شکم کھول کر دکھائے کہ پتھر بندھے ہیں لیکن جب آپ نے شکم مبارک کھولا تو ایک کے بجائے دو پتھر بندھے تھے۔ محاصرہ اس قدر شدید اور پرخطر ہو گیا تھا کہ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے لوگوں سے خطاب کر کے فرمایا کہ کوئی ہے جو باہر نکل کر محاصرین کی خبر لائے۔ تین دفعہ آپ نے یہ الفاظ فرمائے لیکن حضرت زبیرؓ کے سوا اور کوئی صدا نہیں آئی۔ آنحضرت ﷺ نے اس موقع پر حضرت زبیرؓ کو حواری کا لقب دیا۔[2]

محاصرین نے ادھر تو خندق کا محاصرہ کر رکھا تھا ادھر دوسری سمت اس غرض سے مدینہ پر حملہ کرنا چاہا کہ آنحضرت ﷺ اور صحابہ کے اہل و عیال بھی قلعوں میں پناہ گزین تھے۔

محاصرین خندق کو عبور نہیں کر سکتے تھے اس لیے دور سے تیر اور پتھر برساتے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے خندق کے مختلف حصوں پر فوجیں تقسیم کر دی تھیں جو محاصرین کے حصوں کا مقابلہ کرتی تھیں اور ایک حصہ خود آپؐ کے اہتمام میں تھا۔

---

1. قدیم زمانہ میں عرب کی عادت تھی کہ سخت بھوک میں پیٹ پر پتھر باندھتے تھے جس سے کمر جھکنے نہ پاتی تھی
2. صحیح بخاری کتاب غزوۂ احزاب و صحیح مسلم کتاب الفضائل لیکن ابن ہشام میں اس موقع پر حضرت حذیفہ بن یمان کا نام ہے اس لئے محدثین میں ان دونوں ناموں کے واقعوں کی تحقیق میں اختلاف ہے۔ حافظ ابن حجر اور زرقانی نے یہ تطبیق دی ہے کہ محاصرین میں سے قریش کی تحقیق حال کے لئے حضرت حذیفہ اور بنو قریظہ کی تحقیق خبر کے لئے حضرت زبیر گئے تھے۔ تفصیل ابن حجر اور زرقانی نے اپنی کتابوں میں کی ہے فتح الباری جلد ۷ صفحہ ۳۰۲، زرقانی جلد ۲ صفحہ ۱۲۲

محاصرہ کی سختی دیکھ کر آپ کو خیال ہوا کہ ایسا نہ ہو انصار ہمت ہار جائیں اس لئے آپ نے غطفان سے اس شرط پر معاہدہ کرنا چاہا کہ مدینہ کی پیداوار کا ایک ثلث ان کو دے دیا جائے۔ سعدؓ بن عبادہ اور سعدؓ بن معاذ کو جو روسائے انصار تھے بلا کر مشورہ کیا۔ دونوں نے عرض کی کہ اگر یہ اللہ کا حکم ہے تو انکار کی مجال نہیں لیکن اگر رائے ہے تو یہ عرض ہے کہ کفر کی حالت میں بھی کوئی شخص ہم سے خراج مانگنے کی جرأت نہ کر سکا اور اب تو اسلام نے ہمارا پایہ بہت بلند کر دیا ہے۔ یہ استقلال دیکھ کر آپ کو اطمینان ہوا۔ حضرت سعدؓ نے معاہدہ کا کاغذ ہاتھ میں لے کر تمام عبارت[1] مٹا دی۔ اور کہا "ان لوگوں سے جو بن آئے کر دکھائیں"۔

اب مشرکوں کی طرف سے حملہ کا یہ انتظام کیا گیا کہ قریش کے مشہور جنرل یعنی ابوسفیانؓ، خالد بن ولید، عمرو بن العاص، ضرار بن الخطاب اور ہبیرہ کا ایک ایک دن مقرر ہوا۔ ہر جنرل اپنی باری کے دن پوری فوج کو لے کر لڑتا تھا۔ خندق کو عبور نہیں کر سکتے تھے لیکن خندق کا عرض چونکہ زیادہ نہ تھا اس لئے باہر سے پتھر اور تیر برساتے تھے۔ چونکہ اس طریقہ میں کامیابی نہیں ہوئی اس لئے قرار پایا کہ اب عام حملہ کیا جائے۔ تمام فوج مجتمع ہوئی، قبائل کے تمام سردار آگے آگے تھے۔ خندق ایک جگہ سے اتفاقاً کم عریض تھی، یہ موقع حملہ کے لئے انتخاب کیا گیا۔ عرب کے مشہور بہادروں یعنی ضرار، ہبیرہ، نوفل اور عمرو بن عبدود نے خندق کے اس کنارے سے گھوڑوں کو مہمیز کیا تو اس پار تھے۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور بہادر عمرو بن عبدود تھا۔ وہ ایک ہزار سوار کے برابر مانا جاتا تھا۔ جنگ بدر میں زخمی ہو کر واپس چلا گیا تھا اور قسم کھائی تھی کہ جب تک انتقام نہ لوں گا بالوں میں تیل نہ ڈالوں گا۔ اس وقت اس کی عمر ۹۰ برس کی تھی تاہم سب سے پہلے وہی آگے بڑھا اور عرب کے دستور کے موافق پکارا کہ مقابلہ کو کون آتا ہے؟ حضرت علیؓ نے اٹھ کر کہا "میں"۔ لیکن آنحضرت ﷺ نے روکا کہ یہ عمرو بن عبدود ہے۔ حضرت علیؓ بیٹھ گئے لیکن عمرو کی آواز کا اور کسی طرف سے جواب نہیں آتا تھا۔ عمرو نے دوبارہ پکارا اور پھر وہی صرف ایک صدا جواب میں تھی۔ تیسری دفعہ جب آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ یہ عمرو ہے تو حضرت علیؓ نے عرض کی ہاں میں جانتا ہوں کہ یہ عمرو ہے، غرض آپ نے اجازت دی، خود دست مبارک سے تلوار عنایت کی، سر پر عمامہ باندھا۔

عمرو کا قول تھا کہ کوئی شخص دنیا میں اگر مجھ سے تین باتوں کی درخواست کرے تو ایک ضرور قبول کروں گا حضرت علیؓ نے عمرو سے پوچھا کہ کیا واقعی یہ قول ہے؟ پھر حسب ذیل گفتگو ہوئی:

حضرت علیؓ	میں درخواست کرتا ہوں کہ تو اسلام لا۔
عمرو	یہ نہیں ہو سکتا۔
حضرت علیؓ	لڑائی سے واپس چلا جا۔
عمرو	میں عورتوں کا طعنہ نہیں سن سکتا۔
حضرت علیؓ	مجھ سے لڑنے آ رہا ہو۔

عمرو ہنسا اور کہا مجھ کو امید نہ تھی کہ آسمان کے نیچے یہ درخواست بھی میرے سامنے پیش کی جائے گی۔ حضرت علیؓ

[1] طبری جلد ۳ صفحہ ۱۴۷۴

آسمان کا نام نہ تھا، پھر یہ کہ باوجود سردی کے موسم کے اس زور کی ہوا چلی کہ طوفان آ گیا، خیموں کی طنابیں اکھڑ اکھڑ گئیں، کھانے کے دیگچے چولہوں پر الٹ الٹ جاتے تھے۔ اس واقعہ نے فوجوں سے بڑھ کر کام دیا۔ اسی بنا پر قرآن مجید نے اس باد صرصر کو لشکر الٰہی سے تعبیر کیا ہے۔

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَاءَتْكُمْ جُنُودٌ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا وَجُنُودًا لَمْ تَرَوْهَا ﴾ (احزاب-۲)

مسلمانو! اللہ کے اس احسان کو یاد کرو جب کہ تم پر فوجیں آ پڑیں تو ہم نے ان پر آندھی بھیجی اور وہ فوجیں بھیجیں جو تم کو دکھائی نہیں دیتی تھیں۔

نعیم بن مسعود اشجعی ایک غطفانی رئیس تھے، قریش اور یہود دونوں ان کو مانتے تھے، وہ اسلام لا چکے تھے لیکن کفار کو ابھی اس کا علم نہ تھا، انہوں نے قریش اور یہود سے الگ الگ جا کر اس قسم کی باتیں کیں جس سے دونوں میں پھوٹ پڑ گئی

ابن اسحاق کی روایت ہے کہ نعیم نے اس تفرقہ اندازی میں دونوں سے ایسی باتیں کہیں جن سے دونوں ایک دوسرے سے بدگمان ہو جائیں اور اسی بنا پر کہتے ہیں کہ خود آنحضرت ﷺ نے الحرب خدعۃ کی تعلیم کی تھی لیکن ابن اسحاق نے روایت کی سند نہیں نقل کی اور اگر کرتے بھی تو ابن اسحاق کا یہ پایہ نہیں کہ ایسا واقعہ محض ان کی سند سے قبول کر لیا جائے۔ اس کے علاوہ واقعات اس قسم کے پیش تھے کہ دونوں فریقوں کا اتحاد بغیر اس کے توڑا جا سکتا تھا کہ کوئی غلط بات بیان کی جائے، ابن اسحاق کی روایت میں بھی اس قدر مذکور ہے کہ نعیم نے یہود سے کہا کہ قریش تو چند دن کے بعد یہاں سے چلے جائیں گے، تمہارا مسلمانوں کا ہمیشہ کا ساتھ ہے اس لئے تم کیوں بیچ میں پڑ کر ہمیشہ کے لئے لڑائی مول لیتے ہو اور اگر ایسا ہی ارادہ ہو تو قریش سے کہو کہ وہ چند معززین کو ضمانت کے طور پر تمہارے پاس بھیج دیں کہ اگر قریش لڑائی کا فیصلہ کئے بغیر چلے جانا چاہیں تو تم ان لوگوں کو روک لینا۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ یہود بنو قریظہ اول اول نقض عہد پر راضی نہ تھے اور کہتے تھے کہ ہم محمد سے معاہدہ کر چکے ہیں لیکن حیی بن اخطب نے اس شرط پر ان کو راضی کیا تھا کہ ”قریش چلے گئے تو میں خیبر چھوڑ کر تمہارے پاس آ جاؤں گا“، قریش اس قسم کی ضمانت نہیں منظور کر سکتے تھے اس لئے جب انہوں نے انکار کیا ہوگا تو دونوں میں خود پھوٹ پڑ گئی ہوگی اس کے لئے ایک صحابی کو دروغ بیانی کی کیا ضرورت تھی۔[۲]

بہر حال موسم کی سختی، محاصرہ کا امتداد، آندھی کا زور، رسد کی قلت اور یہود کی علیحدگی، یہ تمام اسباب ایسے جمع ہو گئے تھے کہ قریش کے پائے ثبات اب ٹھہر نہیں سکتے تھے، ابو سفیان نے فوج سے کہا رسد ختم ہو چکی، موسم کا یہ حال ہے، یہود نے ساتھ چھوڑ دیا، اب محاصرہ بے کار ہے، یہ کہہ کر طبل رحیل بجانے کا حکم دیا، غطفان بھی اس کے ساتھ روانہ ہو گئے، بنو قریظہ محاصرہ چھوڑ کر اپنے قلعوں میں چلے آئے اور مدینہ کا افق ۲۰-۲۲ دن تک غبار آلود رہ کر صاف ہو گیا۔

۱۔ زرقانی بحوالہ طبرانی، بزار، بیہقی بسند حسن از زرقانی صفحہ ۱۲۴ جلد ۲ واقعہ اشجعی۔

۲۔ مصنف کے اس قیاس کی تائید مغازی موسیٰ بن عقبہ کی روایت سے ہوتی ہے جس کو مختصراً مصنف ابن ابی شیبہ میں اور تفصیل کے ساتھ ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

دن کے بعد یعنی بنو قریظہ کی ہلاکت کے بعد زخم کھل گیا اور انہوں نے وفات پائی۔

بنو قریظہ کا خاتمہ:

اوپر گزر چکا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے آغاز قیام میں یہود کے ساتھ معاہدہ کیا تھا اور ان کو جان و مال و مذہب ہر چیز میں امن و آزادی بخشی تھی لیکن جب قریش نے ان کو تہدید کا خط لکھا تو وہ آمادۂ بغاوت ہو گئے۔ آنحضرت ﷺ نے ان لوگوں سے تجدید معاہدہ کرنی چاہی تو بنو نضیر نے انکار کیا اور وہ جلاوطن کر دیئے گئے لیکن بنو قریظہ نے نئے سرے سے معاہدہ کر لیا[1] چنانچہ ان کو امن دے دیا گیا۔ صحیح مسلم میں ان واقعات کو اختصار کے ساتھ ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

﴿عن ابن عمر ان یہود بنی النضیر و قریظۃ حاربوا رسول اللہ ﷺ فاجلی رسول اللہ ﷺ بنی النضیر واقر قریظۃ و منّ علیہم﴾ (صحیح مسلم ذکر اجلاء الیہود من الحجاز)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ بنو نضیر اور قریظہ کے یہود نے آنحضرت ﷺ سے لڑائی کی تو آپ نے بنو نضیر کو جلاوطن کر دیا اور قریظہ کو رہنے دیا اور ان پر احسان کیا۔

بنو نضیر جب جلاوطن ہوئے تو ان کے رئیس الاعظم حیی بن اخطب، ابو رافع سلام ابن ابی الحقیق خیبر میں جا کر آباد ہوئے اور وہاں ریاست عامہ حاصل کر لی۔ جنگ احزاب انہی کی کوششوں کا نتیجہ تھی۔ قبائل عرب میں دورہ کر کے تمام ملک میں آگ لگا دی اور قریش کے ساتھ مل کر مدینہ پر حملہ آور ہوئے۔ اس وقت تک قریظہ معاہدہ پر قائم تھے لیکن حیی بن اخطب نے ان کو بہکا کر توڑ لیا اور ان سے وعدہ کیا کہ خدانخواستہ اگر قریش حملہ سے دست بردار ہو کر چلے گئے تو میں خیبر چھوڑ کر تمہیں آ رہوں گا۔ چنانچہ اس نے یہ عہد وفا کیا۔

قریظہ نے احزاب میں علانیہ شرکت کی اور شکست کھا کر واپس آئے تو اسلام کے سب سے بڑے دشمن حیی بن اخطب کو ساتھ لائے۔[2]

اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ ان کا آخری فیصلہ کیا جائے۔ آنحضرت ﷺ نے احزاب سے فارغ ہو کر حکم دیا کہ ابھی لوگ ہتھیار نہ کھولیں اور قریظہ کی طرف بڑھیں۔ قریظہ اگر صلح و آشتی سے پیش آتے تو قابل اطمینان تصفیہ کے بعد ان کو امن دیا جاتا لیکن وہ مستعد لڑائی کا فیصلہ کر چکے تھے، فوج سے آگے بڑھ کر جب حضرت علیؓ ان کے قلعوں کے پاس پہنچے تو انہوں نے علانیہ آنحضرت ﷺ کو (نعوذ باللہ) گالیاں دیں۔[3] غرض ان کا محاصرہ کیا گیا اور تقریباً ایک مہینے محاصرہ

---

[1] واقدی نے حیی بن اخطب کی زبانی بنو قریظہ کے اس معاہدہ سے مجبور ہو جانے کے واقعہ کو ان کی روزی چال ظاہر کیا ہے۔ حیی بن اخطب نے کہا کہ وہ اس لئے مجبور کئے گئے ہیں کہ موقع پا کر کفار سے مل کر مسلمانوں پر حملہ کر سکیں۔ [illegible]

[2] صحیح بخاری باب میں کی روایت سے بظاہر یہ نہیں نکلتا کہ بنو قریظہ نے اس جنگ میں کوئی عملی حصہ لیا تھا، ان کا حصہ لینا یہ ہے کہ قرآن مجید میں جہاں احزاب کا ذکر ہے وہاں ان کا ذکر ضرور ہے لیکن قرآن میں صاف یہ الفاظ ہیں [illegible] ظاہروهم من اهل الكتاب [illegible]

[3] طبری ج ۳ ص ۱۴۸۶ [illegible]

[4] طبری جلد ۳ صفحہ ۱۴۸۶ میں ہے [illegible] رسول الله صلی الله علیه وسلم [illegible]

رہا بالآخر انہوں نے درخواست پیش کی کہ حضرت سعد بن معاذؓ جو فیصلہ کریں ہم کو منظور ہے۔

حضرت سعد بن معاذؓ اور ان کا قبیلہ (اوس) قریظہ کا حلیف و ہم عہد تھا عرب میں یہ تعلق بھائی سے بڑھ کر تھا آنحضرت ﷺ نے ان کی درخواست منظور کی۔

قرآن مجید میں جب تک کوئی خاص حکم نہیں آتا تھا آنحضرت ﷺ تورات کے احکام کی پابندی فرماتے تھے۔ چنانچہ اکثر مسائل مثلاً قبلہ نماز، رجم، قصاص، پاشش وغیرہ وغیرہ میں جب تک خاص وحی نہیں آئی آنحضرت ﷺ نے تورات ہی کی پابندی فرمائی۔ حضرت سعدؓ نے جو فیصلہ کیا یعنی یہ کہ لڑنے والے قتل کئے جائیں، عورتیں اور بچے قید ہوں، مال و اسباب غنیمت قرار دیا جائے۔ یہ تورات کے مطابق تھا تورات کتاب استثناء اصحاح ۲۰ آیت ۱۰ میں ہے۔

"جب کسی شہر پر حملہ کرنے کے لئے تو جائے تو پہلے صلح کا پیغام دے۔ اگر وہ صلح قبول کریں اور تیرے لئے دروازے کھول دیں تو جتنے لوگ وہاں موجود ہوں سب تیرے غلام ہو جائیں گے۔ لیکن اگر صلح نہ کریں تو تو ان کا محاصرہ کر اور جب تیرا خدا تجھ کو ان پر قبضہ دلا دے تو جس قدر مرد ہوں سب کو قتل کر دے، باقی بچے، عورتیں، جانور اور جو چیزیں شہر میں موجود ہوں سب تیرے لئے مال غنیمت ہوں گی۔"

احادیث میں مذکور ہے کہ حضرت سعدؓ نے جب یہ فیصلہ کیا تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ تم نے ربانی فیصلہ کیا یعنی تورات کے حکم کی طرف اشارہ تھا۔ یہودیوں کو جب یہ حکم سنایا گیا تو جو فقرے ان کی زبان سے نکلے اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ خود بھی اس فیصلہ کو حکم الٰہی کے موافق سمجھتے تھے۔

حیی بن اخطب جو ان تمام فتن کا بانی تھا، مقتل میں لایا گیا تو آنحضرت ﷺ کی طرف اس نے نظر اٹھا کر دیکھا اور یہ فقرے کہے۔

﴿أما والله ما لمت نفسي في عداوتك ولكنه من يخذل الله يخذل﴾

ہاں اللہ کی قسم مجھ کو اس کا افسوس نہیں کہ میں نے کیوں تیری عداوت کی، لیکن بات یہ ہے کہ جو شخص اللہ کو چھوڑ دیتا ہے اللہ بھی اس کو چھوڑ دیتا ہے۔

پھر لوگوں کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔

﴿أيها الناس إنه لا بأس بأمر الله كتاب وقدر وملحمة كتبها الله على بني إسرائيل﴾ [۲]

لوگو! اللہ کے حکم کی تعمیل میں کچھ مضائقہ نہیں، یہ ایک نوشتہ الٰہی تھا، لکھا ہوا تھا، ایک سزا تھی جو اللہ نے بنو اسرائیل پر لکھ دی تھی۔

حیی بن اخطب کی نسبت یہ بات خاص طور پر لحاظ رکھنے کے قابل ہے کہ جب وہ جلاوطن ہو کر خیبر چلا گیا تھا تو

۱؎ صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۹۵ باب جواز قتال من نقض العهد وجواز انزال اهل الحصن على حكم حاكم عدل اهل للحكم "بن" الامام بخاری باب مرجع النبی ﷺ من الاحزاب "بن" میں یہ الفاظ نہیں مذکور ہے۔ مسٹر مارگولیوس صاحب فرماتے ہیں کہ چونکہ سعدؓ بن معاذ کو اسی جنگ میں ایک قریظی نے تیر سے زخمی کیا تھا جس سے وہ آخر جانبر نہ ہو سکے اس لئے انہوں نے بنو قریظہ کی نسبت ایسا بے رحمانہ فیصلہ کیا، لیکن وہ تیر انداز ابن العرقہ قریشی تھا قریظی نہ تھا جیسا کہ بخاری و مسلم میں صاف تصریح ہے۔

۲؎ یہ دونوں عبارتیں ابن ہشام میں (غزوہ بنی قریظہ) اور طبری میں کچھ تغیر کے ساتھ مذکور ہیں۔

اس نے یہ معاہدہ کیا تھا کہ آنحضرت ﷺ کی مخالفت پر کسی کو مدد نہ دے گا۔[1] اس معاہدہ پر اس نے عملاً کو مناسکن کیا تھا لیکن احزاب میں اس نے اس معاہدہ کی جس طرح تکمیل کی اس کا حال ابھی گزر چکا۔

بنو قریظہ کے متعلق مخالفین اسلام نے بڑے زور کے ساتھ ظلم و بے دردی کا اعتراض کیا ہے لیکن واقعات حسب ذیل ہیں:

۱: آنحضرت ﷺ نے مدینہ میں آ کر ان کے ساتھ دوستانہ معاہدہ کیا جس میں ان کے مذہب کو پوری آزادی دی گئی اور جان و مال کی حفاظت کا اقرار کیا گیا۔

۲: بنو قریظہ رتبہ میں بنو نضیر سے کم تھے یعنی بنو نضیر کا کوئی آدمی قریظہ کے کسی آدمی کو قتل کر دیتا تو اس کو صرف آدھا خون بہا دینا پڑتا بخلاف اس کے بنو قریظہ پورا خون بہا ادا کرتے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے بنو قریظہ پر یہ احسان کیا کہ ان کا درجہ بنو نضیر کے برابر کر دیا۔[2]

۳: آنحضرت ﷺ نے بنو نضیر کی جلاوطنی کے وقت بنو قریظہ سے دوبارہ تجدید معاہدہ کی۔

۴: باوجود ان باتوں کے عہد شکنی کی اور جنگ احزاب میں شریک ہوئے۔

۵: ازواج مطہرات ؓ قلعہ میں حفاظت کے لئے بھیج دی گئی تھیں ان پر حملہ کرنا چاہا۔

۶: حیی بن اخطب جو بغاوت کے جرم میں جلاوطن کر دیا گیا تھا جس نے تمام عرب کو برانگیختہ کر کے جنگ احزاب قائم کر دی تھی جس کو اپنے ساتھ لائے جو آتش جنگ کے اشتعال کا دیباچہ تھا۔

ان حالات کے ساتھ بنو قریظہ کے ساتھ اور کیا سلوک کیا جا سکتا تھا۔

یہ بھی لحاظ رکھنا چاہئے کہ عرب میں حالفہ کا معاہدہ اخوت حقیقی کے برابر تھا۔ بنو قریظہ انصار کے حلیف تھے اور اسی بنا پر تمام انصار (اوس) نے ان کی نہایت الحاح کے ساتھ سفارش کی۔ حضرت سعد بن معاذ ؓ اوس کے سردار تھے اور وہ اس معاہدہ کے ذمہ دار تھے اور وقت تحکیم میں تھے۔ ان کے حلیفوں کی موت وحیات کا مسئلہ تھا جن کی حمایت پر کل انصار (اوس) مصر تھے۔ لیکن حضرت سعد بن معاذ ؓ اس فیصلہ کے سوا اور کیا کر سکتے تھے؟

مقتولین کی تعداد و گو ارباب سیر نے ۴۰۰ سے زائد بیان کی ہے لیکن صحاح میں ۴۰۰ ہے۔ ان میں صرف ایک عورت تھی اور وہ اس قصاص میں ماری گئی تھی کہ اس نے قلعہ پر سے ایک چکی گرا کر ایک مسلمان[3] (خلاد) کو قتل کر دیا تھا۔ اس عورت نے جس جرأت اور دلیری سے جان دی سنن ابی داؤد میں حسب ذیل[4] حیرت انگیز طریقے سے مذکور ہے۔ اس کو معلوم ہو چکا تھا کہ مقتولین کی فہرست میں اس کا نام بھی ہے قتل گاہ میں مجرم آتے اور معدوم کر دئے جاتے تھے۔ ایک ایک کا نام پکارا جا رہا تھا اور یہ عورت بے پروائی سے ادھر ادھر باتیں کر رہی تھی۔ اس کے کانوں میں آئی تھی لیکن وہ بے تکلف حضرت

---

[1] بلاذری مطبوعہ یورپ صفحہ ۳۴ اور یہ روایت مصنف ابن ابی شیبہ کتاب المغازی باب غزوۃ بنی قریظہ میں بھی مذکور ہے۔ (۲/۲۴ ب)

[2] ابوداود وغیرہ کتاب الدیات باب النفس بالنفس۔

[3] ابن ہشام غزوہ بنی قریظہ۔

[4] ابوداؤد کتاب الجہاد باب قتل النساء۔

حافظ ابن مندہ کی عبارت سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ان کو آزاد کر دیا اور وہ اپنے خاندان میں جا کر بیبیوں کی طرح پردہ نشین ہو کر رہیں۔

ہمارے نزدیک محقق واقعہ یہی ہے اور اگر یہی مان لیا جائے کہ وہ حرم نبوی میں آ گئیں تب بھی قطعاً وہ منکوحات میں تھیں کنیز نہ تھیں۔ [1]

حضرت زینبؓ سے نکاح ۵ھ:

اس سال آنحضرت ﷺ نے حضرت زینبؓ سے نکاح کیا۔ نکاح ایک معمولی بات ہے اور اس کی تفصیل کا موقع "ازواج مطہرات" کا عنوان ہے لیکن اس واقعہ میں ایسے حالات جمع ہو گئے جنہوں نے مخالفین کے نزدیک اس کو ایک مہتم بالشان مسئلہ بنا دیا۔ عیسائی مؤرخوں نے اس واقعہ کو نہایت آب و رنگ سے لکھا ہے اور آنحضرت ﷺ کی تنقیص و نکتہ چینی (عیاذاً باللہ) کے لئے ان کے نزدیک اور کوئی واقعہ بکار آمد نہیں ہو سکتا۔

ہم اس واقعہ کو تفصیل سے لکھتے ہیں جس سے اس نکتہ کو اچھی طرح ذہن نشین کرانا مقصود ہے کہ آنحضرت ﷺ کے اخلاق و عادات پر نکتہ چینی کا موقع جو دشمنوں کو ہاتھ آتا ہے اس کا اصلی مخرج کیا ہے؟

آنحضرت ﷺ نے زیدؓ کو جو آپ کے آزاد کردہ غلام تھے متبنیٰ بنا لیا تھا جب وہ سن بلوغ کو پہنچے تو آپ نے ان کی شادی حضرت زینبؓ سے کرنی چاہی جو آنحضرت ﷺ کی حقیقی پھوپھی زاد بہن تھیں (ان کی ماں امیمہ عبدالمطلب کی بیٹی تھیں) وہ غلام رہ چکے تھے اس لئے حضرت زینبؓ کو یہ نسبت گوارا نہ تھی۔

﴿ وکان رسول الله ﷺ اراد ان یزوجها زید بن حارثة مولاه فکرهت ذلك ﴾ [2]

آنحضرت ﷺ نے ان کا نکاح اپنے غلام زید سے کر دینا چاہا تو انہوں نے ناپسند کیا۔

لیکن بالآخر آنحضرت ﷺ کی تعمیل ارشاد کے لحاظ سے راضی ہو گئیں۔ قریباً ایک سال تک حضرت زیدؓ کے نکاح میں رہیں لیکن دونوں میں ہمیشہ شکر رنجی (معمولی رنجش) رہتی تھی یہاں تک کہ زید نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آ کر شکایت کی اور ان کو طلاق دینا چاہا۔

---

[1] حضرت ریحانہؓ کے متعلق کتب سیر میں تین قسم کی روایتیں ہیں۔ ایک یہ کہ آپ ﷺ نے ان کو آزاد کر دیا اور وہ اپنے خاندان والوں کے پاس جا کر پردہ نشین ہو کر رہیں۔ یہ روایت ابن مندہ کی ہے مگر اس کی تائید میں کوئی دوسری روایت نہیں۔ دوسری قسم کی روایت یہ ہے کہ آپ ﷺ نے ان کو آزاد کر کے مثل دیگر امہات المومنینؓ کے رکھنا چاہا مگر انہوں نے اس کی غیر معمولی ذمہ داری محسوس کر کے باندی بن کر حضور انور کی خدمت میں رہنا قبول کیا۔ یہ روایت ابن اسحاق کی ہے۔ تیسری قسم کی روایت یہ ہے کہ حضور انور ﷺ نے ان کو مختار بنا دیا تو انہوں نے اسلام قبول کر لیا تو آپ ﷺ نے ان کو آزاد کر کے نکاح کر لیا۔ یہ روایت واقدی کی ہے۔ ابن سعد نے واقدی سے مختلف سلسلوں سے اسی روایت کو ذکر کیا ہے اور واقدی نے اسی کو اثبت کہا ہے۔ دیکھئے کتاب البدایہ ابن کثیر جلد ۵ صفحہ ۳۰۴ اور امام مزی نے بھی زوجیت ہی کی تائید کی ہے بحوالہ سابق تفصیل کے لئے دیکھئے اصابہ (ذکر ریحانہ)۔ "س"

[2] فتح الباری تفسیر سورۂ احزاب بحوالہ ابن ابی حاتم۔

[3] فتح الباری تفسیر سورۂ احزاب بحوالہ روایت عبدالرزاق [illegible]

مورخوں کا مایۂ استناد ہے۔ لیکن ان قرینوں کو یہ معلوم نہیں کہ اصول فن کے لحاظ سے یہ روایت کس پایہ کی ہے۔ مورخ طبری نے یہ روایت واقدی کے ذریعہ سے نقل کی ہے جو مسلّم کذاب اور دروغ گو ہے اور جس کا مقصد اس قسم کی بیہودہ روایتوں سے یہ تھا کہ عباسیوں کی عیش پرستی کے لئے سند ہاتھ آئے۔

طبری کے علاوہ اور لوگوں نے بھی اس قسم کی بیہودہ روایتیں نقل کی ہیں لیکن محدثین نے ان کو اس قابل بھی نہ سمجھا کہ ان سے تعرض کیا جائے۔ حافظ ابن حجر نخبۃ روایت پرست ہیں تاہم فتح الباری (سورۂ احزاب کی تفسیر) میں جہاں اس واقعہ سے بحث کی ہے لکھتے ہیں:

﴿ووردت آثار أخرى أخرجها ابن أبي حاتم والطبري ونقلها كثيرا من المفسرين لا ينبغي التشاغل بها۔﴾

اور بہت سی روایتیں آئی ہیں جن کو ابن ابی حاتم اور طبری نے روایت کیا ہے اور اکثر مفسرین نے ان کو نقل کر دیا ہے ان روایتوں میں مشغول نہ ہونا چاہئے۔

حافظ ابن کثیر جو مشہور محدثین میں ہیں اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

﴿ذكر ابن أبي حاتم وابن جرير ههنا آثارا عن بعض السلف رضي الله عنهم أحببنا أن نضرب عنها صفحا لعدم صحتها فلا نوردها وقد روى الإمام أحمد ههنا أيضا رواية حماد بن زيد عن ثابت عن أنس رضي الله عنه فيها غرابة تركنا سياقها أيضا۔﴾

ابن ابی حاتم اور ابن جریر نے اس موقع پر بعض سلاف سے چند روایتیں نقل کی ہیں جن کو ہم اس لئے نظر انداز کر دینا چاہتے ہیں کہ وہ غلط ہیں اور امام احمد نے بھی اس واقعہ کے متعلق انس سے ایک روایت نقل کی ہے جو غریب ہے ہم نے اس کا ذکر بھی چھوڑ دیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت منافقوں کا بہت زور تھا۔ حضرت عائشہؓ پر لوگوں نے جو تہمت لگائی وہ بھی اسی سن کا واقعہ ہے۔ منافقین ان خبروں کو اس طرح پھیلاتے تھے کہ بچے بچے کی زبان پر چڑھ جاتی تھیں۔ یہاں تک کہ حضرت عائشہؓ کی تہمت میں خود چند مسلمان بھی آلودہ ہو گئے جن کو شریعت کے موافق قذف کی سزا دی گئی۔ یہی روایتیں ہیں جو بعض غیر محتاط کتابوں میں باقی رہ گئیں۔ لیکن وہ محدثین جن کا معیار تحقیق بلند ہے اور عدالت روایت کے حاکم ہیں مثلاً امام بخاری، امام مسلم وغیرہ ان کے ہاں ان روایتوں کا ذکر تک نہیں آتا۔

واقعات متفرقہ ۵ھ:

اس سال کی تاریخ قدامی میں سب سے اہم واقعات عورتوں کے متعلق متعدد احکام اصلاحی کا نزول ہے۔ اب تک مسلمان عورتیں عام جاہلانہ طریقے سے بے تکلف باہر آتی تھیں اور اسی قسم کے لباس و زیور پہنتی تھیں۔ اب حکم ہوا کہ شریف عورتیں گھر سے نکلیں تو ایک بڑی چادر اوڑھ کر گھونگٹ نکال لیا کریں جس سے منہ بھی چھپ جائے۔ آنچل سینہ پر ڈال کر چلیں پاؤں جھنک جھنک کر نہ چلیں جو پرانی عادت سے چلی آتی تھی اور بناؤ کی بولی ٹھولی میں "زانیات معطرات" کے لئے غیر مردوں کے سامنے آنا قطعاً ممنوع ہوا۔

متبنیٰ بیٹے کی بیوی سے جاہلیت میں نکاح ناجائز تھا اس رسم کی اصلاح بھی اسی سال ہوئی زنا کی سزا سو کوڑے بھی اسی سال نازل ہوئی عفیفہ عورتوں پر افترا اتہام جاہلیت کا ایک معمولی فعل تھا اور ان کمزوروں کے پاس اس حملے کے روکنے کے لئے کوئی قانونی سپر نہ تھی اسی سال "حد قذف" نازل ہوئی جس کی رو سے بغیر شہادت کے تہمت لگانا جرم قرار دیا گیا بصورت عدم وجود شہادت لعان کا طریقہ بتایا گیا یعنی زن و شوہر دونوں اپنی سچائی اور فریق ثانی کی دروغ گوئی کا حلفیہ اظہار کریں اور اس کے بعد ان میں تفریق کرا دی جائے۔[1]

عرب میں ایک قسم کی طلاق جاری تھی جس کو ظہار کہتے ہیں اسی سال اس قسم کی طلاق غیر مؤثر قرار دی گئی اور اس کے لئے کفارہ مقرر کیا گیا۔

پانی نہ ملنے کی حالت میں تیمم کی مشروعیت بھی اسی سال کا حکم ہے بروایت صحیح نماز خوف کا حکم قرآن مجید میں اسی سال نازل ہوا جس کی تفصیل مناسب موقع پر آئے گی۔

[1] [illegible]

وهل اردن یوما میاه مجنة　　اور کیا وہ دن بھی ہوگا کہ میں مجنہ کے چشمہ پر اتروں

وهل یبدون لی شامة و طفیل　　اور شامہ و طفیل مجھ کو دکھائی دیں

اکثر مہاجرین جان بچا کر نکل آئے تھے لیکن خاندان اور اہل و عیال بچے وہیں رہ گئے تھے۔

اسلام کے فرائض پنجگانہ میں حج کعبہ ایک رکن اعظم ہے لیکن مختلف اسباب سے آنحضرت ﷺ نے مکہ معظمہ کا ارادہ کیا اور اس غرض سے کہ قریش کو کوئی احتمال نہ ہو عمرہ[1] کا احرام باندھا اور قربانی کے اونٹ ساتھ لئے یہ بھی حکم دیا کہ کوئی شخص ہتھیار باندھ کر نہ آئے۔ صرف تلوار جو عرب میں سفر کا ضروری آلہ بھی جاتی تھی، پاس رکھ لی جائے اس میں بھی یہ شرط ہے کہ نیام میں بند ہو۔

چونکہ مہاجرین مدت سے اور اکثر انصار اس سعادت کے منتظر تھے ۱۴۰۰ شخص اس سفر میں ہمرکاب ہوئے مقام ذوالحلیفہ پہنچ کر قربانی کی ابتدائی رسمیں ادا ہوئیں یعنی قربانی کے اونٹ ساتھ تھے ان کی گردنوں میں قربانی کی علامت کے طور پر لوہے کے نعل لٹکا دیئے گئے۔

احتیاط کے لئے قبیلہ خزاعہ کا ایک شخص جس کے اسلام لانے کا حال قریش کو معلوم نہ تھا پہلے بھیج دیا گیا کہ قریش کے ارادہ کی خبر لائے۔ جب قافلہ عسفان کے قریب پہنچا اس نے آ کر خبر دی کہ قریش نے تمام قبائل (احابیش) کو جمع کر کے کہہ دیا ہے کہ محمد ﷺ مکہ میں کبھی نہیں آ سکتے۔

غرض قریش نے بڑے زور و شور سے مقابلہ کی تیاری کی۔ قبائل متحدہ کے پاس پیام بھیجا اور جمعیت عظیم لے کر آئے۔ مکہ سے باہر نکل کر ایک مقام پر فوجیں فراہم ہوئیں، خالد بن ولید جو اب تک اسلام نہیں لائے تھے دو سو سوار لے کر جن میں ابوجہل کا بیٹا عکرمہ بھی تھا مقدمۃ الجیش کے طور پر آگے بڑھے اور غمیم تک پہنچ گئے جو رابغ اور حجفہ کے درمیان ہے۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ قریش نے خالد کو طلیعہ بنا کر بھیجا ہے اور وہ مقام غمیم تک آ گئے ہیں اس لئے کترا کر داہنی طرف سے چلو۔ فوج اسلام جب غمیم کے قریب پہنچ گئی تو خالد کو گھوڑوں کی گرد اڑتی نظر آئی وہ گھوڑا اڑاتے ہوئے گئے اور قریش کو خبر کی کہ لشکر اسلام غمیم تک آ گیا۔ آنحضرت ﷺ آگے بڑھے اور حدیبیہ میں پہنچ کر مقام کیا۔ یہاں پانی کی قلت تھی، ایک کنواں تھا وہ پہلے ہی آمد میں خالی ہو گیا لیکن اعجاز نبوی سے اس میں اس قدر پانی آ گیا کہ سب سیراب ہو گئے۔

قبیلہ خزاعہ نے اب تک اسلام نہیں قبول کیا تھا لیکن اسلام کے حلیف اور راز دار تھے قریش اور عام کفار اسلام کے خلاف جو منصوبے باندھتے وہ ہمیشہ آنحضرت ﷺ کو اس سے مطلع کر دیا کرتے تھے اس قبیلہ کے رئیس اعظم بدیل بن ورقا تھے (فتح مکہ میں اسلام لائے) ان کو آنحضرت ﷺ کا تشریف لانا معلوم ہوا تو چند آدمی ساتھ لے کر بارگاہ نبوی میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ قریش کی فوجوں کا سیلاب آ رہا ہے وہ آپ کو کعبہ میں نہ جانے دیں گے آنحضرت ﷺ نے

---

1. [illegible]
2. [illegible]

واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔[1]

﴿وَهُوَ الَّذِي كَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ عَنْهُم بِبَطْنِ مَكَّةَ مِن بَعْدِ أَنْ أَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ﴾ (فتح ۔ ۲۴)

اور وہی اللہ ہے جس نے مکہ میں ان لوگوں کا ہاتھ تم سے اور تمہارا ہاتھ ان سے روک دیا بعد اس کے کہ تم کو ان پر قابو دے دیا تھا

بیعت رضوان:

بالآخر آپ ﷺ نے گفتگو کے لئے حضرت عمرؓ کا انتخاب کیا لیکن انہوں نے معذرت کی کہ قریش میرے سخت دشمن ہیں اور مکہ میں میرے قبیلہ کا ایک شخص بھی نہیں کہ مجھ کو بچا سکے۔ آپ ﷺ نے حضرت عثمانؓ کو بھیجا وہ اپنے ایک عزیز (ابان بن سعید) کی حمایت میں مکہ گئے اور آنحضرت ﷺ کا پیغام سنایا۔ قریش نے ان کو نظر بند کر لیا لیکن عام طور پر یہ خبر مشہور ہو گئی کہ وہ قتل کر ڈالے گئے۔ یہ خبر آنحضرت ﷺ کو پہنچی تو آپ نے فرمایا کہ عثمانؓ کے خون کا قصاص لینا فرض ہے۔ یہ کہہ کر آپ نے ایک ببول کے درخت کے نیچے بیٹھ کر صحابہؓ سے جاں نثاری کی بیعت لی تمام صحابہؓ نے جن میں زن و مرد دونوں شامل تھے ولولہ انگیز جوش کے ساتھ دست مبارک پر جاں نثاری کا عہد کیا۔ یہ تاریخ اسلام کا ایک مہتم بالشان واقعہ ہے اس بیعت کا نام بیعت الرضوان ہے سورۂ فتح میں اس واقعہ اور درخت کا ذکر ہے

﴿لَّقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَنزَلَ السَّكِينَةَ عَلَيْهِمْ وَأَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيبًا﴾

اللہ مسلمانوں سے راضی ہوا جب وہ تیرے ہاتھ پر درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے سو اللہ نے جان لیا جو کچھ ان لوگوں کے دلوں میں تھا تو اللہ نے ان پر تسلی نازل کی اور عاجلانہ فتح دی۔

لیکن بعد کو معلوم ہوا کہ وہ خبر صحیح نہ تھی۔

قریش نے سہیل بن عمرو کو سفیر بنا کر بھیجا وہ نہایت فصیح و بلیغ مقرر تھے چنانچہ لوگوں نے ان کو "خطیب[2] قریش" کا خطاب دیا تھا۔ قریش نے ان سے کہہ دیا تھا کہ صلح صرف اس شرط پر ہو سکتی ہے کہ محمد ﷺ اس سال واپس چلے جائیں۔

سہیل آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دیر تک صلح کے شرائط پر گفتگو رہی بالآخر چند شرطوں پر اتفاق ہوا اور آنحضرت ﷺ نے حضرت علیؓ کو بلا کر حکم دیا کہ معاہدہ کے الفاظ قلمبند کریں حضرت علیؓ نے عنوان پر بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھا۔

عرب کا قدیم طریقہ تھا کہ خطوط کی ابتداء میں "باسمک اللھم" لکھتے تھے "بسم اللہ الرحمن الرحیم" سے وہ آشنا نہ تھے اس بنا پر سہیل بن عمرو نے کہا کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم کے بجائے وہی قدیم الفاظ لکھے جائیں آنحضرت ﷺ نے منظور فرمایا۔ آگے کا فقرہ تھا ھذا ما قاضی علیہ محمد رسول اللہ "یہ وہ معاہدہ ہے جو محمد رسول اللہ نے

---

1. ان آیتوں کی شان نزول میں سخت اختلاف ہے لیکن یہ صحیح مسلم کی روایت ہے۔
2. زرقانی ج ۲ ص ۲۲۳

تسلیم کیا"۔ سہیل نے کہا "اگر ہم آپ کو پیغمبر ہی تسلیم کرتے تو پھر جھگڑا کیا تھا، آپ صرف اپنا اور اپنے باپ کا نام لکھوائیں"۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "کہ گو تم تکذیب کرتے ہو لیکن اللہ کی قسم میں اللہ کا پیغمبر ہوں۔" یہ کہہ کر آپ نے حضرت علیؓ کو حکم دیا کہ اچھا خالی میرا نام لکھو حضرت علیؓ سے زیادہ کون فرمان گذار ہو سکتا تھا لیکن عالم محبت میں ایسے مقام بھی پیش آتے ہیں جہاں فرمانبرداری سے انکار کرنا پڑتا ہے' حضرت علی ؓ نے کہا میں ہرگز آپ کا نام نہ مٹاؤں گا۔ آپ نے فرمایا اچھا مجھ کو دکھاؤ' میرا نام کہاں ہے حضرت علیؓ نے اس جگہ پر انگلی رکھ دی' آپ نے رسول اللہ کا لفظ مٹا دیا۔[1]

آنحضرت ﷺ کو لکھنا نہیں آتا تھا اسی بنا پر آپ کو "امی" کہتے ہیں۔ یہ واقعہ مسلم میں جہاں منقول ہے لکھا ہے کہ آپ نے رسول اللہ کا لفظ مٹا کر ابن عبداللہ لکھ دیا' بخاری میں چونکہ یہ واقعہ عام روایت کے خلاف ہے اس لئے ایک معرکۃ الآراء مباحثہ بن گیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ لکھنے پڑھنے کا کام روزمرہ جب نظر سے گزرتا رہتا ہے تو ناخواندہ شخص بھی اپنے نام کے حرف سے آشنا ہو جاتا ہے اس سے امیت میں فرق نہیں آتا ہے شبہ امی ہونا آپ کا فخر ہے اور خود قرآن مجید میں یہ وصف شرف و عزت کے موقع پر استعمال ہوا ہے۔

﴿ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ ﴾ (اعراف۔۱۹)

شرائط صلح یہ تھیں:

۱۔ مسلمان اس سال واپس چلے جائیں۔

۲۔ اگلے سال آئیں اور صرف تین دن قیام کر کے چلے جائیں۔

۳۔ ہتھیار لگا کر نہ آئیں' صرف تلوار ساتھ لائیں' وہ بھی نیام میں اور نیام بھی جلبان (تھیلا وغیرہ) میں۔

۴۔ مکہ میں جو مسلمان پہلے سے مقیم ہیں ان میں سے کسی کو اپنے ساتھ نہ لے جائیں اور مسلمانوں میں سے کوئی مکہ میں رہ جانا چاہے تو اس کو نہ روکیں۔

۵۔ کافروں یا مسلمانوں میں سے کوئی شخص اگر مدینہ جائے تو واپس کر دیا جائے' لیکن اگر کوئی مسلمان مکہ میں جائے[2] تو وہ واپس نہیں کیا جائے گا۔

۶۔ قبائل عرب کو اختیار ہو گا کہ فریقین میں سے جس کے ساتھ چاہیں معاہدہ میں شریک ہو جائیں۔

یہ شرطیں بظاہر مسلمانوں کے سخت خلاف تھیں' اتفاق یہ کہ عین اس وقت جبکہ معاہدہ لکھا جا رہا تھا' سہیل کے صاحبزادے (ابو جندل) جو اسلام لا چکے تھے اور مکہ میں کافروں نے ان کو قید کر رکھا تھا اور طرح طرح کی اذیتیں دیتے تھے کسی طرح بھاگ کر پاؤں میں بیڑیاں پہنے ہوئے آئے اور سب کے سامنے گر پڑے' سہیل نے کہا "محمد! صلح کی تعمیل کا یہ پہلا موقع ہے اس (ابو جندل) کو شرائط صلح کے مطابق مجھ کو واپس دیدو"۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "ابھی معاہدہ

---

[1] صحیح بخاری کی اس روایت میں حضرت علیؓ کا نام اور ان کی گفتگو مذکور نہیں یہ تصریح بخاری کی اس روایت میں ہے جو کتاب المغازی باب عمرۃ القضاء میں مذکور ہے' صحیح مسلم میں بھی یہ واقعہ منقول ہے۔

[2] یہ تمام شرائط کتب سیر کے علاوہ صحیح مسلم (باب صلح حدیبیہ) میں بھی ہیں۔

قلمبند نہیں ہو چکی۔" سہیل نے کہا "تو ہم کو صلح بھی منظور نہیں" آنحضرت ﷺ نے فرمایا اچھا ان کو مجھ کو رہنے دو۔ سہیل نے نامنظور کیا آپ ﷺ نے چند دفعہ اصرار کیا۔ لیکن سہیل کسی طرح راضی نہ ہوا۔ مجبوراً آنحضرت ﷺ کو تسلیم کرنا پڑا۔ ابوجندلؓ کو کافروں نے اس طرح مارا تھا کہ ان کے جسم پر نشان تھے مجمع کے سامنے تمام زخم دکھائے اور کہا برادران اسلام! کیا پھر مجھ کو اسی حالت میں دیکھنا چاہتے ہو؟ میں اسلام لا چکا ہوں کیا پھر مجھ کو کافروں کے ہاتھ میں دیتے ہو؟ تمام مسلمان تڑپ اٹھے حضرت عمرؓ ضبط نہ کر سکے۔ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آئے اور کہا یا رسول اللہ کیا آپ پیغمبر برحق نہیں ہیں؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا "ہاں ہوں"۔ حضرت عمرؓ نے کہا کیا ہم حق پر نہیں؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہاں ہم حق پر ہیں۔ حضرت عمرؓ نے کہا تو ہم دین میں یہ ذلت کیوں گوارا کریں؟ آپ ﷺ نے فرمایا "میں خدا کا پیغمبر ہوں اور اس کے حکم کی نافرمانی نہیں کر سکتا اللہ میری مدد کرے گا" حضرت عمرؓ نے کہا کیا آپ نے ہم سے نہیں فرمایا تھا کہ ہم لوگ کعبہ کا طواف کریں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا "لیکن یہ تو نہیں کہا تھا کہ اسی سال کریں گے"۔ حضرت عمرؓ خفا ہو کر حضرت ابوبکرؓ کے پاس آئے اور وہی گفتگو کی حضرت ابوبکرؓ نے کہا وہ پیغمبر اللہ ہیں جو کچھ کرتے ہیں اللہ کے حکم سے کرتے ہیں۔ حضرت عمرؓ کو اپنی ان گستاخانہ معروضات کا جو بے اختیاری میں ان سے سرزد ہو گئیں تمام عمر سخت رنج رہا اور اس کے کفارہ کے لئے انہوں نے نمازیں پڑھیں روزے رکھے خیرات کی غلام آزاد کئے بخاری میں اگرچہ ان اعمال کا ذکر اجمالاً ہے لیکن ابن اسحاق نے تفصیل سے یہ تمام باتیں گنائی ہیں۔

اس حالت کو گوارا کرنا گو سب کی اطاعت شعاری کا سخت خطرناک امتحان تھا۔ ایک طرف (بظاہر) اسلام کی توہین ہے ابوجندل بیڑیاں پہنے سو جان نثاران اسلام کے سامنے فریاد کرتے ہیں، سب کے دل جوش سے لبریز ہیں اور اگر رسول اللہ ﷺ کا اشارہ پا جائے تو تلوار فیصلہ کن کے لئے موجود ہے دوسری طرف معاہدہ پر دستخط ہو چکے ہیں اور ایفائے عہد کی ذمہ داری ہے رسول اللہ ﷺ نے ابوجندلؓ کی طرف دیکھا اور فرمایا:

﴿یا ابا جندل اصبر واحتسب فان اللہ جاعل لک ولمن معک من المستضعفین فرجا ومخرجا انا قد عقدنا صلحا وانا لا نغدر بہم﴾

ابوجندلؓ! صبر اور ضبط سے کام لو خدا تمہارے لئے اور مظلوموں کے لئے کوئی راہ نکالے گا صلح اب ہو چکی اور ہم ان لوگوں سے بدعہدی نہیں کر سکتے۔

غرض ابوجندلؓ کو اسی طرح پابزنجیر واپس جانا پڑا۔

آنحضرت ﷺ نے حکم دیا کہ لوگ یہیں قربانی کریں لیکن لوگ اس قدر دل شکستہ تھے کہ ایک شخص بھی نہ اٹھا یہاں تک کہ جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے[1] تین دفعہ بار بار کہنے پر بھی ایک شخص آمادہ نہ ہوا۔ آنحضرت ﷺ گھر میں تشریف لے گئے اور ام المومنین حضرت ام سلمہؓ سے شکایت کی انہوں نے کہا آپ کسی سے کچھ نہ فرمائیں بلکہ باہر نکل کر خود قربانی کریں اور احرام اتارنے کے لئے بال منڈوائیں۔ آپ نے باہر آ کر خود قربانی کی اور بال منڈوائے۔ اب جب لوگوں کو یقین ہو گیا کہ اس فیصلہ میں تبدیلی نہیں ہو سکتی تو سب نے قربانیاں کیں اور احرام اتارا۔

[1] صحیح بخاری کتاب الشروط

صلح کے بعد تین دن تک آپ ﷺ نے حدیبیہ میں قیام فرمایا، پھر روانہ ہوئے تو راہ میں یہ سورہ اتری

﴿إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا﴾ (فتح۔۱)

ہم نے تم کو کھلی ہوئی فتح عنایت کی۔

تمام مسلمان جس چیز کو شکست سمجھے تھے، خدا نے اس کو فتح کہا، آنحضرت ﷺ نے حضرت عمرؓ کو بلا کر فرمایا کہ یہ آیت نازل ہوئی ہے، انہوں نے تعجب سے پوچھا کہ کیا یہ فتح ہے؟ ارشاد ہوا کہ "ہاں" صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت عمرؓ کو تسکین ہو گئی اور مطمئن ہو گئے۔[۱] نتائج مابعد نے اس راز سربستہ کی عقدہ کشائی کی، اب تک مسلمان اور کفار ملتے جلتے نہ تھے۔ اب صلح کی وجہ سے آمد و رفت شروع ہوئی، خاندانی اور تجارتی تعلقات کی وجہ سے کفار مدینہ میں آتے، مہینوں قیام کرتے اور مسلمانوں سے ملتے جلتے تھے، باتوں باتوں میں اسلامی مسائل کا تذکرہ آ جاتا تھا، اس کے ساتھ ہر مسلمان اخلاص، حسن عمل، نیکوکاری، اخلاق پاکیزگی کی ایک زندہ تصویر تھا، جو مسلمان مکہ جاتے تھے ان کی صورتیں بھی یہی مناظر پیش کرتی تھیں، اس سے خود بخود کفار کے دل اسلام کی طرف کھنچے آتے تھے۔ مورخین کا بیان ہے کہ اس معاہدہ صلح سے لے کر فتح مکہ تک اس قدر کثرت سے لوگ اسلام لائے کہ کبھی نہیں لائے تھے۔ حضرت خالدؓ (فاتح شام) اور عمرو بن العاصؓ (فاتح مصر) کا اسلام بھی اسی زمانہ کی یادگار ہے۔ معاہدہ صلح میں یہ جو شرط تھی کہ جو مسلمان مکہ سے چلا آئے گا وہ پھر مکہ کو واپس کر دیا جائے گا اس میں صرف مرد داخل تھے، عورتیں نہ تھیں، عورتوں کے متعلق خاص یہ آیت اتری:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا جَاءَكُمُ الْمُؤْمِنَاتُ مُهَاجِرَاتٍ فَامْتَحِنُوهُنَّ اللَّهُ أَعْلَمُ بِإِيمَانِهِنَّ فَإِنْ عَلِمْتُمُوهُنَّ مُؤْمِنَاتٍ فَلَا تَرْجِعُوهُنَّ إِلَى الْكُفَّارِ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّونَ لَهُنَّ وَآتُوهُم مَّا أَنفَقُوا وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ أَن تَنكِحُوهُنَّ إِذَا آتَيْتُمُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ وَلَا تُمْسِكُوا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ﴾ (ممتحنہ۔۲)

مسلمانو! جب تمہارے پاس عورتیں ہجرت کر کے آئیں تو ان کو جانچ لو، اللہ ان کے ایمان کو خوب جانتا ہے، اب اگر تم کو معلوم ہو کہ وہ مسلمان ہیں تو ان کو کافروں کے پاس واپس نہ بھیجو، نہ وہ عورتیں کافروں کے قابل ہیں اور نہ کافر عورتوں کے قابل ہیں اور ان عورتوں پر ان لوگوں نے جو خرچ کیا ہو وہ تم ان کو دے دو اور تم ان سے شادی کر سکتے ہو بشرطیکہ ان کے مہر ادا کرو اور کافر عورتوں کو اپنے نکاح میں نہ رکھو"

جو مسلمان مکہ میں مجبوری سے رہ گئے تھے چونکہ کفار ان کو سخت تکلیفیں دیتے تھے اس لئے وہ بھاگ بھاگ کر مدینہ آتے تھے۔ سب سے پہلے عتبہؓ بن اسید (ابو بصیر) بھاگ کر مدینہ آئے، قریش نے آنحضرت ﷺ کے پاس دو شخص بھیجے کہ ہمارا آدمی واپس کر دیجئے، آنحضرت ﷺ نے حضرت عتبہؓ سے فرمایا کہ واپس جاؤ، حضرت عتبہؓ نے عرض کی کہ کیا آپ مجھ کو کافروں کے پاس بھیجتے ہیں کہ مجھ کو کفر پر مجبور کریں؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا "اللہ اس کی کوئی تدبیر

---

۱ کتاب المغازی، بخاری

۲ صلح حدیبیہ کے واقعات گو بخاری میں نہایت تفصیل سے مذکور ہیں لیکن اصل مرجع یعنی خود معاہدہ کے الفاظ میں کچھ کمی ہے، کتاب الشروط کا یہ باب بہت طویل ہے، باقی واقعات میں بعض مختصر واقعات ہیں، ہم نے ان کا ذکر کیا ہے، باقی جزئیات صحیح مسلم اور ابن ہشام سے ماخوذ ہیں۔

سلاطین کو اسلام کی دعوت

(آخر) ۶ھ یا (شروع) ۷ھ

﴿ اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ ﴾

حدیبیہ کی صلح سے کسی قدر اطمینان نصیب ہوا تو وقت آیا کہ اسلام کا پیغام تمام دنیا کے کانوں میں پہنچا دیا جائے۔ اس بنا پر آنحضرت ﷺ نے ایک دن تمام صحابہؓ کو جمع کیا اور خطبہ دیا "ایہا الناس! اللہ نے مجھ کو تمام دنیا کے لئے رحمت اور پیغمبر بنا کر بھیجا ہے، دیکھو حواریین عیسیٰ کی طرح اختلاف نہ کرنا، جاؤ میری طرف سے پیغام حق ادا کرو" اس کے بعد آپ نے قیصر روم، شہنشاہ عجم، عزیز مصر اور رؤسائے عرب کے نام دعوت اسلام کے خطوط ارسال فرمائے، جو لوگ خطوط لے کر گئے اور جن کے نام لے کر گئے ان کی تفصیل یہ ہے۔[1]

حضرت دحیہ کلبیؓ	قیصر روم
حضرت عبداللہ بن حذافہ سہمیؓ	خسرو پرویز کج کلاہ ایران
حضرت حاطب بن ابی بلتعہؓ	عزیز مصر
حضرت عمرو بن امیہؓ	نجاشی بادشاہ حبش
حضرت سلیطؓ بن عمرو بن عبد شمس	رؤسائے یمامہ
حضرت شجاعؓ بن وہب الاسدی	رئیس حدود شام، حارث غسانی

ایرانیوں نے چند برس پہلے بلاد شام پر حملہ کر کے رومیوں کو شکست دی تھی جس کا ذکر قرآن مجید کی اس آیت غلبت الروم میں ہے، ہرقل نے اس کے انتقام کے لئے بڑے سروسامان سے فوجیں تیار کیں اور ایرانیوں پر حملہ کر کے ان کو سخت شکست دی تھی۔ اس کا شکرانہ ادا کرنے کے لئے وہ حمص سے بیت المقدس آیا تھا اور اس شان سے آیا تھا کہ جہاں چلتا تھا زمین پر فرش اور فرش پر پھول بچھائے جاتے تھے۔[2]

شام میں عرب کا جو خاندان قیصر کے زیر حکومت رہا کرتا تھا وہ غسانی خاندان تھا اور اس کا پایۂ تخت بصریٰ تھا جو دمشق کے علاقہ میں ہے اور آج کل حوران کہلاتا ہے۔ اس زمانہ میں اس خاندان کا تخت نشین حارث غسانی تھا۔ دحیہ کلبیؓ نے آنحضرت ﷺ کا نامہ مبارک بعینہٖ بصریٰ میں حارث غسانی کو لا کر دیا، اس نے قیصر کے پاس بیت المقدس میں بھیج دیا۔ قیصر کو خط ملا تو اس نے حکم دیا کہ عرب کا کوئی شخص مل سکے تو لاؤ، اتفاق یہ کہ ابوسفیان تجار عرب کے ساتھ غزہ میں مقیم تھے۔ قیصر کے آدمی ان کو غزہ سے جا کر لائے۔

---

[1] طبری جلد ۳ صفحہ ۱۵۶۰ میں "ذکر ارسال رسول اللہ ﷺ الی الملوک" میں

[2] ہرقل کا یہ واقعہ فتح الباری (جلد اول صفحہ ۳۰) میں "شرح صحیح بخاری" سے لیا گیا ہے۔ اصل صحیح بخاری (بخاری کیف کان بدء الوحی و کتاب الجہاد باب دعاء النبی ﷺ الی الاسلام والنبوۃ) میں مجمل واقعہ ہے، باقی تفصیلیں حافظ ابن حجر نے اور کتابوں سے بہم پہنچائی ہیں۔

قیصر نے بڑے سامان سے دربار منعقد کیا' خود تاج شاہی پہن کر تخت پر بیٹھا تخت کے چاروں طرف بطارقہ قسیس اور رہبان کی صفیں تھیں' قیصر نے اہل عرب کی طرف مخاطب ہو کر کہا' تم میں سے اس مدعی نبوت کا رشتہ دار کون ہے؟ ابوسفیان نے کہا "میں" پھر حسب ذیل گفتگو ہوئی۔

قیصر — مدعی نبوت کا خاندان کیسا ہے؟

ابوسفیان — شریف ہے۔

قیصر — اس خاندان میں کسی اور نے بھی نبوت کا دعویٰ کیا تھا؟

ابوسفیان — نہیں۔

قیصر — اس خاندان میں کوئی بادشاہ گزرا ہے؟

ابوسفیان — نہیں۔

قیصر — جن لوگوں نے یہ مذہب قبول کیا ہے وہ کمزور لوگ ہیں یا صاحب اثر؟

ابوسفیان — کمزور لوگ ہیں۔

قیصر — اس کے پیرو بڑھ رہے ہیں یا گھٹتے جاتے ہیں؟

ابوسفیان — بڑھتے جاتے ہیں۔

قیصر — کبھی تم لوگوں کو اس کی نسبت جھوٹ کا بھی تجربہ ہے؟

ابوسفیان — نہیں۔

قیصر — وہ کبھی عہد و اقرار کی خلاف ورزی بھی کرتا ہے؟

ابوسفیان — ابھی تک تو نہیں کی لیکن اب جو نیا معاہدہ ہوا ہے اس میں دیکھیں وہ عہد پر قائم رہتا ہے یا نہیں؟

قیصر — تم لوگوں نے اس سے کبھی جنگ بھی کی؟

ابوسفیان — ہاں۔

قیصر — نتیجہ جنگ کیا رہا؟

ابوسفیان — کبھی ہم غالب آئے اور کبھی وہ۔

قیصر — وہ کیا سکھاتا ہے؟

ابوسفیان — کہتا ہے کہ ایک اللہ کی عبادت کرو' کسی اور کو اللہ کا شریک نہ بناؤ' نماز پڑھو' پاکدامنی اختیار کرو' سچ بولو' صلہ رحمی کرو۔

اس گفتگو کے بعد قیصر نے مترجم کے ذریعہ سے کہا کہ "تم نے اس کو شریف النسب بتایا' پیغمبر ہمیشہ اچھے خاندانوں سے پیدا ہوتے ہیں' تم نے کہا کہ اس کے خاندان سے کسی اور نے نبوت کا دعویٰ نہیں کیا' اگر ایسا ہوتا تو میں سمجھتا کہ یہ خاندانی خیال کا اثر ہے' تم تسلیم کرتے ہو کہ اس خاندان میں کوئی بادشاہ نہ تھا' اگر ایسا ہوتا تو میں سمجھتا کہ اس کو بادشاہت کی ہوس ہے' تم مانتے ہو کہ اس نے کبھی جھوٹ نہیں بولا' جو شخص آدمیوں سے جھوٹ نہیں بولتا' وہ خدا پر کیونکر

جھوٹ باندھ سکتا ہے۔ تم کہتے ہو کہ کمزوروں نے پیروی کی ہے۔ پیغمبروں کے ابتدائی پیرو ہمیشہ غریب ہی لوگ ہوتے ہیں۔ تم نے تسلیم کیا کہ اس کا مذہب ترقی کرتا جاتا ہے۔ سچے مذہب کا یہی حال ہے کہ بڑھتا جاتا ہے۔ تم تسلیم کرتے ہو کہ اس نے کبھی فریب نہیں کیا۔ پیغمبر کبھی فریب نہیں کرتے۔ تم کہتے ہو کہ وہ نماز اور تقویٰ و عفاف کی ہدایت کرتا ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو میری قدم گاہ تک اس کا قبضہ ہو جائے گا۔ مجھ کو یہ ضرور خیال تھا کہ ایک پیغمبر آنے والا ہے لیکن یہ خیال نہ تھا کہ وہ عرب میں پیدا ہوگا۔ میں اگر وہاں جا سکتا تو خود اس کے پاؤں دھوتا۔"[1]

اس گفتگو کے بعد حکم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کا خط پڑھا جائے۔[1]

فرمان رسالت کے یہ الفاظ تھے:

﴿بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم من محمد عبداللّٰہ ورسولہ الی ھرقل عظیم الروم سلام علی من اتبع الھدیٰ اما بعد فانی ادعوک بدعایۃ الاسلام اسلم تسلم یؤتک اللّٰہ اجرک مرتین فان تولیت فعلیک اثم الاریسیین ویااھل الکتاب تعالوا الی کلمۃ سوآءٍ بیننا وبینکم الا نعبد الا اللّٰہ ولا نشرک بہ شیئا ولا یتخذ بعضنا بعضا اربابا من دون اللّٰہ فان تولوا فقولوا اشھدوا بانا مسلمون﴾

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم محمد کی طرف سے جو خدا کا بندہ اور رسول ہے، یہ خط ہرقل کے نام ہے جو روم کا رئیس اعظم ہے۔ اس کو سلامتی ہے جو ہدایت کا پیرو ہے۔ اس کے بعد میں تجھ کو اسلام کی دعوت کی طرف بلاتا ہوں۔ اسلام لا تو سلامتی میں رہے گا۔ اللہ تجھ کو دوگنا اجر دے گا اور اگر تو نے نہ مانا تو اہل ملک کا گناہ تیرے سر پر ہوگا۔ اے اہل کتاب! ایک ایسی بات کی طرف آؤ جو ہم میں اور تم میں یکساں ہے۔ وہ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کو نہ پوجیں اور ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ کو چھوڑ کر اللہ نہ بنائے اور اگر تم نہیں مانتے تو گواہ رہو کہ ہم مانتے ہیں۔

قیصر نے ابوسفیان سے جو گفتگو کی تھی اس سے بطارقہ اور اہل دربار برہم ہو چکے تھے۔ نامہ مبارک کے پڑھے جانے پر اور بھی برہم ہوئے۔ یہ حالت دیکھ کر قیصر نے اہل عرب کو دربار سے اٹھوا دیا اور گو اس کے دل میں نور اسلام آ چکا تھا لیکن تاج و تخت کی تاریکی میں وہ روشنی گم ہو کر رہ گئی۔[2]

---

[1] یہ پوری گفتگو صحیح بخاری کے متعدد ابواب میں منقول ہے۔ ابتدائے کتاب میں بھی اور باب الجہاد میں بھی۔

[2] مسند ابن حنبل صفحہ ۷۵ جلد ۳ میں ہے کہ جب آپ تبوک میں تھے تو قیصر نے اپنا ایک سفیر [illegible] خدمت نبوی میں بھیجا تھا اور سفیر نے چند سوالات کیے تھے جن کے آپ ﷺ نے جوابات دیے [illegible] لیکن یہ حدیث صحیح نہیں۔ اس میں ہے کہ قیصر کا نامہ پڑھنے کے لئے آنحضرت ﷺ نے حضرت معاویہؓ کو بلایا۔ [illegible] حالانکہ وہ اس وقت اسلام بھی نہیں لائے تھے۔ حافظ ابن حجر کے نزدیک سب سے صحیح [illegible] فتح الباری جلد ۸ صفحہ [illegible] زرقانی جلد ۳ صفحہ [illegible] یہ واقعہ دوسرا ہے اور اس کے بعد کا ہے۔ اور خود اس حدیث میں تصریح ہے کہ یہ تبوک کا واقعہ ہے اور غزوہ تبوک فتح مکہ کے بعد [illegible] حضرت معاویہؓ اس سے ایک دو سال پہلے [illegible] فتح مکہ میں مسلمان ہو چکے تھے [illegible] تبوک میں حضرت معاویہؓ کی شرکت کہیں مذکور نہیں [illegible] یہ روایت اسی سند کے ساتھ کتاب الاموال ابو عبید قاسم بن سلام صفحہ ۲۵۵ مصر میں بھی موجود ہے۔

تھے بھی خود کھلاتے تھے۔

مرحب کے جواب میں حضرت علیؓ نے یہ رجز پڑھا:

﴿ انا الذی سمتنی امی حیدرہ   کلیث غابات کریہ المنظرہ ﴾

میں وہ ہوں کہ میری ماں نے میرا نام حیدر (شیر) رکھا تھا، میں شیر نیستان کی طرح مہیب و بدمنظر ہوں۔

مرحب بڑے طمطراق سے آیا لیکن حضرت علیؓ نے اس زور سے تلوار ماری کہ سر کو کاٹتی ہوئی دانتوں تک اتر آئی اور ضربت کی آواز فوج تک پہنچی۔[1] پہلوان کا مارا جانا عظیم الشان واقعہ تھا اس لئے عجائب پسندی نے اس کے متعلق نہایت مبالغہ آمیز افسانے پھیلا دیئے۔ معالم التنزیل میں ہے کہ حضرت علیؓ نے جب تلوار ماری تو مرحب نے سپر پر روکا لیکن ذوالفقار خود اور سر کو کاٹتی ہوئی دانتوں تک اتر آئی۔ مرحب کے مارے جانے پر یہود نے جب عام حملہ کیا تو اتفاق سے حضرت علیؓ کے ہاتھ سے سپر چھوٹ کر گر پڑی۔ آپ نے قلعہ کا در جو یک پارہ سنگ تھا اکھاڑ کر اس سے سپر کا کام لیا۔ اس واقعہ کے بعد لوگوں نے سات آدمیوں کے ساتھ مل کر اس دروازہ کو اٹھانا چاہا تو جگہ سے بھی نہ ہل سکا۔ یہ واقعات ابن اسحاق اور حاکم نے روایت کی ہیں لیکن بازاری قصے ہیں۔ علامہ سخاوی نے مقاصد حسنہ میں تصریح کی ہے کہ

کلھا واھیۃ   سب لغو روایتیں ہیں۔

علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں علی بن احمد فرغانی کے حال میں اس روایت کو نقل کر کے لکھا ہے کہ ''یہ روایت منکر ہے'' ابن ہشام نے دو سلسلوں سے یہ واقعہ نقل کیا ہے ان میں سے ایک روایت میں تو بیچ کے ایک راوی کا نام سرے سے چھوڑ دیا ہے اور دوسرے میں ان مشترک شخص کے ساتھ بریدہ بن سفیان بھی ایک راوی ہیں جن کو امام بخاری اور ابوداؤد وغیرہ قابل احتجاج نہیں سمجھتے۔[2]

ابن اسحاق، موسیٰ بن عقبہ اور واقدی کا بیان ہے کہ مرحب کو محمد بن مسلمہ نے مارا تھا۔ مسند ابن حنبل اور نووی شرح صحیح مسلم میں بھی ایک روایت ہے لیکن صحیح مسلم (اور حاکم ج ۳ ص ۳۹) میں حضرت علیؓ ہی کو مرحب کا قاتل اور فاتح خیبر لکھا ہے اور یہی اصح الروایات ہے۔

غرض یہ قلعہ (قموص) ۲۰ دن کے محاصرہ کے بعد فتح ہو گیا۔ ان معرکوں میں ۹۳ یہودی مارے گئے جن میں حارث، مرحب، اسیر، یاسر اور عامر زیادہ مشہور ہیں۔ مسلمانوں میں سے ۱۵ بزرگوں نے شہادت حاصل کی جن کے نام ابن سعد نے بہ تفصیل لکھے ہیں۔

فتح کے بعد زمین مفتوحہ پر قبضہ کر لیا گیا لیکن یہود نے درخواست کی کہ زمین ہمارے قبضہ میں رہنے دی جائے ہم پیداوار کا نصف حصہ ادا کریں گے۔ یہ درخواست منظور ہوئی۔ غلہ کا وقت آتا تو آنحضرت ﷺ عبداللہ بن رواحہ کو بھیجتے وہ غلہ کو دو حصوں میں تقسیم کر کے یہود سے کہتے تھے کہ ان میں سے جو حصہ چاہو لے لو۔ یہود اس عدل پر متحیر ہو کر کہتے

---

۱ طبری صفحہ ۱۵۷۹ وابن ہشام۔ رجز و قصہ قتل مرحب صحیح مسلم غزوہ ذی قرد میں بھی ہے۔

۲ میزان الاعتدال ذکر بریدہ بن سفیان۔

"بدل دین المسیح" میں لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جس قدر لڑائیاں کیں سب دفاعی تھیں صرف بدر اور خیبر اس سے مستثنیٰ ہیں۔ لیکن اگر علامہ موصوف ذرا بھی استقصا کرتے تو ثابت ہوتا کہ بدر اور خیبر بھی مستثنیٰ نہیں۔ بدر کا بیان اوپر گزر چکا ہے خیبر کے ما سبق واقعات کو ترتیب دے کر دیکھو تو صاف نظر آئے گا کہ یہود اور غطفان مدینہ پر حملہ کی تیاریاں کر چکے تھے۔

تقسیم زمین:

خیبر کی زمین دو برابر حصوں میں تقسیم کی گئی نصف بیت المال مہمانی اور سفارت وغیرہ کے مصارف کے لئے خاص کر دیا گیا۔ باقی نصف مجاہدین پر جو اس غزوہ میں شریک تھے مساوی حصوں میں تقسیم کیا گیا کل فوج کی تعداد چودہ سو تھی دو سو سوار تھے سواروں کو گھوڑوں کے مصارف کے لئے پیدل سے دوگنا ملتا تھا اس بنا پر یہ تعداد اٹھارہ سو کے برابر تھی اس حساب سے کل جائداد کے اٹھارہ سو حصے کئے گئے اور ہر مجاہد کے حصہ میں ایک حصہ آیا جناب سرور کائنات ﷺ کو بھی عام مجاہدین کے برابر ایک ہی حصہ ملا۔ ۱

﴿ولرسول اللہ ﷺ مثل سہم واحد منہم﴾ ۲

اور آنحضرت ﷺ کا بھی عام آدمیوں کی طرح ایک حصہ تھا۔

ملکی حالت اور احکام فقہی:

خیبر کی فتح سے اسلام کی ملکی اور سیاسی حالت کا نیا دور شروع ہوتا ہے اسلام کے حقیقی دشمن صرف دو تھے مشرکین اور یہود اگرچہ مذہباً باہم مختلف تھے لیکن سیاسی اسباب کی بنا پر ان میں اتحاد پیدا ہو گیا تھا۔ مدینہ کے یہود گو انصار کے حلیف تھے اسی طرح خیبر کے یہود غطفان کے حلیف تھے اب آنحضرت ﷺ کے مقابلہ کے لئے مکہ اور مدینہ کے مشرکین اور منافقین سب مل کر نفس واحد ہو گئے خیبر کی فتح کے بعد یہود کی قوت بالکل ٹوٹ گئی اور مشرکین کا ایک بازو جاتا رہا۔

اب تک اسلام چاروں طرف سے نرغہ کی حالت میں تھا اس بنا پر بجز عقائد اور ضروری عبادات کے شریعت کے اور احکام کی جامعیت تعلیم کا موقع نہ تھا شریعت کے احکام جیسا کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا ہے حالات کے اقتضاء سے بتدریج آئے ہیں چنانچہ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔ خیبر کی فتح سے ادھر تو یہود کی فتنہ انگیزیوں سے نجات ملی ادھر حدیبیہ کی صلح سے مشرکین کی طرف سے فی الجملہ اطمینان حاصل ہوا اس بنا پر اب مسلمان جدید فقہی احکام کی تحصیل کے قابل ہو چکے تھے۔

ارباب سیر نے غزوہ خیبر کے تذکرہ میں عموماً ذکر کیا ہے کہ اس موقع پر متعدد جدید فقہی احکام نازل ۳ ہوئے

---

۱ [illegible] ذکر غزوہ خیبر و ابوداؤد حکم ارض خیبر میں ہے۔

۲ [illegible] سہمہم سہم کسہم احدہم

۳ یہاں نزول سے وحی متلو یعنی قرآن مراد نہیں ہے۔

فوراً آنحضرت ﷺ نے ان کی تبلیغ کی، ان کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) پنجہ سے شکار کرنے والے پرند حرام ہو گئے۔

(۲) درندہ جانور حرام کر دیئے گئے۔

(۳) گدھا اور خچر حرام کر دیا گیا۔

(۴) اب تک معمول تھا کہ لونڈیوں سے فوراً تمتع جائز سمجھا جاتا تھا، اب استبراء کی قید ہو گئی یعنی اگر وہ حاملہ ہے تو وضع حمل تک ورنہ ایک مہینہ تک تمتع جائز نہیں۔

(۵) چاندی سونے کا بتفاضل خریدنا حرام ہوا۔

بعض روایتوں میں ہے کہ متعہ بھی اسی غزوہ میں حرام ہوا۔

وادی القریٰ اور فدک:

تیماء اور خیبر کے درمیان ایک وادی ہے جس میں بہت سی بستیاں آباد ہیں، اس کو وادی القریٰ کہتے ہیں۔ قدیم زمانہ میں عاد و ثمود یہاں آباد تھے۔ یاقوت نے معجم البلدان میں لکھا ہے کہ عاد و ثمود کے آثار اب بھی باقی ہیں۔ اسلام سے پہلے ان بستیوں میں یہود آ کر آباد ہوئے اور زراعت اور آب رسانی کو بہت ترقی دی اور اب یہود کا مخصوص مرکز بن گیا تھا۔[1]

خیبر کے بعد آنحضرت ﷺ نے وادی القریٰ کا رخ کیا، لیکن لڑنا مقصود نہ تھا، مگر یہود پہلے سے تیار تھے، انہوں نے خود تیر اندازی شروع کر دی، آنحضرت ﷺ کا غلام آپ کے غلام (حضرت مدعمؓ) اسباب اتار رہے تھے کہ ایک تیر آیا اور وہ جاں بحق ہوئے۔ عام مورخین نے یہود کی تیاری کا ذکر نہیں کیا ہے لیکن امام بیہقی نے صاف تصریح کی ہے:

﴿وقد استقبلتنا يهود بالرمي ولم نكن على تعبئة﴾[2]

یہود ہمارے مقابلہ کو تیر چلاتے ہوئے نکلے اور ہم تیار نہ تھے۔

بہرحال جنگ شروع ہو گئی لیکن تھوڑے سے مقابلہ کے بعد یہود سے بھی اہل خیبر کے شرائط کے موافق صلح ہو گئی۔

ادائے عمرہ:

صلح حدیبیہ میں قریش سے معاہدہ ہوا تھا کہ اگلے سال آنحضرت ﷺ مکہ میں آ کر عمرہ ادا کریں گے اور تین دن قیام کر کے واپس چلے جائیں گے، اسی بنا پر آنحضرت ﷺ نے اس سال عمرہ ادا کرنے کا ارادہ کیا اور اعلان کرا دیا کہ جو لوگ حدیبیہ میں شریک تھے ان میں سے کوئی رہ نہ جائے، چنانچہ بجز ان لوگوں کے جو اس اثنا میں مر چکے تھے، سب نے یہ سعادت حاصل کی۔ معاہدہ میں شرط تھی کہ مسلمان مکہ میں آئیں تو ہتھیار ساتھ نہ ہوں۔ اس لئے اسلحۂ جنگ بطن یاجج میں جو مکہ سے آٹھ میل ادھر ہے چھوڑ دیئے گئے اور دو سو سواروں کا ایک دستہ ان کی حفاظت کے لئے متعین کر دیا گیا۔

---

1. معجم البلدان لفظ قریٰ جلد ۷ صفحہ ۲۳
2. زرقانی بحوالہ بیہقی باب ادائے عمرہ جلد ۲ صفحہ ۲۴۶

آنحضرت ﷺ لبیک کہتے ہوئے حرم کی طرف بڑھے۔ حضرت عبداللہ بن رواحہؓ اونٹ کی مہار تھامے ہوئے آگے آگے یہ رجز پڑھتے جاتے تھے:[1]

خلوا بنی الکفار عن سبیله	کافرو! اس کے سامنے سے ہٹ جاؤ
الیوم نضربکم علی تنزیله	آج جو تم نے اترنے سے روکا تو ہم تلوار کا وار کریں گے
ضربا یزیل الهام عن مقیله	وہ وار جو سر کو خوابگاہ سر سے الگ کر دے
ویذهل الخلیل عن خلیله	اور دوست کے دل سے دوست کی یاد بھلا دے۔

صحابہؓ کا جم غفیر ساتھ تھا، برسوں کی دیرینہ تمنا اور فرض مذہبی بڑے جوش کے ساتھ ادا کر رہا تھا۔ اہل مکہ کا خیال تھا کہ مسلمانوں کو مدینہ کی آب و ہوا نے کمزور کر دیا ہے، اس بنا پر آپ نے حکم دیا کہ لوگ طواف کے تین پہلے پھیروں میں اکڑتے ہوئے چلیں۔ عربی زبان میں اس کو "رمل" کہتے ہیں، چنانچہ آج تک یہ سنت باقی ہے۔

اہل مکہ نے اگرچہ چار و ناچار عمرہ کی اجازت دے دی تھی تاہم ان کی آنکھیں اس منظر کے دیکھنے کی تاب نہیں لا سکتی تھیں، رؤسائے قریش نے شہر خالی کر دیا اور پہاڑوں پر چلے گئے۔ تین دن کے بعد حضرت علیؓ کے پاس آئے اور کہا "محمد سے کہہ دو کہ شرط پوری ہو چکی اب مکہ سے نکل جائیں"۔ حضرت علیؓ نے آنحضرت ﷺ سے عرض کی، آپ ﷺ اسی وقت روانہ ہو گئے۔ چلتے وقت حضرت حمزہؓ کی صغیر السن صاحبزادی امامہ جو مکہ میں رہ گئی تھیں، آنحضرت ﷺ کے پاس چچا چچا[2] کہتی ہوئی آئیں، حضرت علیؓ نے ہاتھوں میں اٹھا لیا، لیکن حضرت جعفرؓ، حضرت علیؓ کے بھائی اور زید بن حارثہؓ نے اپنے دعوے پیش کئے۔ حضرت جعفرؓ کہتے تھے کہ یہ میرے چچا کی لڑکی ہے، زید کہتے تھے کہ حمزہؓ میرے مذہبی بھائی تھے اس رشتہ سے یہ میری بھتیجی ہے، حضرت علیؓ کو دعویٰ تھا کہ میری بھتیجی بھی ہے اور پہلے میری ہی گود میں آئی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے سب کو دعوے میں مساوی الدرجہ دیکھ کر ان کو اسماءؓ کی گود میں دیا جو امامہ کی خالہ تھیں، پھر فرمایا کہ "خالہ ماں کے برابر ہوتی ہے۔"[3]

---

1. یہ اشعار [illegible] نے [illegible] میں نقل کیا ہے۔
2. (آنحضرت ﷺ [illegible] تھے لیکن انہوں نے بھتیجا [illegible] آنحضرت ﷺ اور [illegible] رضاعی بھائی تھے)
3. یہ واقعات صحیح بخاری [illegible] سے [illegible] ہے۔

زید ؓ نے یہ حالات سن کر چاہا کہ ان واقعات کی دربارِ رسالت میں اطلاع دی جائے اور کمک کا انتظار کیا جائے۔ لیکن حضرت عبداللہ بن رواحہ ؓ نے کہا ہمارا اصل مقصود فتح نہیں بلکہ دولتِ شہادت[1] ہے جو ہر وقت حاصل ہو سکتی ہے۔

غرض یہ مختصر گروہ آگے بڑھا اور ایک لاکھ فوج پر حملہ آور ہوا۔ حضرت زید ؓ برچھیاں کھا کر شہید ہوئے۔ ان کے بعد حضرت جعفر ؓ نے علم ہاتھ میں لیا، گھوڑے سے اتر کر پہلے خود اپنے گھوڑے کے پاؤں پر تلوار ماری کہ اس کی کونچیں کٹ گئیں، پھر اس بے جگری سے لڑے کہ تلواروں سے چور ہو کر گر پڑے۔ حضرت عبداللہ بن عمر ؓ کا بیان ہے کہ میں نے ان کی لاش دیکھی تھی، تلواروں اور برچھیوں[2] کے ۹۰ زخم تھے لیکن سب کے سب سامنے کی جانب تھے، پشت نے یہ داغ نہیں اٹھایا تھا۔ حضرت جعفر ؓ کے بعد حضرت عبداللہ بن رواحہ ؓ نے علم ہاتھ میں لیا اور وہ بھی دادِ شجاعت دے کر شہید ہوئے۔

اب حضرت خالد ؓ سردار بنے اور نہایت بہادری سے لڑے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ آٹھ تلواریں ان کے ہاتھ سے ٹوٹ ٹوٹ کر گریں[3] لیکن ایک لاکھ سے تین ہزار کا مقابلہ کیا تھا؟ بڑی کامیابی یہی تھی کہ فوجوں کو دشمن کی زد سے بچا لائے۔ جب یہ شکست[4] خوردہ فوج مدینہ کے قریب پہنچی اور اہل شہر ان کی مشایعت کو نکلے تو لوگ غم خواری کے بجائے ان کے چہروں پر خاک پھینکتے تھے کہ او فرارو! تم اللہ کی راہ سے بھاگ آئے۔

رسول اللہ ﷺ کو اس واقعہ کا سخت صدمہ ہوا۔ حضرت جعفر ؓ سے آپ کو خاص محبت تھی، ان کی شہادت کا نہایت قلق تھا۔ آپ مسجد میں جا کر غمزدہ بیٹھے۔ اسی حالت میں ایک شخص نے آ کر کہا کہ جعفر ؓ کی مستورات رو رہی ہیں اور ماتم کر رہی ہیں۔ آپ ﷺ نے منع کرا بھیجا، وہ گئے اور واپس آ کر کہا کہ میں نے منع کیا لیکن وہ باز نہیں آتیں۔ آپ نے دوبارہ بھیجا، وہ پھر گئے اور واپس آ کر عرض کی کہ ہم لوگوں کی نہیں چلتی۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ "تو ان کے منہ میں خاک بھر دو۔" یہ واقعہ حضرت عائشہ ؓ سے صحیح بخاری میں منقول ہے۔ صحیح بخاری میں یہ بھی ہے کہ حضرت عائشہ ؓ نے اس شخص سے کہا کہ اللہ کی قسم! تم یہ نہ کرو گے (منہ میں خاک نہ ڈالو گے) اور آنحضرت ﷺ کو تکلیف سے نجات نہ دو گے۔

---

[1] ابن ہشام غزوۂ موتہ۔

[2] صحیح بخاری۔

[3] صحیح بخاری غزوۂ موتہ۔

[4] مصنف نے ... [illegible]

رکاب میں تھیں' قبائل عرب راہ میں آ کر ملتے جاتے تھے مر الظہران پہنچ کر لشکر نے پڑاؤ ڈالا' اور فوجیں دور دور تک پھیل گئیں۔ یہ مقام مکہ معظمہ سے ایک منزل یا اس سے بھی کم فاصلہ پر ہے۔

آنحضرت ﷺ کے حکم سے تمام فوج نے الگ الگ آگ روشن کی جس سے تمام صحرا وادی ایمن بن گیا' قریش کی آمد کی بھنک قریش کے کانوں میں پڑ چکی تھی' تحقیق کے لئے انہوں نے حکیم بن حزام (حضرت خدیجہ کے بھتیجے) ابوسفیان اور بدیل بن ورقاء کو بھیجا۔ خیمہ نبوی کی دربانی پر جو دستہ متعین تھا اس نے ابوسفیان کو دیکھ لیا[1] حضرت عمر جذبہ انتقام کو ضبط نہ کر سکے۔ تیز قدمی سے آگے بڑھے اور بارگاہ رسالت میں آ کر عرض کیا کہ کفر کے استیصال کا وقت آ گیا' لیکن حضرت عباسؓ نے جاں بخشی کی درخواست کی' حضرت عمرؓ نے دوبارہ عرض کیا۔ حضرت عباسؓ نے کہا "عمرؓ! اگر یہ شخص تمہارے قبیلہ کا آدمی ہوتا تو تم اس قدر سخت ورزی نہ کرتے" حضرت عمرؓ نے کہا آپ یہ نہ فرمائیں' آپ جس دن اسلام لائے مجھ کو جو مسرت ہوئی تھی خود میرا باپ خطاب اسلام لاتا تو مجھ کو اس قدر خوشی نہ ہوتی۔[2]

ابوسفیان کے تمام پچھلے کارنامے اب سب کے سامنے تھے اور ایک ایک چیز اس کے قتل کی داعی تھی۔ اسلام کی عداوت' مدینہ پر بار بار حملے' قبائل عرب کا اشتعال' اور آنحضرت ﷺ کے خفیہ قتل کرانے کی سازش' ان میں سے ہر چیز اس کے خون کی قیمت ہو سکتی تھی لیکن ان سب سے بالاتر ایک اور چیز (عفو نبوی) تھی' اس نے ابوسفیان کے کان میں آہستہ سے کہا کہ "خوف کا مقام نہیں"

صحیح بخاری میں ہے کہ گرفتار ہونے کے بعد ابوسفیان نے اسلام قبول کر لیا' لیکن طبری وغیرہ میں اس اجمال کی تفصیل میں حسب ذیل مکالمہ لکھا ہے:

رسول اللہ ﷺ	کیوں ابوسفیان کیا اب بھی تم کو یقین نہیں آیا کہ اللہ کے سوا اور کوئی معبود نہیں؟
ابوسفیان	کوئی اور خدا ہوتا تو آج ہمارے کام آتا۔
رسول اللہ ﷺ	کیا اس میں کوئی شبہ ہے کہ میں اللہ کا پیغمبر ہوں؟
ابوسفیان	اس میں تو ذرا شبہ ہے

بہرحال ابوسفیان نے اسلام کا اظہار کیا اور اس وقت گو ان کا ایمان متزلزل تھا' لیکن مورخین لکھتے ہیں کہ بالآخر وہ سچے مسلمان بن گئے۔ چنانچہ غزوۂ طائف میں ان کی ایک آنکھ زخمی ہوئی اور یرموک میں دوسری بھی جاتی رہی۔

لشکر اسلام جب مکہ کی طرف بڑھا تو آنحضرت ﷺ نے حضرت عباسؓ سے ارشاد فرمایا کہ ابوسفیان کو پہاڑی کی چوٹی پر لے جا کر کھڑا کر دو کہ افواج الٰہی کا جلال آنکھوں سے دیکھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد دریائے اسلام میں تلاطم شروع ہوا' قبائل عرب کی موجیں جوش مارتی ہوئی بڑھیں۔ سب سے پہلے غفار کا پرچم نظر آیا' پھر جہینہ' (سعد بن ہذیم) سلیم ہتھیاروں میں ڈوبے ہوئے تکبیر کے نعرے مارتے ہوئے نکل گئے۔ ابوسفیان ہر دفعہ مرعوب ہو جاتے تھے' سب

---

1. اصل واقعہ بخاری میں کافی تفصیل کے ساتھ موجود ہے لیکن مزید تفصیل اور جزئیات حافظ ابن حجر نے بخاری کی شرح میں موسیٰ بن عقبہ اور ابن عائذ وغیرہ سے نقل کئے ہیں' ہم نے ان کو بھی لے لیا ہے' بعض روایات طبری سے ماخوذ ہیں۔
2. طبری جلد سوم صفحہ [illegible]

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللهِ أَتْقَاكُمْ إِنَّ اللهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ (الحجرات۔۱۳) إِنَّ اللهَ وَرَسُولَهُ حَرَّمَ بَيْعَ الْخَمْرِ (بخاری ج ۱ ابواب ۔ ۴۰)

لوگو! میں نے تم کو مرد و عورت سے پیدا کیا اور تمہارے قبیلے اور خاندان بنائے کہ آپس میں ایک دوسرے سے پہچان لئے جاؤ لیکن اللہ کے نزدیک شریف وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہو اللہ دانا اور واقف کار ہے اللہ نے شراب کی خرید و فروخت حرام کر دی۔

تمام عقائد و اعمال کا اصل الاصول اور دعوت اسلام کا اصلی پیغام توحید ہے اس لئے سب سے پہلے اسی سے ابتدا کی گئی۔

خطبے کے اصولی مطالب:

عرب میں دستور تھا کہ کوئی شخص کسی کو قتل کر دیتا تھا تو اس کے خون کا انتقام لینا خاندانی فرض قرار پاجاتا تھا قاتل اگر اس وقت قاتل نہ ہاتھ آسکا تو خاندانی دفتر میں مقتول کا نام لکھا جاتا اور سینکڑوں برس گزرنے کے بعد بھی انتقام کا فرض ادا کیا جاتا تھا قاتل اگر مر چکا ہو تو اس کے خاندان یا قبیلے کے آدمی کو قتل کرتے تھے اسی طرح خون بہا کا مطالبہ بھی نسلاً عن نسل چلا آتا تھا یہ خون کا انتقام عرب میں سب سے بڑے فخر کی بات تھی اسی طرح اور بہت سی خرابیاں مفاخر قومی میں داخل ہو گئی تھیں اسلام ان سب کے مٹانے کے لئے آیا تھا اور اسی بنا پر آپ نے (اس طریق) انتقام اور خون بہا اور تمام جاہلانہ مفاخر کی نسبت فرمایا کہ "میں نے ان کو پاؤں سے کچل دیا۔"

عرب اور تمام دنیا میں نسل و قوم و خاندان کے امتیاز کی بنا پر ہر قوم میں فرق مراتب قائم کئے گئے تھے جس طرح ہندوؤں نے چار ذاتیں قائم کیں اور شودر کو وہ درجہ دیا جو جانوروں کا درجہ ہے اور اس کے ساتھ یہ بندش کر دی کہ وہ کبھی اپنے درجے سے ایک ذرہ آگے نہ بڑھنے پائیں۔ اسلام کا سب سے بڑا احسان جو اس نے تمام دنیا پر کیا مساوات عامہ کا قائم کرنا تھا یعنی عرب و عجم شریف و رذیل شاہ و گدا سب برابر ہیں۔ ہر شخص ترقی کر کے ہر انتہائی درجہ پر پہنچ سکتا ہے اسی بنا پر آنحضرت ﷺ نے قرآن مجید کی آیت پڑھی اور پھر توضیح فرمائی کہ "تم سب اولاد آدم ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے"۔

خطبے کے بعد آپ نے مجمع کی طرف دیکھا تو جباران قریش سامنے تھے ان میں وہ حوصلہ مند بھی تھے جو اسلام کے مٹانے میں سب سے پیش رو تھے وہ بھی تھے جن کی زبانیں رسول اللہ ﷺ پر گالیوں کے بادل برسایا کرتی تھیں وہ بھی تھے جن کی تیغ و سنان نے پیکر قدسی ﷺ کے ساتھ گستاخیاں کی تھیں وہ بھی تھے جنھوں نے آنحضرت ﷺ کے راستے میں کانٹے بچھائے تھے وہ بھی تھے جو وعظ کے وقت آنحضرت ﷺ کی ایڑیوں کو لہولہان کر دیا کرتے تھے وہ بھی تھے جن کی تشنہ لبی خون نبوت کے سوا کسی چیز سے بجھ نہیں سکتی تھی وہ بھی تھے جن کے حملوں کا سیلاب مدینہ کی دیواروں سے آآ کر ٹکراتا تھا وہ بھی تھے جو مسلمانوں کو جلتی ہوئی ریت پر لٹا کر ان کے سینوں پر آتشیں مہریں لگایا کرتے تھے۔

رحمت عالم ﷺ نے ان کی طرف دیکھا اور خوف انگیز لہجہ میں پوچھا "تم کو کچھ معلوم ہے میں تم سے کیا معاملہ کرنے والا ہوں؟"

کہ جہاں ملیں قتل کر دیئے جائیں، ان میں سے بعض مثلاً عبداللہ بن خطل، مقیس بن صبابہ خونی مجرم تھے وہ قصاص میں قتل کئے گئے لیکن بعض ایسے تھے کہ ان کا صرف یہ جرم تھا کہ وہ آنحضرت ﷺ کو گالیاں دیا کرتے تھے یا آپ کی ہجو میں اشعار کہا کرتے تھے۔ ان میں سے ایک عورت اس جرم پر قتل کی گئی کہ وہ آپ کے ہجویہ اشعار گایا کرتی تھی۔

لیکن قواعد تنقید کی رو سے یہ بیان صحیح نہیں، اس جرم کا مجرم تو سارا مکہ تھا، قریش میں سے (بجز دو چار کے) کون تھا جس نے آنحضرت ﷺ کو سخت سے سخت ایذائیں نہیں دیں؟ بایں ہمہ انہی لوگوں کو یہ مژدہ سنا دیا گیا کہ انتم الطلقاء جن لوگوں کا قتل بیان کیا جاتا ہے وہ تو نسبتاً کم درجہ کے مجرم تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کی یہ روایت صحاح ستہ میں موجود ہے کہ آنحضرت ﷺ نے کسی سے ذاتی انتقام نہیں لیا، خیبر میں جس یہودی عورت نے آپ کو زہر دیا اس کی نسبت لوگوں نے دریافت بھی کیا کہ اس کے قتل کا حکم ہوگا، ارشاد ہوا کہ نہیں۔ خیبر کے کفرستان میں ایک یہودیہ زہر دے کر رحمت عالم کے عفو سے جانبر ہو سکتی ہے اس سے کم درجہ کے مجرم عفو نبوی سے کیونکر محروم رہ سکتے ہیں۔

اگر درایت پر قناعت نہ کی جائے تو روایت کے لحاظ سے بھی یہ واقعہ بالکل ناقابل اعتبار رہ جاتا ہے، صحیح بخاری میں صرف ابن خطل کا قتل مذکور ہے[1] اور یہ ظاہراً مسلم ہے کہ وہ قصاص میں قتل کیا گیا۔ مقیس کا قتل بھی خونی قصاص میں تھا۔ باقی جن لوگوں کی نسبت حکم قتل کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ وہ کسی زمانہ میں آنحضرت ﷺ کو ستایا کرتے تھے وہ روایتیں صرف ابن اسحاق تک پہنچ کر ختم ہو جاتی ہیں یعنی اصول حدیث کی رو سے وہ روایت منقطع ہے جو قابل اعتبار نہیں، ابن اسحاق کا فن حدیث میں جو درجہ ہے وہ ہم کتاب کے دیباچہ میں لکھ آئے ہیں۔

سب سے زیادہ معتبر روایت جو اس بارے میں پیش کی جا سکتی ہے ابوداؤد کی وہ روایت ہے[2] جس میں مذکور ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فتح مکہ کے دن فرمایا کہ چار شخصوں کو میں امن نہیں دیا جا سکتا" لیکن ابوداؤد نے اس حدیث کو نقل کر کے لکھا ہے کہ اس روایت کی سند جیسی چاہئے مجھ کو نہیں ملی۔[3] پھر اس کے بعد ابن خطل کی روایت نقل کی ہے

---

1. بخاری فتح مکہ
2. ابوداؤد باب قتل الاسیر
3. ابوداؤد نے باب قتل الاسیر میں اس قسم کی تین روایتیں درج کی ہیں۔ پہلی وہ روایت ہے جس کا ذکر مصنف نے اوپر کیا ہے۔ یہ روایت احمد بن المفضل، اسباط بن نصر، سدی، مصعب بن سعد، سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے ہے، اس میں چار مرد اور دو عورتوں کے قتل کا حکم مذکور ہے جن میں سے ایک ابن ابی سرح ہے جس کو حضرت عثمانؓ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا کے لئے آپ کی خدمت میں پیش کیا اور ان کو بچا لیا۔ اس کے بعد چونکہ ابوداؤد مصنف ہوا اس روایت میں احمد بن مفضل اور اسباط بن نصر اور سدی تینوں پر علماء نے جرح کی ہے اور خصوصاً اسباط بن نصر پر زیادہ جرح کی ہے۔ یہ روایت اسی سلسلہ سے نسائی نے باب الحکم فی المرتد میں اور حاکم نے مستدرک کتاب المغازی میں اس کو نقل کیا ہے۔ اس سلسلہ کے یہ تینوں راوی ضعیف ہیں۔ اور حاکم نے مستدرک میں اس پر کلام سے پہلو تہی کیا ہے۔ دوسری ابوداؤد کی مرفوع روایت محمد بن عثمان بن ابی شیبہ، عمرو بن عثمان بن عبدالرحمن بن سعید مخزومی سے ہے کہ انہوں نے اپنے دادا سے اور انہوں نے اپنے باپ سے روایت کی ہے کہ حضور ﷺ نے چار مردوں اور دو عورتوں کے بارہ میں فرمایا کہ ان کو کہیں امن نہیں ہے۔ ان دو عورتوں میں سے دونوں گانے والی لونڈیاں تھیں، ایک مسلمان ہو گئی اور ایک قتل کی گئی۔ اس روایت کے متعلق ابوداؤد نے لکھا ہے کہ

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

(شروع میں جو روایت ہے) اس کا ایک راوی "محمد بن الفضل" ہے جس کو ازدی نے منکر الحدیث لکھا ہے اور ایک راوی اسباط بن نصر ہے جس کی نسبت نسائی کا قول ہے کہ "قوی نہیں ہے" اگرچہ اس قدر جرح کسی روایت کے نامعتبر ہونے کے لئے کافی نہیں لیکن واقعہ جس قدر اہم ہے۔ اس کے لحاظ سے راوی کی اس قدر جرح بھی روایت کے مشکوک ہونے کے لئے کافی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ بعض سرداران قریش جو دشمن اسلام کے پیشرو تھے آنحضرت ﷺ کی تشریف آوری کی خبر سن کر مکہ سے بھاگ گئے تھے۔ لیکن یہ صرف ابن اسحاق کا قیاس ہے کہ وہ اس وجہ سے بھاگے تھے کہ ان کے قتل کا حکم دیا گیا تھا، ان اشتہاری مفرورین میں ابن اسحاق نے عکرمہ کو بھی شمار کیا ہے جو ابوجہل کے فرزند تھے۔ لیکن موطائے امام مالک میں جس کی نسبت امام شافعی کا قول ہے کہ آسمان کے نیچے (قرآن کے علاوہ) کوئی کتاب اس سے زیادہ صحیح نہیں یہ واقعہ جس طرح منقول ہے اس کا لفظی ترجمہ حسب ذیل ہے:

"حارث بن ہشام کی صاحبزادی ام حکیم عکرمہ بن ابی جہل کی زوجیت میں تھیں، وہ فتح مکہ کے دن اسلام لائیں لیکن ان کے شوہر عکرمہ بن ابوجہل اسلام سے بھاگ کر یمن چلے گئے ام حکیم یمن گئیں اور ان کو اسلام کی دعوت دی اور وہ مسلمان ہو گئے اور مکہ میں آئے آنحضرت ﷺ نے جب ان کو دیکھا تو فرط مسرت سے فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور اس تیزی سے ان کی طرف بڑھے کہ جسم مبارک پر چادر تک نہ تھی پھر ان سے بیعت لی" (کتاب النکاح)

یہ بات بھی اس موقع پر خاص طور پر لحاظ رکھنے کے قابل ہے کہ جن لوگوں کو امن دیا جاتا تھا وہ اسلام پر مجبور نہیں کئے جاتے تھے۔ تمام مورخین اور ارباب سیر نے تصریح کی ہے کہ حنین کی لڑائی میں جو فتح مکہ کے بعد پیش آئی لشکر اسلام میں مکہ کے بہت سے کفار بھی شامل تھے جو اس وقت تک کافر تھے اور شکست بھی زیادہ تر اسی وجہ سے ہوئی کہ پہلے حملہ میں انہی کافروں کے قدم اکھڑے اور اس ابتری کی وجہ سے مسلمانوں کے قدم بھی نہ ٹھہر سکے۔

خزائن حرم:

حرم میں نذور اور ہدایا کا خزانہ ایک مدت سے جمع ہوتا چلا آتا تھا اور محفوظ رکھا گیا، لیکن بعض جائے اور تصویریں

(پچھلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ)

میں نے اپنے شیخ حافظ العلاء سے اس کی سند اسی طرح سنی تھی جیسا کہ روایت کی سلسلہ سے دارقطنی اور کتاب الحج میں ہے۔ اس میں سند کے آخر میں یوں ہے۔ عمرو بن عثمان نے اپنے باپ سے اور انہوں نے اپنے دادا سے یہ روایت کی۔ اس سے ظاہر ہے کہ سند کے اس حصہ میں ابوداؤد کو شک ہے۔ ابوداؤد کی تیسری روایت میں صرف ابن خطل کے قتل کا ذکر ہے جو صحیح بخاری کی روایت سے بھی ثابت ہے۔ بیہقی نے حکم بن عبدالملک قتادہ اور حضرت انس بن مالک سے ایک روایت کی ہے جس میں تین مرد اور ایک عورت یعنی چار اشخاص کے قتل کا حکم ہے تینوں مرد یہ ہیں ابن خطل مقیس بن صبابہ اور عبداللہ بن سعد ابن ابی سرح اور عورت کا نام ام سارہ تھا۔ عبداللہ بن سعد کے قتل کی ایک انصاری نے نذر مانی تھی مگر حضرت عثمانؓ کی سفارش سے ان کی جان بخشی ہو گئی اور ام سارہ وہ عورت ہے جو فتح مکہ سے پہلے مسلمانوں کے مکہ پر حملہ کرنے کا خط خفیہ لے کر چلی تھی۔ اس روایت میں حکم بن عبدالملک ضعیف ناقابل اعتبار ہے اور اس کی اس روایت کو بیہقی نے لکھا ہے کہ کوئی تائید اس کے رفقا میں سے کسی نے نہیں کی ہے۔ تہذیب ابن حجر" "ن"

ہوازن و ثقیف

غزوۂ حنین، اوطاس، طائف

شوال ۸ ھ ہجری

﴿وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ﴾

حنین:

حنین مکہ اور طائف کے درمیان ایک وادی کا نام ہے۔ ذوالمجاز عرب کا مشہور بازار اور عرفہ سے تین میل ہے ۱ اور یہ اس کے دامن میں ہے۔ اس مقام کو اوطاس ۲ بھی کہتے ہیں، ہوازن ایک بڑے قبیلہ کا نام ہے جس کی بہت سی شاخیں ہیں۔

اسلام کی فتوحات کا دائرہ گو وسیع ہوتا جاتا تھا لیکن اہل عرب یہ دیکھ رہے تھے کہ ان کا قبلۂ اعظم یعنی کعبہ اب تک محفوظ ہے۔ ان کا خیال تھا کہ محمد اگر قریش پر غالب آ گئے اور مکہ فتح ہو گیا تو بے شبہ وہ سچے پیغمبر ہیں ۳ مکہ جب فتح ہوا تو تمام قبائل نے خود پیش قدمی کی اور اسلام قبول کرنا شروع کیا لیکن ہوازن اور ثقیف پر اس کا الٹا اثر پڑا۔ یہ قبیلے نہایت جنگجو اور فنون جنگ سے واقف تھے، اسلام کو جس قدر غلبہ ہوتا جاتا تھا یہ زیادہ مضطرب ہوتے تھے ۴ کہ ان کی ریاست اور امتیاز کا خاتمہ ہوا جاتا ہے۔ اس بنا پر فتح مکہ (کے بعد) ہوازن اور ثقیف کے رؤسا نے یہ سمجھ لیا کہ اب ان کی باری ہے اس لئے انہوں نے ایک دوسرے سے مل کر مشورہ کیا اور تمام قبائل عرب سے قرار داد ہو گئی کہ مسلمانوں کے خلاف جو اس وقت مکہ میں جمع ہیں ایک عام حملہ کیا جائے۔ مکہ فتح ہوا تو ان کو یقین ہو گیا کہ اب جلد تدارک نہ کیا گیا تو پھر کوئی طاقت اسلام کو زیر نہ کر سکے گی۔

آنحضرت ﷺ کی روانگی کے وقت ان کو یہ غلط خبر پہنچی تھی کہ حملہ کا رخ انہی کی طرف ہے، اس لئے اب انتظار کی حاجت بھی نہ تھی۔ نہایت بڑے زور و شور کے ساتھ خود حملہ کے لئے بڑھے، جوش کا یہ عالم تھا کہ ہر قبیلہ تمام اہل و عیال لے کر آیا تھا کہ بچے اور عورتیں ساتھ ہوں گی تو ان کی حفاظت کی غرض سے لوگ جانیں دے دیں گے۔

---

۱ یہاں مصنف کی عبارت میں کچھ غلط فہمی ہے، مطلب یہ ہے کہ حنین، زرقانی کی تصریح کے مطابق مکہ اور طائف کے درمیان عرب کے عظیم بازار ذوالمجاز کے پاس ہے جو عرفہ سے تین میل ہے۔ لیکن ابن سعد نے تصریح کی ہے کہ یہ مکہ سے تین دن کے سفر کی مسافت پر واقع ہے۔ "س"

۲ قاضی عیاض کی یہی رائے ہے لیکن حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ ابن اسحاق کی تصریح کے مطابق یہ حنین کے علاوہ دیار ہوازن میں دوسری وادی کا نام ہے، فتح الباری، غزوۂ اوطاس، ذکر غزوہ ہوازن اوطاس۔ "س"

۳ صحیح بخاری ذکر فتح مکہ، باب مقام النبی ﷺ بمکہ۔

۴ مارگولیس صاحب لکھتے ہیں: حکومت اسلامی کی وسعت اور استحکام سے بدوی قبائل جن کو اپنی آزادی بہت عزیز تھی نہایت خائف تھے۔

اس معرکہ میں اگرچہ ثقیف اور ہوازن کی تمام شاخیں شریک تھیں تاہم کعب اور کلاب الگ رہے۔ فوج کی سرداری کے لئے انتخاب تو مالک بن عوف[1] کا کیا گیا جو قبیلۂ ہوازن کا رئیس اعظم تھا لیکن مشیر کی حیثیت سے درید بن الصمہ کو بھی ساتھ لے لیا گیا جو عرب کا مشہور شاعر اور قبیلۂ جشم کا سردار تھا۔ اس کی شاعری اور بہادری کے معرکے اب تک عرب کی تاریخ میں یادگار ہیں لیکن اس کی عمر سو برس سے زیادہ ہو چکی تھی اور صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تھا چونکہ پورا عرب اس کو مانتا تھا اور اس کی رائے و تدبیر پر تمام ملک کو اعتماد تھا، خود مالک بن عوف نے اس سے شرکت کی درخواست کی۔ جنگ پر خود آ کر اس کو میدان جنگ تک لے آئے۔ اس نے پوچھا کہ یہ کون سا مقام ہے؟ لوگوں نے کہا اوطاس۔ بولا "ہاں یہ مقام جنگ کے لئے موزوں ہے، اس کی زمین نہ بہت سخت ہے نہ اس قدر نرم کہ پاؤں دھنس جائیں"۔ پھر پوچھا کہ "یہ بچوں کے رونے کی آوازیں کیسی آ رہی ہیں؟" لوگوں نے کہا کہ "بچے اور عورتیں ساتھ آئی ہیں کہ کوئی شخص پاؤں پیچھے نہ ہٹائے"۔ بولا کہ "جب پاؤں اکھڑ جاتے ہیں تو کوئی چیز روک نہیں سکتی، میدان جنگ میں صرف تلوار کام دیتی ہے۔ بدقسمتی سے اگر شکست ہوئی تو عورتوں کی وجہ سے اور بھی ذلت ہوگی"۔ پھر پوچھا کہ "کعب اور کلاب بھی شریک ہیں یا نہیں؟" اور جب یہ معلوم ہوا کہ ان معزز قبیلوں کا ایک شخص بھی میدان جنگ میں نہیں تو کہا "اگر آج کا دن عزت و شرف کا دن ہوتا تو کعب و کلاب غیر حاضر نہ ہوتے"۔ اس کی رائے تھی کہ میدان سے ہٹ کر کسی محفوظ مقام میں فوجیں جمع کی جائیں اور وہیں اعلان جنگ کیا جائے۔ لیکن مالک بن عوف نے جو تیس سال کا نوجوان تھا جوش شباب میں اس رائے کو قبول کرنے سے انکار کیا اور کہا کہ آپ خرف ہو چکے آپ کی عقل بے کار ہو چکی۔[2]

رسول اللہ ﷺ کو (مکہ میں) ان واقعات کی خبر پہنچی تو آپ نے تصدیق کے لئے حضرت عبداللہ بن ابی حدردؓ کو بھیجا، وہ جاسوس بن کر حنین میں آئے اور کئی دن تک فوج میں رہ کر تمام حالات تحقیق کئے۔ آنحضرت ﷺ نے مجبوراً مقابلہ کی تیاریاں کیں۔ رسد اور سامان جنگ کے لئے قرض کی ضرورت پیش آئی۔ عبداللہ بن ابی ربیعہ جو ابوجہل کے ماں جائے بھائی تھے تجارت سے دولت مند تھے ان سے تیس ہزار درہم قرض[3] لئے۔ صفوان بن امیہ جو مکہ کا رئیس اعظم اور مہمان نوازی میں مشہور تھا لیکن اب تک اسلام نہیں لایا تھا اس سے آنحضرت ﷺ نے اسلحۂ جنگ مستعار مانگے، اس نے سو زرہیں اور ان کے لوازمات پیش کئے۔[4]

شوال ۸ ہجری مطابق جنوری فروری ۶۳۰ء اسلامی فوجیں جن کی تعداد بارہ ہزار تھی اس سروسامان سے حنین پر بڑھیں کہ صحابہؓ کی زبان سے بے اختیار یہ لفظ نکل گیا کہ "آج ہم پر کون غالب آ سکتا ہے"؟ لیکن بارگاہ ایزدی میں یہ

---

[1] مالک بن عوف غزوۂ طائف کے بعد مسلمان ہو گئے تھے اور حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جنگ قادسیہ میں شریک اور دمشق کے عامل رہے (زرقانی جلد ۳ صفحہ ۶)۔

[2] یہ پوری تفصیل طبری میں ہے، جلد ۳ صفحہ ۱۶۵۵ تا ۱۶۵۶۔

[3] مسند ابن حنبل جلد ۴ صفحہ ۳۶۔ اصابہ میں امام بخاری سے بھی یہ روایت نقل کی ہے لیکن اس میں قرض کی تعداد نہیں ہے۔

[4] ابوداؤد میں ہے کہ جب آپ نے اس سے زرہیں طلب کیں تو اس نے کہا محمد! غصب کرتے ہو؟ آپ نے فرمایا نہیں بلکہ عاریۃً، لیکن ابوداؤد میں اس کے بعد یہ ہے کہ حضرت صفوان نے بھی اسی طرح روایت کی ہے۔

گئی، اس نے مڑ کر مجھ کو اس زور سے دبوچا کہ میری جان پر بن گئی، لیکن پھر وہ ٹھنڈا ہو کر گر پڑا، اسی اثناء میں میں نے

(پچھلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ)

﴿ و يجمع بين قوله حتى بقي وحده وبين الاخبار الدالة على انه بقي معه جماعة بان المراد بقي وحده متقدما على العدو والذين ثبتوا معه كانوا وراءه ﴾ (جلد ۸ صفحہ ۲۲ مصر)

اور ان اقوال میں کہ حضور ﷺ تنہا رہ گئے اور ان روایات میں جو اس پر دال ہیں کہ حضور کے ساتھ صحابہؓ کی ایک جماعت تھی تطبیق یہ ہے کہ حضور ﷺ دشمن کے سامنے سب سے آگے مقام میں تنہا تھے اور آپ کے ساتھ ثابت قدم رہنے والے آپ کے پیچھے تھے۔

دوسرے یہ کہ بخاری ہی میں حضرت براءؓ کی جو روایت ہے اس میں حضرت براءؓ تصریح کرتے ہیں کہ ابو سفیان بن حارث اس وقت حضرت رسول اللہ ﷺ کے پاس موجود تھے اور آپ کی سواری کی لگام تھامے تھے (غزوہ حنین بخاری)

مسلم میں حضرت عباسؓ کے یہ الفاظ ہیں کہ میں نے اور ابو سفیان بن حارث نے حضور ﷺ سے علیحدگی اختیار نہیں کی۔

﴿فلزمت انا و ابو سفيان بن الحارث بن عبد المطلب رسول الله ﷺ فلم نفارقه﴾ (مسلم غزوہ حنین)

صحیحین کی ان روایت کے سوا روایات ذیل میں بھی تصریح مذکور ہے

(۱) ابن ابی شیبہ کی ایک مرسل روایت میں جو حکم بن عتیبہ سے مروی ہے چار آدمیوں کا حضور ﷺ کی خدمت میں باقی رہنا بیان کیا گیا ہے (فتح الباری جلد ۸ صفحہ ۲۲)

(۲) ترمذی نے حضرت ابن عمرؓ سے روایت کیا ہے کہ اس دن حضور ﷺ کے ہمراہ سو آدمی باقی رہ گئے تھے

(ترمذی ابواب الجہاد باب ماجاء فی الثبات عند القتال)

(۳) مسند احمد (ج اول ص ۴۵۳) اور حاکم میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ اس دن حضور کے ہمراہ اسی آدمی باقی رہ گئے تھے (فتح الباری ج ۸ ص ۲۲)

(۴) بیہقی نے حارث بن نعمان سے روایت کیا ہے کہ سو آدمی باقی رہ گئے تھے (زرقانی ج ۳ ص ۲۳) ابو نعیم نے دلائل میں اس کی تفصیل بتائی ہے کہ تیس سے کچھ اوپر مہاجرین تھے باقی انصار تھے (فتح الباری ج ۸ ص ۲۲)

(۵) ابن اسحاق کی روایت ہے کہ حضور ﷺ کے پاس اس وقت مہاجرین انصار اور اہل بیت میں سے حسب ذیل اصحابؓ موجود تھے حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب، حضرت ابو سفیانؓ بن حارث، حضرت جعفر بن ابی سفیان بن حارث، حضرت فضلؓ بن عباس، حضرت ربیعہؓ، حضرت اسامہ بن زیدؓ، حضرت ایمنؓ بن ام ایمن۔

اس تفصیل کا ماحصل یہ ہے کہ حضرت انسؓ کے الفاظ سے جو یہ مترشح ہوتا ہے کہ آپ بالکل تنہا رہ گئے تھے حافظ ابن حجر نے اس کی توجیہ یہ کی ہے کہ ان الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ حضور ﷺ آگے اور بقیہ لوگ پیچھے تھے لیکن اس کی مناسب توجیہ یہ ہے کہ ان الفاظ سے ثابت قدم رہنے والوں کی کمی کو ظاہر کرنا مقصود ہے اور حقیقت یہ تھی اور دوسری روایات میں ثابت قدم رہنے والوں میں جو اختلاف پایا جاتا ہے اس کی مختلف توجیہیں کی گئی ہیں (ملاحظہ ہو زرقانی ج ۳ ص ۲۰) لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کچھ حضرات صرف گنتی کے آپ کے پاس تھے اور تھوڑی تھوڑی تعداد میں حضور ﷺ کے پاس پہنچتے گئے یہاں تک کہ خاصی جماعت حضور کے گرد جمع ہو گئی اسی وجہ سے مختلف لوگوں نے مختلف تعداد نقل کی ہے۔

اس پکار کا اثر آواز کا کانوں میں پڑنا تھا کہ تمام فوج دفعتہً پلٹ پڑی جن لوگوں کے گھوڑے کشمکش اور گھمسان کی داب سے مڑ نہ سکے۔ انہوں نے زرہیں پھینک دیں اور گھوڑوں سے کود پڑے دفعتہً لڑائی کا رنگ بدل گیا۔ کفار بھاگ نکلے اور جو رہ گئے ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں۔ بنو مالک (ثقیف کی ایک شاخ تھی) جم کر لڑے لیکن ان کے ستر آدمی مارے گئے اور جب ان کا علمبردار عثمان بن عبداللہ مارا گیا تو وہ بھی ثابت قدم نہ رہ سکے۔

شکست خوردہ فوج ٹوٹ پھوٹ کر کچھ اوطاس میں جمع ہوئی اور کچھ طائف میں جا کر پناہ گزین ہوئی جس کے ساتھ سپہ سالار لشکر مالک بن عوف بھی تھا۔

اوطاس:

درید بن الصمہ کئی ہزار کی جمعیت لے کر اوطاس میں آیا۔ آنحضرت ﷺ نے (ابو عامر اشعری کے ماتحت) تھوڑی سی فوج اس کے استیصال کے لئے بھیج دی حضرت ابو عامر درید کے بیٹے کے ہاتھ سے مارے گئے اور علم اسلام اس کے ہاتھ میں تھا۔ یہ حالت دیکھ کر حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے آگے بڑھ کر حملہ کیا، دشمن کو قتل کر کے علم اس کے ہاتھ سے چھین لیا [1]۔ درید ایک شتر پر ہودج میں سوار تھا، ربیعہ بن رفیع نے اس پر تلوار کا وار کیا لیکن اچٹ کر رہ گئی اس نے کہا "تیری ماں نے تجھ کو اچھے ہتھیار نہیں دیئے" پھر کہا کہ "میرے محمل میں تلوار ہے نکال لو اور جب اپنی ماں کے پاس واپس جاؤ تو کہنا کہ میں نے درید کو قتل کر دیا"۔ ربیعہ نے جا کر ماں کو اس کے قتل کی خبر دی تو اس نے کہا "اللہ کی قسم درید نے تیری تین ماؤں کو آزاد کرایا تھا" [2]۔

اسیران جنگ کی تعداد ہزاروں سے زیادہ تھی ان میں حضرت شیماءؓ بھی تھیں جو رسول اللہ ﷺ کی رضاعی بہن تھیں لوگوں نے جب ان کو گرفتار کیا تو انہوں نے کہا "میں تمہارے پیغمبر کی بہن ہوں"۔ لوگ تصدیق کے لئے آنحضرت ﷺ کے پاس لائے انہوں نے پیٹھ کھول کر دکھائی کہ ایک دفعہ بچپن میں آپ نے دانت سے کاٹا تھا یہ اس کا نشان ہے۔ فرط محبت سے آپ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ان کے بیٹھنے کے لئے خود ردائے مبارک بچھائی۔ محبت کی باتیں کیں، چند شتر اور بکریاں عنایت فرمائیں اور ارشاد کیا کہ "جی چاہے تو میرے گھر چل کر رہو اور گھر جانا چاہو تو وہاں پہنچا دیئے جاؤ" [3]۔ انہوں نے خاندان کی محبت سے وطن جانا چاہا، چنانچہ عزت و احترام کے ساتھ پہنچا دی گئیں۔

محاصرہ طائف:

حنین کی بقیہ شکست خوردہ فوج طائف میں جا کر پناہ گزین ہوئی اور جنگ کی تیاریاں شروع کیں۔ طائف نہایت محفوظ مقام تھا، طائف اس کو اس لئے کہتے ہیں کہ اس کے گرد شہر پناہ کے طور پر چار دیواری تھی یہاں ثقیف کا جو قبیلہ آباد تھا نہایت شجاع، تمام عرب میں ممتاز اور قریش کا گویا ہمسر تھا، عروہ بن مسعود جو یہاں کا رئیس تھا، ابو سفیان (امیر

---

1. مسند ابن حنبل جلد ۴ صفحہ ۳۹۹
2. طبری جلد ۳ صفحہ ۱۶۶۶ مطبوعہ یورپ
3. طبقات ابن سعد، طبقات النساء جلد ۸ صفحہ ۶۸۔

معاویہ کے باپ) کی لڑکی ان کو بیاہی تھی۔ کفار مکہ کہتے تھے کہ قرآن اگر اترتا تو مکہ یا طائف کے کسی رئیس پر اترتا۔ یہاں کے لوگ فن جنگ سے بھی واقف تھے۔ طبری اور ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ عروہ بن مسعود اور غیلان بن سلمہ نے جرش (یمن کا ایک ضلع) میں جا کر قلعہ شکن آلات یعنی دبابہ، ضبور اور منجنیق کے بنانے اور استعمال کرنے کا فن سیکھا تھا۔ ۱؎

یہاں ایک مضبوط قلعہ تھا۔ اہل شہر اور حنین کی شکست خوردہ فوج نے اس کی مرمت کی، سال بھر کا رسد کا سامان جمع کیا، چاروں طرف منجنیقیں اور جا بجا قدر انداز متعین کیے۔ ۲؎

آنحضرت ﷺ نے حنین کے مال غنیمت و اسیران جنگ کے متعلق حکم دیا کہ جعرانہ میں محفوظ رکھے جائیں اور خود طائف کا عزم کیا۔ حضرت خالدؓ مقدمۃ الجیش کے طور پر پہلے روانہ کر دیئے گئے تھے۔ غرض قلعہ کا محاصرہ ہوا اور اسلام میں یہ پہلا موقع تھا کہ قلعہ شکن آلات یعنی دبابے اور منجنیقیں استعمال کیے گئے۔ دبابوں پر اہل قلعہ نے لوہے کی گرم سلاخیں برسائیں اور اس شدت کی تیر بازی کی کہ مسلمانوں کو ہٹنا پڑا۔ بہت سے لوگ زخمی ہوئے۔ بیس دن تک محاصرہ رہا لیکن شہر فتح نہ ہو سکا۔ آنحضرت ﷺ نے نوفل بن معاویہ کو بلا کر پوچھا کہ تمہاری کیا رائے ہے؟ انہوں نے کہا کہ لومڑی بھٹ میں گھس گئی ہے، اگر کوشش جاری رہی تو پکڑ لی جائے گی، لیکن چھوڑ دی جائے تب بھی کچھ اندیشہ نہیں، چونکہ صرف مدافعت مقصود تھی، آنحضرت ﷺ نے حکم دیا کہ محاصرہ اٹھا لیا جائے۔ صحابہؓ نے عرض کی کہ آپ ان کو بددعا دیں، آپ نے دعا دی۔ ۳؎

﴿اللّٰھم اھد ثقیفا وائت بھم﴾

اے اللہ ثقیف کو ہدایت کر اور توفیق دے کہ میرے پاس حاضر ہو جائیں۔

تقسیم غنائم:

محاصرہ چھوڑ کر آپ جعرانہ تشریف لائے، غنیمت کا بے شمار ذخیرہ تھا۔ چھ ہزار اسیران جنگ، چوبیس ہزار اونٹ، چالیس ہزار (سے زیادہ) بکریاں اور چار ہزار اوقیہ چاندی۔ ۴؎ اسیران جنگ کے متعلق آپ نے انتظار کیا کہ ان کے عزیز و اقارب آئیں تو ان سے گفتگو کی جائے لیکن کئی دن گزر گئے اور کوئی نہ آیا، مال غنیمت کے پانچ حصے کیے گئے، چار حصے حسب قاعدہ فوج کو تقسیم کیے گئے، خمس بیت المال اور غرباء و مساکین کے لئے رکھا گیا۔

مکہ کے اکثر رؤسا جنہوں نے حال میں اسلام قبول کیا تھا ابھی تک مذبذب الاعتقاد تھے، ان کو قرآن مجید میں مؤلفۃ القلوب کہا ہے۔ قرآن مجید میں جہاں زکوٰۃ کے مصارف بیان کیے ہیں ان لوگوں کا نام بھی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے ان لوگوں کو نہایت فیاضانہ انعامات دئیے جن کی تفصیل یہ ہے:

ابوسفیان مع اولاد	۳۰۰ اونٹ اور ۱۲۰ اوقیہ چاندی

۱؎ طبری جلد ۳ صفحہ ۱۶۶۹ طبع یورپ

۲؎ تاریخ خمیس جلد ۲ صفحہ ۱۱۱ و زاد المعاد

۳؎ صحیح بخاری (کتاب المغازی صفحہ [illegible])

۴؎ طبقات ابن سعد غزوۂ حنین صفحہ [illegible]

حکیم بن حزام	۲۰۰ اونٹ
نضر بن حارث بن کلدہ ثقفی	۱۰۰ اونٹ
صفوان بن امیہ	۱۰۰ اونٹ
قیس بن عدی	۱۰۰ اونٹ
سہیل بن عمرو	۱۰۰ اونٹ
حویطب بن عبدالعزیٰ	۱۰۰ اونٹ

(ان کے علاوہ تین غیر قریشی رئیس بھی ان انعامات کے مستحق ٹھہرے)

اقرع بن حابس (تمیمی)	۱۰۰ اونٹ
عیینہ بن حصین (فزاری)	۱۰۰ اونٹ
مالک بن عوف (نصری)	۱۰۰ اونٹ

ان کے علاوہ بہت سے لوگوں کو پچاس پچاس اونٹ عطا فرمائے عام تقسیم کی رو سے فوج کے حصہ میں جو آیا وہ فی کس چار اونٹ اور چالیس بکریاں تھیں۔ چونکہ سواروں کو تگنا حصہ ملتا تھا اس لئے ہر سوار کے حصہ میں بارہ اونٹ اور ایک سو بیس بکریاں آئیں۔[1]

جن لوگوں پر انعام کی بارش ہوئی عموماً اہل مکہ اور اکثر جدید الاسلام تھے۔ اس پر انصار کو رنج ہوا بعضوں نے کہا رسول اللہ ﷺ نے قریش کو انعام دیا اور ہم کو محروم رکھا' حالانکہ ہماری تلواروں سے اب تک قریش کے خون کے قطرے ٹپکتے ہیں۔ بعض نے کہا کہ مشکلات میں ہماری یاد ہوتی ہے اور غنیمت اوروں کو ملتی ہے۔[2]

آنحضرت ﷺ نے یہ چرچے سنے تو انصار کو طلب فرمایا ایک چرمی خیمہ نصب کیا گیا جس میں لوگ جمع ہوئے آپ ﷺ نے انصار کی طرف خطاب کیا کہ تم نے ایسا کہا؟ لوگوں نے عرض کی کہ "حضور! ہمارے سربرآوردہ لوگوں میں سے کسی نے یہ نہیں کہا' نوخیز نوجوانوں نے یہ فقرے کہے تھے"[3] صحیح بخاری باب مناقب الانصار میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ جب آنحضرت ﷺ نے انصار کو بلا کر پوچھا کہ یہ کیا واقعہ ہے؟ تو چونکہ انصار جھوٹ نہیں بولتے تھے انہوں نے کہا "آپ نے جو سنا صحیح ہے۔"

آپ نے ایک خطبہ دیا جس کی نظیر فن بلاغت میں نہیں مل سکتی' انصار کی طرف خطاب فرما کر کہا

"کیا یہ سچ نہیں ہے کہ تم پہلے گمراہ تھے اللہ نے میرے ذریعہ سے تم کو ہدایت کی' تم منتشر اور پراگندہ تھے اللہ نے میرے ذریعہ سے تم میں اتفاق پیدا کیا' تم مفلس تھے خدا نے میرے ذریعہ سے تم کو دولت مند کیا۔"

---

1. طبقات ابن سعد ج مغازی ص ۱۱۰ و زرقانی علی المواہب جلد ۳ صفحہ ۴۳ ' ۳۴
2. صحیح بخاری غزوہ طائف۔
3. صحیح بخاری مطبوعہ مطبع نظامی صفحہ ۶۲۰۔

آپ پر فرماتے جاتے تھے اور ہر فقرہ پر انصار کہتے جاتے تھے کہ "اللہ اور رسول کا احسان سب سے بڑھ کر ہے۔"

آپ نے فرمایا نہیں تم یہ جواب دو کہ اے محمد! تجھ کو جب لوگوں نے جھٹلایا تو ہم نے تیری تصدیق کی۔ تجھ کو جب لوگوں نے چھوڑ دیا تو ہم نے پناہ دی تو مفلس آیا تھا ہم نے ہر طرح کی مدد کی۔

یہ کہہ کر آپ ﷺ نے فرمایا کہ "تم یہ جواب دیتے جاؤ اور میں کہتا جاؤں گا کہ تم سچ کہتے ہو لیکن اے انصار! کیا تم کو یہ پسند نہیں کہ لوگ اونٹ اور بکریاں لے کر جائیں اور تم محمد کو لے کر اپنے گھر آؤ۔"

انصار بے اختیار چیخ اٹھے کہ "ہم کو صرف محمد درکار ہے" اکثروں کا یہ حال ہوا کہ روتے روتے داڑھیاں تر ہو گئیں[1] آپ نے انصار کو سمجھایا کہ مکہ کے لوگ جدید الاسلام ہیں میں نے ان کو جو کچھ دیا حق کی بنا پر نہیں دیا بلکہ تالیف قلب کے لئے دیا۔[2]

حنین کے اسیران جنگ اب تک جعرانہ میں محفوظ تھے ایک معزز سفارت آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی کہ اسیران جنگ رہا کر دیے جائیں یہ وہ قبیلہ تھا کہ آپ کی رضاعی والدہ حضرت حلیمہؓ اسی قبیلے سے تھیں رئیس قبیلہ (زہیر بن صرد) نے کھڑے ہو کر تقریر کی اور آنحضرت ﷺ کی طرف مخاطب ہو کر کہا "جو عورتیں چھپروں میں محبوس ہیں ان میں تیری پھوپھیاں اور تیری خالائیں ہیں اللہ کی قسم! اگر سلاطین عرب میں سے کسی نے ہمارے خاندان کا دودھ پیا ہوتا تو اس سے بہت کچھ امیدیں ہوتیں اور تجھ سے تو اور بھی زیادہ توقعات ہیں۔" آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ خاندان عبدالمطلب کا جس قدر حصہ ہے وہ تمہارا ہے لیکن عام رہائی کی تدبیر یہ ہے کہ نماز کے بعد مجمع ہو تو سب کے سامنے یہ درخواست پیش کرو۔ نماز ظہر کے بعد ان لوگوں نے یہ درخواست مجمع کے سامنے پیش کی آپ نے فرمایا "مجھ کو صرف اپنے خاندان پر اختیار ہے لیکن میں تمام مسلمانوں سے ان کے لئے سفارش کرتا ہوں۔" مہاجرین اور انصار بول اٹھے کہ ہمارا حصہ بھی حاضر ہے اس طرح چھ ہزار دفعتاً آزاد تھے۔[3]

واقعات متفرقہ:

حضرت ماریہؓ کے بطن سے اسی سال ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام آنحضرت ﷺ نے ابراہیم رکھا آنحضرت ﷺ کو اس بچے سے نہایت محبت تھی تقریباً ڈیڑھ سال (سولہ یا اٹھارہ مہینے) زندہ رہا۔ جس دن ابراہیمؓ نے وفات پائی سورج گرہن ہوا عرب کا عقیدہ تھا کہ سورج گرہن عظیم الشان انسان کی موت کی علامت ہے لوگوں نے سمجھا کہ یہ ابراہیمؓ کی موت کا نتیجہ ہے آنحضرت ﷺ نے لوگوں کو جمع کر کے خطبہ دیا کہ "سورج اور چاند خدا کی قدرت ہیں! کسی کے مرنے اور جینے سے ان میں گرہن نہیں لگتا" اس کے بعد آپ نے کسوف کی نماز باجماعت ادا فرمائی۔[4]

آنحضرت ﷺ کی صاحبزادی حضرت زینبؓ کا بھی اسی سال انتقال ہوا۔

۱؎ صحیح بخاری صفحہ ۶۲۹ باب غزوہ طائف

۲؎ صحیح بخاری صفحہ ۶۲۰ باب غزوہ طائف فتح الباری جلد ۸ صفحہ ۴۱-۴۰

۳؎ صحیح بخاری و فتح الباری، پوری تفصیل فتح الباری میں ہے

۴؎ بخاری باب کسوف

۹ھ

واقعہ ایلاء و تخییر و غزوۂ تبوک

ایلاء اور تخییر ۹ھ

رسول اللہ ﷺ زاہدانہ اور تمام زخارف دنیوی سے بے نیاز زندگی بسر کرتے تھے۔ دو دو مہینے گھر میں آگ نہیں جلتی تھی، آئے دن فاقے ہوتے رہتے تھے، عمر بھر دو وقت برابر سیر ہو کر کھانا نصیب نہیں ہوا۔ ازواج مطہراتؓ اس مجلس لطیف میں شامل تھیں جن کی مرغوب ترین چیز طبعاً زیب و زینت اور آرائش ہے اور گو شرف صحبت نے ان کو تمام ابنائے جنس سے ممتاز کر دیا تھا تاہم بشریت بالکل معدوم نہیں ہو سکتی تھی خصوصاً وہ دیکھتی تھیں کہ فتوحات اسلام کا دائرہ بڑھتا جاتا ہے اور غنیمت کا سرمایہ اس قدر پہنچ گیا ہے کہ اس کا ادنیٰ حصہ بھی ان کی راحت و آرام کے لئے کافی ہو سکتا ہے۔ ان واقعات کا اقتضا تھا کہ ان کے صبر و قناعت کا جام لبریز ہو جاتا تھا۔

ازواج مطہراتؓ میں بڑے بڑے گھرانوں کی خاتونیں تھیں، حضرت ام حبیبہؓ تھیں جو رئیس قریش کی صاحبزادی تھیں، حضرت جویریہؓ تھیں جو قبیلہ بنی المصطلق کے رئیس کی بیٹی تھیں، حضرت صفیہؓ تھیں جن کا باپ خیبر کا رئیس اعظم تھا، حضرت عائشہؓ تھیں جو حضرت ابوبکرؓ کی صاحبزادی تھیں، حضرت حفصہؓ تھیں جن کے والد فاروق اعظم تھے، بشریت کے اقتضا سے ان میں منافست بھی تھی اور حریف کے مقابلہ میں اپنے رتبہ اور شان کا خیال رہتا تھا۔ آنحضرت ﷺ سے ہر ایک کو جو شدید محبت تھی وہ باہمی تزاحم و تصادم کی حد تک تھی۔

ایک دفعہ کئی دن تک آنحضرت ﷺ حضرت زینبؓ کے پاس معمول سے زیادہ بیٹھے جس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت زینبؓ کے پاس کہیں سے شہد آ گیا تھا انہوں نے آپ ﷺ کے سامنے پیش کیا، آپ کو شہد بہت مرغوب تھا، آپ نے نوش فرمایا اس میں وقت مقررہ سے دیر ہو گئی، حضرت عائشہؓ کو رشک ہوا، حضرت حفصہؓ سے کہا کہ رسول اللہ ﷺ جب ہمارے یا تمہارے گھر میں آئیں تو کہنا چاہئے کہ آپ کے منہ سے مغافیر کی بو آتی ہے (مغافیر کے پھولوں سے شہد کی مکھیاں رس چوستی ہیں) آنحضرت ﷺ نے قسم کھائی کہ میں شہد نہ کھاؤں گا، اس پر قرآن مجید کی یہ آیت اتری۔

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ تَبْتَغِي مَرْضَاتَ أَزْوَاجِكَ﴾ [تحریم آیت ۱]

۱　بعض محدثین کی رائے ہے کہ یہ واقعہ سنہ ۵ھ کا واقعہ ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض روایتوں میں یہ مذکور ہوا ہے کہ یہ زمانہ نزول حجاب سے پہلے کا تھا لیکن آگے چل کر حضرت عمرؓ کی روایت میں مذکور ہے کہ جب اس حادثہ کی خبر پھیلی تو مسلمانوں میں اضطراب دیکھ کر سمجھے کہ غسان کا بادشاہ حملہ آور ہوا جس کی اطلاع پہلے معلوم ہو چکی تھی، غسان کا حملہ [illegible] اسماعیلی نے بھی اس واقعہ کو [illegible] (صحیح البخاری جلد [illegible] صفحہ [illegible])

۲　[illegible] کی [illegible] تھیں۔ [illegible]
[illegible] تھیں۔

لِلْمُحْسِنَاتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴾ (احزاب۔۴)

(اے پیغمبر ﷺ اپنی بیویوں سے کہہ دے کہ اگر تم کو دنیاوی زندگی اور دنیا کا زیب و زینت مطلوب ہے تو آؤ میں تم کو کچھ جوڑا دے کر بطریق احسن رخصت کر دوں اور اگر تم اللہ اور اللہ کا رسول اور آخرت مطلوب ہے تو اللہ نے تم میں سے نیکوکاروں کے لئے بڑا ثواب مہیا کر رکھا ہے)

اس آیت کی رو سے آنحضرت ﷺ کو حکم دیا گیا کہ ازواج مطہرات ؓ کو مطلع فرما دیں کہ دو چیزیں تمہارے سامنے ہیں دنیا اور آخرت اگر تم چاہتی ہو تو آؤ میں تم کو کچھ جوڑا دے کر عزت و احترام کے ساتھ رخصت کر دوں اور اگر تم اللہ اور رسول اور زندگانی ابدی کی طلب گار ہو تو اللہ نے نیکوکاروں کے لئے بڑا اجر مہیا کر رکھا ہے۔

مہینہ ختم ہو چکا تھا آپ ﷺ بالا خانہ سے اتر کے چونکہ ان تمام معاملات میں حضرت عائشہ ؓ پیش پیش تھیں ان کے پاس تشریف لے گئے اور مطلع فرمایا انہوں نے کہا میں سب کچھ چھوڑ کر اللہ اور رسول کو لیتی ہوں تمام ازواج مطہرات نے بھی یہی جواب دیا۔

ایلاء تخییر مظاہرہ حفصہ ؓ و عائشہ ؓ یہ واقعات عموماً اس طرح بیان کئے گئے ہیں کہ گویا مختلف زمانوں کے واقعات ہیں اور ان سے ایک ظاہر بین یہ دھوکا کھا سکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ازواج مطہرات ؓ کے ساتھ ہمیشہ ناگواری کے ساتھ بسر کرتے تھے لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ تینوں واقعے ہم زمان اور ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہیں صحیح بخاری باب النکاح (باب موعظة الرجل ابنته) میں حضرت ابن عباس ؓ کی زبانی جو نہایت تفصیلی روایت ہے اس میں صاف تصریح ہے کہ مظاہرہ ازواج مطہرات سے اعتزال انقضائے ماہ آیت تخییر کا نزول سب ایک ہی سلسلہ کے واقعات ہیں

حافظ ابن حجر اعتزال کے متعدد اسباب لکھ کر لکھتے ہیں

﴿ هذا هو اللائق بمكارم اخلاقه صلى الله عليه وسلم وسعة صدره وكثرة صفحه فان ذلك لم يقع منه حتى تكرر موجبه منهن ﴾ (فتح الباری جلد ۹ صفحہ ۲۵۳)

آنحضرت ﷺ کے مکارم اخلاق، کشادہ دلی اور کثرت عفو کے یہی مناسب ہے اور آپ نے اس وقت تک ایسا نہیں کیا جب تک ان سے اس قسم کی حرکتیں متعدد بار ظہور پذیر نہ ہوئیں

مظاہرہ کے متعلق جو آیت نازل ہوئی اس سے بظاہر مفہوم ہوتا ہے کہ کوئی بہت بڑی خطرناک سازش تھی جس کا اثر بہت پر خطر تھا، آیت مذکورہ یہ ہے۔

﴿وَاِنْ تَظٰهَرَا عَلَيْهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ وَجِبْرِيْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ

(پچھلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ)

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

ظہیر (تحریم۔۱)

اور اگر تم دونوں (حضرت عائشہؓ و حفصہؓ) رسول ﷺ کے برخلاف ایکا کرو تو خدا اس کا مولا ہے اور جبریل اور نیک مسلمان اور ان سب کے ساتھ فرشتے بھی مددگار ہیں۔

اس آیت میں تصریح ہے کہ اگر ان دونوں کا ایکا قائم رہا تو رسول اللہ ﷺ کی مدد کو خدا اور جبریل اور نیک مسلمان موجود ہیں اور اسی پر بس نہیں بلکہ فرشتے بھی اعانت کے لئے تیار ہیں۔

روایتوں سے مظاہرہ کا جو سبب معلوم ہوتا ہے وہ صرف یہی کہ اس کے ذریعہ سے وہ شہد کی تحریم چاہتی تھیں اور اگر ماریہ قبطیہ کی روایت تسلیم کر لی جائے تو صرف یہ کہ وہ الگ کر دی جائیں لیکن یہ ایسی کیا اہم باتیں ہیں اور حضرت عائشہؓ و حضرت حفصہؓ کی کسی قسم کی سازش ایسی کیا پرخطر ہو سکتی ہے جس کی مدافعت کے لئے ملاء اعلیٰ کی اعانت کی ضرورت ہو؟

اس بنا پر بعضوں نے قیاس کیا ہے کہ یہ مظاہرہ کوئی معمولی معاملہ نہ تھا، مدینہ منورہ میں منافقین کا ایک گروہ کثیر موجود تھا جن کی تعداد ۳۰۰ تک بیان کی گئی ہے، یہ شریر النفس ہمیشہ اس تاک میں رہتے تھے کہ کسی تدبیر سے خود آنحضرت ﷺ کے خاندان اور رفقائے خاص میں پھوٹ ڈلوا دیں (ابن حجر نے اصابہ میں ام جلدح کے حال میں لکھا ہے "کانت تسعی بین ازواج النبی ﷺ" وہ ازواج مطہرات کو باہم لڑایا کرتی تھیں) افک کے واقعہ میں ان کو کامیابی کی جھلک نظر آ چکی تھی، رسول اللہ ﷺ چند روز تک حضرت عائشہؓ سے کبیدہ خاطر رہے، حضرت حسانؓ افک میں شریک ہو گئے تھے، آنحضرت ﷺ کی سالی حمنہ جو حضرت زینبؓ کی بہن تھیں سازش میں آ گئی تھیں، چنانچہ اس روایت کو علانیہ شہرت دیتی تھیں، حضرت ابوبکرؓ نے اپنے ایک قریبی عزیز (مسطحؓ) کو جو شریک تہمت تھے مالی اعانت سے محروم کر دیا تھا، غرض اگر حضرت عائشہؓ کی براءت وحی سے نہ آ جاتی تو ایک فتنہ عظیم برپا ہو چکا تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ جب ازواج مطہراتؓ کی کشش خاطر اور کبیدگی اور شکر رنجی کا حال منافقوں کو معلوم ہوا تو ان بدنفسوں نے اشتعال دے کر بگاڑنا چاہا ہو گا چونکہ مظاہرہ کے ارکان اعظم حضرت عائشہؓ و حضرت حفصہؓ تھیں، ان کو خیال ہوا ہو گا کہ ان کے ذریعہ سے ان کے والدین (حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ) کو اس سازش میں شریک کر لینا ممکن ہے لیکن ان کو یہ معلوم نہ تھا کہ ابوبکرؓ اور عمرؓ حضرت عائشہؓ اور حفصہؓ کو رسول ﷺ کی خاک پا پر قربان کر سکتے تھے، چنانچہ جب حضرت عمرؓ کو اذن ملا تو انہوں نے پکار کر کہا کہ "ارشاد ہو تو حضرت حفصہؓ کا سر لے کر آؤں۔"

آیت میں روئے سخن منافقین کی طرف ہے یعنی اگر عائشہؓ و حفصہؓ سازش بھی کریں گی اور منافقین اس کام میں لگے تو اللہ پیغمبر کی اعانت کے لئے موجود ہے اور اللہ کے ساتھ جبریل و ملائکہ بلکہ تمام عالم ہے۔

روایات کا ذخیرہ

ان واقعات میں کذابین رواۃ نے اس قدر تلبیسات اور حاشیہ آرائیاں کی ہیں کہ بڑے بڑے مؤرخین و ارباب سیر نے یہ روایتیں اپنی تصانیف میں سند کے طور پر درج کر دی ہیں اس لئے ہم اس بحث کو کسی قدر تفصیل سے لکھنا چاہتے ہیں۔

اس قدر عموماً مسلم ہے اور خود قرآن مجید میں مذکور ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ازواج مطہراتؓ کی خاطر سے

کوئی چیز اپنے اوپر حرام کر لی تھی؟ اختلاف اس میں ہے کہ وہ کیا چیز تھی؟ بہت سی روایتوں میں ہے کہ وہ ماریہ قبطیہ ایک کنیز تھیں جن کو عزیز مصر نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں تحفہ بھیجا تھا، ماریہ کی روایت تفصیل کے ساتھ مختلف طریقوں سے بیان کی گئی ہے جن میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کا راز جو حضرت حفصہؓ نے فاش کر دیا تھا ان ہی ماریہ قبطیہ کا راز تھا۔ اگرچہ یہ روایتیں بالکل موضوع اور ناقابل ذکر ہیں لیکن یورپ کے اکثر مؤرخوں نے آنحضرت ﷺ کے معیار اخلاق پر جو حرف گیریاں کی ہیں ان کا کل سرمایہ یہی ہیں اس لئے ان سے تعرض کرنا ضروری ہے

ان روایتوں میں واقعہ کی تفصیل کے متعلق اگرچہ بے حد اختلاف ہے لیکن اس قدر سب کی قدر مشترک ہے کہ ماریہ قبطیہ آنحضرت ﷺ کی موطوءۃ کنیزوں میں تھیں اور آنحضرت ﷺ نے حضرت حفصہؓ کی ناراضی کی وجہ سے ان کو اپنے اوپر حرام کر لیا تھا۔

حافظ ابن حجر شرح صحیح بخاری تفسیر سورۂ تحریم میں لکھتے ہیں۔

﴿ووقع عند سعید بن منصور باسناد صحیح الی مسروق قال حلف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لحفصۃ لا یقرب امتہ﴾ (صفحہ ۵۰۳ ج ۸)

اور سعید ابن منصور نے سند صحیح کے ساتھ جو مسروق تک پہنچی ہوئی ہے یہ روایت کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت حفصہؓ کے سامنے قسم کھائی کہ اپنی کنیز سے مقاربت نہ کریں گے۔

اس کے بعد حافظ موصوف نے سند ہیثم بن کلیب اور طبرانی سے متعدد روایتیں نقل کی ہیں جن میں سے ایک یہ ہے۔

﴿وللطبرانی من طریق الضحاک عن ابن عباس قال دخلت حفصۃ بیتہا فوجدتہ یطاء ماریۃ فعاتبتہ﴾ (فتح الباری تفسیر سورۂ تحریم ص ۵۰۳)

اور طبرانی نے ضحاک کے سلسلہ میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ حضرت حفصہؓ اپنے گھر میں گئیں تو آنحضرت ﷺ کو حضرت ماریہؓ کے ساتھ ہم بستر دیکھا اس پر انہوں نے آنحضرت کو عتاب کیا۔

ابن سعد اور واقدی نے اس روایت کو زیادہ بدنما پیرایوں میں نقل کیا ہے، ہم ان کو قلم انداز کرتے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ تمام روایتیں محض افترا اور بہتان ہیں۔

علامہ عینی شرح صحیح بخاری باب النکاح جلد ۹ صفحہ ۳۸۷ میں لکھتے ہیں۔

﴿والصحیح فی سبب نزول الآیۃ انہ فی قصۃ العسل لا فی قصۃ ماریۃ المروی فی غیر الصحیحین وقال النووی ولم یات قصۃ ماریۃ من طریق صحیح﴾

اور آیت کی شان نزول کے باب میں صحیح روایت یہ ہے کہ وہ شہد کے واقعہ میں ہے ماریہؓ کے قصہ کے باب میں نہیں ہے جو صحیحین کے سوا اور کتابوں میں مذکور ہے نووی نے کہا ہے کہ ماریہ کا قصہ کسی صحیح طریقہ سے مروی نہیں ہے۔

یہ حدیث تفسیر ابن جریر، طبرانی، سند ہیثم میں مختلف طریقوں سے مروی ہے ان کتابوں میں عموماً جس قسم کی رطب و یابس روایتیں مذکور ہیں اس کے لحاظ سے جب تک ان کی صحت کے متعلق کوئی خاص تصریح نہ ہو قابل التفات نہیں

دمشق سے پانچ منزل پر ہے وہاں ایک عربی سردار جس کا نام اکیدر تھا قیصر کے زیر اثر تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالدؓ کو چار سو (بیس) کی جمعیت کے ساتھ اس کے مقابلہ کے لئے بھیجا۔ حضرت خالدؓ نے اس کو گرفتار کیا اور اس شرط پر رہائی دی کہ خود دربار رسالت میں حاضر ہو کر شرائط صلح پیش کرے چنانچہ وہ اپنے بھائی کے ساتھ مدینہ میں آیا۔ آپؐ نے اس کو امان دی۔

تبوک سے جب آپؐ واپس پھرے اور مدینہ کے قریب پہنچے تو لوگ عالم شوق میں استقبال کو نکلے یہاں تک کہ پردہ نشینان حرم بھی جوش میں گھروں سے نکل پڑیں اور لڑکیاں یہ اشعار گاتی نکلیں۔ [1]

طلع البدر علینا من ثنیات الوداع
وداع کی گھاٹیوں سے ہم پر چاند طلوع ہوا۔

وجب الشکر علینا ما دعا للہ داع
جب تک خدا کا پکارنے والا کوئی دنیا میں باقی ہے
ہم پر خدا کا شکر فرض ہے۔

مسجد ضرار:

منافقین ہمیشہ اس فکر میں رہتے تھے کہ مسلمانوں میں کسی طرح پھوٹ ڈالیں وہ ایک مدت سے اس خیال میں تھے کہ مسجد قبا کے قریب ہی ایک مسجد اس حیلہ سے بنائیں کہ جو لوگ ضعف یا کسی اور وجہ سے مسجد نبوی میں نہ جا سکیں یہاں آ کر نماز ادا کر لیا کریں ابو عامر جو انصار میں سے عیسائی ہو گیا تھا اس نے منافقین سے کہا کہ تم سامان کرو میں قیصر کے پاس جا کر وہاں سے فوجیں لاتا ہوں کہ اس ملک کو اسلام سے پاک کر دوں۔ [2]

آنحضرت ﷺ جب تبوک تشریف لے جانے لگے تو منافقین نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آ کر عرض کی کہ ہم نے بیماروں اور معذوروں کے لئے ایک مسجد تیار کی ہے آپؐ چل کر اس میں ایک دفعہ نماز پڑھ لیجئے کہ مقبول ہو جائے۔ آپؐ نے فرمایا اس وقت میں جہاد پر جا رہا ہوں جب تبوک سے واپس پھرے تو مالک اور معن بن عدی کو حکم دیا کہ جا کر مسجد میں آگ لگا دیں اسی مسجد کی شان میں یہ آیتیں اتری ہیں:

﴿وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَكُفْرًا وَتَفْرِيقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِينَ وَإِرْصَادًا لِمَنْ حَارَبَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ مِنْ قَبْلُ وَلَيَحْلِفُنَّ إِنْ أَرَدْنَا إِلَّا الْحُسْنَىٰ وَاللَّهُ يَشْهَدُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ لَا تَقُمْ فِيهِ أَبَدًا لَمَسْجِدٌ أُسِّسَ عَلَى التَّقْوَىٰ مِنْ أَوَّلِ يَوْمٍ أَحَقُّ أَنْ تَقُومَ فِيهِ فِيهِ رِجَالٌ يُحِبُّونَ أَنْ يَتَطَهَّرُوا وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِينَ﴾ (توبہ ۱۳)

اور وہ لوگ جنہوں نے ایک مسجد ضرر اور پھوٹ ڈالنے اور کفر کی غرض سے تیار کی اور اس غرض سے کہ جو لوگ پہلے سے خدا اور رسولؐ سے لڑتے ہیں ان کو ایک کمین گاہ ہاتھ آئے اور وہ قسم کھاتے ہیں کہ ہم نے صرف بھلائی کے لحاظ سے بنایا کیا اور خدا گواہی دیتا ہے کہ یہ جھوٹ کہتے ہیں۔ تم کبھی اس مسجد میں جا کر نہ کھڑا ہو، وہ مسجد جس کی بنیاد پہلے ہی دن سے پرہیزگاری پر رکھی گئی ہے وہ اس بات کی زیادہ مستحق ہے کہ تو اس میں نماز پڑھے وہاں ایسے لوگ

---

[1] زرقانی بحوالہ ابن جریر ج ۳ ص ۹۲ ’’ن‘‘

[2] زرقانی بحوالہ ابن جریر ج ۳ ص ۹۱ ’’ن‘‘

واعلموا انکم غیر معجزی اللہ وان اللہ مخزی الکافرین واذان من اللہ ورسولہ الی الناس یوم الحج الاکبر ان اللہ بریء من المشرکین ورسولہ فان تبتم فھو خیر لکم وان تولیتم فاعلموا انکم غیر معجزی اللہ وبشر الذین کفروا بعذاب الیم الا الذین عاھدتم من المشرکین ثم لم ینقصوکم شیئا ولم یظاھروا علیکم احدا فاتموا الیھم عھدھم الی مدتھم ان اللہ یحب المتقین۔ (توبہ۔۱)

اے مسلمانو! جن مشرکین سے تم نے معاہدہ کیا تھا (اور انہوں نے اپنے معاہدہ کو توڑ دیا) ان کی خدا کی طرف سے اور رسول کی طرف سے کوئی ذمہ داری نہیں ہے اب (اے معاہدہ شکن مشرکو!) چار مہینے کی تم کو مہلت ہے، اس میں تم ملک میں چلو پھرو اور جان لو کہ تم خدا کو عاجز نہ کرسکو گے، حج اکبر کے دن لوگوں کو اعلان عام ہے کہ خدا اور اس کا رسول ان مشرکین کا اب ذمہ دار نہیں، اگر (تم نے اے مشرکین) توبہ کرلی تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے اور اگر اب بھی پھرے رہو تو یقین کرلو کہ تم خدا کو ہرا نہ سکو گے، اے پیغمبر! تو کافروں کو دردناک عذاب کی خوشخبری سنادے، لیکن وہ مشرکین جن سے تم نے معاہدہ کیا اور انہوں نے اس کے ایفاء میں تمہارے ساتھ کچھ کمی نہ کی اور نہ تمہارے مقابلہ میں انہوں نے تمہارے دشمنوں کی مدد کی تو ان کے معاہدہ کو پورا کرو، خدا پرہیزگاروں کو دوست رکھتا ہے۔

﴿یایھا الذین امنوا انما المشرکون نجس فلا یقربوا المسجد الحرام بعد عامھم ھذا﴾ (توبہ۔۴)

اے مسلمانو! مشرکین تو ناپاک ہیں اب وہ اس سال کے بعد کعبہ کے قریب نہ آئیں۔

طبری نے بواسطہ سدی روایت کی ہے کہ اس اعلان کے بعد کفار عام طور سے مسلمان ہوگئے۔[1]

واقعات متفرقہ

۹ سال کے بعد اب ملک میں امن وامان کا دور شروع ہوا، اب حصول دولت کے مواقع حاصل تھے، اس بناء پر زکوٰۃ کا حکم اسی سال نازل ہوا اور تحصیل زکوٰۃ کے لئے عمال قبائل میں مقرر ہوئے۔[2]

اسلام کے سایہ میں بعض غیر مسلم قومیں بھی داخل ہو چکی تھیں ان کے جزیہ کی آیت اتری۔

﴿حتی یعطوا الجزیۃ عن ید وھم صاغرون﴾ (توبہ۔۴)

تاکہ یہ چھوٹے بن کر جزیہ ادا کریں۔

سود کی تحریم بھی اسی سنہ میں نازل ہوئی اور اس کے ایک سال بعد ۱۰ھ میں حجۃ الوداع میں آنحضرت ﷺ نے اس کا اعلان عام فرمایا۔

نجاشی جس کے ظل حمایت میں مسلمانوں نے چند سال حبشہ میں بسر کئے تھے اس نے اسی سال انتقال کیا، آنحضرت ﷺ نے ان کی وفات کا خود اعلان فرمایا کہ مسلمانو! آج تمہارے برادر صالح اصحمہ نے وفات پائی، اس کے لئے دعائے مغفرت مانگو۔ اس کے بعد نجاشی کے لئے غائبانہ نماز جنازہ پڑھی۔

---

1. طبری ج ص [illegible]
2. طبری جلد [illegible] ص [illegible]

غزوات پر دوبارہ نظر

کتاب کا یہ حصہ سادہ سوانح زندگی پر محدود ہے۔ بحث و تدقیقات اور رفع شکوک کے لئے دوسرے حصے ہیں اس بنا پر مناسب یہ تھا کہ غزوات کے متعلق جو مباحث ہیں انہی حصوں میں لکھے جاتے لیکن کتب سیر کی کثرت اور اہمیت روایات کی حیثیتوں سے جو واقعات زیادہ تر نمایاں ہیں صرف غزوات ہیں اگر صرف تصنیف سیرت کو پیش نظر رکھا جائے تو نظر آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی تمام تر سوانح عمری غزوات ہی کا نام ہے چنانچہ پہلے سیرت پر جو کتابیں لکھی گئیں وہ سیرت نہیں بلکہ مغازی ہی کے نام سے مشہور ہیں' مثلاً مغازی زہری' ابن عقبہ' مغازی ابن اسحاق' مغازی واقدی۔ یہ انداز تحریر آج تک چلا آیا ہے اس لئے اگر یہ طرز بالکل بدل دی جائے تو جو شخص کوئی قدیم تصنیف پہلے پڑھ چکا ہوگا وہ اس جدید تصنیف کو پڑھ کر سمجھے گا کہ سیرت کے بجائے کوئی اور چیز پڑھ رہا ہے۔ ان اسباب سے ہم کو بھی غزوات کو تفصیل سے لکھنا پڑا' لیکن غزوات کو پڑھ کر جو سوالات دلوں میں پیدا ہو جاتے ہیں ان کو دوسرے موقع کے لئے اٹھا رکھنا ناظرین کے اضطراب کا باعث ہوگا۔

غیر مذہب والوں نے غزوات کے مقاصد اور اسباب کے سمجھنے میں سخت غلطیاں کی ہیں نہ صرف بدنیتوں نے بلکہ نیک دلوں نے بھی۔ لیکن یہ تعجب کی بات نہیں' اسباب ایسے جمع ہیں کہ اس قسم کی غلطیوں پر نہ صرف دوستوں کو بلکہ دشمنوں کو بھی معذور رکھ سکتے ہیں۔

عرب اور جنگ و غارت گری:

اس باب میں سب سے مقدم اور سب سے اہم اس حقیقت کا معلوم کرنا ہے کہ عرب کی قومیت کو "جنگ و غارت گری" سے کیا تعلق ہے؟ ہر قوم کے اخلاق و عادات' رسوم و معاملات' اوصاف و خصائص' معائب و مثالب' غرض اس کی کل قومی زندگی کا ایک خاص اساس اور مرجع ہے کہ سب چیزیں اسی سے اٹھتی اور اسی سے نشوونما پاتی ہیں' عرب میں یہ چیز جنگ و غارت گری تھی' اس کی ابتدا یوں ہوئی کہ عرب ایک ویران ملک تھا' کسی قسم کی پیداوار وہاں نہیں ہوتی تھی' لوگ اس بنا پر سادہ و جاہل تھے' خورش اور پوشش کا قدرتی سامان صرف بھیڑ بکریاں اور اونٹ تھے کہ ان کا دودھ پیتے' گوشت کھاتے اور بالوں کو بن کر کمبل بنا لیتے تھے لیکن یہ سرمایہ بھی ہر شخص کو نصیب نہ تھا یا تھا تو بقدر ضرورت نہ تھا اس لئے حملہ اور غارت گری شروع ہوئی اور معاش کا سب سے بڑا ذریعہ یہی غارت گری قرار پایا' ابو علی قالی نے کتاب الامالی میں لکھا ہے

﴿ وحدث انهم كانوا يكرهون ان يتوالى عليهم ثلاثة اشهر لا يمكنهم الاغارة فيها لان معاشهم كان من الاغارة ﴾ [1]

اور یہ بھی بیان کیا ہے کہ وہ ناپسند کرتے تھے کہ ان پر تین مہینے اس طرح گزر جائیں کہ ان میں وہ غارت گری نہ کر سکیں کیونکہ ان کا ذریعہ معاش یہی تھا

چونکہ عرب میں زیادہ تر بکریاں ہوتی تھیں اور بکری کو عربی میں "غنم" کہتے ہیں اس لئے لوٹ کے مال کو

[1] کتاب الامالی جلد اول صفحہ ۴ طبع مصر۔

عربی میں "غنیمت" کہنے لگے اس لفظ نے پھر یہ وسعت حاصل کی کہ قیصر و کسریٰ کا تاج و تخت لٹ کر آیا تو اسی نام سے پکارا گیا۔

رفتہ رفتہ یہی لفظ عربی قوم عربی زبان اور عربی تاریخ کا سب سے زیادہ محبوب سب سے زیادہ نمایاں اور سب سے زیادہ وسیع الاثر لفظ بن گیا۔ آج بھی ایک سلطان ایک رئیس ایک شیخ القبائل اپنے عزیز و اقارب کو سفر کے وقت رخصت کرتا ہے تو کہتا ہے "سالماً غانماً" یعنی سلامت آؤ اور لوٹ کر لاؤ۔ ہماری زبان میں سب سے عزیز چیز کو جو "غنیمت" کہتے ہیں (مثلاً آپ کا تشریف لانا نہایت غنیمت ہے) یہ وہی لفظ ہے اور عربی زبان سے آیا ہے۔

ضرورت معاش کی وجہ سے تمام عرب میں غارتگری اور جنگ عام ہو گئی تھی تمام قبائل ایک دوسرے پر ڈاکہ ڈالتے اور لوٹ مار کرتے رہتے تھے صرف حج کے زمانہ میں مذہبی خیال سے چار مہینے مخصوص کر دیئے تھے جن کو "اشہر حرم" کہتے تھے ان مہینوں میں لڑائیاں بند ہو جاتی تھیں لیکن مسلسل تین تین مہینے تک معاش کا معطل رہنا سخت گراں تھا اس لئے "نسئی" ایک رسم ایجاد کر لی تھی یعنی ان مہینوں کو حسب ضرورت ادھر کے مہینوں سے بدل لیتے تھے۔

حافظ ابن حجر صحیح بخاری کی شرح (تفسیر سورۂ توبہ) میں لکھتے ہیں:

﴿کانوا یحلون المحرم صفرا او یحلون صفرا المحرم لئلا یتوالی علیهم ثلاثة اشهر لا یتعاطون فیها القتال﴾ (فتح الباری ج ۸ ص ۲۳۴)

وہ محرم کو صفر اور صفر کو محرم کر دیا کرتے تھے تاکہ پے در پے تین مہینے تک لڑائی سے محروم نہ ہو جائیں۔

ثار کا عقیدہ:

لڑائی کا اصلی ابتدائی سبب یہ تھا لیکن جب یہ سلسلہ چھڑ جاتا تو اور اسباب بھی پیدا ہو گئے اور یہ اسباب اہمیت اور وسعت کے لحاظ سے اصلی سبب سے کم نہ تھے ان میں سب سے مقدم اور شدید الاثر ثار کا قانون تھا یعنی جب کسی قبیلہ کا کوئی شخص کسی موقع پر قتل ہو جاتا تھا تو مقتول کے قبیلہ کو اس کا انتقام لینا فرض ہو جاتا تھا سینکڑوں برس گذر جاتے تھے اور قاتل بلکہ اس کے خاندان کا نام و نشان مٹ جاتا تھا تاہم جب تک قاتل کے قبیلے کے ایک آدمی کو قتل نہیں کر لیتا تھا تو یہ فرض سے ادا نہیں ہو سکتا تھا اسی کو ثار کہتے ہیں اور اسی کا نتیجہ تھا کہ ایک معمولی قتل پر سینکڑوں بلکہ ہزاروں برس تک مسلسل لڑائیاں قائم ہو جاتی تھیں اسی طریقہ کے ابطال کو آنحضرت ﷺ نے حجۃ الوداع میں اعلان کیا تھا اور اپنے قبیلہ کے مقتولوں کا خون معاف کر دیا تھا لیکن صحرانشین عربوں میں آج تک یہ طریقہ قائم ہے اور ان کے قومی خصائص کا جزو اعظم ہے۔

ثار کے متعلق عجیب عجیب قسم کے معتقدات پیدا ہو گئے تھے مثلاً یہ کہ مقتول جب مر جاتا ہے تو اس کی روح ایک پرند بن جاتی ہے اور جب تک اس کا انتقام نہیں لیا جاتا مقام قتل پر شور کرتی رہتی ہے کہ "مجھ کو پلاؤ میں پیاسی ہوں" اس پرند کو صدی یا ہامہ کہتے تھے۔

ابو داؤد ایادی کہتا ہے۔

سلط الموت والمنون علیهم ... فلهم فی صدی المقابر هام

---

۱ [illegible]

ان پر موت مسلط ہوگی اور عرب کے "صدیٰ" ان کے لئے "ہام" ہے

ذوالاصبع العدوانی کا شعر ہے

یا عمرو الا تدع شتمی و منقصتی   اضربک حیث تقول الهامة اسقونی

اے عمرو! اگر تو مجھ کو گالی دینا اور میری تحقیر کرنا نہ چھوڑے گا تو میں تجھ کو اس طرح ماروں گا کہ ہامہ کہے گی کہ مجھ کو سیراب کرو

ایک یہ خیال تھا کہ جس مقتول کا انتقام نہیں لیا جاتا اس کی قبر میں ہمیشہ اندھیرا رہتا ہے عمرو بن معدی کرب کی بہن مقتول کی زبان سے کہتی ہے

و اُترک فی قبر بصعدة مظلم   خون بہا لو گے تو میں اندھیری قبر میں چھوڑ دیا جاؤں گا۔

اسی بنا پر خون بہا لینے کو عیب سمجھتے تھے اسی شاعرہ کا مصرع ہے۔

و مشوا باذان النعام المصلم   اور خون بہا لیا ہے تو بے گوش شتر مرغ کا کان کاٹ کر لے جاؤ۔

غیرت اور حمیت کی بنا پر اس بات کو عیب سمجھتے تھے کہ مقتول پر نوحہ کیا جائے

ولا ترهم وان جلت مصيبتهم   مع البكاة على من مات يبكونا

گو کتنی ہی بڑی مصیبت ہو لیکن ان کو مرنے والے پر روتا ہوا نہ دیکھو گے

عمرو بن کلثوم:

معاذ الاله ان تنوح نساؤنا   علی هالک او ان نضج من القتل

خدا نہ کرے کہ ہماری عورتیں مقتول پر نوحہ کریں یا ہم قتل سے گھبرا جائیں

مقتول کا نوحہ اس وقت کرتے تھے جب خون کا انتقام لے لیتے تھے۔

من كان مسرورا بمقتل مالك   فليات نسوتنا بوجه نهار

جو شخص مالک کے قتل سے خوش ہو وہ دن کو ہماری عورتوں کے پاس آئے۔

يجد النساء حواسرا يندبنه   يلطمن اوجههن بالاسحار

وہ دیکھے گا کہ عورتیں کھلے سر نوحہ کر رہی ہیں اور صبح کو اپنے چہروں پر طمانچے مار رہی ہیں

ایک خیال یہ تھا کہ جو شخص زخم کھا کر مرتا ہے اس کی روح زخم کی راہ سے نکلتی ہے اور جو ناک کی راہ سے نکلتی ہے اور یہ نہایت عیب سمجھا جاتا تھا اسی بنا پر بیماری سے مرنے کو "حتف انف" کہتے تھے یعنی "ناک کی موت" اور ایسے مرنے کو نہایت عار سمجھتے تھے۔

وما مات منا سيد حتف انفه   ولا طل منا حيث كان قتيل

ہمارا کوئی سردار ناک کی راہ سے نہیں مرا اور نہ ہمارے کسی مقتول کا خون ہدر ہوا

رفتہ رفتہ عرب کے تمام قومی مفاخر اور اخلاق و عادات کا محور جنگ بن گئی۔ یعنی ان کے اوصاف و اخلاق میں جس چیز کا اصلی سبب تلاش کیا جائے یہی چیز نکلتی تھی۔ یہی چیز تھی جس نے ایک مدت تک قبائل عرب کو اسلام لانے سے باز

باوجود اس کے آنحضرت ﷺ نے شراب کی حرمت کے متعلق اس قدر تاکید و تصریح کی ضرورت خیال کی کہ جس قسم کے برتنوں میں شراب پیتے تھے توڑ دیئے۔ لوگوں نے عرض کی کہ شراب کا سرکہ بنالیں؟ اس سے بھی منع فرمایا۔ ان سب باتوں پر بھی حضرت عمرؓ کے زمانہ میں بعض لوگوں نے شرابیں پیں اور جب ان سے باز پرس کی گئی تو انہوں نے نیک نیتی سے کہا کہ نیک اور اچھے آدمیوں کے لئے شراب کہاں حرام ہے؟ قرآن مجید میں خود شراب کی حرمت کے بعد یہ تصریح موجود ہے:

﴿لَيْسَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جُنَاحٌ فِيمَا طَعِمُوا﴾ (مائدہ-۱۲)

جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کئے انہوں نے جو کچھ کھایا (یعنی شراب پی) اس پر کچھ الزام نہیں۔

اس موقع پر بہت سے صحابہ موجود تھے۔ حضرت عمرؓ نے عبداللہ بن عباسؓ کی طرف دیکھا کہ اس آیت سے کیا مراد ہے؟ انہوں نے کہا کہ یہ ان صحابہ کی نسبت ہے جو شراب کی حرمت نازل ہونے سے پہلے مر گئے۔ حضرت عمرؓ نے تصدیق کی اور ان لوگوں کو سزا دی۔ چنانچہ یہ واقعہ تفصیل کے ساتھ تاریخ طبری میں مذکور ہے۔

اس تفصیل سے مقصود یہ ہے کہ جب کوئی چیز زمانہ دراز سے رسم و عادت میں داخل ہو جاتی ہے تو اس کے آثار اور نتائج مدتوں تک قائم رہتے ہیں اور غنیمت کا بھی یہی حال ہے۔

سب سے پہلے جنگ بدر میں قبل اس کے کہ مال غنیمت یکجا جمع کیا جاتا لوگ غنیمت میں مصروف ہو گئے۔ اس پر یہ آیت اتری

﴿لَوْلَا كِتَابٌ مِّنَ اللَّهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَا أَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ﴾ (انفال-۹)

اگر اللہ کی طرف سے پہلے سے حکم نہ ہو چکا ہوتا تو جو کچھ لیا اس پر تم کو عذاب ہوتا۔

چنانچہ ترمذی تفسیر انفال میں یہ واقعہ بہ تصریح مذکور ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اعلان فرمایا تھا کہ "جو شخص کسی کافر کو قتل کرے گا اس کا مال و اسباب قاتل کو ملے گا۔" اس بنا پر لوگوں نے سلب مال کا دعویٰ کیا جو صحابہؓ خود لڑے نہ تھے بلکہ مجاہدوں کے محافظ تھے ان کا دعویٰ تھا کہ اس میں ہمارا بھی حق ہے[1] اس پر یہ آیت اتری

﴿يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْأَنفَالِ ۖ قُلِ الْأَنفَالُ لِلَّهِ وَالرَّسُولِ﴾ (انفال-۱)

لوگ تجھ سے غنیمت کے متعلق پوچھتے ہیں کہدے غنیمت اللہ اور رسول کی ہے۔

اس آیت سے مقصود یہ ہے کہ مجاہدین مال غنیمت کا خود دعویٰ نہیں کر سکتے اس کی تقسیم آنحضرت ﷺ کے قبضہ میں ہے جس طرح آپ چاہیں تقسیم فرمائیں۔ اس سے اتنا ہوا کہ لڑائیوں میں ہر شخص لوٹ کر جو چیز چاہتا تھا لے لیتا تھا بند ہو گیا لیکن میدان جنگ کے علاوہ اور موقعوں پر لوٹنا مدتوں موقوف نہیں ہوا۔ سنن ابی داؤد[2] میں ایک انصاری سے روایت ہے کہ ہم لوگ آنحضرت ﷺ کے ساتھ ایک سفر میں شریک تھے بھوک کی سخت تکلیف ہوئی اتفاقاً سامنے بکریاں نظر پڑیں ان کو لوٹ لائے اور ذبح کر کے ہانڈیاں چڑھا دیں۔ آنحضرت ﷺ کو خبر ہوئی تو آپ تشریف لائے

---

۱ سنن ابی داؤد باب النفل

۲ کتاب الجہاد باب النہی عن النہبی

اور کھانا جو ہانڈیوں میں تھا اس سے ہانڈیاں الٹ دیں اور فرمایا کہ "لوٹ کی چیز مردہ سے بڑھ کر حلال نہیں"۔

خیبر کی لڑائی ۷ھ میں ہوئی۔ اس وقت تک یہ حالت تھی کہ اس کے بعد لوگوں نے یہودیوں کے جانور اور پھل لوٹ لئے اس پر آنحضرت ﷺ کو نہایت غصہ آیا، آپ نے تمام صحابہؓ کو جمع کیا اور فرمایا:

﴿ان اللہ لم یحل لکم ان تدخلوا بیوت اھل الکتاب الا باذن ولا ضرب نسائھم ولا اکل ثمارھم اذا اعطوکم الذی علیھم﴾ (ابو داؤد [illegible])

خدا نے تم لوگوں کے لئے یہ جائز نہیں کیا کہ اہل کتاب کے گھروں میں گھس جاؤ مگر (با اجازت) اور نہ یہ کہ ان کی عورتوں کو مارو اور نہ یہ کہ ان کے پھل کھا جاؤ جب کہ وہ تم کو ادا کر دیں جو ان پر فرض ہے۔

آنحضرت ﷺ چاہتے تھے کہ غنیمت کے ساتھ لوگوں کا جو شغف ہے کم ہو جائے لیکن مدت تک غنیمت کی محبت اور دلدادگی نہ گئی۔ غزوۂ احد میں صرف اسی وجہ سے شکست ہوئی کہ آنحضرت ﷺ نے اگرچہ تیر اندازوں کو سخت تاکید فرما دی تھی کہ لڑائی کی کچھ حالت ہو تم اپنی جگہ سے نہ ہٹنا تاہم جب فتح ہوئی تو لوگ بے اختیار لوٹ میں مصروف ہو گئے ان کا ہٹنا تھا کہ دشمن نے موقع پا کر پشت کی طرف سے حملہ کر دیا حنین میں بھی شکست کی اصلی وجہ یہی تھی کہ قبل از وقت لوگوں نے غنیمت لوٹنی شروع کر دی تھی۔

"غنیمت" اس قدر محبوب تھی کہ بعض صحابیوں کو کسی کافر کے مسلمان ہونے پر اس بنا پر رنج ہوا کہ اسلام لانے کی وجہ سے اس کا مال نہ مل سکا۔ سنن ابی داؤد میں ہے کہ ایک صحابی نے ایک سریہ میں حملہ کرنا چاہا قبیلہ والے روتے ہوئے آئے انہوں نے کہا لا الہ الا اللہ کہو تو تمہاری جان اور مال بچ جائے گا انہوں نے لا الہ الا اللہ کہا اور ان کو امن دے دیا گیا۔ جب یہ اپنے ساتھیوں کے پاس آئے تو لوگوں نے ان کو ملامت کی کہ

﴿حرمتنا الغنیمۃ﴾ [2]

تم نے ہم کو غنیمت سے محروم کر دیا۔

آنحضرت ﷺ کے پاس جب یہ لوگ گئے تو آپ نے ان صحابیؓ کی تحسین کی اور فرمایا "کہ تم کو ایک ایک آدمی کے بدلے جس کو تم نے چھوڑ دیا اس اس قدر ثواب ملے گا"۔

سب سے بڑھ کر عجیب بات یہ تھی کہ مدت تک لوگ یہ سمجھا کئے کہ غنیمت حاصل کرنا ثواب کا کام ہے۔ سنن ابی داؤد میں ہے کہ ایک صحابیؓ نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ "یا رسول اللہ! ایک شخص جہاد پر جانا چاہتا ہے اور چاہتا ہے کہ کچھ مال ہاتھ آئے" آپ نے فرمایا کہ "اس کو کچھ ثواب نہیں ملے گا"۔ یہ جواب انہوں نے آ کر لوگوں سے بیان کیا تو لوگوں کو بہت تعجب ہوا اور ان سے کہا کہ تم نے آنحضرت ﷺ کا مطلب نہیں سمجھا پھر جا کر پوچھو انہوں نے دوبارہ پوچھا اور وہی جواب ملا لوگوں نے پھر ان کو بھیجا اور پھر آنحضرت ﷺ نے یہی فرمایا کہ اس کو کچھ ثواب نہیں ملے گا۔

اس قسم کے اور بہت سے واقعات ہیں۔

۱؎ ابوداؤد باب [illegible] کتاب الجہاد

۲؎ سنن ابی داؤد [illegible]

وحشیانہ افعال:

عرب میں لڑائیوں کی شدت اور وسعت نے نہایت وحشیانہ رسمیں قائم کر دی تھیں جن میں سے چند کی تفصیل یہ ہے:

(۱) اسیران جنگ کو جب قتل کرتے تھے تو چھوٹے بچوں اور عورتوں کو بھی قتل کرتے تھے بلکہ آگ میں جلا دیتے تھے۔ ۱

(۲) غفلت یا نیند کی حالت میں دفعۃً دشمن پر جا پڑتے تھے اور قتل و غارت گری شروع کر دیتے تھے یہ طریقہ عام اور کثرت سے رائج تھا۔ بہت سے بہادر اس خاص طریقہ میں زیادہ ممتاز تھے اور ان کو فاتک یا فتاک کہتے تھے تابط شرا، سلیک ابن السلکہ اسی قسم کے لوگ تھے۔

(۳) زندوں کو آگ میں جلا دیتے تھے۔ عمرو بن ہند (عرب کا ایک بادشاہ تھا) کے بھائی کو جب بنو تمیم نے قتل کر دیا تو اس نے سخت قسم کھائی کہ ایک کے بدلے سو آدمیوں کو قتل کروں گا۔ چنانچہ بنو تمیم پر حملہ کیا، وہ لوگ بھاگ گئے۔ صرف ایک بڑھیا رہ گئی تھی جس کا نام حمراء تھا، اس کو گرفتار کر کے زندہ آگ میں ڈال دیا، اتفاق یہ کہ ایک سوار جس کا نام عمار تھا آ نکلا، عمرو نے پوچھا تو کیوں آیا، اس نے کہا کئی دن کا بھوکا تھا دھواں اٹھتے دیکھا تو سمجھا کھانا ہو گا، عمرو نے حکم دیا کہ وہ بھی آگ میں ڈال دیا جائے۔ چنانچہ اس حکم کی تعمیل کی گئی۔ جریر نے اپنے شعر میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے

واخزاكم عمرو كما قد خزيتهم   وادرك عمارا شقي البراجم

(۴) بچوں کو نشانہ بنا کر تیروں سے مارتے تھے، داحس اور غبراء کی لڑائیوں میں قیس نے بنو ذبیان کے پاس اپنے بچے ضمانت کے طور پر رکھے تھے، حذیفہ نے جو بنو ذبیان کا رئیس تھا ان بچوں کو لے جا کر ایک وادی میں کھڑا کیا، وہاں ان کو نشانہ بنا کر تیر اندازی کرتا تھا، اتفاق سے کوئی لڑکا مر جاتا تو دوسرے دن پھر شکار کیا جاتا تھا۔ چنانچہ دوسرے دن یہ تفریح انگیز چاند ماری پھر شروع ہوتی ۲ تھی اور لوگ یہ تماشا دیکھتے تھے۔

(۵) قتل کا ایک یہ طریقہ تھا کہ ہاتھ پاؤں اور دیگر اعضاء کاٹ کر چھوڑ دیتے تھے کہ وہ تڑپ تڑپ کر مر جاتا۔ غطفان اور عامر کی لڑائی میں اسی خوف سے حکم بن الطفیل نے اپنے آپ کو خود گلا گھونٹ کر مار ڈالا تھا جیسا کہ عقد الفرید میں یہ تفصیل مذکور ہے۔

عرینہ کے لوگ جو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں بظاہر اسلام لا کر آنحضرت کے غلام کو پکڑ لے گئے تو اس کے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالے پھر ان کی آنکھوں اور زبان میں کانٹے چبھوئے یہاں تک کہ وہ تڑپ تڑپ کر مر گئے۔ ۳

(۶) مرنے کے بعد بھی انتقام کا جوش طرح طرح کی نفرت انگیز صورتوں میں ظاہر ہوتا تھا، مردوں کے ہاتھ پاؤں، کان اور ناک وغیرہ کاٹ لیتے تھے، ہند نے جنگ احد میں اسی رسم کے موافق حضرت حمزہؓ اور دیگر شہداء کے اعضا

---

۱ مجمع الامثال زیر مثل مطبوعہ مصر جزء ۲ ص ۳۲۸

۲ مجمع الامثال ص ۵۰۷

۳ یہ واقعہ تمام کتب حدیث میں مذکور ہے لیکن یہ تفصیل طبقات ابن سعد حصہ اول ص ۶۷ سے ماخوذ ہے مسلم میں صرف آنکھوں کو اندھا کرنا مذکور ہے۔

کاٹ کر ہار بنایا اور گلے میں پہنا تھا۔

(۷) منت مانتے تھے کہ دشمن پر قابو ہاتھ آئے گا تو اس کی کھوپڑی میں شراب پئیں گے۔ سلافہ کے دو بیٹے جنگ احد میں عاصمؓ کے ہاتھ سے مارے گئے تھے اس بنا پر سلافہ نے منت مانی کہ عاصمؓ کی کھوپڑی میں شراب ڈال کر پئے گی۔ یہ بھی معمول تھا کہ مقتولوں کا کلیجہ نکال کر کھا جاتے تھے، ہند نے حضرت حمزہؓ کا کلیجہ جو نکال کر چبایا تھا اس کا حال اوپر گزر چکا ہے۔

(۸) حاملہ عورتوں کا پیٹ چاک کر ڈالتے اور اس پر فخر کرتے تھے۔ عامر بن طفیل عرب کا مشہور بہادر اور رئیس ہوازن کہتا ہے

بقرنا الحبالى من شنوءة بعدما ... خبطن بغيف فرمح نهدا و خثعما

غزوات نبوی کے اسباب اور انواع: [۲]

تفصیل مذکورۂ بالا کے بعد اب ہم اس واقعہ کی تحقیق کی طرف متوجہ ہوتے ہیں کہ غزوات نبوی کن اسباب سے وجود میں آئے اور شارع نے عرب جاہلیت قدیمہ میں کیا اصلاحیں فرمائیں۔ مورخین نے "غزوہ" کے لفظ کو اس قدر وسعت دی ہے کہ امن و امان قائم رکھنے کے لئے دو چار آدمی بھی کہیں بھیج دیئے گئے تو اس کو بھی انہوں نے غزوہ میں شمار کر لیا۔ غزوہ کے علاوہ ایک اور لفظ ہے یعنی "سریہ"۔ غزوہ اور سریہ میں لوگوں کے نزدیک یہ فرق ہے کہ غزوہ میں کم سے کم آدمیوں کی ایک خاص تعداد ضروری ہے، سریہ میں کوئی قید نہیں، ایک آدمی بھی کہیں لڑائی کی دیکھ بھال کو بھیج دیا گیا تو یہ بھی سریہ ہے۔ بعضوں کے نزدیک غزوہ کے لئے یہ شرط ہے کہ آنحضرت ﷺ نے بنفس نفیس اس میں شرکت کی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ جن واقعات کو مورخین سریہ کہتے ہیں وہ چند قسموں پر منقسم ہے

(۱) محکمۂ تجسس یعنی دشمنوں کی نقل و حرکت کی خبر رسانی۔

(۲) دشمنوں کے حملہ کی خبر سن کر مدافعت کے لئے پیش قدمی کرنا۔

(۳) قریش کی تجارت کی روک ٹوک جس سے وہ مجبور ہو کر مسلمانوں کو حج و عمرہ کی اجازت دیں۔

(۴) امن و امان قائم کرنے کے لئے تعزیری فوجیں بھیجنا۔

(۵) اشاعت اسلام کے لئے لوگ بھیجے گئے اور حفاظت کے خیال سے کچھ فوج ساتھ کر دی گئی، اس صورت میں تاکید کر دی جاتی تھی کہ تلوار سے کام نہ لیا جائے۔

غزوہ کی صرف دو صورتیں تھیں

(۱) دشمنوں نے دار الاسلام پر حملہ کیا اور ان کا مقابلہ کیا گیا۔

(۲) یہ معلوم ہوا کہ دشمن مدینہ پر حملہ کی تیاری کر رہے ہیں اور پیش قدمی کی گئی۔

---

۱ طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۳۹ (سریۂ مرثد بن ابی مرثد) "ق س"

۲ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ یہ بحث تمام تر تاریخی حیثیت سے ہے جہاد کی اصل حقیقت پر بحث کتاب کی دوسری جلدوں میں آئے گی

آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں جو لڑائیاں واقع ہوئیں یا اس قسم کے جو واقعات پیش آئے وہ مختلف اغراض سے تھے۔

۱۔ آنحضرت ﷺ جب مکہ سے چلے آئے تو قریش نے فیصلہ کر لیا کہ اسلام کو مٹا دیا جائے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اگر اسلامی تحریک قائم رہی تو ایک طرف ان کے مذہب کو صدمہ پہنچے گا، دوسری طرف تمام عرب میں ان کا جو تفوق اور اثر اور مرجعیت عام ہے سب جاتا رہے گا۔ اس بنا پر ایک طرف تو قریش نے خود مدینہ پر حملہ کی تیاریاں شروع کیں، دوسری طرف تمام قبائل عرب کو بھڑکایا کہ یہ نیا گروہ اگر کامیاب ہو گیا تو تمہاری آزادی بلکہ ہستی بھی فنا ہو جائے گی۔

بیعت عقبہ میں جب انصار آنحضرت ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کر رہے تھے تو ایک انصاری نے کہا "برادران من! جانتے ہو کس چیز پر بیعت کر رہے ہو؟ یہ عرب و عجم سے اعلان جنگ ہے۔" اوپر ہم مسند دارمی وغیرہ کے حوالے سے نقل کر آئے ہیں کہ آنحضرت ﷺ جب مدینہ میں تشریف لائے تو تمام عرب مدینہ پر حملہ کے لئے تیار ہو گیا تو نوبت یہاں تک پہنچی کہ مدینہ میں مہاجرین اور انصار رات کو سوتے تھے تو ہتھیار باندھ کر سوتے تھے۔ اوپر گزر چکا ہے [بحوالہ ابوداؤد] کہ قریش نے عبداللہ بن ابی کو پیغام بھیجا تھا کہ "محمد کو وہاں سے نکال دو ورنہ ہم خود مدینہ آ کر تمہارا اور محمد دونوں کا فیصلہ کر دیں گے۔"

محکمۂ تفتیش:

ان واقعات کی بنا پر ضروری تھا کہ اسلام اور دارالاسلام کی حفاظت کے لئے ضروری تدبیریں اختیار کی جائیں۔ اس سلسلہ کا سب سے پہلا کام یہ تھا کہ خبر رسانی اور جاسوسی کا انتظام وسیع پیمانہ پر کیا جائے۔ چنانچہ ابتدا ہی سے آنحضرت ﷺ نے اس انتظام پر توجہ کی اور اکثر کثرت سے چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں بنا کر مختلف مقامات پر بھیجتے رہتے تھے۔ یہ ٹکڑیاں کبھی خبر رسانی کے لئے جاتی تھیں، کبھی حفاظت کی غرض سے مسلح اور جمعیت کی صورت میں جاتی تھیں۔

یہی واقعات ہیں جن کو مورخین "سرایا" سے تعبیر کرتے ہیں اور ان کے نزدیک ان کا مقصد کسی قافلہ کا لوٹنا یا کسی جماعت پر بے خبری کی حالت میں جا پڑنا تھا۔ ایک بڑا قرینہ اس بات کا کہ ان دستوں کے بھیجنے سے حملہ کرنا مقصود نہیں ہوتا تھا۔ یہ ہے کہ یہ دستے اکثر دس دس بارہ بارہ آدمیوں سے زیادہ نہیں ہوتے تھے اور یہ ظاہر ہے کہ اتنے تھوڑے سے آدمی لڑنے کے لئے نہیں بھیجے جا سکتے تھے۔ مثلاً ۲ھ میں آنحضرت ﷺ نے عبداللہ بن جحش کو بارہ آدمیوں کے ساتھ نخلہ کی طرف بھیجا اور ایک سربمہر تحریر دی کہ دو دن کے بعد اس کو کھولنا۔ دو دن کے بعد انہوں نے کھولا تو اس میں یہ الفاظ تھے

﴿فسر حتى تنزل نخلة بين مكة و الطائف فترصد بها قريشا و تعلم لنا من اخبارهم﴾ (طبری صفحہ ۱۲۷۴)

جاؤ، چلتے جاؤ یہاں تک کہ نخلہ میں جو کہ مکہ اور طائف کے بیچ میں ہے۔ جا کر قریش کی دیکھ بھال کرتے رہو

۱۔ [illegible]

۲۔ [illegible]

ان کی خبریں دریافت کرو۔

مدافعت:

اس انتظام کا یہ نتیجہ تھا کہ جب کوئی مدینہ پر حملہ کرنے کا ارادہ کرتا تو فوراً خبر ہو جاتی اور پیش دستی کر کے فوج بھیج دی جاتی تھی۔ اکثر سرایا اسی قسم کے تھے اور چونکہ ہم سرایا کا ذکر زیادہ تر اجمالاً کرتے آئے ہیں اس لئے مثال کے طور پر چند سرایا کا ذکر کرتے ہیں اور قدمائے اہل سیر کی تصریحات سے ثابت کرتے ہیں کہ یہ مہمات مدافعت کی غرض سے تھیں

سریۂ غطفان ۳ھ:

﴿و ذلک انه بلغ رسول الله ﷺ ان جمعا من بنی ثعلبة و محارب بذی امر قد تجمعوا يريدون ان يصيبوا من اطراف رسول الله ﷺ جمعهم رجل منهم يقال له دعثور بن الحارث﴾ (مغازی طبقات صفحہ ۲۳)

اس غزوہ کا سبب یہ تھا کہ آنحضرت ﷺ کو خبر پہنچی کہ قبیلہ ثعلبہ اور محارب کی ایک جماعت ذوامر میں اس غرض سے جمع ہوئی ہے کہ آنحضرت ﷺ کی طرف حملہ کرے۔ اس فوج کو ایک شخص نے فراہم کیا جس کا نام دعثور ہے۔

سریہ ابو سلمہؓ ۴ھ:

﴿و ذلک انه بلغ رسول الله صلى الله عليه وسلم ان طليحة و سلمة ابنی خويلد قد سارا فی قومهما و من اطاعهما يدعونهم الی حرب رسول الله الخ﴾ (ابن سعد صفحہ ۳۵)

اس سریہ کی یہ وجہ تھی کہ آنحضرت ﷺ کو خبر ملی کہ طلیحہ اور سلمہ پسران خویلد دونوں اپنی قوم اور اپنے ہواخواہوں کو لے کر آنحضرت ﷺ سے لڑنے کے لئے روانہ ہوئے ہیں۔

سریہ عبداللہ بن انیس بغرض قتل سفیان بن خالد ۴ھ:

﴿و ذلک انه بلغ رسول الله ﷺ ان سفيان بن خالد الهذلی ثم اللحيانی و کان ينزل عرنة و ما والاها فی ناس من قومه و غيرهم قد جمع الجموع لرسول الله صلى الله عليه وسلم﴾

ابن انیس اس لئے بھیجے گئے تھے کہ آنحضرت ﷺ کو خبر ملی کہ سفیان بن خالد اپنے قبیلہ کو اور باہر کے لوگوں کو آنحضرت ﷺ سے لڑنے کے لئے جمع کر رہے تھے۔

غزوۂ ذات الرقاع ۵ھ:

﴿فاخبر اصحاب رسول الله ﷺ ان انمارا و ثعلبة قد جمعوا لهم الجموع .... [illegible]﴾

ایک جاسوس نے آ کر صحابہؓ کو اطلاع کی کہ انمار اور ثعلبہ وغیرہ مسلمانوں سے لڑنے کے لئے فوجیں جمع کر رہے ہیں آپ نکل کھڑے ہوئے۔

غزوۂ دومۃ الجندل ۵ھ:

﴿فلما بلغ رسول الله ﷺ ان بدومة الجندل جمعا کثيرا .... و انهم يريدون ان

يدنوا من المدينة ﴾ (ابن سعد صفحہ ۳۳)
یہ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کو خبر ملی کہ دومۃ الجندل میں ایک گروہ کثیر جمع ہے اور مدینہ پر چڑھنا چاہتا ہے

غزوۂ مریسیع ۵ھ

﴿ انّ بني المصطلق من خزاعة و هو من حلفاء بني مدلج و كان رأسهم و سيدهم الحارث بن ابي ضرار فسار في قومه و من قدر عليه من العرب فدعاهم الى حرب رسول الله فاجابوه ﴾ (ابن سعد صفحہ ۳۵)
قبیلۂ بنو مصطلق خزاعہ کی شاخ ہے اور یہ لوگ بنو مدلجؓ کے حلیف تھے، ان کا سردار حارث بن ابی ضرار تھا، اس نے اپنی قوم کو اور لوگوں کو جہاں تک اس کا بس چلا، رسول اللہ سے لڑنے کی دعوت دی اور لوگوں نے منظور کی۔

سریۂ علیؓ بن ابی طالب بطرف فدک ۶ھ:

﴿ بلغ رسول الله ﷺ ان لهم جمعا يريدون ان يمدوا يهود خيبر ﴾
آنحضرت ﷺ کو معلوم ہوا کہ بنو سعد فدک میں یہود خیبر کی کمک کے لئے فوج جمع کر رہے ہیں۔

سریۂ بشیر بن سعدؓ شوال ۷ھ:

﴿ بلغ رسول الله ﷺ ان جمعا من غطفان بالجناب قد واعدهم عيينة بن حصن ليكون معهم ليزحفوا الى رسول الله ﴾
آنحضرت ﷺ کو خبر پہنچی کہ غطفان کا ایک گروہ مقام جناب میں جمع ہے اور ان سے عیینہ بن حصن نے وعدہ کیا ہے کہ ان کے ساتھ مل کر رسول اللہ پر حملہ آور ہوگا۔

سریۂ عمروؓ بن العاص ذات سلاسل ۸ھ یہ مقام مدینہ سے ۱۰ منزل ہے

﴿ بلغ رسول الله ﷺ ان جمعا من قضاعة قد تجمعوا يريدون ان يدنوا من اطراف رسول الله ﷺ ﴾
آنحضرت ﷺ کو خبر پہنچی کہ قضاعہ کا ایک گروہ جمع ہوا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی طرف بڑھے۔

قریش کی تجارت کی روک ٹوک:

بخاری کے حوالے سے ہم اوپر نقل کر آئے ہیں کہ (قریش اور مسلمانوں میں جنگ چھڑنے سے پہلے) ابوجہل نے حضرت معاذ انصاریؓ سے کعبہ میں یہ کہا تھا کہ "اگر تم لوگ محمد کو پناہ دو گے تو تم کعبہ کا طواف نہیں کر سکتے۔" انہوں نے جواب دیا تھا کہ "تم نے اگر ہم کو کعبہ میں آنے سے روکا تو ہم تمہاری شام کی تجارت روک دیں گے" (مکہ سے شام کو جو قافلہ جاتا تھا مدینہ اس کی راہ میں پڑتا تھا) کعبہ مسلمانوں کی خاص چیز تھی کہ اس کو جس نے تعمیر کیا تھا مسلمان اسی کے دین (ابراہیمی) کے پیرو تھے، باوجود اس کے قریش نے مسلمانوں کو حج اور عمرہ سے روک دیا اور اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ ان کا کاروان تجارت روک دیا جائے کہ وہ مجبور ہو کر مسلمانوں کو کعبہ کے اندر جانے کی اجازت دے دیں۔

بعض سرایا قبل حدیبیہ:

سرایا کے ذکر میں اکثر جگہ اہل سیر لکھتے ہیں کہ "تسعرض لعیر قریش" "یعنی" اس لئے فوجیں بھیجی گئیں یا خود آنحضرت ﷺ تشریف لے گئے کہ کاروان قریش کی روک ٹوک کی جائے" یہ تمام مہمات اسی غرض کے لئے تھیں چونکہ قریش تجارت کے لئے بھی ہتھیار بند ہو کر نکلتے تھے اور کم از کم سو دو سو کی جمعیت ساتھ لے کر جاتے تھے اس لئے روک ٹوک میں کبھی کبھی مقابلہ پیش آ جاتا تھا اور جب قریش شکست کھا کر بھاگ جاتے تھے تو مال تجارت غنیمت میں ہاتھ آتا تھا۔ اہل سیر غلطی سے ان واقعات کو اس پیرایہ میں لکھتے ہیں کہ قافلہ کا لوٹنا ہی اصلی مقصد تھا۔

یہی روک ٹوک جس کی بنا پر قریش نے بالآخر حدیبیہ کی صلح کر لی جس کے رو سے مسلمانوں کو چند خاص پابندیوں کے ساتھ حج کی اجازت مل گئی قریش پر کاروان تجارت کی روک ٹوک کا اس قدر اثر پڑتا تھا کہ (حضرت ابوذر غفاریؓ نے مکہ میں جب اپنے اسلام کا اعلان کیا اور قریش نے اس جرم میں ان کو مارنا پیٹنا شروع کیا اور حضرت عباسؓ نے کہا کہ غفار کا قبیلہ تمہارا کاروان تجارت کے سر راہ واقع ہے تمہاری اس حرکت سے برہم ہو کر وہ راستہ نہ روک دے تو یہ تدبیر پوری کارگر ہوئی اور انہوں نے ڈر کر حضرت ابوذرؓ کو چھوڑ دیا) صلح حدیبیہ کے بعد قریش کی خواہش کے مطابق جب یہ طے ہوا کہ آنحضرت ﷺ مکہ کے نومسلموں کو واپس دے دیں گے اور ان نومسلموں نے مکہ سے بھاگ کر شام کی راہ میں اپنا ایک مستقر قائم کر لیا (اور قریش کی تجارت کی راہ کو غیر مامون کر دیا) تو قریش نے بالآخر اجازت دے دی کہ جو مسلمان چاہے مکہ سے مدینہ چلا جائے ان کی طرف سے کوئی روک ٹوک نہ ہو گی (پھر آئندہ سال انہوں نے مسلمانوں کو حج و عمرہ کی بھی اجازت دے دی اس کے بعد پھر کبھی مسلمانوں نے قریش کے کاروان تجارت سے تعرض نہیں کیا بلکہ خود اس کی حفاظت کے لئے فوج بھیجتے تھے۔) [1]

امن و امان قائم کرنا:

اوپر گذر چکا ہے کہ عرب میں اس سرے سے اس سرے تک مطلق امن و امان نہ تھا تمام قبائل باہم لڑتے رہتے تھے یہاں تک کہ محترم مہینوں میں بھی بہانے نکال کر مہینوں کے نام بدل دیتے تھے اور لڑتے تھے تجارت بالکل غیر محفوظ تھی قافلوں کا لوٹ لینا عام بات تھی جیسا کہ بدقسمتی سے آج بھی بدو قافلوں کو لوٹتے رہتے ہیں۔[2]

رسول اللہ ﷺ کو اللہ نے اس لئے بھیجا تھا کہ نہ صرف وعظ و پند بلکہ دست و بازو سے بھی تمام عرب بلکہ تمام دنیا میں امن و امان قائم کریں کیونکہ خونریزی اور قتل سے زیادہ کوئی چیز اللہ کو ناپسند نہیں۔

﴿مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِى الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا﴾ (مائدہ۔۵)

اسی لئے ہم نے بنی اسرائیل کو لکھ دیا تھا کہ جس شخص نے ایک جان کو بغیر معاوضہ (یا زمین میں فساد) کے قتل کر دیا اس نے تمام عالم کو قتل کر دیا۔

---

۱ فتح الباری جلد ۸ صفحہ ۲۰۷۔ ۲ یہ صورت حال ۱۹۱۸ء میں تھی جب کتاب کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا۔

﴿وَإِذَا تَوَلَّىٰ سَعَىٰ فِي الْأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ﴾ (البقرۃ ۲۰۵)

اور جب وہ پھر جاتا ہے تو کوشش کرتا ہے کہ زمین میں فساد پیدا کرے اور کھیتی اور نسل کو برباد کرے اور اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا۔

﴿إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَنْ يُقَتَّلُوا أَوْ يُصَلَّبُوا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ مِنْ خِلَافٍ أَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْأَرْضِ﴾ (مائدہ ۔۵)

جو لوگ اللہ اور رسول سے لڑتے ہیں اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں ان کی سزا یہ ہے کہ وہ قتل کر دیے جائیں یا سولی دیے جائیں یا ان کا ایک ہاتھ اور دوسری طرف کا پاؤں کاٹ ڈالا جائے یا جلاوطن کر دیے جائیں۔

احادیث میں ہے کہ جب عدیؓ (حاتم طائی کے بیٹے) اسلام لائے تو آنحضرت ﷺ نے ان سے ارشاد فرمایا کہ "اللہ اس کام کو اس طرح پورا کرے گا کہ ایک شتر سوار صنعاء سے لے کر حضر موت تک سفر کرے گا اور کسی کو اللہ کے سوا بھیڑیے کے سوا (کہ اس کی بکریاں نہ اٹھا لے جائے) اور کسی کا ڈر نہ ہوگا"[1] یہ ابوداؤد کے الفاظ ہیں صحیح بخاری[2] میں ہے کہ "اللہ اس کام کو اس طرح پورا کرے گا کہ ایک عورت حیرہ سے چلے گی اور آ کر کعبہ کی زیارت کرے گی اور اس کو اللہ کے سوا کسی کا ڈر نہ ہوگا" حضرت عدیؓ کہتے ہیں کہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ ایک عورت حیرہ سے سفر کر کے مکہ تک آتی ہے اور اس کو کسی کا ڈر نہیں ہوتا۔

بہت سے واقعات ہیں جن کو اہل سیر سرایا میں شمار کرتے ہیں لیکن وہ محض تجارت کی آمد و رفت اور عام امن و امان قائم کرنے کی غرض سے تھے۔ دو تین مثالیں ہم درج کرتے ہیں۔

سریۂ زیدؓ بن حارثہ:

۶ ھ میں حضرت زیدؓ مال تجارت لے کر شام گئے۔ واپس آتے ہوئے جب وادی قریٰ کے قریب پہنچے تو بنو فزارہ کے لوگوں نے آ کر ان کو مارا پیٹا اور تمام مال و اسباب چھین لے گئے۔ آنحضرت ﷺ نے ان کے تدارک کے لئے تھوڑی سی فوج بھیجی جس نے ان لوگوں کو سزا دی۔[3]

اسی سال میں اس سے پہلے حضرت دحیہ کلبیؓ جن کو آنحضرت ﷺ نے خط دے کر قیصر کے پاس بھیجا تھا شام سے واپس آ رہے تھے جب حسمیٰ پہنچے تو ہنید نے چند آدمیوں کے ساتھ ان پر ڈاکہ ڈالا اور جو کچھ ان کے پاس تھا سب چھین لیا یہاں تک کہ بدن کے کپڑے (وہ بھی جو پرانے رہ گئے تھے) چھوڑ دیے۔ آنحضرت ﷺ نے اس کے تدارک کے لئے حضرت زیدؓ کو بھیجا۔[4]

---

۱ صحیح بخاری باب ... صحابہ ... صفحہ ۱۰۲

۲ باب علامات النبوۃ

۳ طبقات ابن سعد حصہ مغازی صفحہ غزوات۔

۴ ابن سعد صفحہ ۶۳۔

اور اعراب پہاڑوں کی چوٹیوں پر بھاگ گئے۔

سریہ عکاشہؓ ۶ھ:

وبعث رسول اللہ ﷺ عکاشة بن محصن الی الغمر فی اربعین رجلا فخرج سریعا یعد السیر ...... فهربوا (ص ۶۳)

آنحضرت ﷺ نے عکاشہ بن محصن کو ۴۰ آدمیوں کے ساتھ بھیجا وہ یک لخت گئے...... لیکن وہ لوگ بھاگ گئے۔

سریہ علی ابن ابی طالب الی بنی سعد ۶ھ:

﴿بعث الیهم علی ابن ابی طالب فی مائة رجل فسار اللیل وکمن النهار حتی انتهی الی الهمج فاغاروا علیهم فاخذوا خمس مائة بعیر والفی شاة وهربت بنو سعد بالظعن﴾ (طبقات ابن سعد)

آنحضرت ﷺ نے حضرت علیؓ کو سو آدمیوں کے ساتھ بھیجا، وہ راتوں کو چلتے تھے اور دن کو چھپ رہتے تھے یہاں تک کہ مقام ہمج پہنچ گئے پھر ان لوگوں پر حملہ کیا اور پانچ سو اونٹ اور دو ہزار بکریاں لوٹیں اور بنو سعد مستورات کو لے کر بھاگ گئے۔

غزوۂ بنو لحیان ۶ھ:

فسمعت بهم بنو لحیان فهربوا فی رؤس الجبال (طبقات ابن سعد)

بنولحیان نے ان کی آمد کی خبر سنی تو پہاڑوں کی چوٹیوں پر بھاگ گئے۔

سریہ عمرؓ بن خطاب بطرف تربہ ۷ھ:

فکان یسیر اللیل ویکمن النهار فاتی الخبر هوازن فهربوا وجاء عمر بن الخطاب محالهم فلم یلق منهم احدا (طبقات ابن سعد)

راتوں کو چلتے تھے اور دن کو چھپ جاتے تھے ہوازن کو خبر لگ گئی تو وہ فرار ہو گئے حضرت عمرؓ ان کے پڑاؤ پر پہنچے تو کسی کو نہ پایا۔

سریہ کعب بن عمیر ربیع الاول ۸ھ:

اس سریہ کا یہ واقعہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے پندرہ ۱۵ آدمیوں کو شام کی طرف بھیجا ذات اطلاح پہنچ کر ان لوگوں کو ایک بڑی جماعت نظر آئی ان لوگوں نے ان کو اسلام کی دعوت دی انہوں نے انکار کر دیا اور ان پر تیر اندازی شروع کی مجبور ہو کر یہ لوگ بھی لڑے اور بالآخر سب شہید ہوئے صرف ایک صاحب بچے انہوں نے آ کر خبر دی، آنحضرت ﷺ نے ان سے انتقام لینا چاہا لیکن وہ لوگ یہ مقام چھوڑ کر کہیں اور چلے گئے۔ ابن سعد میں یہ الفاظ ہیں

﴿وهم بالبعث الیهم فبلغه انهم قد ساروا الی موضع آخر﴾

ان پر فوج بھیجنے کا ارادہ کیا پھر معلوم ہوا کہ وہ اور کہیں چلے گئے۔

﴿لَا يَرْقُبُونَ فِي مُؤْمِنٍ إِلًّا وَلَا ذِمَّةً إِنَّهُمْ لَا أَيْمَانَ لَهُمْ﴾ (توبہ۔۲)

کسی مسلمان کے متعلق وہ نہ کسی قسم کا لحاظ رکھتے ہیں نہ ذمہ داری کا ان کی قسم قسم نہیں۔

آنحضرت ﷺ نے سخت تاکید کی کہ جو عہد کیا جائے ہر حال میں اس کی پابندی کی جائے۔ قرآن مجید میں اس کے متعلق جابجا تاکیدی اور صاف احکام ہیں' عہد نبوت اور خلفائے راشدین ؓ کے زمانہ میں پابندی عہد کی حیرت انگیز مثالیں ملتی ہیں۔

آنحضرت ﷺ جب ہجرت کر کے مدینہ چلے آئے تھے تو بہت سے صحابہ مجبوریوں کی وجہ سے مکہ ہی میں رہ گئے تھے ان میں حذیفہ ؓ بن یمان اور ان کے والد بھی تھے' جنگ بدر کے موقع پر حذیفہ بن یمان ؓ اور ان کے والد کہیں سے آ رہے تھے' کفار نے ان کو پکڑ لیا کہ تم مدینہ جا کر پھر ہمارے مقابلہ کو آؤ گے' انہوں نے کہا ہمارا مقصد صرف مدینہ جانا ہے' کفار نے ان سے عہد لے کر چھوڑ دیا' یہ لوگ مقام بدر میں آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پہنچے اور یہ دیکھ کر کہ رسول اللہ ﷺ کفار سے مصروف جنگ ہیں' خود بھی اس سعادت کی آرزو کی' لیکن آنحضرت ﷺ نے ان کو باز رکھا کہ تم معاہدہ کر چکے ہو۔

ابورافع کو قریش نے قاصد بنا کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں بھیجا تھا بارگاہ نبوت میں آ کر ان پر یہ اثر ہوا کہ مسلمان ہو گئے اور عرض کی اب میں کافروں میں واپس نہ جاؤں گا' آپ نے فرمایا تم قاصد ہو اور قاصد کو روک لینا عہد کے خلاف ہے۔ اس وقت واپس جاؤ پھر آ جانا۔[1]

صلح حدیبیہ میں جب حضرت ابوجندل ؓ پابہ زنجیر آئے اور بدن کے داغ دکھائے کہ قریش مجھ کو قید کر کے اس طرح ستاتے ہیں' آپ ﷺ نے فرمایا ہاں لیکن قریش سے معاہدہ ہو چکا ہے کہ کوئی مسلمان مکہ سے بھاگ آئے گا تو ہم قریش کے پاس بھیج دیں گے' اس پر حضرت ابوجندل ؓ نے رو کر تمام مسلمانوں کو مخاطب کیا' لوگ جوش رقت سے بے قرار ہو گئے اور قریب تھا کہ قابو سے باہر ہو جائیں' حضرت عمر ؓ بے تاب ہو گئے' حضرت ابوبکر ؓ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بار بار جاتے تھے' یہ سب کچھ تھا لیکن پابندی عہد کی قیمت ان سب خطرات سے زیادہ تھی' حضرت ابوجندل ؓ کو پابہ زنجیر واپس جانا پڑا۔

اسلام سے پہلے قاصدوں کا قتل کر دینا ممنوع نہ تھا۔ صلح حدیبیہ سے پہلے آنحضرت ﷺ نے قریش کے پاس جو قاصد بھیجا تھا قریش نے اس کی سواری کے اونٹ کو مار ڈالا اور قاصد کو بھی قتل کر دینا چاہا لیکن باہر والوں نے بچا لیا۔

آنحضرت ﷺ نے حکم دیا کہ قاصد کبھی قتل نہ کئے جائیں' مسیلمہ نے جب قاصد بھیجا اور اس نے گستاخانہ گفتگو کی تو آپ نے فرمایا کہ ''قاصد کا قتل کرنا دستور نہیں ورنہ تو قتل کر دیا جاتا'' مورخین اس واقعہ کو لکھ کر لکھتے ہیں کہ اس دن سے یہ ایک قاعدہ بن گیا کہ قاصد قتل نہیں کئے جاتے تھے۔

اسیران جنگ کے ساتھ عرب نہایت برا سلوک کرتے تھے اور تمام قوموں میں بھی یہی طریقہ جاری تھا۔ جنگ صلیبی میں یورپین سلطنتیں جب مسلمانوں کو لڑائیوں میں گرفتار کرتی تھیں تو ان سے جانوروں کی طرح کام لیتی تھیں۔

---

[1] ابوداؤد جلد دوم صفحہ ۱۹ باب فی قتل الاسیر

علامہ ابن جبیر جب حروب صلیبیہ کے زمانہ میں عکہ سے گزرے ہیں تو یہ حالت دیکھ کر تڑپ گئے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

﴿ومن الفجائع التي يعاينها من حل بلادهم اسرى المسلمين يرسفون في القيود ويصرفون في الخدمة الشاقة والاسيرات المسلمات كذلك في اسوقهن خلاخيل حديد فتنفطر لهم الاكباد﴾ [1]

اور منجملہ ان دردانگیز حالات کے جو ان شہروں میں نظر آتے ہیں اسیرانِ اسلام ہیں جو بیڑیاں پہنے نظر آتے ہیں اور جن سے سخت سخت مشقت لی جاتی ہے اور اسی طرح مسلمان عورتیں جن کی پنڈلیوں میں لوہے کے کڑے پہنے سخت سخت مشقت سے کام کرتی ہیں جن کو دیکھ کر دل پھٹا جاتا ہے۔

آنحضرت ﷺ نے اسیرانِ جنگ کی نسبت تاکید کی کہ ان کو کسی طرح کی تکلیف نہ پہنچنے پائے۔ اسیرانِ بدر کو جب آپ ﷺ نے صحابہؓ کے حوالہ کیا تو تاکید کی کہ کھانے پینے کی تکلیف نہ ہونے پائے۔ چنانچہ صحابہؓ خود کھجور وغیرہ کھا کر بسر کر لیتے تھے اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے تھے غزوۂ حنین میں چھ ہزار اسیر تھے سب چھوڑ دیئے گئے اور آپ نے ان کے پہننے کے لئے چھ ہزار جوڑے (مصر کے کپڑے کے) عنایت فرمائے، چنانچہ ابن سعد نے اس واقعہ کی تصریح کی ہے۔

حاتم طائی کی بیٹی جب گرفتار ہو کر آئی تو آپ نے عزت و حرمت سے مسجد کے ایک گوشہ میں اس کو مقیم کیا اور فرمایا کہ کوئی تمہارے شہر کا آ جائے تو میں اس کے ساتھ تم کو رخصت کر دوں۔ چنانچہ چند روز کے بعد سفر کا سامان کر کے ایک شخص کے ساتھ یمن بھجوا دیا۔

قرآن مجید میں جہاں خدا نے بندگانِ خاص کے اوصاف بتائے ہیں وہاں فرمایا ہے

﴿وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا﴾ (دہر-۱)

اور یہ لوگ خدا کی محبت میں مسکین کو یتیم کو اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے ہیں۔

معمول تھا کہ جب کسی قوم پر حملہ ہوتا تو اہل فوج چاروں طرف دور دور پھیل جاتے جس سے راستے بند ہو جاتے گھروں میں آنا جانا مشکل ہو جاتا راہ گیروں کا مال و متاع لٹ جاتا یہ طریقہ ایک مدت سے چلا آتا تھا ایک لڑائی میں قدیم دستور کے مطابق یہی حرکتیں لوگوں سے سرزد ہوئیں، آپ نے منادی کرا دی کہ جو شخص ایسا کرے گا اس کا جہاد جہاد نہیں۔

ابوداؤد میں (حضرت معاذ بن انس) سے روایت ہے:

﴿غزوت مع نبي الله ﷺ غزوة كذا وكذا فضيق الناس المنازل وقطعوا الطريق فبعث نبي الله مناديا ينادي في الناس ان من ضيق منزلا او قطع طريقا فلا جهاد له﴾ [2]

میں فلاں غزوہ میں آپ کے ساتھ تھا لوگوں نے دوسروں کے پڑاؤ پر جا کر ان کو تنگ کیا لوٹ مار کی آپ ﷺ نے ایک شخص کو بھیجا جس نے منادی کی کہ جو دوسروں کو گھروں میں تنگ کرے یا لوٹے مارے اس کا جہاد قبول نہیں۔

ابوداؤد میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جب یہ حکم دیا کہ لوگ ادھر ادھر پھیل نہ جایا کریں تو لوگ اس طرح

[1] ابوداؤد جلد دوم (باب ما یؤمر من انضمام العسکر) ص ۳

[2] رحلۂ ابن جبیر مطبوعہ لیڈن ۱۹۰۷ء صفحہ ۳۰۵۔

سخت کرتے تھے کہ ایک چادر تان دی جاتی تو سب اس کے نیچے آجاتے۔[1]

سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ مال غنیمت کے ساتھ لوگوں کو اس قدر شغف تھا کہ لڑائیوں کا بہت بڑا سبب یہی ہوتا تھا اس کی اصلاح میں نہایت تدریج سے کام لینا پڑا۔ جاہلیت میں تو غنیمت محبوب ترین چیز تھی تعجب یہ ہے کہ اسلام میں بھی ایک مدت تک اس کو ثواب کی چیز سمجھتے تھے ابوداؤد میں ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا

﴿رجل يريد الجهاد في سبيل الله وهو يبتغي عرضا من عرض الدنيا فقال النبي ﷺ لا اجر له فاعظم ذالك الناس وقالوا للرجل عد لرسول الله ﷺ فلعلك لم تفهمه﴾ (ابوداؤد جلد اصفحہ ۳۴۳) [باب فی من یغزو و یلتمس الدنیا]

ایک شخص خدا کی راہ میں جہاد کرنا چاہتا ہے لیکن کچھ دنیوی فائدہ بھی چاہتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا اس کو کچھ ثواب نہیں ملے گا۔ یہ امر لوگوں کو بہت عجیب معلوم ہوا اور لوگوں نے اس شخص سے کہا کہ پھر جا کر پوچھو شاید تم نے آنحضرت ﷺ کا مطلب نہیں سمجھا۔

بار بار لوگ دوبارہ دریافت کرنے کے لئے بھیجتے تھے اور ان کو یقین نہیں آتا تھا کہ آنحضرت ﷺ نے ایسا فرمایا ہوگا بالآخر جب آپؐ نے تیسری دفعہ بھی یہی فرمایا کہ لا اجر له یعنی اس کو کچھ ثواب نہیں ملے گا تب لوگوں کو یقین آیا۔

ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے چند صحابہ کو ایک قبیلے کے مقابلہ کے لئے بھیجا ان میں سے ایک صاحب صف سے آگے نکل گئے قبیلہ والے روتے ہوئے آئے انہوں نے کہا لا اله الا الله کہو تو بچ جاؤ گے لوگوں نے اسلام قبول کرلیا اور حملہ سے بچ گئے اس پر ساتھیوں نے ان کو ملامت کی کہ تم نے ہم لوگوں کو غنیمت سے محروم کردیا ابوداؤد میں صحابی کا قول ان الفاظ میں مذکور ہے

﴿فلامني اصحابي وقالوا حرمتنا الغنيمة﴾ (ابوداؤد باب ما یقول اذا اصبح کتاب الادب)

مجھ کو میرے ساتھیوں نے ملامت کی کہ تم نے ہم لوگوں کو غنیمت سے محروم کردیا۔

جب لوگوں نے آنحضرت ﷺ سے آ کر ان کی شکایت کی تو آپؐ نے ان کی تحسین کی اور فرمایا کہ تم کو ایک ایک آدمی (جو چھوڑ دیے گئے) کے بدلے اتنا اتنا ثواب ملے گا (ابوداؤد)

قرآن مجید میں غنیمت کی نسبت "متاع دنیوی" کا لفظ آتا تھا اور اس کی طرف اعتنا کرنے اور دلدادگی پر ملامت کی جاتی تھی۔ جنگ احد میں جب اسی بنا پر شکست ہوئی کہ کچھ لوگ کفار کا مقابلہ چھوڑ کر غنیمت میں مصروف ہو گئے تو یہ آیت اتری

﴿مِنكُم مَّن يُرِيدُ الدُّنْيَا وَمِنكُم مَّن يُرِيدُ الْآخِرَةَ﴾ (آل عمران۔ ۱۴)

تم میں سے کچھ لوگ دنیا کے طلب گار تھے اور کچھ آخرت کے

جنگ بدر میں لوگوں نے جب اجازت سے پہلے غنیمت لوٹنی شروع کر دی (یا) بقول بعض مفسرین فدیہ کی خواہش سے لوگوں کو گرفتار کیا تو یہ آیت اتری۔

---

[1] ابوداؤد کتاب الجہاد جلد اول صفحہ ۳۵۳ [باب ما یؤمر من انضمام العسکر]

میں شرکت مقصود تھی)۔ [1]

دوران جنگ میں دشمن کے مال اور جو مقدار کا لوٹنا بھی عام رواج تھا خصوصاً جب کہ رسد غیر جوفی تھی اور کھانے پینے کا انتظام نہیں ہو سکتا تھا تو ہر سپاہی یہ فعل جائز سمجھا جاتا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے اس کی سخت ممانعت کی اور سرے سے اس طریقہ کو روک دیا۔ ابوداؤد میں ایک انصاری سے روایت ہے کہ ایک دفعہ ہم لوگ ایک مہم پر گئے اور نہایت تنگ حالی اور مصیبت پیش آئی اتفاق سے بکریوں کا ریوڑ نظر آیا سب ٹوٹ پڑے اور بکریاں لوٹ لیں آنحضرت ﷺ کو خبر ہوئی آپ موقع پر تشریف لائے تو گوشت پک رہا تھا اور ہانڈیاں ابال کھا رہی تھیں آپ کے ہاتھ میں کمان تھی آپ نے اس سے ہانڈیاں الٹ دیں اور سارا گوشت خاک میں مل گیا پھر فرمایا "لوٹ کا مال مردار گوشت کے برابر ہے"۔ [2]

لڑائی عبادت بن گئی

اسلام نے جہاد کو جو بظاہر ایک ظالمانہ کام ہے اس قدر پاک اور منزہ کر دیا کہ وہ افضل ترین عبادت بن گئی جہاد کا مقصد یہ قرار دیا کہ مظلوموں کو ظلم سے بچائے جابر اور ظالم کفار اہل اسلام پر دست ستم دراز نہ کرنے پائیں۔

﴿أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِم بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَن يَقُولُوا رَبُّنَا اللَّهُ﴾ (حج - ۶)

جن لوگوں سے لوگ لڑائی کرتے ہیں ان کو اس بنا پر لڑنے کی اجازت دی گئی کہ ان پر ظلم کیا گیا اور خدا ان کی مدد پر قادر ہے وہ لوگ جو اپنے گھروں سے صرف اس بنا پر نکال دیئے گئے کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا رب "خدا" ہے۔

ملک میں جو ہمیشہ فتنہ و فساد برپا رہتا تھا اور لوگ امن و امان سے بسر نہیں کر سکتے تھے جہاد کی غرض یہ تھی کہ فتنہ و فساد کو مٹا دے اور امن قائم کر دے۔

﴿وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ﴾ (انفال)

اور ان سے لڑو تا کہ فتنہ نہ رہے۔

جو لوگ خدا پر اور جزا و سزا پر اعتقاد نہیں رکھتے تھے اور اس وجہ سے ان کے نزدیک ہر قسم کے ظلم و ستم جائز تھے اور ان کو جائز و ناجائز کی کچھ تمیز نہ تھی جہاد سے ان کا زور توڑ دیا اور ان لوگوں کو ان کے ظلم سے بچانا مقصود قرار دیا گیا۔

﴿قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ﴾ (توبہ)

ان لوگوں سے لڑو جو نہ خدا پر اعتقاد رکھتے ہیں نہ قیامت پر اور جن چیزوں کو خدا اور رسول نے حرام قرار دیا ہے ان کو حرام نہیں سمجھتے۔

جہاد میں فتح پانے اور زمین پر قبضہ حاصل کرنے کا مقصد یہ نہیں قرار دیا گیا کہ فاتح مال و دولت اور حکومت کا طلب گار ہو بلکہ یہ غرض قرار دی گئی کہ وہ لوگوں کو عبادت و ریاضت اور فقرا کی دستگیری کی تلقین کریں اور اچھی باتیں پھیلائیں اور برے کاموں سے لوگوں کو روک دیں۔

---

[1] صحیح مسلم کتاب الامارۃ باب من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا۔

[2] ابوداؤد: کتاب الجہاد باب فی النہی عن النہبی اذا کان فی الطعام قلۃ فی ارض العدو۔

خدمت میں پہنچ رہے ہیں، مال غنیمت فروخت ہو رہا ہے، ایک ایک کو ہزاروں کی رقمیں وصول ہو رہی ہیں، ایک صحابی خوش خوش آتے ہیں اور جوش مسرت میں کہتے ہیں "یا رسول اللہ! آج میں نے مال غنیمت سے جس قدر نفع اٹھایا، کسی نے نہیں اٹھایا تھا، پورے تین سو اوقیہ ہاتھ آئے" (اوقیہ چالیس درہم کے برابر ہوتا ہے) آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ "میں اس سے بھی زیادہ نفع بتاؤں؟" وہ بڑے شوق سے پوچھتے ہیں "کیا؟" ارشاد ہوتا ہے "نماز فرض کے بعد دو رکعتیں"۔ [1]

تم الجزء الأول من السيرة النبوية على صاحبها الصلوة والتحية

---

[1] ابوداؤد باب صلوٰۃ الضحیٰ۔

حصہ دوم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

سیرت نبوی جلد دوم

سیرت نبوی کی جلد اول ۱۳۳۶ھ (۱۹۱۸ء) میں شائع ہوئی تھی۔ اب جلد دوم ۱۳۳۸ھ (۱۹۲۰ء) کے اواخر میں شائع ہوتی ہے۔ شائقین کا تقاضا ہے کہ جلد سے جلد اس کی جلدیں شائع ہوتی رہیں، لیکن شاید ان مشکلات کا ان کو علم نہیں جو عالمگیر جنگ نے زندگی کے ہر شعبہ میں پیدا کر دی ہیں۔ گو ایک سال سے زیادہ ہوا کہ جنگ کا خاتمہ ہو گیا لیکن بایں ہمہ حقیقت یہ ہے کہ صلح کا آغاز نہیں ہوا، اور اس خاتمہ جنگ سے زندگی کے مشکلات میں ذرا بھی کمی نہیں ہوئی۔ جلد اول کے تکلیف دہ تجربہ کے بعد یہ طے کر لیا گیا تھا کہ دوسری جلد خود مطبع معارف میں چھپے گی لیکن مشکل یہ تھی کہ ہمارے پاس مشین نہ تھی۔ بڑی تلاش و جستجو سے مشین ہاتھ میں آئی تو کاغذ کا قحط نظر آیا۔ جلد اول میں جن اصناف کے کاغذ لگ چکے تھے ان کا ملنا دشوار ہو گیا اور کسی کاغذ کے ۲۰۰ رم بھی جب وقت نہ ملتے۔ یہ وقت کی مدت ختم ہوئی تو لوح (ٹائٹل پیج) کے کاغذ کی مشکل پڑی، لکھنؤ سے لے کر کلکتہ اور بمبئی تک کے کارخانے چھان مارے گئے مگر حسب ضرورت کاغذ دستیاب نہ ہوا آخر جو بھی مل سکا اور جس طرح بھی بنا یہ جلد اختتام کو پہنچی ﴿فللہ الحمد علی ذالک﴾

پہلی جلد نبوت کے آغاز سے آخر سلسلہ غزوات پر مشتمل تھی، اور دوسری جلد نبوت کی سہ سالہ امن کی زندگی کی تاریخ ہے نبوت کی بست و سہ سالہ زندگی میں پہلی جلد بیس سال کے واقعات کا مجموعہ تھی، اور یہ جلد بقیہ آخری تین سال کے واقعات کو محیط ہے اور اس کے بعد اخلاق و شمائل شریفہ اور ازواج مطہرات و اولاد کرام کا تذکرہ ہے۔

مصنف مرحوم کی وفات کے بعد جب اس جلد کا تمام علمی سرمایہ میرے ہاتھ میں آیا تو مجھے اس میں بہت سے ابواب کی کمی محسوس ہوئی جن کے اضافہ کے بغیر یہ جلد ناتمام نظر آتی تھی لیکن مصنف کے مسودہ میں اضافہ کی ہمت نہیں ہوتی تھی آخر کار مدت کے بعد جس کے بعد میں نے طے کر لیا کہ ان کو الگ ہی لکھ دوں۔ چند روز کے بعد مجھے اتفاقاً مصنف کے ہاتھ کی ایک یادداشت ملی جو وفات سے پانچ ماہ پیشتر ایک صفحہ میں لکھی تھی، اس کا عنوان "یادداشت اخیر" تھا۔ اس یادداشت کو پڑھ کر میری مسرت کی انتہا نہ تھی جب میں نے یہ دیکھا کہ جن ابواب کو میں ضروری سمجھتا تھا مصنف مرحوم نے بھی اپنی آخری یادداشت میں ان کا اضافہ ضروری قرار دیا تھا اور گویا ایک وصیت نامہ تھا جس کو قدرت غیب نے ان کے دست و قلم سے میری تسکین کے لیے پہلے ہی لکھوا دیا تھا۔

سخن ... گفت ایں قصہ ہم از روئے نگار آمد شد

اتفاق کے سبب سے مصنف مرحوم نے جن کو لکھنے نہ پائے تھے، بہت سے عنوانات سادہ تھے بہت سے عنوانات کو شروع کر کے آئندہ اضافہ کے لیے ناتمام بصورت بیاض چھوڑ دیا تھا، جامع نے ان کو مکمل کر کے بطور ضمیمہ کتاب میں شامل کر دیا بہت سے ضروری حواشی بھی جا بجا بڑھائے گئے ہیں چنانچہ جیسا کہ جلد اول کے دیباچہ میں ذکر کیا گیا ہے اضافہ اور تمام حواشی کی تمام عبارتیں ہلالین کے اندر کر دی گئی ہیں تاکہ مصنف اور جامع کی عبارتیں باہم مخلوط نہ ہونے پائیں۔

جامع

سید سلیمان ندوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلام کی امن کی زندگی

۹ھ ۱۰ھ اور ۱۱ھ

قیام امن، اشاعت اسلام، تاسیس خلافت، تکمیل شریعت

قیام امن

گزشتہ ابواب پڑھ لینے کے بعد یہ حقیقت نمایاں نظر آتی ہے کہ اس وقت گو فطری صلاحیت و استعداد کی رو سے عرب کا ذرہ ذرہ تابدار تھا لیکن وہ کسی ایک نظام شمسی کے تابع نہ تھا۔ یوں تو تمام جزیرہ عرب ایک واحد ملک اور ایک متحد قوم تھا تاہم نہ تو کبھی تاریخ نے اس کی ملکی و قومی اتحاد کا نشان دیا اور نہ سیاسی حیثیت سے کسی زمانہ میں تمام عرب ایک پرچم کے نیچے جمع ہوا۔ جس طرح گھر گھر کا الگ الگ خدا تھا اسی طرح قبیلہ قبیلہ کے جدا رئیس تھے۔ جنوبی عرب میں حمیری اذواء اور اقیال کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں۔ شمالی عرب میں بکر، تغلب، شیبان، ازد، قضاعہ، کندہ، لخم، جذام، بنو حنیفہ، طے، اسد، ہوازن، غطفان، اوس، خزرج، ثقیف اور قریش وغیرہ کی الگ الگ ٹولیاں تھیں، جو دن رات خانہ جنگیوں میں مبتلا رہتی تھیں۔ بکر و تغلب کی چہل سالہ جنگ کا ابھی ابھی خاتمہ ہوا تھا کندہ اور حضر موت کے قبائل کٹ کٹ کر فنا ہو چکے تھے اوس و خزرج لڑ لڑ کر اپنے ایک ایک سردار کو کھو چکے تھے خاص حرم اور ناحیہ حرم میں خود قیس اور قریش کے درمیان حرب فجار کا سلسلہ جاری تھا اور اسی طرح تمام ملک معرکہ کارزار بنا ہوا تھا۔

پہاڑوں اور صحراؤں میں خود مختار جرائم پیشہ قبائل آباد تھے تمام ملک قتل و غارت گری، سفاکی، خونریزی کے خطرات میں گھرا تھا تمام قبائل غیر مختتم سلسلہ جنگ کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے انتقام کا ذوق اور خون بہا کی پیاس سینکڑوں اور ہزاروں اشخاص کے قتل کے بعد بھی نہیں بجھتی تھی۔ ملک کا ذریعہ معاش غارت گری کے بعد فقط تجارت تھی لیکن تجارت کے قافلوں کا ایک جگہ سے دوسری جگہ تک گزرنا محال تھا۔ حیرہ کے عرب بادشاہ اگرچہ شمالی عربستان میں اثر اور اقتدار رکھتے تھے تاہم ان کا تجارتی سامان بھی عکاظ کے بازاروں میں بآسانی نہیں پہنچ سکتا تھا۔ محرم و رجب عرب کے مقدس مہینے تھے۔ پھر بھی لڑائیوں کے جواز کے لئے وہ کبھی بڑھا اور کبھی گھٹا دیئے جاتے تھے۔ ابو علی قالی نے کتاب الامالی میں لکھا ہے۔

﴿وذلك لأنهم كانوا يتحرجون أن تتوالى عليهم ثلاثة أشهر لا تمكنهم الإغارة فيها لأن معاشهم كان من الإغارة﴾ (جلد اص ۶)

یہ اس لئے کہ وہ پسند نہیں کرتے تھے کہ تین مہینے متصل ان پر غارت گری کے بغیر گزر جائیں، کیونکہ غارت گری ہی ان کا ذریعہ معاش تھا۔

بہت سے جرائم پیشہ قبائل کے ذریعہ معاش کے لیے یہی موسم بہار تھا۔ مکہ کے آس پاس اسلم و غفار وغیرہ قبائل

۱ (بخاری باب مناقب قریش)

﴿وَأَنزَلَ الَّذِينَ ظَاهَرُوهُم مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ مِن صَيَاصِيهِمْ﴾ (احزاب)

اور ان یہودیوں کو جنہوں نے ان کی مدد کی تھی ان کے قلعوں سے اتارا۔

زمانہ قدیم میں مالی کاروبار کی وسعت نے یہودیوں اور دیگر مذاہب یورپ میں ان کو جس طرح ملک کی پولیٹکس کا خطرناک عنصر بنا رکھا تھا بعینہٖ یہی حال ان کا عرب میں بھی تھا۔ ان چند قلعوں کے بل بوتے پر وہ اسلام کی قوت کو بالکل خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ آنحضرت ﷺ کو متعدد بار نہ صرف ان کی شرارت سے لڑائی پڑیں۔ بدر میں جب مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی تو یہ فخریہ کہتے تھے "یہ بچارے مکہ کے قریش تھے؛ کیا جانیں؟ مسلمانوں کو ہمارے قلعوں سے مقابلہ پڑے تو معلوم ہو۔"

غرض عرب کا ملک اس قدر متعدد اور مختلف اندرونی اور بیرونی خطرات میں مبتلا تھا کہ اس کی اصلاح و تدبیر کے لیے عام انسانی دست و بازو بیکار تھے۔ خدا کا غیر مرئی ہاتھ محمد رسول اللہ ﷺ کی آستین میں پوشیدہ تھا ﴿وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ﴾ ہجرت کے بعد آٹھ برس کی متواتر کوششوں اور پیہم اصلاحات کا یہ نتیجہ ہوا کہ محال نے امکان بلکہ واقع کی صورت اختیار کر لی۔ عرب کے سیاسی ضعف کا تمام تر راز نااتفاقی اور باہمی جنگ و جدال میں مضمر تھا اور اس نااتفاقی اور خانہ جنگی کا سبب صرف یہ تھا کہ تمام عرب مختلف قبائلی نسلوں میں منقسم تھا۔ تمام ملک کے اجتماع اور اتحاد کے لئے ان میں کوئی مستحکم رشتہ موجود نہ تھا۔ محمد رسول اللہ ﷺ نے تمام عرب کی شیرازہ بندی کے لیے اسلام کا رشتہ قائم کیا ﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ﴾ (حجرات) اور دفعۃً اس روحانی رشتہ نے خونی قرابت اور نسل کے تار و پود ادھیڑ دیے اور صرف ایک کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی برقی رو اب تمام عرب کی اتحادی روح کو حرکت دے رہی ہے۔ خدائے پاک نے قرآن مجید میں اس اجتماع اور اتحاد کے وجود کو اپنی خصوصی نعمت فرمایا۔

﴿وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُم بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا﴾ (آل عمران)

خدا کے اس احسان کو یاد کرو کہ تم باہم ایک دوسرے کے دشمن تھے خدا نے تمہارے دلوں کو جوڑ دیا پھر اس کے لطف و محبت سے بھائی بھائی بن گئے۔

خدا نے خود آنحضرت ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ محمد! یہ تیرا کام نہ تھا، اس میں خود خداوند مقلب القلوب کا ہاتھ کام کر رہا تھا۔

﴿هُوَ الَّذِي أَيَّدَكَ بِنَصْرِهِ وَبِالْمُؤْمِنِينَ ۝ وَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ ۚ لَوْ أَنفَقْتَ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مَّا أَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ أَلَّفَ بَيْنَهُمْ ۚ إِنَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ﴾ (انفال۔ ۸)

وہ خدا وہ ہے جس نے محمد! اپنی نصرت اور مسلمانوں کے ذریعہ سے تجھ کو قوت بخشی اور اسی نے مسلمانوں کے دل باہم جوڑ دیئے، اگر تم تمام دنیا خرچ کر ڈالتے تو بھی ان کے دلوں کو نہ جوڑ سکتے لیکن خدا نے ان کے دل باہم جوڑ دیئے۔ وہ زبردست حکمت والا ہے۔

ہجرت کے بعد آنحضرت ﷺ نے مہاجرین و انصار کے درمیان جو مواخاۃ اور برادری قائم کرائی تھی وہ اس سلسلہ کی پہلی کڑی تھی اور اس کی آخری کڑی وہ خطبہ تھا جو فتح مکہ کے موقع پر دیا گیا۔

قرآن مجید نے اپنے متواتر ارشادات میں فتنہ و فساد فی الارض کو بدترین فعل انسانی قرار دیا اور اس فعل کے مرتکب کے لئے سخت سزائیں مقرر کیں۔ چوری کے لئے قطع ید کی سزا، رہزنی کے لئے قتل، پھانسی، قطع ید اور جلاوطنی کی تعزیریں جاری کیں۔ سورۂ مائدہ میں خونریزی اور قتل و غارت کے انسداد کے لئے قصاص کا قانون نازل ہوا۔ ملک میں قیام امن کے لئے آنحضرت ﷺ نے متعدد بار فوجیں بھیج کر رہزن قبائل پر چھاپے مارے۔ [1] حجاز میں جن قبائل کا پیشہ چوری تھا وہ تائب ہو کر مسلمان ہو گئے۔ [2] فوجداری اور دیوانی کے مقدمات کے فیصلے کے لئے قوانین وضع ہوئے اور جابجا عمال کا تقرر ہوا۔

لیکن یہ سب جو کچھ ہوا وہ انسان کی ظاہری فطرت کی پابندی تھی ورنہ ایک پیغمبر کا فرض ایک مقنن اور ایک عام مدبر کے فرائض سے بدرجہا بلند ہے۔ اسلام کے قانون تعزیرات نے جو کچھ کام کیا قرآن کا روحانی اثر اور خاتم الانبیاء ﷺ کا فیض تلقین اس سے پہلے فرد قرارداد جرم کی دفعات کو بالکل معطل کر چکا تھا۔ قانون کا خوف تعزیر صرف بازاروں میں اور انسانوں کے عام مجمعوں میں مجرم کو باز رکھ سکتا ہے لیکن دعوت اسلام کے فیض اثر نے دلوں کو بالکل خدا کے سامنے کر دیا، جو رات کی تاریکیوں میں بھی دیکھتا تھا اور مقفل دروازوں کی کوٹھریوں سے بھی جھانک سکتا تھا اور اب تمام ملک میں امن و امان تھا اور یہ عدی بن حاتم نے شہادت دی کہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ آنحضرت ﷺ کی پیشین گوئی کے مطابق لوگ صنعاء سے حجاز تک تن تنہا سفر کرتے تھے اور خشیت الٰہی کے سوا کوئی اور خوف راستہ میں نہ تھا۔ [3] ایک یورپین مورخ نے جس کے قلم نے پیغمبر اسلام ﷺ کی مدح کے لئے بہت کم جنبش کی ہے (مارگولیس) وہ بھی ان الفاظ میں اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہے۔

> محمد ﷺ کی وفات کے وقت ان کا سیاسی کام غیر مکمل نہیں رہ گیا تھا۔ آپ ایک سلطنت کی جس کا ایک سیاسی وفاقی دارالسلطنت مقرر کیا گیا تھا بنیاد ڈال چکے تھے۔ آپ ﷺ نے عرب کے منتشر قبائل کو ایک قوم بنا دیا تھا۔ آپ ﷺ نے عرب کو ایک مشترک مذہب عطا کیا اور ان میں ایک ایسا رشتہ قائم کیا جو خاندانی رشتوں سے زیادہ مستحکم اور مستقل تھا۔ [4]

بیرونی خطرات کے انسداد کے لئے خدا نے عجیب و غریب سامان پیدا کر دیے۔ قریش اور منافقین مدینہ کے اشتعال سے یہودیوں نے اسلام کو پامال کرنا چاہا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خود چور ہو گئے۔ ۵ھ سے لے کر ۷ھ تک متواتر لڑائیاں پیش آئیں اور فتح خیبر پر ان کی سیاسی قوت کا خاتمہ ہو گیا۔ رومیوں نے اور سرحد شام کے عیسائی عربوں نے اسلام کے استیصال کا بیڑا اٹھایا۔ عیسائی روسائے عرب میں سب سے زیادہ طاقت ور اور پرزور غسانی تھے جو رومیوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی کی طرح کام کرتے تھے۔ بہرا، وائل، بکر، لخم، جذام اور عاملہ وغیرہ عرب قبائل ان کے تحت تھے۔

---

[1] دیکھو غزوات نبوی پر دوبارہ نظر۔
[2] صحیح بخاری ذکر غفار و اسلم۔
[3] صحیح بخاری۔
[4] لائف آف محمد، مارگولیس ص ۴۰۰۔

جو حج کے لئے ادھر آ رہے تھے اس لئے قریش نے کوشش کی کہ وہ کسی طرح آنحضرت ﷺ کی خدمت میں نہ پہنچنے پائیں لیکن ایک دفعہ جب انہوں نے اتفاقیہ آنحضرت ﷺ کو قرآن مجید پڑھتے سنا تو فوراً مسلمان ہو گئے اور ان کے ذریعہ سے ان کے قبیلہ دوس میں بھی اسلام پھیلنے لگا تاہم عام قبیلہ نے مکمل دعوت قبول نہ کی تو وہ رنجیدہ ہو کر آنحضرت ﷺ کے پاس آئے اور عرض کی کہ یا رسول اللہ! دوس نے نافرمانی کی ان پر بددعا کیجئے آپ نے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی کہ خدایا دوس کو ہدایت دے اور ان کو کھینچ لا۔ اس کے بعد سارا قبیلہ مسلمان ہو گیا۔ [۳]

عمرو بن عبسہ کا اسلام:

عمرو بن عبسہ سلمی بھی انہی بزرگوں میں ہیں جنھوں نے لوگوں کی زبانی یہ سن کر کہ مکہ میں ایک شخص پیدا ہوا ہے جو بہت سی باتیں بتاتا ہے مشتاقانہ مکہ آئے۔ آنحضرت ﷺ اس وقت قریش کے مظالم کی بنا پر چھپے رہتے تھے عمرو بن عبسہ کسی طرح آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پہنچ گئے اور عرض کی کہ آپ کون ہیں؟" آپ نے فرمایا "میں پیغمبر ہوں۔" انھوں نے کہا "پیغمبر کس کو کہتے ہیں؟" آپ نے فرمایا "خدا نے مجھے بھیجا ہے۔" انھوں نے پھر پوچھا "کیا پیغام دے کر بھیجا ہے؟" ارشاد فرمایا "مجھے خدا نے یہ پیغام دے کر بھیجا ہے کہ قرابت کا حق ادا کیا جائے، بت توڑ دیئے جائیں، اللہ کو ایک مانا جائے اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرایا جائے۔" عمرو نے پوچھا "اس مذہب کے کتنے پیرو ہیں؟" آپ نے فرمایا ایک آزاد (ابوبکرؓ) اور ایک غلام (بلالؓ) عمرو نے کہا "میں بھی پیروی کرتا ہوں۔" ارشاد ہوا کہ "ابھی تو یہ ممکن نہیں تم دیکھتے ہو کہ میں کس حال میں ہوں اور لوگوں کا کیا حال ہے؟ میری کامیابی کا جب حال سننا تو میرے پاس آ جانا" چنانچہ عمرو واپس گئے اور ہجرت کے بعد جب لوگوں کی زبانی آپ کی کامیابی کا حال معلوم ہوا تو حاضر خدمت ہوئے۔ [۴]

ضماد بن ثعلبہ کا اسلام:

ضماد بن ثعلبہ قبیلہ ازدشنوءہ کے رئیس اور آپ کے زمانہ جاہلیت کے دوست تھے، وہ مکہ آئے تو سنا کہ محمد کو جنون ہو گیا ہے۔ وہ جھاڑ پھونک بھی کرتے تھے وہ آپ کے پاس آئے کہ لاؤ میں تمہارا علاج کر دوں۔ آپ نے فرمایا ﴿الحمد لله نحمده ونستعينه من يهده الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادي له واشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريك له واشهد ان محمدا عبده ورسوله﴾ ان فقروں نے ضماد پر غیر معمولی اثر کیا۔ عرض کی دوبارہ ارشاد فرمایئے۔ آپ نے پھر اعادہ فرمایا۔ ضماد نے پھر تیسری بار پڑھوایا اب وہ بالکل مسحور تھے۔ بولے کہ میں نے کاہنوں کی باتیں، جادوگروں کے منتر اور شاعروں کے قصائد سنے ہیں لیکن ایسا کلام میں نے کہیں نہیں سنا، یہ تو دریا کی تہ تک پہنچ گیا۔ لائیے ہاتھ لائیے میں اسلام پر بیعت کرتا ہوں۔ آپ نے ان سے بیعت لی۔

۱ زرقانی۔

۲ صحیح مسلم کتاب الایمان سے یہ مفہوم ہوتا ہے۔

۳ صحیح بخاری باب قصہ دوس۔

۴ صحیح مسلم باب الاوقات التی نہی عن الصلوٰۃ فیہا۔

قبیلہ ازد کا اسلام:

پھر فرمایا اپنے پورے قبیلہ کی طرف سے بھی بیعت کرلو۔ چنانچہ انہوں نے پورے قبیلہ کی طرف سے بیعت کرلی اور وہاں کی دعوت سے مسلمان ہو گیا۔ ایک دفعہ ایک لڑائی میں مسلمان سپاہیوں کا ادھر سے گزر ہوا تو افسر نے پوچھا کہ کسی نے اس قبیلہ کی کوئی چیز لی ہے؟ ایک سپاہی نے کہا ایک لوٹا میرے پاس ہے۔ اس نے حکم دیا کہ واپس کردو۔

حضرت ابوذرؓ کا اسلام:

حضرت ابوذرؓ کا قصہ اس موقع پر خاص طرح پر ذکر کے قابل ہے۔

غفار کا قبیلہ جو قریش کی شامی تجارت کے راستہ میں آباد تھا جب وہاں یہ چرچا پھیلا تو حضرت ابوذرؓ جو بت پرستی سے متنفر ہو چکے تھے اور حق کی تلاش میں تھے انہوں نے اپنے بھائی (انیس) سے کہا کہ تم مکہ جاؤ اور دیکھو یہ شخص جو نبوت کا دعویٰ کرتا ہے اس کی تعلیم اور تلقین کیا ہے؟ انیس مکہ آئے واپس جا کر بیان کیا کہ وہ مکارم اخلاق کی تعلیم دیتا ہے اور جو کلام پیش کرتا ہے وہ شاعری سے الگ ہے۔ حضرت ابوذرؓ کو اس مختصر سے جواب سے تسکین نہیں ہوئی خود گئے زاد سفر کے لئے مشک میں پانی اور کچھ کھانے کو لے لیا مکہ میں آئے تو ڈر کے مارے کسی سے آنحضرت ﷺ کا نام پوچھ نہیں سکتے تھے۔ حرم میں حضرت علیؓ سے ملاقات ہوگئی انہوں نے گھر پر لا کر مہمان رکھا لیکن تین دن تک ان سے بھی کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ بالآخر خود حضرت علیؓ نے پوچھا کہ "یہاں آنے کی کیا غرض ہے" انہوں نے ڈرتے ڈرتے بتایا لیکن پھر قول و قرار لے لیا کہ کسی پر راز ظاہر نہ ہونے پائے۔ حضرت علیؓ ان کو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں لائے اور آپ ﷺ نے اسلام کی تلقین کی اور فرمایا کہ اس وقت گھر واپس جاؤ۔ پھر میں جو کچھ کہتا ہوں اس کی تعمیل کرنا۔ لیکن ان کو اسلام کا جوش تھا عرض کی کہ میں تو اسلام کا اعلان کرکے رہوں گا۔ غرض حرم میں آئے اور زور سے پکارے کہ اشہد ان لا الہ الا اللہ واشہد ان محمدا رسول اللہ اس آواز کا سننا تھا کہ لوگ چاروں طرف سے دوڑ پڑے اور ان کو مارنا شروع کیا۔ حضرت عباسؓ نے آکر بچایا اور لوگوں سے کہا کہ تم یہ نہیں سمجھتے کہ تمہاری تجارت کا راستہ غفار کی آبادی سے ہو کر گزرتا ہے اور یہ اسی قبیلہ کے آدمی ہیں۔ اس وقت لوگوں نے چھوڑ دیا لیکن دوسرے دن حضرت ابوذرؓ نے حرم میں جاکر پھر اسی طریقہ سے اسلام کا اعلان کیا اور نتیجہ بھی وہی ہوا جو کل ہو چکا تھا آج بھی اتفاق سے حضرت عباسؓ آ گئے اور انہوں نے جان بچائی۔ [۱]

قبیلہ غفار کا اسلام:

حضرت ابوذرؓ مکہ سے جب واپس گئے اور اپنے قبیلہ کو اسلام کی دعوت دی تو آدھا قبیلہ اسی وقت مسلمان ہوگیا۔ بقیہ آدمیوں نے کہا کہ ہم اس وقت تک اسلام کا اظہار نہیں کریں گے جب آنحضرت ﷺ مدینہ آجائیں گے۔ چنانچہ جب آپ ﷺ مدینہ میں تشریف لائے تو باقی آبادی بھی مسلمان ہوگئی۔ [۲]

---

۱ یہ واقعہ صحیح بخاری سے ماخوذ ہے۔ صحیح مسلم میں یہ واقعہ جس طرح منقول ہے اس میں بعض باتیں اس سے زائد ہیں مختلف ہیں۔ حافظ ابن حجر فتح الباری میں لکھتے ہیں کہ ان دونوں روایتوں میں تطبیق ممکن ہے۔

۲ صحیح مسلم باب فضائل ابی ذر۔

قبیلہ اسلم کا اسلام:

غفار سے قریب اسلم کا قبیلہ آباد تھا اور دونوں قبیلوں میں قدیم تعلقات تھے۔ غفار کے اثر سے انہوں نے بھی اسلام قبول کر لیا۔[1] (حالانکہ یہ دونوں قبیلے اسلام سے پہلے چوری میں بدنام تھے اور ان کو معلوم تھا کہ اسلام اس فعل شنیع کا دشمن ہے)

اوس وخزرج کا اسلام:

موسم حج میں عرب کے اکثر قبائل کا اجتماع ہو جاتا تھا۔ آپؐ اس موقع پر ایک ایک قبیلہ کے قیام گاہ پر جاتے اور اسلام کی دعوت دیتے تھے چنانچہ مدینہ کے قبائل اوس وخزرج کی مختصر جماعت نے اسی موقع پر اسلام قبول کیا۔

قیام مدینہ میں اشاعت اسلام:

اس کے بعد جب حضرت مصعبؓ بن عمیر داعی اسلام بنا کر مدینہ منورہ بھیجے گئے تو ان کے فیض تعلیم سے چند ہی مہینوں میں دو گھرانوں کے سوا قبیلہ کے تمام گھرانے مسلمان ہو گئے۔ ہجرت کے بعد جب آپؐ مدینہ تشریف لائے تو آس پاس کے قبائل میں جہینہ کا ایک گروہ، غفار و اسلم نے اسلام قبول کر لیا۔[2]

بدر کے بعض قریشیوں کا اسلام:

تھوڑے دنوں کے بعد بدر کا معرکہ پیش آیا جس میں قریش کو شکست ہوئی اور متعدد اشخاص مسلمانوں کے ہاتھ میں قید ہوئے۔ ان قیدیوں کی رہائی کے لئے قریش نے مدینہ میں آمدورفت شروع کی۔ اس تقریب سے لوگوں کو مسلمانوں سے ملنے جلنے کا اتفاق ہوا اور اس اثر سے متعدد اشخاص مسلمان ہو گئے۔

(ان میں) بہت سے لوگ ایسے تھے کہ اتفاقیہ ان کے کانوں میں قرآن مجید کی آواز پڑ گئی اور باوجود قساوت کے ان کا دل تھر سے موم بن گیا۔ جبیر بن مطعم بدر کے قیدیوں کو فدیہ دے کر چھڑانے کے لئے آئے تھے اور قیدیوں کے ساتھ اسیر تھے ایک دن آنحضرت ﷺ یہ آیتیں پڑھ رہے تھے۔

ام خلقوا من غير شيء ام هم الخالقون ام خلقوا السموات والارض بل لا يوقنون (طور ۲)

کیا یہ بغیر کسی کے آپ سے آپ پیدا ہو گئے یا ان لوگوں نے خود اپنے آپ کو پیدا کیا یا ان لوگوں نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا، اصل یہ بات ہے کہ ان کو یقین نہیں ہے۔

جبیر بن مطعم کا اسلام:

جبیر بن مطعم نے یہ آیتیں سن لیں تو ان کا بیان ہے کہ مجھ کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ میرا دل پرواز کر گیا۔ بخاری سورۂ طور میں یہ واقعہ مذکور ہے۔

---

1. صحیح بخاری ذکر سلم وغفار۔
2. ایضاً۔

ہوا کہ اس سے پہلے باوجود غزوات اور محاربات کے جس قدر لوگ اسلام لائے تھے صرف دو برس میں یہ تعداد اس سے اضعافاً مضاعفہ بڑھ گئی چنانچہ جب آنحضرت ﷺ حدیبیہ کے سال ادائے عمرہ کے ارادہ سے مدینہ طیبہ سے نکلے تو صرف ڈیڑھ ہزار شخص ساتھ تھے۔ اب دو برس کے بعد فتح مکہ کو چلے تو دس ہزار مسلمانوں کا لشکر جرار ساتھ تھا۔

صلح حدیبیہ کا اثر اگرچہ تمام عرب پر پھیلا تھا لیکن اس معاہدہ میں صرف قریش اور کنانہ شریک تھے اس لئے جو لوگ براہ راست قریش کے زیر اثر یا اُن کے حلیف اور ہم عہد تھے وہ اب بھی مدینہ پر حملہ کی تیاریاں کرتے رہتے تھے اور ان کے دفاع کے لئے آنحضرت ﷺ کو چھوٹی چھوٹی مہمیں بھیجنی پڑتی تھیں تاہم جن موقعوں پر امن کا امکان ہوتا تھا وہاں داعیانِ اسلام بھیجے جاتے تھے کہ لوگوں کو اسلام کی طرف بلائیں لیکن چونکہ حفاظت خود اختیاری کی غرض سے ان داعیوں کے ساتھ تھوڑی بہت جمعیت بھی ہوتی تھی اس لئے ارباب سیر ان تبلیغی جماعتوں کو بھی سرایا سے تعبیر کرتے تھے۔

فتح مکہ کا اثر:

تمام عرب تولیت کعبہ کی وجہ سے قریش کو مذہبی رہبر سمجھتا تھا اس لئے وہ انتظار کر رہے تھے کہ قریش کا کیا انجام ہوتا ہے۔ عمرو بن سلمہ ایک صحابی تھے جو مدینہ سے دور ایک گزرگاہ عام پر رہتے تھے ان کے یہ الفاظ صحیح بخاری میں منقول ہیں:

﴿كانت العرب تلوم باسلامهم الفتح فيقولون اتركوه وقومه فانه ان ظهر عليهم فهو نبي صادق فلما كانت وقعة اهل الفتح بادر كل قوم باسلامهم﴾[1]

عرب قریش کے اسلام کا انتظار کرتے تھے وہ کہتے تھے کہ محمد ﷺ کو ان کی قوم (قریش) پر چھوڑ دو اگر وہ ان پر غالب آ گئے تو بے شبہ وہ پیغمبر ہیں۔ پس جب مکہ فتح ہوا تو ہر قبیلے نے اسلام کی طرف پیش دستی کی۔

ابن ہشام نے زیادہ صاف لکھا ہے۔

﴿وانما كانت العرب تربص بالاسلام امر هذا الحي من قريش وامر رسول الله ﷺ وذلك ان قريشا كانوا امام الناس وهاديهم واهل البيت والحرم وصريح ولد اسمعيل بن ابراهيم عليهما السلام وقادة العرب لا ينكرون ذلك وكانت قريش هي التي نصبت لحرب رسول الله ﷺ وخلافه فلما افتتحت مكة ودانت له قريش ودوخها الاسلام عرفت العرب انه لا طاقة لهم بحرب رسول الله ﷺ ولا عداوته فدخلوا في دين الله كما قال الله عزوجل﴾[2]

(پچھلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ)

فلما كانت الهدنة ووضعت الحرب اوزارها وامن الناس كلهم بعضهم بعضا والتقوا وتفاوضوا في الحديث والمنازعة فلم يكلم احد بالاسلام يعقل شيئا الا دخل فيه فلقد دخل في تينك السنتين في الاسلام مثل ما كان في الاسلام قبل ذلك او اكثر (ابن ہشام)

"جب صلح ہوگئی اور جنگ موقوف ہوگئی ایک دوسرے سے لوگ بے خوف ہو گئے باہم ملتے جلتے تھے اور گفتگو ہوتی تھی تو کوئی سمجھدار ایسا نہیں تھا جس سے اسلام کے متعلق گفتگو ہوئی ہو اور اس نے قبول نہ کر لیا ہو یہاں تک کہ ابتدائے اسلام سے اس وقت تک جس قدر مسلمان ہوئے تھے صرف ان دو برسوں میں اس قدر یا اس سے زیادہ تعداد میں لوگ مسلمان ہو گئے"۔

[1] صحیح بخاری فتح مکہ۔

[2] سیرت ابن ہشام ذکر واقعات سنہ ۹ھ

اور عرب اسلام کے باب میں صرف قریش کا انتظار کر رہے تھے اور وجہ یہ تھی کہ قریش تمام ملک کے سردار اور پیشوا اور کعبہ و حرم کے متولی اور حضرت اسمٰعیلؑ کی خاص اولاد اور عرب کے قائد تھے اور صرف قریش نے آنحضرت ﷺ کی مخالفت کے لئے جنگ برپا کی تھی تو جب مکہ فتح ہو گیا اور قریش نے سپر ڈال دی اور اسلام مکہ میں چھا گیا تو عرب کو یقین ہو گیا کہ ان کو آنحضرت ﷺ کی جنگ اور عداوت کی طاقت نہیں ہے تو وہ خدا کے دین میں داخل ہو گئے جیسا کہ اللہ عزوجل نے قرآن مجید کہا ہے یعنی ﴿اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَ الْفَتْحُ﴾

غرض اسلام کی سچائی اور سادگی اور عرب کی تیز فہمی اور ذہانت کے لحاظ سے اسلام کے پھیلنے میں جو دیر لگی وہ زیادہ تر قومی اور خاندانی مخالفت کی وجہ سے تھی اب جبکہ یہ باطل کا سنگ راہ ہٹ گیا تو حق کے آگے بڑھنے میں دیر نہ تھی۔

فتح مکہ کے بعد اب اسلام کے لئے یہ خطرہ نہیں رہا کہ اس کے دعاۃ جہاں جائیں بے دریغ قتل کر دیئے جائیں اس بنا پر آنحضرت ﷺ نے تمام اطراف عرب میں دعاۃ بھیج دیئے کہ لوگوں کو اسلام کے فضائل و محاسن بتا کر ان کو اسلام کی ترغیب دلائیں۔ دعاۃ حسب ذیل طریقے سے مقرر کئے گئے۔

(۱) حفاظت خود اختیاری کی غرض سے کسی قدر فوج ساتھ کر دی جاتی تھی کہ ان کو کوئی شخص ضرر نہ پہنچانے پائے اور وہ آزادی سے تبلیغ اسلام کر سکیں حضرت خالدؓ کو آنحضرت ﷺ نے یمن بھیجا تو فوج بھی ساتھ کر دی لیکن تاکید تھی کہ جبر پیش نہ آئیں۔ چنانچہ پورے چھ مہینے تک ان کے دعوت اسلام پر کسی نے توجہ نہیں کی اور وہ ناکام واپس ہوگئے حضرت خالدؓ سپہ سالار اور فاتح تھے واعظ اور صاحب ارشاد نہ تھے اس بنا پر آنحضرت ﷺ نے اب حضرت علیؓ کو بھیجا انہوں نے قبائل کے سامنے جب اسلام کی تبلیغ کی تو دفعتاً ملک کا ملک مسلمان تھا۔

یہی وہ دعاۃ ہیں جن کو علامہ طبری نے ان لفظوں سے تعبیر کیا ہے۔

قد کان رسول اللہ ﷺ بعث فیما حول مکۃ السرایا تدعو الی اللہ عزوجل ولم یامرھم بقتال۔

آنحضرت ﷺ نے مکہ کے اطراف میں جو فوجیں بھیجی تھیں کہ لوگوں کو خدا کی طرف بلائیں لیکن ان کو لڑنے کا حکم نہیں دیا تھا۔

حضرت خالدؓ کو قبیلہ بنی جذیمہ کے پاس بھی اسی طرح دعوت اسلام کے لئے بھیجا تھا لیکن جب انہوں نے کشت و خون کیا اور آنحضرت ﷺ کو خبر ہوئی تو آپ ﷺ کھڑے ہو گئے اور قبلہ رخ دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا کہ خدایا! میں خالد کے فعل سے بری ہوں پھر حضرت علیؓ کو بھیجا انہوں نے ایک ایک مقتول کا خون بہا ادا کیا یہاں تک کہ کتوں کا بھی۔

اشاعت اسلام کی غرض سے جو مسلح جماعت اطراف ملک میں بھیجی جاتی تھی اس میں بھی کبھی آپ ﷺ ایک ایک فرد کا امتحان لیتے تھے ان میں جو صاحب سب سے زیادہ حافظ قرآن ہوتے تھے ان کو اس کا امیر مقرر فرماتے تھے چنانچہ آپ ﷺ نے ایک بار اسی قسم کی فوج روانہ کرنا چاہی[۱] تو ایک ایک شخص سے قرآن پڑھوا کر سنا اور

۱؎ اس روایت میں اگرچہ یہ تصریح نہیں ہے کہ یہ فوج اشاعت اسلام کے لئے بھیجی گئی تھی صرف یہ الفاظ ہیں [illegible] آپ ﷺ نے ایک بہت بڑی جماعت بھیجی تاہم اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مقصد صرف اشاعت اسلام تھا کیونکہ جنگی مقصد ہوتا تو حفظ قرآن کی ضرورت نہیں ہوتی اور آپ ﷺ ہر ایک سے قرآن پڑھوا کر نہ سنتے۔

لوگوں میں ایک کم سن نوجوان تھے آنحضرت ﷺ ان کے پاس آئے، پوچھا تمہیں کیا یاد ہے؟ انہوں نے کہا مجھ کو سورۂ بقرہ اور فلاں فلاں سورتیں یاد ہیں آپ ﷺ نے فرمایا تو تم ہی اب سب کے امیر ہو۔ (ترغیب و ترہیب ج ۱ ص ۲۵۹ بروایت ترمذی)

(۲) جو ممالک زیرِ اثر آتے تھے اور وہاں زکوٰۃ اور جزیہ کے وصول کرنے کے لئے عمال بھیجے جاتے تھے وہ اکثر اس درجہ کے لوگ ہوتے تھے جن کا تقدس، زہد اور پاکیزگی مسلم ہوتی تھی اس کے ساتھ عالم اور فاضل بھی ہوتے تھے اور اس لئے وہ تحصیل مال کے ساتھ تبلیغ اسلام کی خدمت بھی انجام دے سکتے تھے ان میں سے بعضوں کے نام حسب ذیل ہیں۔

نام	مقام	کیفیت
مہاجر بن ابی امیہ	صنعاء یمن	حضرت ام سلمہؓ (زوجۂ نبی) کے بھائی تھے۔
زیاد بن لبید	حضرموت	یہ ان اصحاب میں ہیں جو غزوۂ بدر میں شریک تھے۔
خالد بن سعید	صنعاء یمن	سابقین اولین اور مہاجرین حبش میں ہیں، سب سے پہلے انہی نے خطوط پر بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھا
عدی بن حاتم	قبیلہ طے یمن	مشہور صحابی ہیں۔ حاتم طائی انہی کا باپ تھا۔
علاء بن حضرمی	بحرین	
حضرت ابوموسیٰ اشعری	زبید و عدن	ان کی دعوت اسلام سے قریباً تمام لوگ مسلمان ہو گئے مشہور صاحب علم صحابی ہیں۔
حضرت معاذ بن جبل	جند	
جریر بن عبداللہ بجلی	ذوالکلاع حمیری	جریر مشہور صحابی ہیں ذوالکلاع حمیری یمن کے سلاطین کے خاندان سے تھے ایک موقع پر لاکھ آدمیوں نے ان کو سجدہ کیا تھا۔ جریرؓ کی دعوت پر یہ اسلام لائے تو اس کی خوشی میں چار ہزار غلام آزاد کئے۔

(۳) بعض لوگ خاص اشاعت اسلام کی غرض سے بھیجے جاتے تھے تفصیل سے اس قسم کے دعاۃ کے نام حسب ذیل ہیں۔

نام	مقام دعوت	نام	مقام دعوت
علی بن ابی طالب	قبیلہ ہمدان و جذیمہ و مذحج	خالد بن الولیدؓ	اطراف مکہ
مغیرہ بن شعبہ	نجران	عمرو بن العاص	عمان
وبر بن یحنس	ابنائے فارس	مہاجر بن ابو امیہ	بطرف حارث بن عبد کلال شہزادہ یمن
نعیمؓ بن مسعود	فدک		
احنف	قبیلہ تمیم (مستدرک ج ۳ ص ۲۹۴)		

۱ اضافہ از ذکر اسلام ابنائے یمن۔

حدود شام میں اسلام

شام کے اطراف میں جو عرب آباد تھے ان میں متعدد ریاستیں تھیں ان میں سے معان اور اس کے اضلاع فروہ بن عمرو کے زیر حکومت تھے لیکن خود فروہ رومی سلطنت کی طرف سے گورنر تھے۔ انہوں نے اسلام سے واقفیت پیدا کی تو مسلمان ہو گئے اور آنحضرت ﷺ کی خدمت میں اظہار اسلام کے ساتھ ایک خچر ہدیہ کے طور پر بھیجا (صحیح مسلم) رومیوں کو ان کے اسلام کا حال معلوم ہوا تو ان کو گرفتار کر کے سولی دے دی اس وقت یہ شعر ان کی زبان پر تھا۔ [1]

بلغ سراة المسلمين بانني　　　سلم لربي اعظمي ومقامي

(مسلمان سرداروں کو میرا یہ پیغام پہنچا دو کہ میرا جسم اور میری عزت سب اپنے پروردگار کے نام پر نثار ہے)

(شام اور عرب کے درمیان عذرہ، بلی، جذام وغیرہ قبائل آباد تھے قبیلہ بلی میں حضرت عمرو بن العاص کا ننھیال تھا اس لئے ایک جماعت کے ساتھ وہ ان اطراف میں بھیجے گئے۔ جب وہ جذام کے تالاب پر پہنچے تو ان کو حملہ کا خوف ہوا۔ دربار نبوت میں اطلاع دی یہاں سے حضرت ابو عبیدہ کی ماتحتی میں بغرض حفاظت کچھ فوج بھیج دی گئی اس کو اہل سیر کی اصطلاح میں غزوہ ذات السلاسل کہتے ہیں)

[1] ابن ہشام جلد دوم [illegible]

وفود عرب

جن لوگوں نے مستقیماً اسلام کی دعوت قبول کرنے کے بعد خود بارگاہ نبوت میں جا کر اپنے اسلام کا اعلان کرنا چاہا، ارباب سیر "وفود" کے عنوان سے ان کا ذکر کرتے ہیں، اس قسم کے وفود کی تعداد بہت زیادہ ہے، ابن اسحاق نے صرف پندرہ وفود کا حال لکھا ہے، ابن سعد میں ۷۰ وفود کا تذکرہ ہے، دمیاطی، مغلطائی، زین الدین عراقی بھی یہی تعداد بیان کرتے ہیں، لیکن مصنف سیرت شامی نے زیادہ استقصاء کیا ہے اور ایک سو چار وفود کے حالات بہم پہنچائے ہیں، اگرچہ ان میں کثرت سے ضعیف روایتوں سے استناد کیا گیا ہے اور اکثر وفود کے نام مبہم ہیں، تاہم یہ مسلم ہے کہ مجمل عدد ابن اسحاق کی روایت سے کہیں زیادہ ہے، علامہ ابن قیم اور قسطلانی نے نہایت تحقیق اور احتیاط کے ساتھ ان میں سے صرف ۳۴ وفود کی تفصیل کی ہے۔

اصل یہ ہے کہ تمام عرب فتح مکہ کے فیصلہ کا منتظر رہا تھا۔ مکہ فتح ہو چکا تو یہ انتظار جاتا رہا، اب ہر قبیلہ نے چاہا کہ خود دارالاسلام میں جا کر کوئی فیصلہ کرے، اہل عرب کو یہ بات تو معلوم ہو چکی تھی کہ اب وہ اسلام کے مقابلہ میں مزاحمت نہیں کر سکتے، لیکن خیبر وغیرہ کی طرح جو اس سے پہلے ہو چکے تھے کہ اسلام لانے پر وہ مجبور نہیں ہیں، بلکہ جزیہ یا کسی اور طریقہ سے صلح کر کے اپنی سابق حالت قائم رکھ سکتے ہیں۔

فتح مکہ کے ساتھ ہی ہر طرف سے سفارتیں آنی شروع ہو گئیں اور بڑے چھوٹے ہر قسم کی جس قدر سفارتیں آئیں انہوں نے بارگاہ نبوت میں پہنچ کر وہ منظر دیکھا کہ جو آئے تھے تو ایمان کی دولت سے مالا مال آئے۔

عرب کے سب سے طاقتور قبیلے جن کا اثر دور تک پھیلا ہوا تھا، تمیم، بنو سعد، بنو حنیفہ، اسد، کندہ، اشعریین، ہمدان، ازد اور طے تھے۔ ان قبائل کی سفارتیں دربار نبوت میں آئیں۔ ان میں سے بعض کی حیثیت مختلف تھی، بعض کا مقصد صرف یہ تھا کہ بہ حیثیت فاتح کے آنحضرت ﷺ کے ساتھ معاہدہ کر لیں، لیکن اکثر اس غرض سے آئیں کہ اسلام کی حقیقت سے مطلع ہو کر اس کے حلقہ میں آ جائیں، یہ وفود زیادہ تر فتح مکہ کے بعد ۹ھ و ۱۰ھ میں آئے، لیکن سلسلہ بیان کے لیے اس سے پہلے کے چند وفود کا ذکر کرنا بھی موزوں ہوگا۔

مزینہ:

یہ ایک بڑا قبیلہ تھا جو مضر تک پہنچ کر قریش کے خاندان سے مل جاتا ہے۔ نعمان بن مقرن مشہور صحابی جو فتح مکہ میں قبیلہ مزینہ کے علمبردار تھے، اسی قبیلہ سے تھے، اصفہان انہی نے فتح کیا تھا، ۵ھ میں اس قبیلہ کے چار سو شخص قبیلہ کے سفیر بن کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آئے اور اسلام لائے۔ عراقی نے سیرت منظوم میں لکھا ہے۔[1]

اول وفد المدینه سنة خمس وفد مزینه

سب سے پہلا وفد جو مدینہ میں آیا وہ مزینہ کا قبیلہ تھا جو ۵ھ میں آیا

---

[1] [illegible]

بنو تمیم:

بنو تمیم کے وفد بڑی شوکت و شان سے آئے قبیلہ کے تمام بڑے بڑے روسا مثلاً اقرع بن حابس، زبرقان، عمرو بن الاہتم، نعیم بن یزید سب اس سفارت میں شامل تھے۔ عیینہ بن حصن فزاری جو مدینہ کے حدود تک حملہ آور ہوا کرتا تھا وہ بھی ساتھ تھا۔ یہ لوگ اگرچہ اسلام قبول کرنے کی غرض سے آئے تھے تاہم عربی فخر و غرور کا نشہ سر میں اب بھی باقی تھا۔ دربار نبوت یعنی مسجد نبوی میں پہنچے تو آنحضرت ﷺ گھر میں تشریف رکھتے تھے آستانہ اقدس پر جا کر پکارے کہ محمد! باہر آؤ۔ آنحضرت ﷺ باہر تشریف لائے تو بولے کہ محمد! ہم اس لیے آئے ہیں کہ تم سے مفاخرہ کریں آپ نے اجازت دی۔ عطارد بن حاجب جو مشہور خطیب تھا اور جس نے نوشیروان کے دربار سے حسن تقریر کے صلہ میں کمخواب کا خلعت حاصل کیا تھا اٹھا اور اپنی قوم کے مفاخر پر ایک پرزور تقریر کی جس کا خلاصہ یہ تھا۔

"خدا کا شکر ہے جس کے الطاف کی بدولت ہم صاحب تاج و تخت، خزانہ ہائے گراں بہا کے مالک ہو، مشرق میں تمام قوموں سے ممتاز ترین ہیں، ہماری برابری آج کون کر سکتا ہے؟ ہماری ہمسری کا جس کو دعویٰ ہو وہ یہ خصائص اور اوصاف گنائے جو ہم نے گنائے ہیں"۔

عطارد خطبہ دے کر بیٹھ گیا تو آنحضرت ﷺ نے ثابتؓ بن قیس کو جواب دینے کا اشارہ کیا انہوں نے جو تقریر کی اس کا ماحصل یہ تھا۔

"اس کی تعریف جس نے زمین اور آسمان بنائے اس نے ہم کو بادشاہت دی، اور اپنے بندوں میں سے بہترین شخص کو انتخاب کیا جو سب سے زیادہ شریف النسب، سب سے زیادہ راست گفتار، سب سے زیادہ شریف الاخلاق تھا وہ تمام عالم کا انتخاب تھا، اس پر خدا نے اس پر کتاب نازل کی، اس نے لوگوں کو اسلام کی دعوت دی تو سب سے پہلے مہاجرین اور ان کے بعد ہم (انصار) نے دعوت اسلام پر لبیک کہی، ہم لوگ انصار الٰہی اور وزرائے رسالت ہیں"۔

تقریریں ہو چکیں تو شعر و شاعری کی باری آئی، سفارت کی طرف سے تمیم کے مشہور شاعر زبرقان بن بدر نے قصیدہ پڑھا

نحن الکرام فلا حی یعادلنا | منا الملوک و فینا تنصب البیع

ہم شرفائے قوم ہیں کوئی قبیلہ ہمارا ہمسر نہیں ہو سکتا ہم میں تخت نشین ہیں اور ہم کلیساؤں کے بانی ہیں۔

روایتوں میں آیا ہے کہ ایک شخص نے مدینہ میں آ کر خطبہ دیا اس کی خوبی تقریر نے تمام حاضرین کو حیرت زدہ کر دیا اس وقت آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا (ان من البیان لسحرا) یعنی بعض بعض تقریروں میں جادو ہوتا ہے۔ اصابہ فی احوال الصحابہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے زبرقان ہی کی تقریر پر یہ الفاظ ارشاد فرمائے تھے۔ غرض جب زبرقان تقریر کر چکے آنحضرت ﷺ نے دربار رسالت کے شاعر یعنی حسان بن ثابتؓ کی طرف دیکھا، انہوں نے برجستہ کہا۔

ان الذوائب من فہر و اخوتہم | قد بینوا سنۃ للناس تتبع

شرفائے قبیلہ فہر اور ان کے بھائیوں نے لوگوں کو وہ راستہ بتا دیا ہے جس کی وہ پیروی کرتے ہیں۔

---

۱ اصابہ فی احوال الصحابہ

امکان مفاخرت میں قریش ہی وہ تنہا عرب کا مشہور حاکم تھا جن کی قومی مقدمات کا مرافعہ ان کے پاس جاتا تھا اور ان کے فیصلوں پر لوگ گردن جھکا دیتے تھے وہ اسلام لا چکے تھے۔ پیچھے تمیم تھا اس کا دعویٰ یہ تھا کہ جب مفاخرت کے ساتھ دربار رسالت میں آئے تو آنحضرت ﷺ سے کہا۔

﴿ان حمدی لزین وان ذمی لشین﴾

میں جس کی تعریف کردوں وہ چمک جاتا ہے اور جس کو برا کہہ دوں اس کو بٹہ لگ جاتا ہے

غرض نظم و نثر کی معرکہ آرائی ہوئی تو مفاخرت نے اعتراف کیا کہ دربار رسالت کے خطیب اور شاعر دونوں ہمارے شاعر اور خطیب سے افضل ہیں۔ پھر سب نے اسلام قبول کیا۔

بنو سعد

بنو سعد نے ضمام بن ثعلبہ کو سفیر بنا کر بھیجا وہ جس طرح آنحضرت ﷺ کے دربار میں آئے اور جس طریقے سے مفاوضت ادا کی اس سے عرب کی اصلی سادگی اور آزادروی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ صحیح بخاری میں متعدد موقعوں پر اس کا ذکر ہے۔ کتاب العلم کی روایت حسب ذیل ہے۔

حضرت انس بن مالک کہتے ہیں کہ ہم لوگ دربار رسالت میں حاضر تھے ایک شخص ناقہ پر سوار آیا اور اس کو مسجد میں لا کر باندھ دیا پھر حاضرین سے پوچھا "محمد کس کا نام ہے؟" لوگوں نے آنحضرت ﷺ کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ "یہ گورے رنگ کے جو تکیہ لگائے بیٹھے ہیں" بدو آگے بڑھا "اے عبدالمطلب کے بیٹے!" آپ ﷺ نے فرمایا "میں جواب دے رہا ہوں" بولا کہ "میں تم سے کچھ باتیں پوچھوں گا سختی سے پوچھوں گا اس پر ناراض نہ ہونا" ارشاد ہوا کہ "جو پوچھنا ہو پوچھو" بولا کہ "اپنے خدا کی قسم کھا کر کہو کیا خدا نے تم کو دنیا کے لئے پیغمبر بنا کر بھیجا ہے؟" آپ نے فرمایا "ہاں" پھر قسم دلا کر پوچھا کہ "کیا تم کو خدا نے پنج وقتہ نماز کا حکم دیا ہے؟" اسی طرح زکوٰۃ روزہ حج کی نسبت پوچھا اور آپ برابر "ہاں" فرماتے جاتے تھے جب سب ارکان ختم ہو چکے تو کہا "میرا نام ضمام بن ثعلبہ ہے اور مجھ کو میری قوم نے بھیجا ہے میں جاتا ہوں اور جو تم نے بتایا ہے میں اس سے ایک ذرہ زیادہ کروں گا نہ کم" وہ چلا گیا تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ "اگر یہ سچ کہتا ہے تو اس نے فلاح پائی"۔ [1]

ضمام نے واپس جا کر اپنی قوم سے کہا کہ "لات و عزیٰ کوئی چیز نہیں" لوگوں نے کہا "یہ کیا کہتے ہو تم کو جنون یا جذام نہ ہو جائے" انہوں نے کہا "خدا کی قسم یہ دونوں نہ کچھ فائدہ پہنچا سکتے ہیں نہ ضرر میں تو خدا اور محمد پر ایمان لا چکا ہوں" ان کی مختصر تقریر کا یہ اثر تھا کہ شام نہیں ہونے پائی تھی کہ قبیلہ کا قبیلہ مرد و عورت سب مسلمان تھے۔ [2]

اشعریین ۷ھ

یمن کا ایک نہایت معزز قبیلہ اشعریین کا تھا۔ ابو موسیٰ اشعریؓ اسی قبیلہ سے ہیں۔ ان لوگوں نے جب آنحضرت ﷺ کی بعثت کی خبر سنی تو تریپن شخصوں نے مدینہ کی ہجرت کا قصد کیا، اسی قافلہ میں حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ بھی

---

[1] یہ روایت صحیح بخاری کتاب العلم سے منقول ہے۔

[2] ابن سعد

تھے۔ یہ لوگ جہاز میں سوار ہو کر چلے لیکن ہوا کے مخالف رخ نے جہاز کو حبش تک پہنچا دیا، وہاں حضرت جعفر طیارؓ موجود تھے، وہ اپنے ساتھ لے کر عرب کو روانہ ہوئے، اس زمانہ میں خیبر فتح ہو چکا تھا اور آنحضرت ﷺ وہیں تشریف فرما تھے چنانچہ وہیں لوگوں نے شرف باریابی حاصل کیا۔

یہ صحیح مسلم (فضائل اشعریین) کی روایت ہے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ جب اشعریوں کا وفد آیا تو آنحضرت ﷺ نے صحابہ سے فرمایا کہ تمہارے ہاں یمن کے لوگ آتے ہیں جو نہایت رقیق القلب اور نرم دل ہیں۔ مسند احمد بن حنبل میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ جب اشعریوں کا وفد آیا تو یہ لوگ جوش مسرت سے یہ رجز پڑھتے تھے۔

غدا نلقی الاحبة	محمدا و حزبه
کل ہم دوستوں سے ملیں گے	یعنی محمد اور ان کے گروہ سے

(بارگاہ نبوت میں پہنچے تو عرض کیا "یا رسول اللہ! ہم اس لیے حاضر ہوئے ہیں کہ اپنے مذہب کے کچھ احکام سیکھیں اور ابتدائے کائنات کے کچھ حالات پوچھیں آپ نے فرمایا "پہلے خدا تھا اور کچھ نہ تھا اس کا تخت پانی پر تھا۔)[1]

دوس ۷ھ:

دوس عرب کا ایک مشہور قبیلہ ہے، حضرت ابوہریرہؓ اسی قبیلہ سے ہیں اس قبیلے کے مشہور شاعر اور رئیس طفیل بن عمرو تھے، وہ ہجرت سے پہلے مکہ گئے قریش نے ان کو منع کیا تھا کہ آنحضرت ﷺ کے پاس نہ جائیں لیکن اتفاق سے ایک دفعہ حرم میں گئے آنحضرت ﷺ نماز پڑھ رہے تھے۔ قرآن مجید سن کر متاثر ہوئے اور آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ آپ مجھ کو اسلام کی حقیقت سمجھائیں، آپ ﷺ نے اسلام کی تبلیغ کی، اور قرآن مجید کی آیتیں سنائیں، وہ نہایت خلوص سے اسلام لائے، وطن جا کر لوگوں کو اسلام کی دعوت دی، لیکن ان کے قبیلہ میں زنا کا بہت رواج تھا لوگ سمجھے کہ اسلام کے بعد اس آزادی سے محروم ہو جائیں گے اس لیے لوگوں نے تامل کیا طفیلؓ نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آ کر یہ حقیقت بیان کی آپ نے دعا فرمائی کہ "خدایا! دوس کو ہدایت دے" پھر طفیلؓ سے ارشاد فرمایا کہ جا کر نرمی اور ملاطفت سے لوگوں کو اسلام کی دعوت دو، غرض (دعائے نبوی کی برکت اور) طفیلؓ کی ترغیب اور ہدایت سے لوگوں نے اسلام قبول کیا اور اسی خاندان جس میں حضرت ابوہریرہؓ بھی تھے ہجرت کر کے مدینہ چلے آئے۔[2]

بنو حارث بن کعب ۹ھ:

یہ نجران کا ایک نہایت معزز خاندان تھا، آنحضرت ﷺ نے حضرت خالدؓ کو ان کے پاس دعوت اسلام کے لیے بھیجا، یہ لوگ نہایت خلوص کے ساتھ اسلام لائے۔ آنحضرت ﷺ نے ان لوگوں کو مدینہ میں بلا بھیجا، چنانچہ قیس بن الحصین و یزید بن عبدالمدان وغیرہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے چونکہ اکثر معرکوں میں قبائل عرب پر غالب رہے تھے آپ ﷺ نے ان سے پوچھا کہ تمہارے غلبہ کے کیا اسباب تھے؟ بولے کہ ہم ہمیشہ متفق ہو کر لڑتے تھے

---

[1] صحیح بخاری باب بدء الخلق۔

[2] اصابہ تذکرۂ طفیل (زرقانی جلد ۳ ص ۶۰)

اور کسی پر ظلم نہیں کرتے تھے آپ نے قیس کو ان کا رئیس مقرر کیا۔ [1]

قبیلہ طے ۹ھ

یمن میں طے نہایت مشہور قبیلہ تھا۔ اس قبیلہ کے رؤسا زید الخیل، عدی بن حاتم طائی تھے اور ان کے حدود حکومت الگ تھے۔ زید مشاہیر جاہلیت کے مشہور شاعر، خطیب، خوش جمال، فیاض، بہادر تھے۔ ۹ھ میں یہ چند معززین طی کے ساتھ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ نے ان کو اسلام کی دعوت دی، انہوں نے مع اپنے ساتھیوں کے نہایت صدق دل سے اسلام قبول کیا۔ شہسواری کی وجہ سے زید الخیل کے لقب سے مشہور تھے۔ آنحضرت ﷺ نے اس لقب کو زید الخیر سے بدل دیا۔ [2]

عدی بن حاتم ۹ھ

عدی مشہور حاتم طائی کے بیٹے اور قبیلہ طے کے سردار اور مذہباً عیسائی تھے۔ سلاطین عرب کی طرح ان کو بھی آمدنی کا چوتھا حصہ ملتا تھا۔ جس زمانہ میں اسلامی فوجیں یمن گئیں، یہ بھاگ کر شام چلے گئے۔ ان کی بہن گرفتار ہو کر مدینے آئیں۔ آنحضرت ﷺ نے ان کو بڑی عزت و حرمت سے رخصت کیا۔ وہ اپنے بھائی کے پاس چلی گئیں اور کہا کہ جس قدر جلد ہو سکے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو۔ وہ پیغمبر ہوں یا بادشاہ ہر حال میں ان کے پاس جانا مفید ہے۔ غرض عدی مدینہ آئے۔ آنحضرت ﷺ مسجد میں تھے۔ عدی نے مسجد میں جا کر سلام کیا۔ آپ نے جواب سلام کے بعد نام پوچھا، پھر ان کو لے کر گھر کی طرف چلے۔ اسی اثنا میں ایک بڑھیا آ گئی، اس نے آپ کو روک لیا اور دیر تک آپ سے کسی کام کے متعلق باتیں کرتی رہی۔ عدی خود رئیس تھے، شام میں رومیوں کا دربار دیکھا تھا، ان کو حیرت ہوئی کہ شہنشاہ عرب ایک بڑھیا کے ساتھ اس مساوات سے پیش آتا ہے۔ اسی وقت ان کو خیال ہوا کہ یہ شخص بادشاہ نہیں ہے۔ آنحضرت ﷺ گھر میں تشریف لائے، چمڑے کا ایک گدا تھا، اس کو عدی کی طرف بڑھایا، یہ اصرار کے بعد اس پر بیٹھے۔ پھر آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "کیوں عدی! تم اپنی قوم سے مرباع لیتے تھے، لیکن یہ تو تمہارے مذہب [نصرانیت] میں جائز نہیں ہے۔" پھر فرمایا کہ خدا کے سوا کوئی اور خدا ہے؟ بولے کہ نہیں۔ پھر پوچھا کہ خدا سے کوئی بڑا ہے؟ بولے کہ نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ "یہودیوں پر خدا کا غضب نازل ہوا ہے اور عیسائی گمراہ ہو گئے ہیں"۔ [4]

غرض عدی نے اسلام قبول کیا اور وہ اس قدر ثابت قدم رہے کہ ردہ کے زمانہ میں بھی ان پر کچھ اثر نہیں پڑا۔ باپ کی سخاوت کا اثر ان پر بھی تھا۔ ایک دفعہ ایک شخص نے ان سے سو درہم طلب کئے، بولے کہ تم حاتم کے بیٹے سے اس قدر حقیر رقم مانگتے ہو، بخدا ہرگز نہ دوں گا۔ [5]

---

1. زاد المعاد۔
2. ایضاً۔
3. ابن ہشام اسلام عدی بن حاتم۔
4. مسند احمد حدیث عدی و ترمذی تفسیر فاتحہ۔
5. اصابہ فی احوال الصحابہ ذکر عدی۔

وفد ثقیف

یاد ہوگا کہ جب آنحضرت ﷺ طائف کا محاصرہ چھوڑ کر واپس ہونے لگے تو صحابہؓ نے عرض کی تھی کہ آپ ان کے حق میں بد دعا فرمائیں، آپ نے جن لفظوں میں دعا فرمائی تھی یہ تھی

﴿ اللھم اھد ثقیفا و أت بھم ﴾

اے خدا ثقیف کو ہدایت دے اور ان کو میرے پاس لے آ۔

(یہ دعا کرشمۂ ربانی کا ایک اعجاز تھی کہ وہ قبیلہ جو تلوار سے زیر نہ ہوسکا تھا خود بخود جلال نبوت سے آستانۂ اسلام پر اس نے گردن جھکا دی اور پورا قبیلہ مسلمان ہوگیا)

طائف دو رئیسوں کے قبضہ میں تھا جن میں ایک عروہ بن مسعود تھے۔ جن کی نسبت کفار مکہ کہا کرتے تھے کہ کلام الٰہی مکہ میں آتا تو ان پر اترتا۔ عروہ اگرچہ اب تک اسلام نہیں لائے تھے لیکن وہ دل میں سمجھ گئے تھے۔ حدیبیہ کی صلح بھی ان ہی کی سفارت سے انجام پائی تھی۔ آنحضرت ﷺ جب طائف سے واپس چلے تو خدا نے ان کو اسلام کی توفیق دی۔ آنحضرت ﷺ مدینہ نہیں پہنچنے پائے تھے کہ وہ خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور اسلام لا کر واپس گئے۔ واپس جا کر انہوں نے اسلام کا اظہار کیا اور لوگوں کو اسلام کی ترغیب دی۔ لوگوں نے ان کو بہت برا بھلا کہا۔ صبح کو جب بالاخانہ پر اذان دی تو ہر طرف سے تیروں کا مینہ برسا یہاں تک کہ وہ شہید ہو گئے۔ مرتے وقت وصیت کی کہ محاصرۂ طائف میں جو مسلمان شہید ہوئے ہیں انہی کے پہلو میں دفن کیے جائیں۔

(عروہ کا خون رائگاں نہیں جا سکتا تھا۔ صخر بن عیلہ رئیس احمس یہ سن کر کہ آنحضرت ﷺ طائف کا محاصرہ کئے ہوئے ہیں کچھ سوار لے کر مدد کو چلا تھا۔ اتفاق سے اس وقت پہنچا جب آپ ﷺ طائف چھوڑ کر مدینہ کی طرف مراجعت فرما چکے تھے۔ صخر نے عہد کیا کہ جب تک اہل طائف آنحضرت ﷺ کی اطاعت قبول نہ کر لیں گے میں قلعہ کا محاصرہ نہ چھوڑوں گا۔ آخر اہل طائف نے اطاعت قبول کر لی۔ صخر نے خدمت نبوی میں اطلاع کی تو آپ ﷺ نے مسجد نبوی میں تمام لوگوں کو جمع کیا اور احمس کے لیے دس بار دعا فرمائی[1]۔ چند روز کے بعد اہل طائف نے باہم مشورہ کیا کہ تمام عرب اسلام لا چکا اب ہم تنہا کیا کر سکتے ہیں۔ آخر یہ رائے قرار پائی کہ چند سفیر مقرر کر کے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں بھیجے جائیں۔

ان کی سفارت نے مدینہ کا رخ کیا تو مسلمانوں کو اس قدر مسرت ہوئی کہ سب سے پہلے مغیرہ بن شعبہؓ دوڑے کہ آنحضرت ﷺ کو جا کر خبر کریں، راہ میں حضرت ابوبکرؓ مل گئے ان کو معلوم ہوا تو مغیرہؓ کو قسم دلائی کہ یہ خوش خبری مجھ کو پہنچانے دو۔ مغیرہ نے ان لوگوں کو تعلیم دی کہ دربار رسالت میں جاؤ تو اس طریقہ سے سلام عرض کرنا لیکن یہ لوگ اسی قدیم دستور کے موافق آداب بجا لائے۔

عبد یالیل طائف کا مشہور رئیس امیر الوفد تھا۔ آنحضرت ﷺ نے ان کو (حالانکہ اب تک وہ کافر تھا) مسجد

---

[1] ابوداؤد باب اقطاع الارضین۔

نبوی میں اتارا (کہ مسلمانوں کی محویت و استغراق کو دیکھ کر متاثر ہوں)[1] یہ لوگ صحن مسجد میں خیمے نصب کرا کر ٹھہرائے گئے۔ نماز اور خطبہ کے وقت یہ لوگ موجود رہتے تھے گو خود شریک نہیں ہوتے تھے۔ آنحضرت ﷺ کا معمول تھا کہ خطبوں میں اپنا نام نہیں لیتے تھے۔ ان لوگوں نے آپس میں تذکرہ کیا کہ محمد ہم سے تو اپنی پیغمبری کا اقرار لیتے ہیں لیکن خطبہ میں خود اپنی پیغمبری کا اقرار نہیں کرتے۔ آنحضرت ﷺ نے سنا تو فرمایا کہ "میں سب سے پہلے شہادت دیتا ہوں کہ میں فرستادۂ الٰہی ہوں"۔

جماعت سفراء میں عثمانؓ بن ابی العاص سب سے کم عمر تھے۔ سفراء دربار نبوی میں آتے تو ان کو پیچھے کر قیام گاہ میں چھوڑ آتے۔ عثمان گو کمسن تھے لیکن سب سے زیادہ تیز فہم اور مسائل پر متجسس تھے ان کا معمول تھا کہ جب سفراء دن کو قیلولہ کرتے تو یہ چپکے سے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور قرآن مجید اور مسائل اسلام سیکھتے یہاں تک کہ اکثر ضروری مسائل سیکھ لیے۔

آنحضرت ﷺ ہمیشہ ان لوگوں کو اسلام کی تبلیغ کرتے (نماز عشاء کے بعد ان کے پاس تشریف لے جاتے اور کھڑے کھڑے ان سے باتیں کرتے۔ زیادہ تر مکہ میں قریش کے ہاتھ سے جو اذیتیں اٹھائی تھیں ان کو بیان فرماتے۔[2] مدینہ میں آ کر جو لڑائیاں پیش آ گئیں ان کا بھی تذکرہ فرماتے) بالآخر ان لوگوں نے اسلام پر آمادگی ظاہر کی لیکن یہ شرطیں پیش کیں۔

۱۔ زنا ہمارے لیے جائز رکھا جائے کیونکہ ہم میں سے اکثر مجرد رہتے ہیں اور اس لیے ان کو اس سے چارہ نہیں۔
۲۔ ہماری قوم کا تمام کاروبار اور ذریعہ معاش سود ہے اس لیے سودخواری جائز رکھی جائے۔
۳۔ شراب سے منع نہ کیا جائے ہمارے شہر میں کثرت سے انگور پیدا ہوتا ہے اور یہ ہماری بڑی تجارت ہے۔

لیکن یہ تینوں درخواستیں نامنظور ہوئیں، بالآخر ان لوگوں نے کہا اچھا ہم یہ شرطیں واپس لیتے ہیں، لیکن ہمارے معبود (طائف کا سب سے بڑا بت جس کا نام لات تھا) کی نسبت کیا ارشاد ہے؟ آپ نے فرمایا کہ وہ توڑ دیا جائے گا، یہ سن کر ان کو سخت حیرت ہوئی کہ کیا کوئی شخص ان کے خدائے اعظم کو ہاتھ بھی لگا سکتا ہے! بولے کہ اگر ہمارے معبود کو معلوم ہو جائے کہ آپ کا یہ ارادہ ہے تو وہ تمام شہر کو تباہ کر دے گا۔ حضرت عمرؓ سے ضبط نہ ہو سکا بولے کہ تم لوگ کس قدر جاہل ہو، منات صرف ایک پتھر ہے، ان لوگوں نے کہا عمر! ہم تمہارے پاس نہیں آئے، یہ کہہ کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں عرض کی کہ ہم منات کو ہاتھ نہیں لگا سکتے آپ جو چاہیں کریں، لیکن ہم کو اس جنایت سے معاف رکھا جائے۔ آپ نے یہ درخواست منظور کر لی۔[3]

ان لوگوں نے نماز، زکوٰۃ اور جہاد سے مستثنیٰ ہونے کی بھی درخواست کی۔ نماز سے معافی تو کسی حالت میں ممکن نہ تھی وہ ہر روز پانچ دفعہ ادا کرنے کی چیز ہے، لیکن زکوٰۃ سال بھر کے بعد واجب ہوتی ہے اور جہاد فرض کفایہ ہے، ہر شخص

---

1. ابوداؤد باب ما جاء فی خبر الطائف۔
2. ابوداؤد باب تحزیب القرآن۔
3. [illegible] وفد ثقیف۔

کی۔ ابوحارثہ جو لارڈ بشپ تھا نہایت محترم اور فاضل شخص تھا قیصر روم نے اس کو یہ منصب عطا کیا تھا اور اس کے لیے گرجے اور معبد بنوائے تھے۔ ۱؎

ان لوگوں نے آنحضرت ﷺ سے مختلف مذہبی مسائل پوچھے اور آپ نے وحی کی رو سے ان کا جواب دیا۔ ان کے زمانہ قیام میں سورۂ آل عمران کی ابتدا کی اسی آیتیں اتریں۔ ان آیتوں میں ان کے سوالات کا جواب تھا۔ جس آیت میں دعوت اسلام کی تصریح تھی وہ یہ ہے۔

﴿قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ ۚ فَإِن تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ﴾ (آل عمران)

کہہ دے کہ اے اہل کتاب! آؤ ایک ایسی بات کو مان لیں جو ہم تم دونوں میں مشترک ہے وہ یہ کہ ہم خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور کسی کو خدا کا شریک نہ بنائیں اور ہم میں کوئی کسی کو خدا کے سوا رب نہ قرار دے پھر اگر یہ لوگ نہ مانیں تو کہہ دو کہ تم گواہ رہو ہم تو مسلمان ہیں۔

آنحضرت ﷺ نے جب ان کو اسلام کی دعوت دی تو ان لوگوں نے کہا ہم تو پہلے سے مسلمان ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جب تک تم صلیب پوجتے ہو، مسیح کو خدا کا بیٹا کہتے ہو کیونکر مسلمان ہو سکتے ہو؟ جب یہ لوگ اس پر راضی نہ ہوئے تو آنحضرت ﷺ نے وحی کے مطابق ان سے کہہ دیا کہ آؤ مباہلہ کر لو یعنی ہم تم دونوں اپنے اہل و عیال کو لے کر آئیں اور دعا کریں کہ جو شخص جھوٹا ہو اس پر خدا کی لعنت ہو۔

﴿فَمَنْ حَاجَّكَ فِيهِ مِن بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَاءَنَا وَأَبْنَاءَكُمْ وَنِسَاءَنَا وَنِسَاءَكُمْ وَأَنفُسَنَا وَأَنفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَل لَّعْنَتَ اللَّهِ عَلَى الْكَاذِبِينَ﴾ (آل عمران)

تو جو شخص تم سے علم آنے کے پیچھے جھگڑا کرتا ہے اس سے کہہ دے کہ آؤ ہم اور تم اپنی اولاد اور اپنی عورتوں کو اور خود اپنے آپ کو بلائیں پھر مباہلہ کریں اور خدا سے دعا کریں کہ ہم میں سے جو جھوٹا ہو اس پر خدا کی لعنت ہو۔

لیکن جب آنحضرت ﷺ حضرت فاطمہ زہراؓ اور امام حسنؓ و حسینؓ کو لے کر مباہلہ کے لیے نکلے تو خود ان کی جماعت میں سے ایک شخص نے رائے دی کہ مباہلہ نہیں کرنا چاہیے اگر یہ شخص واقعی پیغمبر ہے تو ہم لوگ ہمیشہ کے لیے تباہ ہو جائیں گے۔ غرض ان لوگوں نے کچھ سالانہ خراج قبول کر کے صلح کر لی۔

بنو اسد کا وفد:

یہ وہ قبیلہ ہے جو عزت میں قریش کا دست و بازو تھا۔ طلیحہ بن خویلد جس نے حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں نبوت کا دعویٰ کیا تھا اسی قبیلہ سے تھا۔ ۹ھ میں یہ لوگ بھی اسلام لائے اور سعادت بھی حاصل کی لیکن اب تک ان کے دماغ میں فخر کا نشہ باقی تھا۔ سفراء دربار رسالت میں آئے تو اسلام کے بیچ میں کہا کہ آپ نے ہمارے پاس کوئی مہم نہیں بھیجی بلکہ ہم نے خود اسلام قبول کیا اس پر یہ آیت نازل ہوئی

۱؎ زاد المعاد ابن قیم

﴿يَمُنُّونَ عَلَيْكَ أَنْ أَسْلَمُوا قُلْ لَا تَمُنُّوا عَلَيَّ إِسْلَامَكُمْ بَلِ اللَّهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ أَنْ هَدَاكُمْ لِلْإِيمَانِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ﴾ (سورہ حجرات)

یہ لوگ تم پر احسان رکھتے ہیں کہ ہم اسلام لائے۔ کہہ دو کہ مجھ پر اپنے اسلام کا احسان نہ رکھو بلکہ خدا تم پر احسان رکھتا ہے کہ تم کو ایمان لانے کی ہدایت کی اگر تم سچے ہو۔

بنو فزارہ ۔ ۹ ھ

یہ نہایت سرکش اور تند خو قبیلہ تھا۔ عیینہ بن حصن اسی قبیلہ سے تھا۔ اسی قبیلہ نے رمضان ۹ ھ میں جب آنحضرت ﷺ تبوک سے واپس تشریف لائے اپنا وفد بھیجا اور اسلام قبول کیا۔

کندہ ۔ ۱۰ ھ

یہ حضرموت (یمن) کے اضلاع میں سے ایک شہر تھا۔ یہاں کندی خاندان کی سلطنت تھی اس زمانہ میں اس خاندان کے امام اشعث بن قیس تھے۔ یہ حضرت اسی سواروں کے ساتھ بڑی شان و شوکت سے حبرہ کی چادریں جن کے حاشیے حریر کے تھے کاندھوں پر ڈالے بارگاہ نبوی میں حاضر ہوئے۔ یہ پہلے اسلام قبول کر چکے تھے آنحضرت ﷺ نے ان کو دیکھ کر فرمایا "کیا تم اسلام نہیں لا چکے ہو؟" بولے "ہاں" آپ نے فرمایا "تو پھر یہ حریر کیسا؟" ان لوگوں نے فوراً چادریں پھاڑ پھاڑ کر زمین پر ڈال دیں۔[1]

حضرت ابوبکرؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں اپنی بہن (ام فروہ) سے ان کی شادی کر دی تھی نکاح ہو چکا تو فوراً تلوار کھینچ کر اونٹوں کے بازار میں پہنچے اور جو اونٹ سامنے آیا تلوار سے اس کی کونچیں اڑا دیں تھوڑی دیر میں سینکڑوں اونٹ زمین پر تڑپ رہے تھے لوگوں کو حیرت ہوئی انہوں نے کہا میں اپنے وطن میں ہوتا تو اور ہی سروسامان ہوتا یہ کہہ کر اونٹوں کے دام دے دیئے اور لوگوں سے کہا یہ آپ کی دعوت ہے۔[2] یہ جنگ قادسیہ و یرموک میں شریک تھے اور صفین میں حضرت علیؓ کے ساتھ تھے۔[3]

عبدالقیس:

یہ قبیلہ جیسا کہ اوپر گزر چکا، بحرین کا باشندہ تھا یہاں اسلام کا اثر بہت پہلے پہنچ چکا تھا سب سے پہلے اس قبیلہ نے تیرہ آدمی ۵ ھ میں یا اس سے آگے پیچھے وفد کی خدمت نبوی میں حاضر ہوئے۔ آنحضرت ﷺ نے پوچھا تم کون لوگ ہو؟ عرض کی یا رسول اللہ! ہم خاندان ربیعہ سے ہیں۔ فرمایا "مرحبا بالوفد غیر خزایا ولا ندامی" پھر ان لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہمارا ملک بہت دور ہے (بحرین) اور بیچ میں کفار مضر کی آبادیاں ہیں ہم اشہر حرم کے سوا اور مہینوں میں نہیں آ سکتے چند ایسی باتیں تلقین فرمائیے جن پر ہم عمل کریں اور اپنے اہل وطن کو بھی ان کی تعلیم دیں۔ ارشاد ہوا کہ میں تم

---

1. زرقانی۔
2. ابن ہشام وفد کندہ۔
3. اصابہ۔

کو چار باتوں کا حکم دیتا ہوں۔ خدا کو ایک جانو، نماز پڑھو، روزہ رکھو اور خمس دو؛ اور چار چیزوں سے منع کرتا ہوں: دباء، حنتم، نقیر، مزفت۔

دباء، حنتم، نقیر، مزفت یہ عرب میں چار قسم کے برتن ہوتے تھے جن میں شراب بنائی جاتی تھی، آنحضرت ﷺ کی عادت شریف یہ تھی کہ جس قبیلہ میں جو مخصوص عیوب ہوتے تھے ان کے پند و موعظت میں انہیں کا خصوصیت کے ساتھ ذکر فرماتے تھے، لوگوں کو تعجب تھا کہ حضور ﷺ نے ان ظروف کا کیوں مخصوص طور سے ذکر فرمایا، چنانچہ انہوں نے پوچھا "یا رسول اللہ! نقیر کے متعلق آپ کو کیا معلوم ہے؟" ارشاد فرمایا "ہاں کھجور کی موٹی لکڑی کو اندر سے کھود کر تم اس میں پانی ڈال لیتے ہو جب ابال ختم ہو جاتا ہے تو اس کو پی کر بہکے ہوئے بھائیوں پر تلوار چلاتے ہو"۔ اتفاق یہ کہ وفد میں ایک صاحب ایسے تھے جن پر یہی واقعہ گزرا تھا، ان کی پیشانی پر تلوار کا داغ بھی تھا اور اس کو وہ شرم سے چھپاتے تھے۔[1]

بعض روایتوں میں ہے کہ عبد القیس نے خود پوچھا تھا کہ یا رسول اللہ! ہم کو کیا پینا چاہیے؟ اس کے جواب میں آپ نے ان چار برتنوں کا ذکر فرمایا۔[2]

بنو عامر بن صعصعہ ۹ھ

بنو عامر[3] کا قبیلہ عرب کے مشہور قبیلہ قیس عیلان کی شاخ تھا، بنو عامر میں اس وقت تین رئیس تھے، عامر بن طفیل، اربد بن قیس اور جبار بن سلمیٰ۔ عامر اور اربد صرف حصول جاہ کے خواہاں تھے، یہ عامر وہی شخص تھا جو اس سے پہلے متعدد فتنوں کا باعث ہو چکا تھا اور اس وقت بھی شر کی نیت سے آیا تھا، جبار اور قبیلہ کے عام لوگ البتہ خلوص قلب سے صداقت کے طالب تھے۔

عامر مدینہ پہنچ کر خاندان سلول کی ایک خاتون کا مہمان ہوا، جبار اور مشہور صحابی کعب بن مالکؓ میں پہلے سے مراسم تھے، اس لئے وہ تیرہ آدمیوں کے ساتھ انہیں کے گھر مہمان اترے اور انہی کی تقریب سے کعبؓ ان لوگوں کو لے کر خدمت اقدس میں حاضر ہوئے۔ بنو عامر نے سلسلہ کلام میں آنحضرت ﷺ سے خطاب کر کے کہا "انت سیدنا" "حضور ﷺ ہمارے آقا ہیں" آپ نے فرمایا "السید اللہ" "آقا خدا ہے" انہوں نے پھر عرض کی "حضور ﷺ ہم میں سب سے افضل اور سب سے بڑھ کر فیاض ہیں" ارشاد ہوا "بات بولو تو اس کا خیال رہے کہ شیطان تم کو بہکا نہ لے جائے"۔ یعنی چاپلوسی اور تملق بھی ایک قسم کا جھوٹ ہے۔[4]

1. صحیح بخاری کتاب العلم باب الایمان۔
2. صحیح مسلم کتاب الایمان۔
3. مسلم اور دیگر کتب صحاح میں عبد القیس کے اسی وفد کا ذکر ہے لیکن مسند و ابن ماجہ وغیرہ نے اسی قبیلہ کے ایک اور وفد کا ذکر کیا ہے جس میں ۱۳ آدمی شریک تھے، امام قسطلانی نے اسی قبیلہ کے دو وفد قرار دیئے ہیں پہلا قبل فتح مکہ اور دوسرا ۱۰ھ میں، حافظ ابن حجر نے کتاب المغازی میں یہی تحقیق کی ہے لیکن کتاب الایمان کی شرح میں دونوں واقعوں کو ایک ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔
4. اضافہ

صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۭ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ○ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ﴾ (سورہ حج)

مسلمان جن سے (بلا سبب) جنگ کی جاتی ہے، اب ان کو بھی جنگ کی اجازت دی گئی کیونکہ وہ مظلوم ہیں اور خدا ان کی مدد پر قادر ہے، وہ جو ناحق اپنے گھروں سے نکال دیئے گئے صرف اس لئے کہ ان کا اور کوئی قصور نہ تھا کہ وہ یہ کہتے تھے کہ ہمارا پروردگار ہی ہمارا خدا ہے۔ اگر دنیا میں ایک قوم کو دوسری قوم سے ہٹایا نہ جائے تو بہت سی خانقاہیں، گرجے، عبادت گاہیں، مسجدیں جن میں اکثر خدا کا نام لیا جاتا ہے، برباد کر دی جائیں۔ جو خدا کی مدد کرتا ہے خدا اس کی مدد کرتا ہے۔ خدا طاقتور اور غالب ہے۔ (مسلمان وہ ہیں) جن کو اگر خدا زمین میں قوت عطا کرے تو عبادت الٰہی کریں، مستحقین کی مالی اعانت کریں (زکوٰۃ دیں) لوگوں کو نیکیوں کی تاکید کریں، برائیوں سے روکیں، انجام کار خدا ہی کے ہاتھ میں ہے۔

ان آیتوں میں اجمالاً یہ بتایا گیا ہے کہ اسلام میں غزوات کی ابتداء کیوں اور کیونکر ہوئی؟ اسلام کی حکومت کے کیا اغراض و مقاصد تھے اور استخلاف فی الارض کے کیا فرائض ہیں؟ اور دنیا کی عام حکومتوں سے وہ کن امور میں ممتاز ہے؟ ان مباحث کا اصولی اور مفصل بیان کتاب کے دوسرے حصوں میں آئے گا، یہاں صرف عرب کے نظم و نسق کے متعلق عام اور جزئی باتیں بیان کرنی مقصود ہیں۔

صفحات بالا سے معلوم ہو چکا ہے کہ اب تمام عرب میں امن و امان قائم ہے۔ سیاسی مشکلات کا خاتمہ ہو چکا ہے ملک کے ہر گوشہ میں دعاۃ اسلام پھیلے ہوئے ہیں، قبائل دور دراز صوبوں سے بارگاہ نبوت کا رخ کر رہے ہیں، فتح مکہ اسلام کی شہنشاہی کا پہلا دن تھا، جو رمضان ۸ھ کا واقعہ ہے، اسی کے بعد آنحضرت ﷺ نے قبائل میں محصلین زکوٰۃ کا تقرر فرمایا لیکن اصل خلافت الٰہی کے تمام جزئیات اخیر ۱۰ھ میں زمانہ حجۃ الوداع کے قریب تکمیل پا گئے۔

یورپ کی آشنا نگاہ میں اگرچہ آپ ﷺ کی زندگی کا یہ دور ایشیائی شہنشاہانہ زندگی کا ایک طرب انگیز منظر تھا لیکن یہ شاہان حقیقت کا شہنشاہ عرب پھٹے پرانے کپڑوں میں مدینہ کی گلیوں کے اندر غلاموں اور مسکینوں کے کام کرتا ہوا نظر آتا، جو وہ تاج و تخت سے بے نیاز، قیصر و ایوان سے مستغنی، حاجب و دربان سے بے پروا، مال و زر سے خالی، خدم و حشم کے بجائے دلوں پر حکومت کر رہا تھا۔ اس کی حکومت میں پولیس تھی نہ فوج، نہ بڑے بڑے انتظامی دفاتر، نہ کثیر التعداد ارباب مناصب، نہ وزرائے شوریٰ، نہ امرائے سیاست، نہ الگ الگ حکام و قضاۃ، وہ ایک ہی ذات تھی جو ہر فرض و خدمت کی خود ذمہ دار تھی لیکن باایں ہمہ وہ اپنے آپ کو عام مسلمانوں سے امانت کے ایک بال کا بھی زیادہ مستحق نہیں سمجھتا تھا[1] اس کے عدل و انصاف کے آگے فاطمہ جگر گوشہ نبوت اور ایک مجرم برابر تھے۔[2]

آنحضرت ﷺ کی اصل بعثت کا مقصد دعوت مذہب، اصلاح اخلاق اور تزکیہ نفوس تھا، اس کے علاوہ دور تمام

---

[1] ابوداؤد کتاب [illegible] باب [illegible]۔

[2] صحیح بخاری کتاب الحدود۔

فرائض مخصوص کر لیے تھے۔ اس بنا پر انتظامات ملکی آپ نے اسی حد تک قائم کیے جہاں تک ملکی ضرورت کے باعث دعوت توحید کے لیے مواقع پیش آتے تھے تاہم یہ کام بھی بجائے خود اہم تھا۔

انتظام ملکی:

(عمر شریف اس وقت ساٹھ برس کی تھی اس عمر میں بھی اس حکومت کے تمام کام خود انجام دیتے تھے ولاۃ اور عمال کا تقرر، موذنین اور ائمہ کا تعین، محصلین زکوٰۃ و جزیہ کی نامزدگی، غیر قوموں سے مصالحت، مسلمان قبائل میں جائدادوں کی تقسیم، فوجوں کی آراستگی، مقدمات کا فیصلہ، قبائل کی فتنہ جنگیوں کا انسداد، وفود کے لیے تعین وظائف، اجرائے فرامین، نو مسلموں کے انتظامات، مسائل شرعیہ میں افتاء، جرائم کے لیے اجرائے تعزیر، ملک کے بڑے بڑے سیاسی انتظامات، عہدہ داروں کی خبر گیری اور احتساب، دور کے صوبوں میں متعدد صحابہؓ گورنر اور والی بنا کر بھیج دیئے گئے تھے لیکن خود مدینہ اور اطراف مدینہ کے فرائض آپ ﷺ خود انجام دیتے تھے۔

خلافت الٰہی کے ان فرائض و مشاغل نے آپ ﷺ کے دل و دماغ پر جو بار عظیم ڈالا اس نے آپ کے نظام جسمانی کو چور چور کر دیا۔ عام روایات سے ثابت ہے کہ آپ آخر زندگی میں تہجد کی نماز بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے جو ضعف جسمانی کا اقتضا تھا لیکن یہ ضعف جسمانی خود کس چیز کا نتیجہ تھا؟ اس کا جواب حضرت عائشہؓ کی زبان سے سننا چاہیے جس سے بڑھ کر آپ ﷺ کے اعمال زندگی کا کوئی ترجمان نہیں ہو سکتا۔

﴿عن عبد اللّٰہ بن شقیق قال سألت عائشۃ اکان یصلی قاعدا قالت حین حطمہ الناس[1]﴾

عبداللہ بن شقیق کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا کہ کیا آنحضرت ﷺ بیٹھ کر نماز پڑھتے تھے؟ انہوں نے کہا ہاں لیکن اس وقت جب لوگوں نے آپ کو چور چور کر دیا تھا۔

امیر العسکری:

(چھوٹے چھوٹے غزوات و سرایا کے امیر اگرچہ اکثر صحابہ ہوتے تھے لیکن جو بڑے بڑے معرکے پیش آتے تھے ان کی قیادت خود آپ ﷺ بنفس نفیس فرماتے تھے چنانچہ بدر، احد، خیبر، فتح مکہ، تبوک میں خود آپ ﷺ ہی امیر العسکر تھے۔ اس کا مقصد صرف فوج کا لڑانا اور آخری فتح و ظفر حاصل کرنا نہ تھا بلکہ فوج کی عام اخلاقی اور روحانی نگرانی کرنا تھا چنانچہ آپ ﷺ نے مجاہدین اسلام کی جزئی سے جزئی بے احتیاطیوں پر گرفت فرمائی ہے جو احادیث میں بتصریح مذکور ہیں اور اسلام کا قانون جنگ انہی دارو گیر کے ذریعہ سے وجود میں آیا ہے)

افتاء:

(آپ کے عہد مبارک میں اگرچہ متعدد صحابہؓ بھی بطور خود فتویٰ دیتے تھے لیکن زیادہ تر آپ ﷺ ہی اس فرض کو بھی ادا کرتے تھے۔ فتویٰ دینے کے لیے آپ ﷺ نے کوئی خاص وقت مقرر نہیں فرمایا تھا۔ بلکہ چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، غرض جس وقت لوگ آپ سے احکام اسلام کے متعلق سوالات کرتے تھے آپ ان کا جواب دیتے تھے۔ چنانچہ امام

---

[1] ابوداؤد: کتاب الصلوٰۃ باب صلوٰۃ القاعد۔

انتظام کرتے جب آپ کے پاس کہیں سے کچھ مال آتا تو اس کے ذریعے سے وہ قرض ادا کیا جاتا۔ یہاں تک کہ اگر کوئی شخص آپ ﷺ کو ذاتی طور پر ہدیہ بھیجتا تو وہ بھی اسی مد میں صرف کیا جاتا ۱۔ کبھی کبھی اس غرض کے لیے آپ تمام صحابہ کو صدقہ و خیرات کی ترغیب دیتے اور جو رقم وصول ہوتی وہ ان مفلوک الحال مہاجرین کی اعانت میں صرف ہوتی۔ چنانچہ ایک بار مہاجرین کی ایک بہت بڑی جماعت آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ ہر شخص کے بدن پر صرف ایک چادر اور گلے میں ایک تلوار حمائل تھی۔ آپ ﷺ نے ان کی پریشان حالی کو دیکھا تو چہرے کا رنگ بدل گیا فوراً حضرت بلال کو اذان کا حکم دیا نماز سے فارغ ہونے کے بعد ایک خطبہ میں تمام صحابہ کو ان لوگوں کی اعانت کی ترغیب دی اس کا یہ اثر ہوا کہ ایک انصاری اٹھے اور ایک توڑا جو اس قدر وزنی تھا کہ ان سے بمشکل اٹھ سکتا تھا لا کر آپ کے آگے ڈال دیا اس سے تمام لوگوں میں اور بھی جوش پیدا ہوا اور تھوڑی دیر میں ان بے سروسامان مہاجرین کے آگے غلہ اور کپڑے کا ڈھیر لگ گیا۔ ۲

فتح مکہ کے بعد تمام اطراف ملک سے کثرت کے مذہبی وفود آنے لگے۔ آپ ﷺ بنفس نفیس ان کی خاطر مدارات کرتے تھے اور ان کے لیے حسب حاجت وظائف اور سفر کے مصارف ادا فرماتے تھے قبائل پر اس کا بہت اچھا اثر پڑتا تھا۔ آپ ﷺ اس کا اس قدر لحاظ فرماتے تھے کہ وفات کے وقت آپ نے جو آخری وصیتیں فرمائی تھیں ان میں ایک یہ بھی تھی۔

﴿اجیزوا الوفد بنحو ما کنت اجیزھم﴾ ۳

جس طرح میں وفود کو عطیہ دیا کرتا تھا تم بھی اسی طرح دیا کرو۔

وفود کے حالات آگے آتے ہیں۔

عیادت مرضیٰ:

(مریضوں کی عیادت اور ان کی تجہیز و تکفین میں شریک ہونا) چونکہ ایک مذہبی فرض تھا اور مذہبی حیثیت سے اس کی ابتدا بھی ہوئی چنانچہ جب آپ ﷺ مدینہ تشریف لائے تو یہ عام دستور ہو گیا کہ دم نزع میت کے اعزہ آپ کو اطلاع دیتے۔ آپ ﷺ ان کے پاس آ کر ان کے لیے دعائے مغفرت کرتے تھے لیکن بعض حیثیتوں سے اس کا تعلق خلافت کے ساتھ بھی ہو گیا تھا کیونکہ بعض صحابہ اس حالت میں اپنی جائداد کو وقف یا صدقہ کرنا چاہتے تھے اور آنحضرت ﷺ اس وقت ان کا صحیح طریقہ بتاتے تھے۔ جن لوگوں پر قرض آتا تھا آپ ان کے جنازہ میں شریک نہیں ہوتے تھے اس لیے ان کے ورثہ یا دوسرے صحابہ کو مجبوراً یہ قرض ادا کرنا پڑتا تھا اور اس طرح بعض معاملات و نزاعات کا فیصلہ ہو جاتا تھا چنانچہ

۱ ابوداؤد کتاب الخراج والامارۃ باب فی الامام یقبل ہدایا المشرکین۔
۲ مسند امام ابن حنبل جلد ۳ صفحہ ۵۵۔
۳ صحیح بخاری جلد اول باب اخراج الیہود من جزیرۃ العرب۔
۴ مسند جلد ۳ صفحہ ۲۶۔

احادیث میں اس قسم کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔)

احتساب:

[تمدن اسلام کے دور ترقی میں محکمہ احتساب ایک مستقل محکمہ تھا جو نہایت وسیع پیمانے پر تمام قوم کے اخلاق و عادات، بیع و شرا اور معاملات داد و ستد کی نگرانی کرتا تھا لیکن آنحضرت ﷺ کے عہد مبارک میں یہ محکمہ قائم نہیں ہوا تھا، بلکہ خود ہی آپ اس فرض کو ادا فرماتے تھے۔ ہر شخص کے جزئیات اخلاق اور فرائض مذہبی کے متعلق آپ وقتاً فوقتاً داروگیر فرماتے رہتے تھے۔ تجارتی معاملات کی بھی نگرانی فرماتے تھے۔ عرب میں تجارتی معاملات کی حالت نہایت قابل اصلاح تھی اور مدینہ میں آنے کے ساتھ ہی آپ نے ان اصلاحات کو جاری کر دیا۔ لیکن تمام لوگوں سے اصلاحات پر عمل کرانا صیغہ احتساب سے تعلق رکھتا تھا چنانچہ آپ نہایت سختی کے ساتھ ان معاملات کی نگرانی فرماتے تھے اور تمام لوگوں سے ان پر عمل کراتے تھے اور جو لوگ باز نہیں آتے تھے ان کو سزائیں دلاتے تھے۔ صحیح بخاری کتاب البیوع میں ہے۔

﴿لقد رأيت الناس في عهد النبي ﷺ يبتاعون جزافا يعني الطعام يضربون ان يبيعوه في مكانهم حتى يؤووه الى رحالهم۔﴾

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ میں نے آنحضرت ﷺ کے عہد میں دیکھا کہ جو لوگ تخمینا غلہ خریدتے تھے ان کو اس بات پر سزا دی جاتی تھی کہ اپنے گھروں میں منتقل کرنے سے پہلے اس کو خود اسی جگہ بیچ ڈالیں جہاں اس کو خریدا تھا۔

کبھی کبھی تحقیق حال کے لیے آپ ﷺ خود بازار تشریف لے جاتے، ایک بار آپ بازار سے گزرے تو غلہ کا ایک انبار نظر آیا۔ اس کے اندر ہاتھ ڈالا تو تری محسوس ہوئی۔ دوکاندار سے دریافت فرمایا کہ یہ کیا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ بارش سے بھیگ گیا ہے۔ ارشاد ہوا کہ "پھر اس کو اوپر کیوں نہیں کر لیا تا کہ ہر شخص کو نظر آئے؟ جو لوگ فریب دیتے ہیں وہ ہم میں سے نہیں ہیں۔"[1]

فرائض احتساب میں آپ کا سب سے بڑا فرض عمال کا محاسبہ تھا یعنی جب عمال زکوۃ اور صدقہ وصول کر کے آتے تھے تو آپ اس غرض سے ان کا جائزہ لیتے تھے کہ انہوں نے کوئی ناجائز طریقہ تو نہیں اختیار کیا ہے۔ چنانچہ ایک بار آپ ﷺ نے ابن اللتبیہ کو صدقہ وصول کرنے کے لیے مامور فرمایا وہ اپنی خدمت انجام دے کر واپس آئے اور آپ ﷺ نے ان کا جائزہ لیا تو انہوں نے کہا یہ مال مسلمانوں کا ہے اور یہ مجھ کو ہدیہ ملا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "گھر بیٹھے تم کو یہ ہدیہ کیوں نہیں ملا" اس کے بعد آپ ﷺ نے ایک عام خطبہ دیا جس میں اس کی سخت ممانعت فرمائی۔[2]

اصلاح بین الناس:

(اسلام تمام دنیا کے تفرقوں کو عموماً اور عرب کے اختلافات کو خصوصاً مٹانے کے لیے آیا تھا اس بنا پر آنحضرت

[1] صحیح مسلم جلد ۱ صفحہ ۷۰ کتاب الایمان۔

[2] بخاری جلد ۲ صفحہ ۱۰۶۸ کتاب الاحکام۔

ﷺ نے اس کو اپنا ایک ضروری فرض قرار دیا تھا اور جب آپ ﷺ کو اس قسم کے منازعات کی خبر ہوتی تھی تو آپ ﷺ اصلاح کو تمام خدائی فرائض پر مقدم رکھتے تھے چنانچہ ایک بار قبیلہ بنو عمرو بن عوف کے چند اشخاص کے درمیان نزاع پیدا ہوئی آپ کو معلوم ہوا تو چند صحابہؓ کے ساتھ ان میں مصالحت کرانے کے لیے تشریف لے گئے۔ آپ کو اس معاملہ میں دیر ہوئی اور نماز کا وقت آ گیا حضرت بلالؓ نے اذان دی لیکن اذان کے بعد بھی آپ ﷺ تشریف نہیں لائے۔ تھوڑی دیر کے انتظار کے بعد انہوں نے حضرت ابوبکرؓ کو امام بنا کر نماز شروع کر دی آپ ﷺ اسی حالت میں تشریف لائے اور صفوں کو چیرتے ہوئے اگلی صف میں جا کھڑے ہوئے حضرت ابوبکرؓ گو نماز میں ادھر ادھر نہیں دیکھتے تھے لیکن جب لوگوں نے زور زور سے تالیاں بجانی شروع کیں تو انہوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا کہ آنحضرت ﷺ کھڑے ہیں۔ آپ ﷺ نے اگرچہ ہاتھ سے اشارہ کیا کہ کھڑے رہیں لیکن آپ ﷺ کی موجودگی میں انہوں نے امامت کرنا سوء ادب خیال کیا اس لیے پیچھے ہٹ آئے اور آنحضرت ﷺ آگے بڑھ کر ان کی جگہ کھڑے ہو گئے۔[1]

ایک بار اہل قبا کے درمیان نزاع قائم ہوئی اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ لوگوں نے باہم سنگ اندازی کی۔ آنحضرت ﷺ کو خبر ہوئی تو آپ ﷺ صحابہؓ کے ساتھ مصالحت کرانے کی غرض سے تشریف لے گئے[2] (یہ دونوں واقعات گو امام بخاری نے الگ لکھے ہیں لیکن شراح حدیث کی تحقیق میں یہ ایک ہی واقعہ کے دو حصے ہیں) بخاری کی دوسری روایتوں میں ہے کہ آپ ﷺ اتی اور پیدل گئے تھے۔

ابن ابی حدرد پر حضرت کعب بن مالکؓ کا کچھ قرض تھا انہوں نے مسجد میں تقاضا کیا ابن ابی حدرد قرض کا ایک حصہ معاف کرانا چاہتے تھے لیکن وہ اس پر راضی نہ ہوتے تھے بات زیادہ بڑھی اور شور وغل ہوا تو آپ ﷺ گھر کے اندر سے نکل آئے اور کعبؓ کو پکارا کعبؓ نے لبیک کہا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ "نصف معاف کردو" وہ راضی ہو گئے تو آپ ﷺ نے ابن ابی حدرد سے کہا کہ "جاؤ اور بقیہ حصہ ادا کردو"۔

اس قسم کے سینکڑوں جزئی واقعات روزمرہ پیش آیا کرتے تھے۔

مدینہ میں اور مدینہ سے باہر دیگر فرائض کی انجام دہی کے لیے اکابر صحابہؓ اور ارباب استعداد کو مختلف عہدوں پر نصب فرمایا۔ کتابت وحی، تحریر پیام، اجرائے احکام و فرامین کے لیے سب سے پہلی ضرورت عہدۂ انشاء اور کتابت کی تھی۔ اسلام سے پہلے عرب میں عام طور پر لکھنے پڑھنے کا رواج نہ تھا لیکن اسلام عرب کے لیے رحمتوں کا جو خزانہ لایا تھا اس میں ایک یہ شے بھی تھی۔ اسیران بدر میں نادار لوگوں کا فدیہ صرف یہ قرار دیا گیا کہ وہ مدینہ کے بچوں کو لکھنا سکھا دیں۔ حضرت زید بن ثابتؓ نے جن کے متعلق کتابت وحی کی مقدس خدمت تھی اسی طریقہ پر تعلیم پائی تھی۔ ابوداؤد کی ایک روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ اصحاب صفہ کو جو تعلیم دی جاتی تھی اس کا ایک جز کتابت کی تعلیم بھی تھی)

کتّاب:

[عہدۂ قضا گویا آنحضرت ﷺ کی ایک حیثیت سے نیابت تھی۔ اس لیے مختلف اوقات میں بڑے بڑے

---

۱ بخاری جلد اول کتاب الصلح۔

۲ بخاری کتاب الصلح۔

صحابہ اس خدمت پر مامور کیے گئے۔ جن میں شرحبیل بن حسنہ کندی سب سے پہلے اس شرف سے ممتاز ہوئے۔ یہ نہایت قدیم الاسلام تھے مکہ میں جنہوں نے سب سے پہلے کتابت وحی کا فرض انجام دیا، قریش میں سب سے پہلے کاتب عبداللہ بن ابی سرح تھے، مدینہ میں اس کی اولیت کا شرف حضرت ابی بن کعبؓ کو حاصل ہوا۔

حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت عامرؓ بن فہیرہ، حضرت عمروؓ بن العاص، حضرت عبداللہؓ بن ارقم، حضرت ثابتؓ بن قیس بن شماس، حضرت حنظلہؓ بن الربیع الاسدی، حضرت مغیرہؓ بن شعبہ، حضرت عبداللہؓ بن رواحہ، حضرت خالدؓ بن ولید، حضرت خالدؓ بن سعید بن العاص، حضرت علاءؓ بن حضرمی، حضرت حذیفہؓ بن الیمان، حضرت معاویہؓ بن ابی سفیان، حضرت زیدؓ بن ثابت مختلف اوقات میں اس منصب پر مامور ہوئے۔

اگرچہ تمام بزرگوں کو کبھی کبھی یہ خدمت ادا کرنی پڑتی تھی، چنانچہ صلح نامہ حدیبیہ حضرت علیؓ نے اپنے ہاتھ سے لکھا تھا، امراء اور سلاطین کے نام خطوط حضرت عامرؓ بن فہیرہ لکھتے تھے اور امرائے عمان کے نام آپ نے جو مکتوب بھیجا تھا وہ حضرت ابیؓ بن کعب کا لکھا تھا۔ قطن بن حارثہ کو جو خط یا دستاویز دی گئی تھی وہ حضرت ثابتؓ بن قیس نے لکھا تھا لیکن عام طور پر یہ خدمت حضرت زیدؓ بن ثابت کے متعلق تھی اور صحابہ کے گروہ میں ان کا نام اسی حیثیت سے زیادہ نمایاں ہے۔[1]

حضرت زیدؓ بن ثابت نے آنحضرت ﷺ کے ارشاد سے ان تمام بزرگوں پر ایک خاص امتیاز حاصل کیا کہ عبرانی زبان سیکھی جس کی ضرورت یہ پیش آئی کہ مدینہ میں آنحضرت ﷺ کو زیادہ تر یہود سے تعلق رہتا تھا جن کی مذہبی زبان عبرانی تھی۔ اس بنا پر آپ نے حضرت زید بن ثابتؓ کو عبرانی زبان سیکھنے کا حکم دیا اور انہوں نے چند دنوں میں اس میں مہارت حاصل کر لی۔

حکام اور ولاۃ:

فصل قضایا، اقامت عدل، بحالی امن، رفع نزاع کے لیے متعدد ولاۃ و حکام کی ضرورت تھی اس غرض سے آپ ﷺ نے متعدد صحابہؓ کو مختلف مقامات کا حاکم و والی مقرر فرمایا، چنانچہ ان کے ناموں کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

باذانؓ بن ساسان	بہرام گور کے خاندان سے تھے اور سلاطین عجم میں سب سے پہلے مشرف باسلام ہوئے۔ اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے ان کو یمن کا والی مقرر فرمایا۔
شہرؓ بن باذان	باذان بن ساسانؓ کے بعد آنحضرت ﷺ نے ان کو صنعاء کا والی مقرر فرمایا۔
خالد بن سعیدؓ بن العاصؓ	شہر بن باذانؓ مارے گئے تو ان کے بعد آپ ﷺ نے ان کو صنعاء کا عامل مقرر فرمایا۔
مہاجر بن امیہ المخزومی	آپ نے ان کو کندہ و صدف کا والی مقرر فرمایا تھا لیکن وہ ابھی روانہ بھی نہ ہوئے تھے کہ آپ ﷺ نے انتقال فرمایا۔
زیاد بن لبید الانصاریؓ	حضرموت کے والی تھے۔
ابوموسیٰ اشعریؓ	زبید، عدن، رمعہ وغیرہ کے والی تھے۔

[1] ان بزرگوں کے نام اور تفصیلی حالات زرقانی جلد ۳ صفحہ ۳۱۲ میں مذکور ہیں۔

معاذ بن جبلؓ	والی جند۔
عمرو بن حزمؓ	والی نجران۔
یزید بن ابی سفیانؓ	والی تیماء۔
عتاب بن اسیدؓ	والی مکہ۔
علی بن ابی طالبؓ	متولی اخماس یمن۔
عمرو بن العاصؓ	والی عمان۔
علاء بن حضرمیؓ	والی بحرین۔

ان ولاۃ یعنی گورنروں کا تقرر ملک کی وسعت اور ضروریات کے لحاظ سے ہوتا تھا۔ آنحضرت ﷺ کے عہد مبارک میں عرب کے جو حصے اسلام کے زیر اثر آ گئے ان میں یمن سب سے زیادہ وسیع اور متمدن تھا اور مدت تک ایک باقاعدہ سلطنت کے زیر سایہ رہ چکا تھا اس بناء پر آنحضرت ﷺ نے اس کو پانچ حصوں میں منقسم فرمایا اور ہر ایک کے لئے علیحدہ علیحدہ گورنر مقرر فرمائے۔ خالد بن سعیدؓ کو صنعاء پر مہاجر بن ابی امیہؓ کو کندہ پر زیاد بن لبیدؓ کو حضر موت پر معاذ بن جبلؓ کو جند پر ابو موسیٰ اشعریؓ کو زبید، معافر، عدن اور سواحل پر۔ [1]

عموماً جب کسی مہاجر کو کہیں کا عامل مقرر فرماتے تھے تو اس کے ساتھ ایک انصاری کا تقرر بھی فرماتے تھے۔ [2]

ملکی انتظام، فصل مقدمات اور تحصیل خراج وغیرہ کے علاوہ ان عمال کے سب سے مقدم فرض اشاعت اسلام اور سنن و فرائض کی تعلیم تھی اس لحاظ سے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے یہ لوگ حاکم ملک اور والی صوبہ ہونے کے ساتھ مبلغ دین اور معلم اخلاق کی حیثیت بھی رکھتے تھے۔ استیعاب تذکرہ معاذ بن جبلؓ میں ہے۔

﴿وبعثه رسول الله ﷺ قاضيا الى الجند من اليمن يعلم الناس القرآن و شرائع الاسلام و يقضي بينهم و جعل اليه قبض الصدقات من العمال الذين باليمن.﴾

آنحضرت ﷺ نے ان کو یمن کے ایک حصہ یعنی جند کا قاضی بنا کر روانہ فرمایا۔ یہ لوگوں کو قرآن اور شرائع اسلام کی تعلیم دیں اور جو عمال یمن میں تھے ان کے صدقات کے جمع کرنے کی خدمت بھی ان کے متعلق تھی۔

چنانچہ جب یہ لوگ روانہ ہوتے تھے تو آنحضرت ﷺ ان فرائض کی تعیین فرما دیتے تھے۔ معاذ بن جبلؓ کو روانہ فرمایا تو یہ نصیحت کی۔

﴿انك ستاتي قوما من اهل الكتاب فادعهم الى شهادة ان لا اله الا الله واني رسول الله فان هم اطاعوا لذلك فاعلمهم ان الله افترض عليهم خمس صلوات في كل يوم و ليلة فان هم اطاعوا لذلك فاعلمهم ان الله افترض عليهم صدقة تؤخذ من اغنيائهم و ترد الى فقرائهم فان هم اطاعوا لذلك فاياك و كرائم اموالهم واتق دعوة المظلوم فانه ليس بينها

---

1. استیعاب تذکرہ معاذ بن جبلؓ۔
2. مسند ابن حنبل جلد ۵ صفحہ ۱۸۶۔

و بین اللہ حجاب ﴾

تم اہل کتاب کے پاس جاتے ہو پہلے ان کو کلمہ توحید کی دعوت دو، اگر وہ اس کو قبول کر لیں تو ان کو بتاؤ کہ خدا نے رات اور دن میں ان پر پانچ نمازیں فرض کی ہیں، اگر وہ اس کو بھی مان لیں تو ان کو بتاؤ کہ خدا نے ان پر صدقہ فرض کیا ہے جو ان کے امراء سے لے کر ان کے غرباء پر تقسیم کر دیا جائے گا، اگر وہ اس کو بھی تسلیم کر لیں تو ان کے بہترین مال سے احتراز کرو اور مظلوم کی بددعا سے بچنا کیونکہ اس میں اور خدا کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہے۔

ان فرائض کے ادا کرنے کے لیے سب سے زیادہ ضرورت تجربہ کی وسعت نظر اور اجتہاد کی تھی، اس بنا پر آپ ان لوگوں کے تجربہ کی اور طرز عمل کا امتحان لیتے تھے چنانچہ جب حضرت معاذؓ کو روانہ فرمایا تو پہلے ان کی اجتہادی قابلیت کے متعلق اطمینان فرمالیا۔ ترمذی میں ہے۔

﴿ قال رسول اللہ ﷺ لمعاذ بن جبل حین وجھہ الی الیمن بم تقضی قال بما فی کتاب اللہ قال فان لم تجد فی کتاب اللہ قال بما فی سنۃ رسول اللہ قال فان لم تجد فی سنۃ رسول اللہ قال اجتھد رأیی فقال رسول اللہ ﷺ الحمد للہ الذی وفق رسول رسول اللہ لما یحب رسول اللہ ﴾

رسول اللہ ﷺ نے جب معاذ بن جبلؓ کو یمن کی طرف بھیجا تو فرمایا کس چیز سے مقدمات کا فیصلہ کرو گے؟ انہوں نے کہا قرآن مجید سے۔ آپ ﷺ نے فرمایا اگر اس میں وہ فیصلہ تم کو نہ ملے؟ انہوں نے کہا احادیث سے۔ پھر آپ نے فرمایا اگر احادیث میں بھی اس کے متعلق ہدایت نہ ملے؟ تو انہوں نے کہا میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا۔ اس پر آپ نے فرمایا اس خدا کا شکر ہے جس نے رسول اللہ کے رسول کو اس چیز کی توفیق دی جس کو خود اس کا رسول محبوب رکھتا ہے۔

لیکن اہل عرب کے دلوں کو مسخر کرنے کے لیے ان تمام چیزوں سے زیادہ نرمی، ملاطفت، نرمی اور خوش خوئی کی ضرورت تھی جس کی آمیزش سیاست اور حکومت کے اقتدار کے ساتھ تقریباً ناممکن ہو جاتی ہے اس لیے آنحضرت ﷺ گورنروں کو بار بار اس کی طرف متوجہ فرماتے رہتے تھے چنانچہ جب معاذ بن جبلؓ کو ایک صحابی کے ساتھ یمن کی گورنری پر روانہ فرمایا تو پہلے دونوں کو عام طور سے وصیت فرمائی۔

﴿ یسرا ولا تعسرا و بشرا ولا تنفرا و تطاوعا ولا تختلفا ﴾ (بخاری جلد دوم صفحہ ۶۲۲ کتاب [illegible])

آسانی پیدا کرنا، دشواری نہ پیدا کرنا، لوگوں کو بشارت دینا اور ان کو وحشت زدہ نہ کرنا، باہم اتفاق رکھنا اور اختلاف نہ کرنا۔

اس پر بھی تسکین نہ ہوئی تو معاذ بن جبلؓ جب رکاب میں پاؤں ڈال چکے تو ان سے خاص طور پر یہ الفاظ فرمائے

﴿ احسن خلقک للناس ﴾ (ابن سعد تذکرہ معاذ بن جبلؓ)

لوگوں کے ساتھ خوش خلقی کے ساتھ برتاؤ کرنا۔

اگرچہ یہ اصول صحیح ہے کہ کوئی حکومت کبھی حق و عدل کے بغیر نہیں قائم رہ سکتی لیکن ابتدا میں جب وہ کسی ملک کو اپنے قبضہ اقتدار میں لاتی ہے تو سرکش لوگوں کے مطیع کرنے کے لیے اس کو مجبوراً سختیاں کرنی پڑتی ہیں، تو عرب سب سے زیادہ اس کا مستحق

تھا لیکن آنحضرت ﷺ کی اس مقدس تعلیم کا یہ نتیجہ تھا کہ ریگستان عرب کا ایک ذرہ بھی ولاۃ کے مظالم کے ننگ سے آلودہ نہ ہوا یہاں تک کہ اخیر زمانہ میں جب صحابہؓ خلافت کے مظالم دیکھتے تھے تو ان کو سخت اضطراب ہوتا تھا اور وہ آنحضرت ﷺ کی تعلیمات کے ذریعہ سے ان کو روکتے تھے چنانچہ ایک بار ہشام بن حکیم بن حزام نے دیکھا کہ شام کے چند قبطی دھوپ میں کھڑے کئے گئے ہیں انہوں نے لوگوں سے اس کی وجہ پوچھی لوگوں نے کہا کہ جزیہ وصول کرنے کے لیے ان لوگوں کے ساتھ یہ سختی کی جا رہی ہے۔ انہوں نے یہ سن کر کہا۔

﴿اشهد لسمعت رسول الله ﷺ يقول ان الله يعذب الذين يعذبون الناس في الدنيا﴾ [1]

میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے سنا ہے کہ خدا ان لوگوں کو عذاب دے گا جو لوگوں کو دنیا میں عذاب دیتے ہیں۔

محصلین زکوٰۃ و جزیہ

اہل عرب کا خلوص اور جوش ایمان اگرچہ خود ان کو صدقہ و زکوٰۃ کے ادا کرنے پر آمادہ کر دیتا تھا چنانچہ اسلام لانے کے ساتھ ہی ہر قبیلہ اپنی قوم کا صدقہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں خود پیش کرتا اور آپ ﷺ کی دعا سے برکت اندوز ہوتا تھا لیکن ایک وسیع ملک اور ایک وسیع حکومت کے لیے یہ طریقہ کافی نہ تھا اس لیے ولاۃ کے علاوہ محرم ۹ھ میں آنحضرت ﷺ نے صدقہ و زکوٰۃ کے وصول کرنے کے لیے ہر قبیلہ کے لیے الگ الگ محصلین مقرر فرمائے جو قبائل کا دورہ کر کے لوگوں سے زکوٰۃ اور خراج وصول کر کے آپ کی خدمت مبارک میں پیش کرتے تھے۔ عموماً خود وہ ساعی قبائل اپنے قبیلوں کے محصل ہوتے تھے اور احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عموماً ان کا تقرر وقتی ہوتا تھا۔

بہرحال آپ نے اس فرض کی انجام دہی کے لیے حسب ذیل اشخاص کو مختلف قبائل اور شہروں میں متعین فرمایا۔ [2]

نام	مقام مقرر	نام	مقام مقرر
عدی بن حاتمؓ	طے و بنی اسد	ابوجہم بن حذیفہؓ	بنو لیث
صفوان بن صفوانؓ [3]	بنی عمرو	ایک غفاری	بنو جذیمہ
مالک بن نویرہؓ	بنو حنظلہ	عمر فاروقؓ	شہر مدینہ
بریدہ بن حصیب الاسلمیؓ	غفار و اسلم	ابوعبیدہؓ بن جراح	شہر نجران
عباد بن بشر الاشہلیؓ	سلیم و مزینہ	عبداللہؓ بن رواحہ	شہر خیبر
رافع بن مکیث جہنیؓ	جہینہ	زیاد بن لبیدؓ	حضرموت

---

1. صحیح مسلم، باب الوعید الشدید لمن عذب الناس بغیر حق۔
2. اس فہرست کے نام ابن سعد و مغازی جلد ۲ میں مذکور ہیں۔ عمر فاروقؓ اور ابوعبیدہؓ بن جراح کا ذکر بخاری کتاب الصدقات اور مسلم کتاب الزکوٰۃ و کتاب الخراج میں ہے۔ جزیہ کے لیے زیاد بن لبید کا ذکر اصابہ اور فتوح البلدان بلاذری میں ہے۔
3. اصابہ ج ۲ صفوان۔

نصف پیداوار حسب معاہدہ تقسیم کرا کے لائے تھے، یہودیوں نے ان کو رشوت دینی چاہی تو انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ "اے خدا کے دشمنو! کیا مجھے حرام مال کھلانا چاہتے ہو"۔[۱] لیکن با ایں ہمہ پاک و مقدس جب محصل اپنے دورہ سے واپس آتے تھے تو رسول اللہ ﷺ خود ان کا محاسبہ فرماتے تھے۔ چنانچہ ایک بار آپ نے ابن اللتبیہ کو صدقہ وصول کرنے کے لیے روانہ فرمایا، جب وہ واپس آئے اور آپ نے ان کا محاسبہ کیا تو انہوں نے کہا یہ آپ کا مال ہے اور یہ مجھے ہدیتاً ملا ہے۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا کہ تم گھر بیٹھے بیٹھے ہدیہ کیوں نہیں ملا۔ اس پر بھی تسکین نہ ہوئی تو ایک عام خطبہ دیا اور تمام لوگوں کو اس قسم کے مال لینے سے سختی کے ساتھ ممانعت فرمائی۔[۲]

(۴) چونکہ آنحضرت ﷺ نے اپنے خاندان پر صدقہ و زکوٰۃ کا مال حرام کر دیا تھا، اس لیے خاندان نبوت کا کوئی شخص صدقہ کا محصل مقرر نہیں ہوا۔ ایک بار عبد المطلب بن ربیعہ بن حارث اور فضل بن عباس نے کہ عم زاد بھائی اور بھتیجے تھے آپ کی خدمت میں درخواست کی کہ اب ہم دونوں نکاح کے قابل ہو گئے ہیں، تمام لوگوں کی طرح ہم کو بھی صدقہ کا عامل مقرر فرما دیجئے تاکہ اس کے معاوضہ سے کچھ مال جمع کر کے نکاح کے لیے سرمایہ مہیا کریں، لیکن آپ نے فرمایا کہ صدقہ آل محمد کے لیے جائز نہیں ہے، وہ لوگوں کا میل ہے۔[۳]

(۵) عمال کا انتخاب خود رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے اور جو لوگ اپنے آپ کو اس خدمت کے لیے خود پیش کرتے تھے، ان کی درخواست نامنظور ہوتی تھی۔ چنانچہ ابوموسیٰ اشعریؓ کے ساتھ دو شخص آئے اور عامل بننے کی درخواست کی۔ آپ نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ "تم کیا کہتے ہو" انہوں نے کہا کہ مجھ کو یہ خبر نہ تھی کہ یہ لوگ اس غرض سے آئے ہیں۔ آپ ﷺ نے ان دونوں کی درخواست نامنظور کی اور فرمایا کہ جو لوگ خود خواہش کرتے ہیں ہم ان کو عامل مقرر نہیں کرتے، لیکن اسی وقت حضرت ابوموسیٰ کو بلا درخواست یمن کا عامل مقرر کر کے روانہ فرمایا۔[۴]

(۶) عمال کو صرف بقدر ضرورت معاوضہ ملتا تھا، آپ نے عام منادی فرما دی تھی کہ جو شخص ہمارا مقرر کردہ عامل ہو اس کو صرف اتنا لینا چاہیے، اس سے زیادہ لے گا وہ خیانت ہوگی۔ بقدر ضرورت کی تصریح خود آپ نے فرما دی تھی۔[۵]

﴿من کان لنا عاملاً فلیکتسب زوجۃ فان لم یکن لہ خادم فلیکتسب خادما وان لم یکن لہ مسکن فلیکتسب مسکنا ومن اتخذ غیر ذلک فھو غال﴾

جو شخص ہمارا عامل ہو اس کو ایک بی بی کا خرچ لینا چاہیے، اگر اس کے پاس نوکر نہ ہو تو نوکر کا، اگر مکان نہ ہو تو گھر کا لیکن اگر کوئی اس سے زیادہ لے گا تو وہ خائن ہوگا۔

آپ ﷺ کے زمانہ میں حضرت عمر فاروقؓ کو بھی اس قسم کا معاوضہ ملتا تھا، چنانچہ ان کے عہد خلافت میں جب

---

۱ فتح الباری جلد ۳ صفحہ ۲۸۰۔

۲ صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۱۴۱۔

۳ صحاح کتاب الصدقات۔

۴ صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۱۰۱۔

۵ ابوداؤد جلد ۲ باب ارزاق العمال میں یہ دونوں حدیثیں ہیں۔

صحابی نے زہد و تقویٰ کی بنا پر معاوضہ لینے سے انکار کیا تو انہوں نے آنحضرت ﷺ کے اسی طرز عمل سے استدلال کیا۔

قضاۃ:

[ان مناصب کے علاوہ بعض اور عہدے بھی سادہ طور سے قائم ہو گئے تھے مثلاً فصل مقدمات کا کام اگرچہ زیادہ تر آپ خود انجام دیتے تھے لیکن کبھی کبھی آپ ﷺ کے حکم سے حسب ذیل صحابہ نے بھی اس فرض کو انجام دیا ہے حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، عبدالرحمٰنؓ بن عوف، ابی بن کعبؓ، معاذ بن جبلؓ۔ ۱

پولیس:

اگرچہ خلفائے راشدین کے زمانہ میں بھی باضابطہ طور پر پولیس کا محکمہ قائم نہیں ہوا اور اس کی ابتدا بنوامیہ کی سلطنت میں ہوئی ہے تاہم آنحضرت ﷺ کے عہد مبارک میں بھی اس کا ابتدائی نمونہ قائم ہو چکا تھا چنانچہ آپ کے عہد مبارک میں قیسؓ بن سعد اس خدمت کو انجام دیتے تھے اور اس غرض سے ہمیشہ آپ کے ساتھ رہتے تھے۔ ۲

جلاد:

(مجرموں کی گردن مارنے کی خدمت حضرت زبیرؓ، حضرت علیؓ، مقداد بن الاسودؓ، محمدؓ بن مسلمہ، عاصمؓ بن ثابت، ضحاکؓ بن سفیان کلابی کے سپرد تھی) ۳

غیر قوموں سے معاہدے:

عرب میں اب کفر اور شرک کا بالکل وجود نہ تھا کہیں کہیں صرف مجوس نصاریٰ اور یہود کی آبادیاں تھیں ان میں سے معتدبہ افراد نے گو نور ایمان سے قلوب کو روشن کر لیا تھا لیکن مجموعی حیثیت سے وہ اب تک تاریکی میں تھے تاہم خلافت الٰہی کی ہمہ گیر قوت سے وہ سرتابی نہ کر سکے۔ حجاز کے یہودیوں کے سوا عرب کی تمام قوموں نے بخوشی اسلام کی اطاعت قبول کی۔ اس لیے اسلام نے بھی ان کی جان و مال عزت و آبرو اور مذہب کی حفاظت کی تمام تر ذمہ داری اپنے سر لے لی اور اس کے مقابلہ میں جزیہ کی ایک خفیف رقم [یعنی ہر مستطیع عاقل بالغ مرد پر ایک دینار سالانہ] ان پر مقرر کی اس رقم کا نقد روپیہ کی صورت میں ادا ہونا ضروری نہ تھا بلکہ عموماً جہاں جس چیز کی پیداوار ہوتی تھی یا جو چیز بنتی تھی وہی چیز جزیہ قرار پائی۔ ۴

غیر قوموں میں سب سے پہلے آنحضرت ﷺ نے ۷ھ میں خیبر، فدک، وادی القریٰ اور تیماء کے یہودیوں سے مصالحت فرمائی۔ اس وقت تک آیت جزیہ کا نزول نہیں ہوا تھا اس بنا پر باہمی رضامندی سے جو شرائط قرار پا گئے

---

۱ فتح الباری جلد ۱۳ صفحہ ۱۱۳۔

۲ بخاری کتاب الاحکام۔

۳ زاد المعاد ابن قیم۔

۴ زاد المعاد ابن قیم جلد اول فصل جزیہ۔

۵ زاد المعاد ابن قیم جلد اول۔

تھے وہ آیت جزیہ کے نزول کے بعد بھی قائم رہے۔ اصل شرط یہ تھی کہ وہ رعایا کی حیثیت سے کام کریں گے اور پیداوار کا نصف حصہ خود لیں گے اور نصف مالکوں کو ادا کریں گے۔[1]

۹ ہجری میں جزیہ کی آیت نازل ہوئی، اس کے بعد تمام معاہدے اسی کی رو سے قرار پائے۔ نجران کے عیسائیوں نے مدینہ میں آکر مصالحت کی درخواست کی جس کو آپ نے منظور فرمایا۔ شرائط صلح یہ تھے کہ "وہ مسلمانوں کو سالانہ دو ہزار کپڑے دیا کریں گے اور ان کو دو قسطوں میں آدھا ماہ صفر اور آدھا رجب میں ادا کریں گے، اگر یمن میں کبھی بغاوت یا شورش ہوگی تو وہ عاریۃً تیس زرہیں، تیس گھوڑے، تیس اونٹ اور تیس تیس عدد ہر قسم کے اسلحے دیں گے اور مسلمان ان کی واپسی کے ضامن ہوں گے۔ اس کے معاوضہ میں جب تک وہ سودی لین دین یا بغاوت نہ کریں گے نہ ان کے گرجے ڈھائے جائیں گے، نہ ان کے پادری نکالے جائیں گے، نہ ان کو ان کے مذہب سے برگشتہ کیا جائے گا۔"[2]

حدود شام میں بہت سے عیسائی اور یہودی گاؤں میں آباد تھے۔ رجب ۹ھ میں غزوہ تبوک کے موقع پر دومۃ الجندل، ایلہ، مقنا، جرباء، اذرح، تبالہ اور جرش کے جو عیسائی اور یہودی رئیس اور حکام تھے اسلام نہیں لائے بلکہ جزیہ قبول کیا۔ ان میں سے ہر بالغ مرد پر ایک دینار سالانہ مقرر ہوا اور مسلمان جب ادھر سے گزریں تو ان کی ضیافت بھی ان پر لازمی قرار دی گئی۔[3] ایک آبادی پر یہ بھی رکھی گئی کہ اگر نقد ادا نہ کر سکیں تو اسی کے برابر معافری کپڑے دیا کریں۔ بحرین کے مجوسیوں سے بھی جزیہ کی اسی شرح مقدار پر مصالحت کی گئی۔[4]

اصناف محاصل و مخارج:

مختلف اغراض و مصالح کی بنا پر اسلام میں آمدنی کے صرف پانچ ذرائع تھے۔ غنیمت، فئی، زکوٰۃ، جزیہ، خراج، اول و دوم کے سوا بقیہ ذرائع آمدنی سالانہ تھے۔ غنیمت کا مال صرف فتوحات کے موقع پر آتا تھا۔ عرب میں قاعدہ تھا کہ رئیس فوج غنیمت کا چوتھا حصہ خود لیتا تھا جس کو اصطلاح میں مرباع کہتے تھے اور بقیہ جو جس کے ہاتھ لگ جاتا تھا اس کے لیے تھا، تقسیم کا کوئی نظام نہ تھا۔ غزوہ بدر کے بعد خدا نے غنیمت کو اپنی ملک قرار دیا جس میں خمس یعنی پانچواں حصہ خدا اور رسول کے نام سے حکومت الٰہی کے مصالح و اغراض کے لیے مخصوص فرمایا۔

﴿يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْأَنْفَالِ قُلِ الْأَنْفَالُ لِلَّهِ وَالرَّسُولِ﴾ (انفال)

اے پیغمبر لوگ تجھ سے مال غنیمت کی نسبت پوچھتے ہیں کہہ دے کہ وہ خدا اور رسول کی ملک ہے۔

خدا اور رسول کی ملکیت سے مقصود یہ ہے کہ وہ سپاہیوں کی شخصی ملکیت نہیں ہے بلکہ مصالح کی بنا پر صاحب خلافت جس طرح مناسب سمجھے اس کو صرف کر سکتا ہے۔ اسی طرح خمس کی نسبت ارشاد ہوا ہے۔

﴿وَاعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَأَنَّ لِلَّهِ خُمُسَهُ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَى وَالْيَتَامَى

---

[1] بخاری و مسلم و ابوداؤد ذکر خیبر و فتوح البلدان بلاذری ذکر فدک و وادی القری وغیرہ۔

[2] ابوداؤد کتاب الخراج باب اخذ الجزیہ۔

[3] فتوح البلدان بلاذری۔

[4] ابوداؤد باب اخذ الجزیہ۔

وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ﴾ (انفال)

مسلمانو! جان لو کہ تم کو جو مال غنیمت ہاتھ آئے اس کا پانچواں حصہ خدا، رسول، اہل قرابت اور یتیموں اور مسکینوں کا ہے۔

ایک دو استثنائی واقعے کے سوا جس میں آنحضرت ﷺ نے مال غنیمت مخصوص مہاجرین کو یا مکہ کے نومسلموں کو عنایت فرمایا ہمیشہ آپ کا یہ طرزِ عمل رہا کہ خمس کے بعد ایک ایک حبہ سپاہیوں پر برابر برابر تقسیم فرما دیتے تھے سواروں کو تین حصے اور پیادہ کو ایک حصہ۔ بعض روایتوں میں ہے کہ سواروں کو صرف دو حصے ملتے تھے۔[1] خمس کا بھی بہت کم حصہ ذاتی مصرف میں آتا تھا" آیت بالا میں جن ارباب استحقاق کا ذکر ہے زیادہ تر انہی پر صرف کر دیا جاتا تھا۔

زکوٰۃ:

صرف مسلمانوں پر فرض تھی اور وہ چار مدوں سے وصول ہوتی تھی۔ نقد روپیہ، پھل اور پیداوار، مویشی (بکری، گھوڑے) اسباب تجارت۔ دو سو درہم چاندی، بیس مثقال سونے اور پانچ اوقیہ سے کم پر زکوٰۃ نہ تھی۔ پیداوار سے جو زکوٰۃ وصول کی جاتی تھی اس کے لیے ضروری تھا کہ اس کی مقدار ۵ وسق (۳۰۰ صاع بہ تحقیق امام ترمذی) یا پانچ وسق سے زیادہ ہو۔ سونا اور چاندی کا چالیسواں حصہ وصول کیا جاتا تھا۔ مویشیوں کا نرخ زکوٰۃ بھی مختلف جنس کی مختلف تعداد پر مقرر تھا جو حدیث اور فقہ کی تمام کتابوں میں مفصل مذکور ہے۔ اراضی کی دو قسمیں کی گئیں۔ ایک وہ جس کی سیرابی صرف بارش یا چشمے کے پانی سے ہوتی ہے۔ اس قسم کی اراضی کی پیداوار میں دسواں حصہ (عشر) وصول ہوتا تھا اور جس کو آب پاشی کے ذریعہ سے سیراب کیا جاتا تھا اس میں نصف عشر یعنی بیسواں حصہ لیا جاتا تھا۔ سبزی پر کوئی زکوٰۃ نہ تھی۔

زکوٰۃ کے آٹھ مصرف تھے جن کی تفصیل خود قرآن مجید نے کر دی تھی۔ فقراء، مساکین، نومسلم، غلام اور جن کو خرید کر آزاد کرانا ہے، مقروض، مسافر، محصلین زکوٰۃ، دیگر کار خیر۔ معمول تھا جہاں سے زکوٰۃ کی رقم وصول کی جاتی تھی وہیں کے مستحقین پر صرف کی جاتی تھی۔ صحابہ اس حکم کے اس قدر عادی ہو گئے تھے کہ ایک صحابی کو زیاد نے عامل بنا کر ایک مقام میں بھیجا جب وہ واپس آئے تو زیاد نے ان سے رقم کا مطالبہ کیا انہوں نے جواب میں کہا کہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ سے جس طرح ہم کرتے آئے تھے وہی ہم نے کیا۔ حضرت معاذ بن جبل جب عامل بنا کر یمن بھیجے گئے تو زکوٰۃ کے متعلق آنحضرت ﷺ نے فرمایا ﴿ وصدقة تؤخذ من اغنيائهم وترد على فقرائهم ﴾

جزیہ غیر مسلم رعایا سے ان کی حفاظت اور ذمہ داری کے معاوضہ میں لیا جاتا تھا اس کی مقدار متعین نہ

---

1. ابوداؤد اخذ الجزیہ میں مجوس سے متعلق روایات ملاحظہ کر لیں۔
2. ابوداؤد حکم ارض خیبر روایت مجمع۔
3. ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ باب العروض اذا کانت للتجارۃ۔
4. صحیح بخاری جلد اول صفحہ ۲۰۱۔
5. ترمذی کتاب الزکوٰۃ۔
6. ترمذی کتاب الزکوٰۃ۔

پائے۔ افتادہ زمینیں بھی صحابہؓ کو بطور جاگیر عطا فرمادیں۔ حضرت وائلؓ کو حضرموت میں ایک قطعہ زمین عنایت فرمایا۔ بلال بن حارث مزنی کو قابل زراعت زمین کا ایک بہت بڑا ٹکڑا اور کانیں مرحمت فرمائیں۔ حضرت زبیرؓ کو مدینہ کے پاس اور حضرت عمرؓ کو خیبر میں جاگیریں عطا کیں۔ خود وفد عدوۃ وحیہ الجعدل کے پاس زمین عنایت کی۔

یہ جاگیریں اس فیاضی اور وسعت کے ساتھ دی جاتی تھیں کہ ہر شخص حسب استطاعت ان کا انتخاب اور ان کے رقبہ کی تحدید کر سکتا تھا۔ ایک بار آپ ﷺ نے حضرت زبیرؓ کو حکم دیا کہ جہاں تک ان کا گھوڑا دوڑ سکے وہ زمین ان کی جاگیر میں داخل ہوگی چنانچہ انہوں نے گھوڑا دوڑایا جب گھوڑا ایک خاص حد تک پہنچ کر رک گیا تو انہوں نے اپنا کوڑا پھینکا اور وہ جس نقطے پر گرا وہی ان کی جاگیر کا رقبہ قرار پایا۔ عرب کی خشک زمین میں سب سے زیادہ ضرورت چشمہ ہائے آب کی تھی چنانچہ ایک بار جب آپ نے حکم عام دیا "من سبق الی ماء لم یسبقہ الیہ مسلم فہو لہ" "جو شخص ایسے چشمہ پر قبضہ کرلے جس پر کسی مسلمان نے قبضہ نہیں کیا ہے تو وہ اس کا ہے"۔ تو تمام لوگوں نے دوڑ دوڑ کر اپنے اپنے چشموں کے حدود مقرر کر لیے۔[1]

اس فیاضی کی اس قدر شہرت ہوئی کہ لوگوں نے دور دور سے آ کر آنحضرت ﷺ سے جاگیروں کی درخواست کرنا شروع کی۔ ابیض بن حمال یمن سے خدمت مبارک میں حاضر ہوئے اور ایک نمک کی کان کی درخواست کی جس کو آپ ﷺ نے منظور فرمایا۔ لیکن ایک صحابی نے کہا کہ آپ نے ان کو جو جاگیر میں عطا فرمایا ہے وہ پانی کا ایک بہت بڑا چشمہ ہے چونکہ وہ ایک پبلک چیز تھی اس بنا پر آپ ﷺ نے اس کو واپس لے لیا۔

یہ تمام فیاضیاں صرف انہی چیزوں کے ساتھ مخصوص تھیں جن کا تعلق پبلک کے ساتھ نہیں ہوسکتا تھا لیکن جو چیزیں رفاہ عام کے کام میں آسکتی تھیں ان کو آپ ﷺ نے اسی قدیم حالت پر چھوڑ دیا۔ عرب کا قدیم دستور تھا کہ اپنے مویشیوں کے لیے چراگاہیں متعین کر لیتے تھے جن کو حمیٰ کہتے تھے۔ عرب میں پیلو کا درخت اونٹوں کی عام غذا تھی اور اس کے متعلق کسی قسم کی روک ٹوک نہ تھی۔ لیکن ابیض بن حمال نے جب اس کو اپنے ملک میں داخل کرنا چاہا تو آپ ﷺ نے منع فرمایا۔ لاحمی فی الاراک۔ عرب میں یہ بھی دستور تھا کہ مویشیوں کے چرانے کے لیے رؤساء اور ارباب اقتدار اپنے لیے چراگاہ مخصوص کر لیتے تھے اور وہاں کسی دوسرے کو نہیں آنے دیتے تھے چونکہ اس سے عام لوگوں کو تکلیف ہوتی تھی اس لیے اس طریقہ کو بھی روک دیا۔[2]

اسی طرح عرب میں ایک مقام دہنا ہے جس کے ایک طرف بکر بن وائل کا قبیلہ تھا اور دوسری طرف بنو تمیم رہتے تھے۔ حریث بن حسانؓ نے بکر بن وائل کے لیے اس زمین کی درخواست کی۔ آپ نے فرمان لکھنے کا حکم دیا اتفاق سے اس وقت ایک تمیمیہ موجود تھی۔ آپ نے اس کی طرف دیکھا اس نے عرض کی یا رسول اللہ! وہ اونٹوں اور بکریوں کی چراگاہ ہے اور اس کے پاس بنو تمیم کی عورتیں اور بچے رہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا "بے چاری سچ کہتی ہے فرمان نہ لکھو ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، ایک چشمہ اور ایک چراگاہ سب کو کافی ہو سکتا ہے"۔

---

1. ابوداؤد کتاب الخراج باب حکم حمی
2. یہ تمام واقعات ابوداؤد کتاب الخراج کے مختلف ابواب میں مذکور ہیں

مذہبی انتظامات

(ملک میں امن و امان قائم رکھنے کی غرض سے جو بعض ضروری ملکی انتظامات سر انجام پائے تھے ان سے زیادہ ضروری مسلمانوں کے مذہبی امور کے انتظامات کا مسئلہ تھا۔ یہودیوں میں مذہبی فرائض کے ادا کرنے کے لیے ایک مخصوص خاندان مقرر تھا۔ اس کے علاوہ کسی اور کو ان خدمات کی بجا آوری کا حق حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ عیسائیوں میں گو خاندان کی تخصیص نہ تھی لیکن ان میں ایک خاص طبقہ پیدا ہو گیا تھا جس نے ان خدمات کو اپنا حق قرار دے لیا تھا۔ ہندوؤں میں غیر برہمن کسی مذہبی خدمت کا مستحق نہیں۔ دنیا کی دوسری قوموں کا بھی یہی حال تھا لیکن جو شریعت محمد رسول اللہ ﷺ نے دنیا میں قائم کی اس میں مخصوص اشخاص، مخصوص خاندان اور مخصوص طبقہ کی حاجت نہ تھی بلکہ ہر شخص جو اسلام کا کلمہ گو تھا اس رتبہ کا مستحق ہو سکتا تھا۔)

دعاۃ اور مبلغین اسلام:

ایک مشہور مغربی مورخ نے لکھا ہے کہ "مدینہ میں آ کر اسلام نبوت کا منصب چھوڑ کر سلطنت بن گیا تھا اور اب اسلام کے معنی بجائے اس کے کہ خدا پر ایمان لایا جائے، یہ ہو گئے تھے کہ لوگ اس کی حکومت تسلیم کر لی جائے۔"[1] اسلام کا مقصود وہ تھا جو خدا نے قرآن مجید میں بیان کیا ہے۔

﴿ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ﴾ (حج)

وہ لوگ جن کو ہم زمین میں اگر طاقت دیں تو نماز قائم کریں، زکوٰۃ دیں، اچھی باتوں کا حکم دیں اور بری باتوں سے روکیں۔

اس بنا پر ہر مسلمان واعظ بھی ہوتا تھا اور محتسب بھی، داعی بھی اور ماہر شریعت بھی۔ یہی وجہ ہے کہ یا تو اسلام سے پہلے عرب میں اس قدر جہالت پائی جاتی تھی کہ شرفا میں لکھنا پڑھنا عیب خیال کیا جاتا تھا یا ایک ایک گھر مدرسہ حدیث اور تفسیر کا دار العلم بن گیا۔ تاہم چونکہ ہر شخص کو تعلیم و تدریس کا کافی وقت نہیں مل سکتا تھا اس لیے یہ ضروری قرار پایا کہ ہر جماعت اور ہر قبیلہ میں کچھ ایسے لوگ موجود رہیں جو تعلیم و ارشاد کا فرض انجام دے سکیں۔ اسی بنا پر قرآن مجید میں حکم آیا۔

﴿ وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَاۗفَّةً ۭ فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَاۗىِٕفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ ﴾ (توبہ۔ رکوع آخر)

اور سب کے سب مسلمان تو سفر کر کے (مدینہ) نہیں آ سکتے اس لیے ہر قبیلہ سے ایک گروہ آنا چاہیے تاکہ وہ شریعت میں تفقہ حاصل کریں اور تاکہ واپس جا کر اپنی قوم کو ڈرائیں، شاید لوگ بری باتوں سے بچیں۔

ان کی تعلیم و تربیت:

چونکہ مقصد یہ تھا کہ ایک ایسی جماعت تیار کی جائے جو نہ صرف شریعت کے اوامر و نواہی سے واقف ہو بلکہ

---

[1] دیکھو [illegible] صاحب کا آرٹیکل [illegible]

شب و روز آنحضرت ﷺ کی خدمت میں رہنے سے تمام تر اسلامی رنگ میں ڈوب جائے جس کی گفتار، کردار، بات چیت، نشست و برخاست، قول و عمل ایک ایک چیز تعلیم نبوی کے پرتو سے منور ہو جائے تا کہ وہ تمام ملک کے لیے اسوۂ حسنہ اور نمونۂ عمل بن سکے۔ اس لیے عرب کے ہر قبیلہ سے ایک جماعت آتی تھی اور آپ ﷺ کی خدمت میں رہ کر تعلیمات سے بہرہ اندوز ہوتی تھی۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے۔

﴿كان ينطلق من كل حي من العرب عصابة فيأتون النبي ﷺ فيسألونه عما يريدون من أمر دينهم ويتفقهوا في دينهم﴾ [1]

عرب کے ہر قبیلہ کا ایک گروہ آنحضرت ﷺ کے پاس جاتا تھا اور آپ سے مذہبی امور دریافت کرتا تھا اور دین میں تفقہ حاصل کرتا تھا۔

داعیانِ اسلام جا بجا اطراف عرب میں بھیجے جاتے تھے ان کو ہدایت کی جاتی تھی کہ لوگوں کو اس بات پر آمادہ کریں کہ وطن چھوڑ کر مدینہ آ جائیں اور یہیں بود و باش اختیار کریں۔ اس کا نام ہجرت تھا۔ اس بنا پر بیعت کی دو قسمیں کر دی گئی تھیں، بیعت اعرابی اور بیعت ہجرت۔ بیعت اعرابی صرف ان بدوؤں کے لیے تھی جن کو ہمیشہ مدینہ منورہ میں رکھ کر تعلیم دینا مقصود نہ تھا۔ مختصر مشکل الآثار میں روایت ہے کہ عتبہ سلمیؓ جب اسلام لائے تو آنحضرت ﷺ نے ان سے دریافت کیا کہ بیعت اعرابی کرتے ہو یا بیعت ہجرت؟ اس کے بعد مصنف لکھتا ہے۔

﴿ان البيعة من المهاجر توجب الاقامة عنده ﷺ ليصرفه فيما يصرفه فيه من امور الاسلام بخلاف بيعة الاعرابية﴾

ہجرت کی بیعت کرنے سے لازم ہو جاتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے پاس قیام کرے تا کہ آنحضرت ﷺ ان کو اسلامی امور میں لگائیں اور بیعت اعرابی میں یہ ضروری نہیں۔

اسی بنا پر عرب کے بہت سے خاندان اپنے گھروں سے ہجرت کر کے مدینہ میں چلے آئے تھے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ آئے تو اسی شخصوں کو لے کر آئے اور مدینہ میں آباد ہو گئے۔ خلاصۃ الوفاء سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ میں جہینہ وغیرہ قبائل کی الگ الگ مسجدیں تھیں۔ یہ وہی قبائل تھے جو ہجرت کر کے مدینہ آ گئے تھے اور چونکہ مسجد نبوی سب کے لیے کافی نہ تھی اس لیے الگ الگ مسجدیں بن گئی تھیں۔

تعلیم و ارشاد کے مختلف طریقے تھے۔

ایک یہ کہ لوگ بیس دن یا مہینہ دو مہینہ رہ کر عقائد اور فقہ کے ضروری مسائل سیکھ لیتے تھے اور اپنے قبائل میں واپس جاتے تھے اور ان کو تعلیم دیتے تھے۔ مثلاً مالک بن الحویرثؓ جب ساتھیوں کو لے کر آئے تو بیس دن تک قیام کیا اور ضروری مسائل کی تعلیم حاصل کی۔ جب چلنے لگے تو آپ ﷺ نے فرمایا۔

﴿ارجعوا الى اهليكم فعلموهم ومروهم وصلوا كما رأيتموني اصلي﴾ (بخاری [illegible])

---

۱ [illegible]

اپنے خاندان میں واپس جاؤ ان میں رہ کر ان کو امور شریعت کی تعلیم دو اور جس طرح مجھ کو نماز پڑھتے دیکھا ہے اسی طرح نماز پڑھو۔

دوسرا مستقل طریقہ درس کا تھا یعنی لوگ مستقل طریقے سے مدینہ میں رہتے تھے اور عقائد شریعت اور اخلاق کی تعلیم پاتے تھے ان کے لیے صفہ خاص درس گاہ تھی اور اس میں زیادہ تر وہ لوگ قیام کرتے تھے جو تمام دنیاوی تعلقات سے آزاد ہو کر شب و روز زہد و عبادت اور زیادہ تر خدمت علم میں مصروف رہتے تھے۔

مشکوٰۃ کتاب العلم میں روایت ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ مسجد میں تشریف لے گئے اس وقت مسجد میں دو حلقے تھے۔ حلقہ ذکر اور حلقہ درس آنحضرت ﷺ حلقہ درس میں جا کر بیٹھ گئے۔

اس وقت کی اصطلاح میں ان طالبان علم کو قراء کہتے تھے چنانچہ صحیح بخاری وغیرہ میں ہر جگہ یہی نام آتا ہے۔ بئر معونہ میں جو لوگ تعلیم و ارشاد کے لیے گئے تھے اور کفار نے ان کو دھوکے سے شہید کر دیا تھا[1] وہ اسی درسگاہ کے تربیت یافتہ تھے اور کتب حدیث میں ان کا نام اسی لقب (قراء) کے ساتھ آیا ہے۔ ارباب سیر نے لکھا ہے کہ ان لوگوں میں سے جب کوئی شادی کر لیتا تھا تو اس جماعت سے نکل جاتا تھا اور ان کے بجائے دوسرے لوگ داخل ہوتے تھے۔

اصحاب صفہ اگرچہ اس قدر مفلس اور نادار تھے کہ کسی کے پاس ایک کپڑے سے زیادہ نہیں ہوتا تھا جس کو گردن سے باندھ کر گھٹنوں تک چھوڑ دیتے تھے کہ چادر اور تہبند دونوں کا کام دیتا تھا تاہم یہ لوگ باری باری دن کو جنگل میں جا کر لکڑیاں چن لاتے تھے اور ان کو بیچ کر آدھا خیرات کر دیتے اور آدھا اخوان طریقت میں تقسیم ہوتا تھا اسی بنا پر تعلیم اور درس کا وقت رات کو مقرر کیا گیا۔ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس درسگاہ کے معلمین میں سے حضرت عبادہ بن الصامتؓ بھی تھے۔ جو مشہور صاحب علم تھے اور جن کو حضرت عمرؓ نے زمانہ خلافت میں تعلیم قرآن کے لیے فلسطین بھیجا تھا۔ ابوداؤد میں حضرت عبادہ بن الصامتؓ سے روایت ہے۔

﴿علمت ناسا من اهل الصفة القرآن والكتاب فاهدى الي رجل منهم قوسا﴾ (صفحہ ۹۳ جلد دوم)
میں نے اصحاب صفہ میں سے چند لوگوں کو قرآن مجید اور لکھنے کی تعلیم دی ان کے صلہ میں مجھ کو ایک شخص نے ایک کمان تحفہ میں دی۔

ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے عبادہؓ کو اس تحفہ کے قبول کرنے کی اجازت نہیں دی۔ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ درسگاہ صفہ کے علاوہ اور بھی کوئی جگہ تھی جہاں اصحاب صفہ رات کو تعلیم پاتے تھے۔ مسند امام ابن حنبل میں ہے۔

﴿عن انس كانوا سبعين فكانوا اذا جنهم الليل انطلقوا الى معلم لهم بالمدينة فيدرسون الليل حتى يصبحوا﴾ (مسند جلد ۳ صفحہ ۱۳۷)
حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ اصحاب صفہ میں ستر شخص رات کو ایک معلم کے پاس جاتے تھے اور صبح تک درس میں مشغول رہتے تھے۔

---

[1] صحیح بخاری غزوہ بئر معونہ

عرب میں لکھنے پڑھنے کا رواج بہت کم تھا لیکن اسلام آیا تو تحریر و کتابت کا فن بھی گویا ساتھ لے کر آیا۔ سب سے بڑی ضرورت قرآن مجید کے حفظ و تدوین کی تھی اس بنا پر آنحضرت ﷺ نے شروع ہی سے کتابت کی ترویج کی طرف توجہ فرمائی۔ جنگ بدر کے ذکر میں گزر چکا ہے کہ اسیران جنگ میں سے جو لوگ فدیہ نہیں ادا کر سکے ان کو اس شرط پر رہا کیا گیا کہ مدینہ میں دو دو لڑکوں کو لکھنا سکھا دیں۔ ابوداؤد کی مذکورہ بالا حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ اصحاب صفہ کو جو تعلیم دی جاتی تھی اس میں لکھنا بھی داخل تھا، چنانچہ حضرت عبادہؓ [1] قرآن مجید کے ساتھ لکھنے کی بھی تعلیم دیتے تھے۔

مساجد کی تعمیر:

آنحضرت ﷺ نے اگرچہ ترقی و جاہ پرستی سے طبعاً نفور تھے اور اس لیے اینٹ اور مٹی پر صرف زر ناپسند فرماتے تھے تاہم چونکہ اسلام کی تمام تحریکات کا مقصد صرف رفع ذکر اور تبلیغ و تفہیم الٰہی تھا اس بنا پر ہر قبیلہ کو مسلمان ہونے کے ساتھ سب سے پہلے مسجد کی ضرورت پیش آتی تھی۔ ایک سبب اس کا یہ بھی تھا کہ یہ مسجدیں صرف نماز ہی پڑھنے کے کام میں نہیں آتی تھیں بلکہ درحقیقت یہ تمام اہل قریہ یا اہل محلہ کو دن رات میں پانچ بار ایک جگہ جمع کر کے ان کی اجتماعی اور اتحادی قوت کو روز بروز اور زیادہ ترقی دینے کا ذریعہ بھی بنتی تھیں اس لیے آپ ﷺ باجماعت نماز پڑھنے کی سخت تاکید فرماتے تھے۔ خود مدینہ کے اندر بہت سے قبائل آباد تھے، ہر قبیلہ کا الگ الگ محلہ تھا اور ہر محلہ میں ایک ایک مسجد تھی۔

ابوداؤد نے کتاب المراسیل میں بسند لکھا ہے کہ صرف مدینہ کے اندر آپ کے زمانہ میں ۹ مسجدیں تھیں جہاں الگ الگ جماعتیں ہوتی تھیں، ان کے نام یہ ہیں۔ مسجد بنی عمرو، مسجد بنی ساعدہ، مسجد بنی عبید، مسجد بنی سلمہ، مسجد بنی رابح، مسجد بنی زریق، مسجد غفار، مسجد اسلم، مسجد جہینہ۔ ان کے علاوہ متفرق روایات میں مختلف قبائل کی حسب ذیل مسجدوں کا اور پتہ لگتا ہے، مسجد بنی عمرو، مسجد بنی امیہ (انصار کا ایک قبیلہ تھا) مسجد بنی بیاضہ، مسجد بنی الحبلی، مسجد بنی عصیہ، مسجد ابی العاص، مسجد بنی دینار، مسجد ابی بن کعب، مسجد النابغہ، مسجد ابن عدی، مسجد حارث بن خزرج، مسجد بنی خطمہ، مسجد الفضیخ، مسجد بنی حارثہ، مسجد بنی ظفر، مسجد بنی عبدالاشہل، مسجد واقم، مسجد بنی معاویہ، مسجد عتک، مسجد بنی قریظہ، مسجد بنی وائل، مسجد الشجرہ۔ [2]

روایتوں سے یہ بھی ثابت ہے کہ اشاعت اسلام کے ساتھ ہی مدینہ سے باہر عرب کے گوشہ گوشہ میں مسجدیں بنتی جاتی تھیں جہاں دن میں پانچ بار خدا کا نام پکارا جاتا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے غزوات میں معمول کر لیا تھا کہ رات بھر انتظار فرماتے تھے، صبح کو جہاں سے اذان کی آواز آتی وہاں حملہ نہ فرماتے، چنانچہ ایک سفر جہاد میں آپ ﷺ کے کانوں میں ایک طرف سے اللہ اکبر کی آواز آئی تو آپ ﷺ نے فرمایا "یہ فطری شہادت ہے" اس کے بعد آپ ﷺ نے اشہد ان لا الہ الا اللہ کی آواز سنی تو فرمایا "آگ سے نجات ہوگی" صحابہ نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی تو معلوم ہوا کہ بکری کے چرواہے کی آواز ہے۔ تمام مجاہدین اسلام کو بھی یہی حکم تھا، چنانچہ ایک بار آپ ﷺ نے ایک سریہ روانہ کیا تو یہ وصیت فرمائی۔

---

[1] اسد الغابہ ذکر "عبادہ"۔

[2] یہ تمام تفصیل وفاء الوفا للسمہودی صفحہ ۲۴۹ سے ماخوذ ہے۔

اور اس شرف میں چھوٹے بڑے غلام آقا سب برابر تھے۔ آپ کی تشریف آوری سے پہلے مدینہ میں جو مہاجرین آ چکے تھے ان کے امام حضرت ابو حذیفہؓ کے آزاد کردہ غلام سالمؓ تھے۔ جرم کا قبیلہ جب اسلام لایا تو عمرو بن سلمہ جرمی اس وقت سات یا آٹھ برس کے کم سن بچے تھے لیکن چونکہ اپنے قبیلہ میں قرآن کے سب سے بڑے حافظ وہی تھے اس لیے وہی امام قرار پائے۔

امامت کے انتخاب کے لیے آنحضرت ﷺ نے چند اصول مقرر فرما دیئے تھے۔

﴿عن ابی مسعود الانصاری قال قال رسول الله ﷺ یؤم القوم اقرؤهم لکتاب الله فان کانوا فی القراءة سواء فاعلمهم بالسنة فان کانوا فی السنة سواء فاقدمهم هجرة فان کانوا فی الهجرة سواء فاقدمهم سنا﴾ (مسلم)

ابو مسعود انصاریؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جماعت کی امامت وہ کرے جو سب سے زیادہ کلام اللہ پڑھا ہوا ہو، اگر اس میں سب برابر ہوں تو جو سنت سے سب سے زیادہ واقف ہو، اگر اس میں بھی مساوات ہو تو جس نے سب سے پہلے ہجرت کی تھی اور اس میں بھی سب برابر ہوں تو جس کی عمر زیادہ ہو۔

جب کوئی ایسا قبیلہ خدمت اقدس میں حاضر ہوتا تو آپ پوچھتے کہ تم میں سب سے زیادہ حافظ قرآن کون ہے؟ اگر کوئی ایسا شخص ہوتا تو لوگ اس کا نام لیتے اور آپ اس کو اس عہدہ پر خود ممتاز فرماتے، چنانچہ اہل طائف کے امام عثمان بن ابی العاص اسی طرح مقرر ہوئے تھے اور سب مساوی الحیثیت ہوتے تو ارشاد ہوتا کہ تم میں جو بڑا ہو وہ جماعت کی امامت کرے۔ مالک بن حویرث جب اپنی قوم کی طرف سے بارگاہ نبوت میں حاضر ہوئے تو آنحضرت ﷺ نے یہی ارشاد فرمایا۔

مدینہ منورہ سے باہر اطراف میں عرب کے مختلف صوبوں میں، جہاں جہاں مسجدیں تعمیر ہوئی تھیں ظاہر ہے کہ وہاں ہر جگہ الگ الگ امام مقرر ہوئے ہوں گے۔ جن قبائل میں عمال مقرر ہوتے تھے وہی ان کے امام بھی ہوتے تھے[1]۔ بڑے بڑے مقامات میں یہ دونوں عہدے الگ الگ ہوتے تھے۔ عمان میں حضرت عمرو بن العاصؓ عامل تھے اور ابو زید انصاری امام[2] لیکن افسوس ہے کہ احادیث و سیر کی کتابوں میں تمام ائمہ کے نام ان کی یکجا تفصیل مذکور نہیں۔ مختلف واقعات میں جہاں تک ان کا سراغ لگ سکا ہے وہ حسب ذیل ہے۔

نام	مقام تقرر	کیفیت
مصعب بن عمیرؓ	مدینہ منورہ	ہجرت نبوی ﷺ سے پہلے انصار کی امامت کرتے تھے (ابن سعد ذکر بیعت عقبہ)
سالم مولی ابی حذیفہؓ	"	آنحضرت ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے مہاجرین کے امام تھے۔ (بخاری، ابو داؤد)

[1] فتح الباری جلد اول۔

[2] مسند ابن حنبل جلد ۲ ص ۲۱۸۔

نام	مقام	کیفیت
ابن ام مکتومؓ	مدینہ منورہ	جب آپ ﷺ مدینے سے باہر غزوات میں تشریف فرما ہوتے تو اکثر صحابہؓ بھی ہم رکاب ہوتے لیکن چونکہ یہ آنکھوں سے معذور تھے اس لئے مدینے ہی میں رہتے تھے اس سبب سے ان کو موقع ملتا تھا کہ آپ امام مقرر فرما جاتے (ابوداؤد)
ابوبکرؓ صدیق	"	آنحضرت ﷺ کی عدم تشریف آوری پر مسجد نبوی میں امام ہوتے تھے (صحیح بخاری)
عتبانؓ بن مالک	بنو سالم	اپنے قبیلے کے امام تھے (ابوداؤد نسائی)
معاذؓ بن جبل	بنو سلمہ	اپنے قبیلے کے امام تھے (بخاری وغیرہ)
ایک انصاریؓ	مسجد قباء	اپنے قبیلے کے امام تھے (بخاری)
عمروؓ بن سلمہ	بنو جرم	اپنے قبیلے کے امام تھے (ابوداؤد نسائی)
اسیدؓ بن حضیر	بنو جرم	اپنے قبیلے کے امام تھے (ابوداؤد)
انسؓ بن مالک یا کوئی	بنو نجار	اپنے قبیلے کے امام تھے۔ امام کا نام مشکوک ہے۔
دوسرے صحابیؓ	=	اپنے قبیلے کے امام تھے۔ (مسند جلد ۳ صفحہ ۴۳۳)
مالکؓ بن حویرث	=	اپنے قبیلے کے امام تھے۔ (ابوداؤد)
عتابؓ بن اسید	مکہ معظمہ	اپنے قبیلے کے امام تھے (نسائی)
عثمانؓ بن ابی العاص	طائف	اپنے قبیلے کے امام تھے (ذکر وفد طائف)
ابوزیدؓ انصاری	عمان	اپنے قبیلے کے امام تھے (بلاذری ذکر عمان)

مؤذنین:

عام طور پر اذان کے لئے کوئی خاص شخص منتخب نہیں کیا جاتا تھا تاہم چند مثالوں سے قیاس ہوتا ہے کہ بڑی بڑی مسجدوں میں یہ عہدہ الگ آپ نے قائم فرمایا تھا۔ چنانچہ مکہ معظمہ اور مدینہ طیبہ میں اس عہدہ پر آنحضرت ﷺ نے ان صاحبوں کو ممتاز فرمایا تھا۔

نام	مقام	مسجد
بلالؓ بن رباح	مدینہ منورہ	مؤذن مسجد نبوی
عمروؓ بن ام مکتوم قرشی	مدینہ منورہ	مؤذن مسجد نبوی
سعد القرظؓ	عوالی مدینہ	مؤذن مسجد قباء
ابو محذورہ جمحی قرشیؓ	مکہ مکرمہ	مؤذن مسجد حرام

تاسیس و تکمیل شریعت

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾

(آج ہم نے تمہارا مذہب کامل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی اور اسلام کو تمہارے لیے مذہب پسند کیا)۔

یہ تمام فتوحات اور نظم و نسق اسلام کا اصلی نصب العین نہ تھا بلکہ جیسا کہ تفصیل اوپر بیان کیا جا چکا ہے یہ اس لیے تھا کہ ملک میں امن و امان پیدا ہو اور ایک منظم اور باقاعدہ حکومت کا وجود ہو تا کہ مسلمان بے روک ٹوک اور بلا مزاحمت اپنے مذہبی فرائض انجام دے سکیں۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے کسی نے اس آیت کے معنی پوچھے۔

﴿وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ﴾

ان کافروں سے جہاد کرو یہاں تک کہ فتنہ نہ رہے اور مذہب تمام تر خدا کے لیے ہو جائے۔

انہوں نے فرمایا کہ ”یہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں تھا جب اسلام کم تھا، آدمی اپنے مذہب کی بنا پر فتنہ میں مبتلا ہو جاتا تھا، لوگ اس کو قتل کر دیتے تھے، اب جب اسلام ترقی کر گیا تو کوئی فتنہ نہیں رہا“۔[1]

ہجرت سے آٹھ برس تک کا زمانہ تمام تر انہیں فتنوں کی دار و گیر، مخالفین کی شورشوں اور ہنگاموں کی مدافعت اور ملک میں امن و امان قائم کرنے میں گزرا، اسی لیے آٹھ برس کی وسیع مدت میں فرائض اسلام سے جو چیز ہر جگہ اور ہر موقع پر نمایاں نظر آتی ہے وہ صرف جہاد ہے یہی وجہ ہے کہ تاریخ میں ایک ایک غزوہ کی تفصیل سینکڑوں صفحات میں ہے لیکن نماز، روزہ، زکوۃ کے متعلق دو دو چار چار سطروں سے زیادہ واقعات نہیں ہیں، وہ بھی اس طرح کہ جب کوئی سنہ ختم ہوتا ہے تو اس قدر لکھ دیتے ہیں کہ اسی سال فرض نماز کی رکعتیں دو سے چار ہو گئیں۔

اس کی وجہ یہ نہیں کہ خدانخواستہ ارباب سیر مذہبی فرائض کی اہمیت اور عظمت پیش نظر نہیں رکھتے تھے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ غزوات کی مصروفیت (اور ملک کی بدامنی) کی وجہ سے اکثر فرائض دیر میں فرض ہوئے اور جو پہلے فرض ہو چکے تھے ان کی تکمیل بھی بتدریج اسی زمانہ میں ہوتی رہی جس کے لیل و نہار زیادہ تر مخالفین کے تیر باراں کے روکنے میں بسر ہو گئے۔

جن احکام کو تعلق تمدن کلی سے تھا وہ اسی وجہ سے نازل نہ ہو سکے کہ اب تک اسلام کو ایک حکمران طاقت نہ تھی، خالص مذہبی فرائض اور احکام بھی رفتہ رفتہ اسی زمانہ میں نازل ہوتے رہے اور بتدریج جیسے جیسے ان کے مناسب حالات پیدا ہوتے جاتے تھے وہ تکمیل کو پہنچتے رہتے تھے۔ سب سے بڑا نکتہ احکام کے تدریجی نزول میں یہ تھا کہ ان سے مقصود گو عربوں کو ان کا پابند بنانا نہیں تھا بلکہ اصلاً ان کی زندگی کو ان پر منطبق کرنا تھا اس لیے نہایت آہستہ آہستہ بتدریج ترتیب کے ساتھ ان کو آگے بڑھایا گیا۔ اسی نکتہ کو حضرت عائشہؓ نے نہایت خوبی سے بیان فرمایا ہے کہ ”پہلے عذاب و ثواب کی آیتیں نازل ہوئیں جب دلوں میں استعداد اور رغبت پیدا ہو گئی تو احکام نازل ہوئے ورنہ اگر پہلے ہی دن یہ حکم ہوتا کہ شراب نہ پیو

[1] بخاری جلد صفحہ ۶۰۸ تفسیر سورہ انفال۔

تو کون مانتا؟"[1]

الغرض ان مختلف اسباب کی بنا پر اسلام کے اکثر فرائض اور احکام اس وقت تکمیل کو پہنچے جب تمام ملک میں امن و امان قائم ہو گیا۔ مکہ معظمہ کے قیام تک روزہ و صدقہ سے فرض نہیں ہوا، مدینہ منورہ میں روزے فرض ہوئے لیکن زکوٰۃ کی فرضیت سات آٹھ سال کے بعد ہوئی۔ اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ رات دن کی معرکہ آرائیوں سے مالی حالت اس حد تک کہاں پہنچی تھی کہ زکوٰۃ کی فرضیت کا موقع آئے۔ فتح مکہ سے پہلے مسلمان اس سرزمین مقدس میں قدم نہیں رکھ سکتے تھے اس لیے اس وقت تک حج بھی فرض نہ ہوا۔ نماز روزانہ کا فرض ہے اور یہ فرض اسلام کے وجود کے ساتھ آیا لیکن اس کی تکمیل بتدریج ہجرت کے چھ سات برس کے بعد ہوئی۔ ۲ ہجری تک نماز میں بات چیت کرنا جائز تھا اور کوئی باہر کا آدمی سلام کرتا تو نمازی بحالت نماز اس کا جواب دیتے تھے جیسا کہ ابوداؤد وغیرہ میں متعدد روایتیں مذکور ہیں۔[2]

غرض فتح مکہ کے بعد جب کفر کا زور ٹوٹ گیا اور تمام ملک میں امن و امان قائم ہو گیا تو مذہبی احکام کی تفصیل اور نظام شریعت کی تکمیل کا موقع آیا۔ احکام بہت سے ایسے تھے جو سرے سے ابھی شروع نہیں ہوئے تھے۔ مثلاً زکوٰۃ، حج، حرمت ربا وغیرہ، بہت سے ایسے تھے کہ ابتدائی ارکان قائم ہو گئے تھے لیکن تکمیل نہیں ہوئی تھی۔[3]

---

1. صحیح بخاری باب تالیف القرآن۔
2. ابوداؤد باب رد السلام فی الصلوٰۃ۔
3. اس حصہ میں بعض اسلام کے مذہبی احکام اور مذہبی تکمیل کی تاریخ جداگانہ ہے، واقعات متفرق ... [illegible]

﴿آمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ﴾

پیغمبر اس پر ایمان لایا جو اس پر اس کے رب کی طرف سے اترا اور تمام مسلمان خدا پر خدا کے فرشتوں پر اس کی کتابوں پر اور اس کے پیغمبروں پر سب پر ایمان لائے۔

سورۂ نساء کی آیت یہ ہے جس میں بالتفصیل بتایا گیا ہے کہ جو لوگ مسلمان ہو چکے ان کے کیا عقائد ہونے چاہئیں۔

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰي رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا﴾ (پ ۵ ع ۱۷)

اے وہ لوگو جو ایمان لا چکے ہو ایمان لاؤ خدا پر اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر اتاری اور اس کتاب پر جو اس سے پہلے اتاری اور جو شخص خدا کا اور اس کے فرشتوں کا اور اس کی کتابوں کا اور اس کے پیغمبروں کا اور روز آخرت کا انکار کرے گا وہ سخت گمراہ ہوا۔

احادیث کتاب الایمان میں بہت سے ایسے واقعات مذکور ہیں جن میں لوگوں نے آپ ﷺ سے اسلام اور ایمان کے معنی دریافت کیے ہیں اور آپ ﷺ نے سائل کی یا وقت کی مناسبت سے مختلف جوابات دیئے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "مجھ کو حکم دیا گیا ہے کہ میں اس وقت تک لڑوں جب تک لوگ یہ گواہی نہ دیں کہ خدا ایک ہے محمد خدا کا پیغمبر ہے نمازیں پڑھیں اور زکوۃ دیں"۔

ایک دفعہ کسی دیہات سے ایک مسلمان حاضر خدمت ہوا اور دریافت کیا کہ اسلام کی حقیقت کیا ہے؟ آپ نے تین چیزیں بتائیں رات دن میں پانچ وقت کی نماز رمضان کے روزے اور زکوۃ۔ عبدالقیس کے وفد نے ۵ ھ میں حاضر ہو کر عرض کی کہ ہم دشمنوں کی مزاحمت کے سبب سے ہمیشہ نہیں حاضر ہو سکتے اس لئے ایسے احکام بتا دیئے جائیں جو ان لوگوں کو بھی سنا دیئے جائیں جو شرف حضوری حاصل نہیں کر سکتے۔ آپ نے فرمایا۔

﴿شهادة ان لا اله الا الله وان محمدا رسول الله واقام الصلوة وايتاء الزكوة وصيام رمضان وان تعطوا من المغنم الخمس﴾

اس بات کی شہادت کہ خدا ایک ہے محمد خدا کے پیغمبر ہیں نماز پڑھنا زکوۃ دینا رمضان کے روزے رکھنا اور مال غنیمت میں سے پانچواں حصہ دینا۔

ایک دفعہ آپ صحابہ کے مجمع میں تشریف فرما تھے اس اثناء میں ایک شخص نے آ کر سوال کیا کہ ایمان کیا چیز ہے؟ آپ نے فرمایا ایمان یہ ہے کہ خدا پر فرشتوں پر خدا کی ملاقات پر اس کے پیغمبروں پر اور مرنے کے بعد جی اٹھنے پر یقین ہو۔ اس نے پوچھا اور اسلام کیا ہے؟ فرمایا "اسلام یہ ہے کہ صرف خدا کو پوجو، کسی کو اس کا شریک نہ بناؤ نماز پڑھو فرض زکوۃ ادا کرو رمضان کے روزے رکھو" اس نے پھر دریافت کیا کہ "احسان کس کو کہتے ہیں؟" ارشاد ہوا کہ "خدا کی اس طرح عبادت کرو گویا کہ تم اس کو دیکھ رہے ہو کیونکہ اگر تم اس کو نہیں دیکھتے تو وہ تم کو دیکھ رہا ہے"۔

یہ اصول اسلام کا تقریباً کامل نقشہ ہے تاہم یہ سوال و جواب حج کی یعنی ۹ھ سے پہلے کا واقعہ ہے کیونکہ اس میں حج کا ذکر نہیں ہے تاہم اس قدر اطمینان حاصل ہو چکا تھا کہ تکمیل عبادت کے لیے خضوع و خشوع کی قید بھی اضافہ کی جا سکے

اصول اسلام کا آخری اعلان یہ ہے۔

﴿بنی الاسلام علی خمس شھادۃ ان لا الہ الا اللہ وان محمدا رسول اللہ واقام الصلوۃ وایتاء الزکوۃ والحج وصوم رمضان﴾

اسلام کی بنا پانچ باتوں پر ہے اس بات کی گواہی کہ خدا کے سوا کوئی اور خدا نہیں محمد اس کا پیغمبر ہے نماز پڑھنا زکوۃ دینا حج کرنا رمضان کے روزے رکھنا۔

رفتہ رفتہ ایمان اور اسلام کے اصول کلیہ کی جب تکمیل ہو چکی تو اس کے جزئیات اور دیگر لوازم کی بھی تعلیم دی گئی۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "ایمان کی کچھ اوپر ساٹھ شاخیں ہیں جن میں ایک شاخ حیا ہے" ایک دفعہ فرمایا کہ "بہترین اسلام یہ ہے کہ مسلمان اس کی زبان اور ہاتھ سے محفوظ رہے" ایک اور صاحب کے جواب میں فرمایا کہ "بہترین اسلام یہ ہے کہ تم بھوکوں کو کھانا کھلاؤ اور کسی سے جان پہچان ہو یا نہ ہو مگر اس کو سلام کرو" یہ بھی فرمایا کہ "اس وقت تک تم مومن نہیں جب تک اپنے بھائی کے لیے وہی پسند نہ کرو جو تم اپنے لیے پسند کرتے ہو"۔[1]

غرض اسلام کے تمام اصول و فروع کی تعلیم اسی طرح بتدریج تکمیل کو پہنچتی گئی اور آخر ۹ ذی الحجہ ۱۰ھ جمعہ کے روز وہ ساعت آئی جب خدا نے فرمایا۔[2]

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ﴾

آج ہم نے تمہارا مذہب مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی۔

عبادات

اوپر یہ حدیث گزر چکی ہے کہ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر قائم کی گئی ہے۔ ان میں سے توحید و رسالت کے علاوہ بقیہ چار چیزیں یعنی نماز روزہ حج زکوۃ عبادات میں داخل ہیں ان میں سب سے اول شے نماز ہے۔ نماز کی صحت کے لیے متعدد شرطیں ہیں سب سے اول اور ضروری شرط طہارت ہے۔

طہارت:

طہارت کے معنی یہ ہیں کہ جسم اور لباس ظاہری اور معنوی ہر قسم کی نجاستوں سے پاک ہو۔ طہارت کو اسلام میں جو اہمیت حاصل ہے اس کا اندازہ اس سے کرو کہ دوسری ہی وحی سے جب احکام اور فرائض کا آغاز ہوا تو توحید کے بعد دوسرا حکم طہارت ہی کا دیا گیا۔

﴿يَا اَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۝ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ﴾ (مدثر۔۱)

اے چادر اوڑھنے والے! اٹھ اور ہوشیار کر اور اپنے پروردگار کی بڑائی کر اور اپنے کپڑے سے پاک کر اور ناپاکی کو چھوڑ دے۔

---

[1] یہ تمام حدیثیں صحیح بخاری کتاب الایمان میں ہیں۔

[2] صحیح بخاری تفسیر آیت مذکورہ۔

اگرچہ مفسرین نے لباس یا کپڑے کی طہارت سے "دل کی طہارت" اور "ناپاکی" سے "بت پرستی" مراد لی ہے تاہم اس سے ظاہری طہارت اور پاکیزگی کی اہمیت کا اندازہ بھی ہو سکتا ہے۔ نماز سے پہلے وضو کرنا فرض ہے۔ اس فرضیت کا ثبوت ابتدائے اسلام سے ثابت ہوتا ہے۔ تاریخ و سیر اور بعض روایات حدیث میں ہے کہ وضو کا طریقہ آغاز وحی ہی میں حضرت جبریلؑ نے آپ کو سکھایا تھا۔ حاکم نے مستدرک میں حضرت ابن عباسؓ سے ایک روایت کی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ہجرت سے پہلے بھی وضو فرماتے تھے۔[1] لیکن قرآن میں وضو کا حکم باتفاق محدثین مدینہ میں نازل ہوا

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ﴾

مسلمانو! جب نماز کے لیے کھڑے ہو تو منہ اور کہنیوں تک ہاتھ دھولو، سر پر مسح کرو اور ٹخنوں تک پاؤں دھوؤ۔

یہ آیت سورۂ مائدہ میں ہے اور اس سورہ کی آخری آیتیں ہجرت کے چار پانچ سال بعد کی ہیں۔ اس آیت کے متعلق بخاری میں تصریح ہے کہ وہ آیت تیمم کے ساتھ اتری ہے۔ آیت تیمم ۵ھ میں نازل ہوئی اسی بنا پر اکثر علماء کی رائے یہ ہے کہ وضو پر عمل تو پہلے سے تھا لیکن قرآن میں اس کی فرضیت ہجرت کے چار پانچ سال کے بعد نازل ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابتداً لوگ نہایت جلدی جلدی وضو کر لیتے تھے کچھ حصہ بھیگتا تھا کچھ نہیں بھیگتا تھا۔ ۸ھ میں یا اس کے بعد کے کسی سفر میں آپ ﷺ مکہ سے واپس آ رہے تھے کچھ لوگ جھپٹ کر تالاب کے پاس پہنچے اور جلدی جلدی ہاتھ منہ دھو لیا۔ ایڑیاں کچھ بھیگیں کچھ خشک رہیں۔ آپ نے فرمایا۔[2]

﴿ويل للاعقاب من النار اسبغوا الوضوء﴾

ان ایڑیوں پر دوزخ کی پھٹکار ہے، وضو کامل کرو۔

اس وقت سے "اسباغ وضو" یعنی سکون و اطمینان کے ساتھ وضو کے تمام اعضاء کو دھونا لازم قرار پا گیا۔ اسباغ وضو کے تمام فضائل آپ ﷺ نے بیان فرمائے۔[3] وضو کے پابند نے ہر نماز کے وقت تازہ وضو کرتے تھے لیکن آخر عام مسلمانوں پر جبر ہونے کے خیال سے ہر وقت ضروری نہ رہا[4] اور اس کا اعلان آپ ﷺ نے فتح مکہ کے وقت فرمایا۔[5]

تیمم

وضو کے لیے پانی کی ضرورت ہے لیکن ہر وقت سفر میں اس کا ملنا مشکل ہے نیز بیماری کی حالت میں پانی کا استعمال بھی مضر ہے اس لیے ۵ھ میں تیمم کی آیت نازل ہوئی۔

---

1. ابن ہشام، صحیح البخاری کتاب المغازی ابن الصید، والامام احمد جلد ۴ صفحہ ۱۶۱ ابواب۔
2. صحیح البخاری جلد اصفحہ ۵۰ و طبرانی فی الاوسط۔
3. صحیح مسلم باب فضل اسباغ الوضوء۔
4. صحیح البخاری باب الوضوء من غیر حدث۔
5. صحیح مسلم۔

انسان نفس کو خوب زیر کرتا ہے اور یہ وقت دعا کے لیے مناسب بھی زیادہ ہے دن کو تم کو زیادہ شغل رہتا ہے اپنے پروردگار کا نام لے سب سے ٹوٹ کر اسی کا ہو رہ۔

اس کے بعد صبح وشام کی دو دو رکعتیں اور فرض ہوئیں۔

﴿وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ۝ وَمِنَ اللَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهُ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيلًا﴾ (دہر)

صبح وشام خدا کا نام لیا کر اور رات کے وقت دیر تک اللہ کے آگے سجدہ کیا کر اور اس کی تسبیح بیان کر۔

رات کو دیر تک نماز پڑھنے کا جو حکم تھا ایک سال تک قائم رہا چنانچہ حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ آپ ﷺ کا اور اکثر صحابہؓ کا ایک سال تک اسی پر عمل رہا، نماز پڑھتے پڑھتے ان کے پاؤں سوج جاتے تھے ایک سال کے بعد فرضیت منسوخ ہو گئی[1] اور حکم ہوا۔

﴿إِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ أَنَّكَ تَقُومُ أَدْنَىٰ مِن ثُلُثَيِ اللَّيْلِ وَنِصْفَهُ وَثُلُثَهُ وَطَائِفَةٌ مِّنَ الَّذِينَ مَعَكَ ۚ وَاللَّهُ يُقَدِّرُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۚ عَلِمَ أَن لَّن تُحْصُوهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ۖ فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ ۚ عَلِمَ أَن سَيَكُونُ مِنكُم مَّرْضَىٰ ۙ وَآخَرُونَ يَضْرِبُونَ فِي الْأَرْضِ يَبْتَغُونَ مِن فَضْلِ اللَّهِ ۙ وَآخَرُونَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ﴾

تیرا پروردگار جانتا ہے کہ تو دو تہائی رات سے کم اور آدھی رات اور تہائی رات تک نماز پڑھا کرتا ہے اور کچھ لوگ اور تیرے ساتھ خدا ہی رات اور دن کا اندازہ کرتا ہے، اس نے جان لیا کہ تم اس کو گن نہیں سکتے تم پر اس نے مہربانی کی اب جتنا ہو سکے اتنا ہی قرآن نماز میں پڑھو اس نے جان لیا کہ تم میں بیمار بھی ہوں گے مسافر بھی ہوں گے جو خدا کی روزی ڈھونڈنے کو سفر کریں گے اور لوگ خدا کی راہ میں جہاد کریں گے پس اب جتنا ہو سکے اتنا ہی پڑھو۔

رات کی اس نفل نماز کا نام تہجد ہے نماز نفل کے تہجد ہو جانے کے بعد فجر، مغرب اور عشاء تین وقت کی نمازیں فرض ہوئیں۔

﴿أَقِمِ الصَّلَاةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ اللَّيْلِ﴾ (ہود-۱۰)

دن کے دونوں (ابتدائی اور انتہائی) کناروں میں (یعنی فجر و مغرب) اور تھوڑی رات گزرنے کے بعد نماز پڑھا کرو

معراج میں جو نبوت کے پانچویں سال ہوئی[2] پانچ وقت کی نمازیں فرض ہوئیں[3] اور سورہ اسراء میں جو معراج کے بیان پر مشتمل ہے یہ آیت اتری۔

﴿أَقِمِ الصَّلَاةَ لِدُلُوكِ الشَّمْسِ إِلَىٰ غَسَقِ اللَّيْلِ وَقُرْآنَ الْفَجْرِ ۖ إِنَّ قُرْآنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُودًا ۝ وَمِنَ اللَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهِ نَافِلَةً لَّكَ﴾

نماز کے اوقات زوال آفتاب سے لے کر ظلمت شب تک ہیں (ظہر، عصر، مغرب، عشاء) اور صبح کی نماز میں سب جمع ہوتے ہیں اور رات کو تہجد پڑھا کرو یہ تیرے لیے مزید ہے۔

---

1. ابوداؤد باب فی صلوٰۃ اللیل ومسند احمد جلد ۶ صفحہ ۵۴۔
2. ہماری تحقیق میں معراج نبوت کے بارہویں سال ہوئی "س"
3. صحیح بخاری جلد ۱ صفحہ ۵۰۔

لی جاتی ہے کہ یہ سب افعال نماز نفل میں جائز ہیں۔ نفل کی تخصیص اس لیے کہ جن نمازوں میں آنحضرت ﷺ نے یہ افعال کیے وہ فرض نہ تھیں بلکہ نفل تھیں۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ تاویل صحیح نہیں۔ ایک حدیث میں صاف موجود ہے کہ آنحضرت ﷺ امامہ بنت ابو العاص کو کندھے پر چڑھائے مسجد میں آئے اور فرض ادا کی۔[1] ہمارے نزدیک یہ تمام واقعات اس زمانہ کے ہیں جب کہ نماز میں بات چیت اور اس قسم کے حرکات ممنوع نہیں قرار پائے تھے۔ رفتہ رفتہ نماز تکمیل کی اس حد کو پہنچی کہ وہ تمام تر خضوع و خشوع اور استغراق و محویت بن گئی۔

قرآن مجید میں آیت اتری ﴿ قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ ۝ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ ﴾ یعنی "فلاح پانے والے وہ مسلمان ہیں جو خشوع کے ساتھ نماز ادا کرتے ہیں" اس بنا پر نماز میں ادھر ادھر دیکھنا یا کوئی حرکت خضوع و خشوع کے خلاف کرنا منع ہوا۔ نماز کے تمام ارکان کا نہایت سکون اور اطمینان کے ساتھ ادا کرنا لازمی قرار پایا۔ یہاں تک کہ ایک شخص نے آنحضرت ﷺ کے سامنے نماز ادا کی اور تمام ارکان ٹھہر ٹھہر کر اچھی طرح نہیں ادا کیے تو آپ ﷺ نے اس سے فرمایا کہ "تم نے نماز نہیں پڑھی، جا کر پھر پڑھو" اس نے دوبارہ اسی طرح ادا کی آپ ﷺ نے فرمایا کہ "نماز نہیں ہوئی" تیسری دفعہ اس نے پوچھا کہ کیونکر پڑھوں؟ آپ ﷺ نے رکوع، سجدہ، قیام سب کی نسبت ہدایت کی کہ نہایت اطمینان کے ساتھ ادا کیے جائیں، چنانچہ صحیح بخاری وغیرہ[2] میں یہ روایت تفصیل کے ساتھ مذکور ہے۔

غرض پہلے یہ حالت تھی کہ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھ رہے تھے، اتفاقاً شام سے تجارت کا قافلہ آیا، بارہ آدمیوں کے سوا جس قدر لوگ نماز میں شریک تھے اٹھ کر قافلہ کی طرف دوڑے۔ اس پر یہ آیت اتری۔[3]

﴿ وَإِذَا رَأَوْا تِجَارَةً أَوْ لَهْوًا انْفَضُّوا إِلَيْهَا وَتَرَكُوكَ قَائِمًا قُلْ مَا عِنْدَ اللَّهِ خَيْرٌ مِنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ ﴾ (جمعہ۔۲)

اور جب لوگ تجارت یا کھیل تماشا دیکھ پاتے ہیں تو ٹوٹ کر اس پر گرتے ہیں اور تجھ کو کھڑا چھوڑ دیتے ہیں کہہ دے کہ جو کچھ خدا کے ہاں ہے وہ تجارت اور کھیل تماشے سے بہتر ہے۔

اور پھر آنحضرت ﷺ کی تربیت و تعلیم سے یہ حالت ہوئی (کہ ایک انصاری تیر اندازی کی حالت میں تین دفعہ تیر کا زخم کھاتے ہیں لیکن نماز نہیں توڑتے کہ جو سورۃ انہوں نے شروع کی تھی اس کی لذت معنوی اس درد زخم سے زیادہ تھی اس سے جدا نہ ہو سکے) کہ حضرت عمر فاروقؓ نماز میں زخم کھا کر گرتے اور تڑپتے ہیں، یہ قیامت خیز منظر سب کے سامنے ہے لیکن ایک شخص مڑ کر نہیں دیکھتا کیونکہ خشیت الٰہی اور محویت کا عالم جو دلوں پر طاری ہے وہ اور کسی طرف متوجہ نہیں ہونے دیتا۔

نماز جمعہ اور عیدین:

مکہ میں چند شخصوں کا یکجا ہو کر نماز ادا کرنا ناممکن تھا اس لیے جمعہ کی نماز فرض نہ تھی (کیونکہ جمعہ کی پہلی شرط

1. ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ باب العمل فی الصلوٰۃ۔
2. صحیح بخاری باب امر النبی ﷺ من لا یتم الصلوٰۃ بالاعادۃ۔
3. صحیح بخاری کتاب البیوع تفسیر آیت مذکور۔

جماعت ہے لیکن مدینہ منورہ میں انصار کی ایک بڑی جماعت اسلام لا چکی تھی اور کوئی شخص ان کے نماز میں خلل انداز نہیں ہو سکتا تھا اس لیے آنحضرت ﷺ کی تشریف آوری سے قبل جو مسلمان مدینہ آ چکے تھے اسعد بن زرارہ کی تحریک سے بنی بیاضہ کے محلہ میں انہوں نے جمعہ کی سب سے پہلی نماز ادا کی[1]۔ مصعبؓ بن عمیر امام تھے (ابن اسحاق) اور کل چالیس مسلمان نمازی تھے۔ اس کے بعد آنحضرت ﷺ جب مدینہ تشریف لائے تو پہلے قبا میں قیام فرمایا یہاں سے روانگی کے لیے آپ ﷺ نے قصداً جمعہ کا دن متعین فرمایا۔ بنی سالم کے محلہ میں پہنچے تو نماز کا وقت آ گیا چنانچہ آنحضرت ﷺ نے سب سے پہلے نماز جمعہ یہیں ادا فرمائی یہ اواخر ربیع الاول ۱ھ کا واقعہ ہے[2]۔ مدینہ سے باہر عرب کے دوسرے حصوں میں مسلمانوں کی یکجا تعداد سب سے زیادہ جواثی میں تھی جو بحرین میں واقع تھا حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ مسجد نبوی کے بعد سب سے پہلے نماز جمعہ یہیں قائم ہوئی[3]۔ لیکن بظاہر نماز جمعہ کا اہتمام مسلمانوں میں پہلے اتنا نہ تھا جتنا کہ ہونا چاہیے۔ ابھی اوپر گزر چکا ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھا رہے تھے اور ایک روایت میں ہے کہ جمعہ کا خطبہ دے رہے تھے کہ اتفاقاً شام سے غلہ کے بیوپاری آ گئے سب لوگ اٹھ کر ادھر چلے گئے جماعت میں صرف بارہ آدمی اور دوسری روایت کی رو سے چالیس آدمی[4] رہ گئے۔ اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں۔

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا انْفَضُّوْٓا اِلَيْهَا وَتَرَكُوْكَ قَآئِمًا قُلْ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ وَاللّٰهُ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴾ (جمعہ)

ایمان والو! جب نماز جمعہ کے لیے پکارا جائے تو یاد الٰہی کی طرف دوڑو اور خرید و فروخت چھوڑ دو یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم کو علم ہو جب نماز سے فراغت ہو جائے تو زمین میں چلو پھرو اور خدا کی روزی تلاش کرو اور خدا کو کثرت سے یاد کیا کرو تا کہ فلاح پاؤ، جب لوگ تجارت اور کھیل تماشہ کچھ پاتے ہیں تو ٹوٹ کر اس پر گرتے ہیں اور تم کو اے پیغمبر! کھڑا چھوڑ دیتے ہیں کہہ دے کہ جو کچھ خدا کے پاس ہے وہ تجارت اور کھیل تماشہ سے بہتر ہے اور خدا بہتر روزی دینے والا ہے۔

اس کے بعد یہ حالت ہو گئی کہ نماز کے سامنے تمام دنیا کی دولت کا خزانہ بھی ان کے آگے ہیچ ہو گیا۔ خدا نے ان کی مدح فرمائی۔

﴿ رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ﴾ (نور)

یہ وہ لوگ ہیں جن کو تجارت اور خرید و فروخت خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتی۔

عید کی نماز بھی مدینہ ہی میں آ کر قائم ہوئی لیکن جس سال آپ تشریف لائے اس سال عید کی نماز نہیں ہوئی

---

1. ابوداؤد و ابن ماجہ و دارقطنی کتاب الجمعہ مصنف عبدالرزاق و احمد و ابن خزیمہ حسب حوالہ فتح الباری۔
2. طبری صفحہ ۱۲۵۶۔
3. صحیح بخاری باب الجمعہ۔
4. دارقطنی کتاب الجمعہ۔

بڑی عزت کرتے ہیں فرمایا کہ آئندہ سال زندہ رہا تو نویں کو روزہ رکھوں گا لیکن افسوس کہ آپ ﷺ نے اسی سال وفات پائی۔[1]

یہود اس طرح روزہ رکھتے تھے کہ نماز عشاء کے بعد پھر کچھ نہیں کھاتے تھے اور اس کو حرام سمجھتے تھے عورت کے ساتھ ہم بستری بھی منع تھی۔[2] ابتدائے اسلام میں مسلمان بھی اسی طریقہ کے موافق مامور ہوئے اسلام کے تمام احکام میں سب سے مقدم یہ اصول ملحوظ رہتے تھے۔

﴿يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾ (بقرہ)

خدا تمہارے حق میں آسانی چاہتا ہے سختی نہیں چاہتا۔

﴿لا صرورة في الاسلام﴾ (ابو داؤد)

اسلام میں جوگی پنا نہیں ہے۔

اسی بنا پر یہ آیت نازل ہوئی۔

﴿أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَائِكُمْ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ﴾ (بقرہ۔۲۳)

روزے کی راتوں میں تمہارے لیے عورتوں سے لطف اٹھانا حلال کر دیا گیا ہے جب تک صبح کی سپید لکیر (رات کی) سیاہ لکیر سے الگ نہ ہو جائے تم کھاتے پیتے رہو۔

اہل عرب روزے سے بہت کم خوگر تھے۔ اس لیے اول اول روزہ ان پر شاق ہوا۔[3] اس لیے نہایت تدریج کے ساتھ روزہ کی تکمیل کی گئی۔ اول اول آنحضرت ﷺ جب مدینہ تشریف لائے تو سال میں تین روزے رکھنے کا حکم دیا۔ پھر روزے میں فرضیت نازل ہوئی تو یہ اختیار دیا کہ جو شخص چاہے روزہ رکھے اور جو چاہے روزہ کے بدلے ایک غریب کو کھانا کھلا دے۔ رفتہ رفتہ جب لوگ روزے کے خوگر ہو چلے تو یہ آیت اتری۔

﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾[4]

جو رمضان کا مہینہ پائے وہ ضرور روزہ رکھے۔

اب بالکل روزہ فرض ہو گیا اور فدیہ کی اجازت جاتی رہی البتہ جو شخص بیمار ہو یا سفر میں ہو اس کے لیے یہ حکم ہوا کہ اس وقت روزہ چھوڑ دے اور ان کے بدلے کسی اور وقت قضا کر لے چونکہ اور تمام مذہبوں میں خصوصاً عیسائیوں میں رہبانیت بڑی فضیلت کی بات سمجھی جاتی تھی اس لیے جو لوگ زیادہ مذہب پرست تھے وہ روزہ میں زیادہ سختی برداشت کرتے تھے لیکن آنحضرت ﷺ ہمیشہ لوگوں کو اس سے روکتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ سفر میں تھے ایک شخص کو دیکھا کہ اس کے گرد بھیڑ لگی ہوئی ہے اور اس پر لوگوں نے سایہ کر رکھا ہے آپ نے سبب پوچھا معلوم ہوا کہ سخت گرمی میں اس شخص نے

[1] یہ تمام واقعات صحیح بخاری، صحیح مسلم اور ابو داؤد کتاب الصوم میں بہ تفصیل مذکور ہیں۔

[2] ابو داؤد کتاب الصوم باب مبدء فرض الصیام

[3] صحیح بخاری میں ہے نزل رمضان فشق علیہم۔ [4] ابو داؤد کتاب الصلوۃ باب بدء الاذان۔

روزہ رکھا ہے آپ نے فرمایا کہ سفر میں روزہ رکھنا کچھ ثواب کی بات نہیں [1] بعض لوگوں نے صوم وصال رکھنا چاہا یعنی رات دن روزہ رکھیں بیچ میں افطار نہ کریں آپ ﷺ نے اس سے منع فرمایا۔

روزہ کا مقصد عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ اپنے آپ کو تکلیف میں ڈالنا ثواب کی بات ہے اس لیے آنحضرت ﷺ نے ہر طرح کی آسانیوں کا حکم دیا سفر میں اور بیماری میں روزہ رکھنا فرض نہ تھا۔ راتوں کو صبح صادق تک کھانے پینے اور تمام اشغال کی اجازت تھی سحر کھانے کی فضیلت بیان کی اور یہ بھی فرمایا کہ صبح کے قریب کھایا جائے تاکہ دن بھر قوت باقی رہے۔

روزہ کا مقصد صرف معاصی سے کف نفس تھا اور روزہ اس کا مکمن تھا اس لیے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "جو شخص روزہ میں جھوٹ فریب نہیں چھوڑتا خدا کو اس کی فاقہ کشی کی کوئی حاجت نہیں" [2]

زکوۃ:

خیرات اور زکوۃ کی ترغیب اور تحریص اسلام میں ابتدا ہی سے معمول رہی تھی۔ مکہ میں جو سورتیں اتریں ان میں زکوۃ کا لفظ تصریحاً مذکور ہے اور خیرات نہ دینے والے پر نہایت عتاب ہے۔

أَرَأَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالدِّينِ ۝ فَذَٰلِكَ الَّذِي يَدُعُّ الْيَتِيمَ ۝ وَلَا يَحُضُّ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ (ماعون)

تم نے اس شخص کو دیکھا جو قیامت کو جھٹلاتا ہے یہی وہ شخص ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کے کھانا کھلانے کی لوگوں کو ترغیب نہیں کرتا۔

مدینہ منورہ میں زیادہ تاکید کی آیتیں نازل ہوئیں رمضان ۲ھ میں عید کے دن صدقہ فطرہ دینا واجب قرار پایا [3] ہجرت کے ابتدائی زمانہ میں عام مسلمان اور خصوصاً مہاجرین سخت فقر وفاقہ میں مبتلا تھے۔ حدیثوں میں صحابہ کے فقر وتنگ دستی کے جو واقعات کثرت کے ساتھ مذکور ہیں اسی زمانے کے ہیں۔ اس بنا پر یہ حکم ہوا کہ جس شخص کے پاس ضروری مصارف سے جو کچھ بچے سب کو خیرات کر دینا چاہیے ورنہ عذاب ہوگا چنانچہ یہ آیت نازل ہوئی۔ [4]

﴿وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ﴾ (توبہ)

جو لوگ چاندی سونا جمع کرتے ہیں اور خدا کی راہ میں خیرات نہیں کرتے۔

اس آیت کا بھی یہی مطلب ہے۔

﴿يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ﴾ (بقرہ)

لوگ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خیرات دیں، کہہ دو کہ جو کچھ مصارف ضروری سے بچ رہے۔

بہت سے لوگ خیرات کرتے تھے لیکن جو مال محفوظ رکھتے تھے بیکار اور ردی چیزیں خیرات میں دیتے تھے اس

---

1. صحیح بخاری کتاب الصوم۔
2. ایضاً کتاب مذکور۔
3. طبری مطبوعہ یورپ صفحہ ۱۲۸۱۔
4. صحیح بخاری طبع مصر تفسیر سورۂ برأت۔

حضرت ابراہیمؑ کی دعوت عام پر دنیا نے لبیک کہا اور ہر سال عرب کے دور دراز اطراف سے لوگ حج کو آتے تھے لیکن ایک طرف تو یہ افسوسناک انقلاب ہوا کہ جو گھر خالص توحید کے لیے تعمیر ہوا تھا وہ تین سو ساٹھ بتوں کا تماشا گاہ بن گیا' دوسری طرف اس گھر کی تولیت کا سب سے زیادہ جس کو حق تھا وہ یہاں سے نکلنے پر مجبور ہوا اور پورے آٹھ برس تک ادھر آنکھ اٹھا کر دیکھ بھی نہ سکا۔ بالآخر ظہور حق کا وقت آیا' مکہ فتح ہوا اور جانشین ابراہیمؑ اور ان کے متبعین کو موقع ملا کہ شعار ابراہیمی کو پھر زندہ کیا جائے' چنانچہ ۹ھ میں حج فرض ہوا [1] تاہم آنحضرت ﷺ نے اس سال یہ فرض ادا نہیں کیا کہ عرب ننگے ہو کر طواف کعبہ کرتے تھے اور آنحضرت ﷺ ایسی بے حیائی کا منظر آنکھ سے دیکھنا گوارا نہیں فرما سکتے تھے اس لیے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ ایام حج میں روانہ کیے گئے کہ کعبہ میں جا کر منادی کر دیں کہ آئندہ سے کوئی شخص عریاں ہو کر کعبہ کا طواف نہ کرنے پائے گا۔ [2]

ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ نسی کے قاعدہ سے حج کا مہینہ ہٹتے ہٹتے ذوالقعدہ میں آ گیا تھا' چنانچہ ۹ھ کا حج اسی مہینہ میں ادا ہوا' لیکن حج کا اصلی مہینہ ذوالحجہ تھا' اس لیے آنحضرت ﷺ نے ایک سال کا انتظار فرمایا اور اس وقت حج ادا کیا جب وہ اپنے اصلی مرکز پر آ گیا۔ [3]

حج کی اصلاحات:

حج کی رسم اگرچہ کفار نے قائم رکھی تھی لیکن اس کی صورت بالکل بدل دی تھی اور اس میں اس قدر بدعات اضافہ کر دی تھیں کہ وہ ثواب کے بجائے عذاب کا کام بن گیا تھا۔ سب سے مقدم یہ کہ حج اور تمام عبادات کا مقصد خدا کا ذکر اور توجہ الی اللہ ہے لیکن اہل عرب جب حج میں جمع ہوتے تھے تو خدا کے بجائے اپنے باپ دادا کے مفاخر اور کارنامے بیان کرتے تھے اس بنا پر یہ آیت اتری۔

﴿فَإِذَا قَضَيْتُم مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا﴾ [4] (بقرہ ۲۰۰)

پھر جب حج کے ارکان پورے کر لو تو خدا کا ذکر کرو جس طرح اپنے باپ دادا کا ذکر کرتے تھے بلکہ اس سے بڑھ کر۔

خاص اہل مدینہ نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ منات جو بت تھا' اس کا طواف کرتے تھے اور اس بنا پر جب کعبہ کا حج کرتے تھے تب بھی صفا و مروہ کا طواف نہیں کرتے تھے حالانکہ حج کے مقاصد میں سے ایک بڑا مقصد یہ بھی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی یادگاریں قائم رکھی جائیں اور صفا و مروہ کا طواف اسی عہد کی یادگار ہے' اسی بنا پر یہ آیت اتری۔

﴿إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِن شَعَائِرِ اللَّهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَن يَطَّوَّفَ

---

[1] (زاد المعاد جلد اول ص ۱۹۰)

[2] صحیح مسلم کتاب الحج باب لا یحج البیت مشرک ولا یطوف بالبیت عریان۔

[3] آنحضرت ﷺ نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں یہ الفاظ فرمائے تھے ان الزمان قد استدار کہیئتہ یوم خلق اللہ السموات والارض السنۃ اثنا عشر شہرا منہا اربعۃ حرم ثلاث متوالیات ذوالقعدۃ و ذوالحجۃ والمحرم و رجب مضر الذی بین جمادی و شعبان۔ اسی سے اس طرف اشارہ تھا۔

[4] اسباب النزول للواحدی۔

بِهِمَا﴾ (بقرہ ۔۱۹)

صفا و مروہ خدا کی یادگاریں ہیں اس لیے جو شخص حج یا عمرہ کرے تو اس کو ان دونوں مقاموں کا بھی طواف کرنا چاہیے۔[1]

ایک طریقہ یہ جاری ہو گیا تھا کہ اکثر لوگ (آج کل کی طرح) جن کے پاس زاد سفر نہیں ہوتا تھا یوں ہی چل کھڑے ہوتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم متوکل ہیں ان لوگوں کو اکثر راستہ میں گداگری اور دوسروں کی دستگیری کا محتاج ہونا پڑتا تھا۔ تو اس بنا پر یہ آیت نازل ہوئی۔

﴿وَتَزَوَّدُوا فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوَىٰ﴾[2] (بقرہ)

اور گھر سے زاد سفر لے کر چلو کیونکہ بہتر زاد سفر تقویٰ ہے۔

احرام حج میں سر کے بالوں کا منڈوانا یا ترشوانا منع ہے لیکن اس میں اہل جاہلیت نے بہت سختی کر دی تھی یہاں تک کہ بعض صاحبوں کے بالوں میں اس قدر جوئیں پڑ گئیں کہ بینائی جاتے رہنے کا خوف ہو گیا' تاہم وہ بال نہ ترشوا سکے۔ اسلام میں چونکہ سب سے مقدم یہ امر پیش نظر ہے کہ اس کی عبادات اور احکام تکلیف مالا یطاق نہ بن جائیں اس لیے یہ حکم ہوا۔

﴿فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ بِهِ أَذًى مِنْ رَأْسِهِ فَفِدْيَةٌ مِنْ صِيَامٍ أَوْ صَدَقَةٍ أَوْ نُسُكٍ﴾

تو جو شخص بیمار ہو یا اس کے سر میں کچھ عارضہ ہو تو وہ (اگر بال منڈوا لے) تو فدیہ ادا کرے یعنی یا روزہ یا خیرات یا قربانی۔

قربانی جو کرتے تھے اس کا خون لے کر کعبہ کے در و دیوار پر ملتے تھے اور اس کو ثواب سمجھتے تھے اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔[3]

﴿لَنْ يَنَالَ اللَّهَ لُحُومُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا وَلَٰكِنْ يَنَالُهُ التَّقْوَىٰ مِنْكُمْ﴾ (حج)

خدا کو قربانی کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا بلکہ تمہاری پرہیزگاری اس تک پہنچتی ہے۔

اس آیت میں صرف اس فعل سے نہیں روکا گیا بلکہ یہ بھی بتا دیا گیا کہ قربانی خود کوئی مقصود بالذات چیز نہیں بلکہ اصل چیز جس کو خدا قبول کرتا ہے وہ تقویٰ اور پرہیزگاری ہے۔

رسوم حج میں ایک بڑی چیز جو قریش نے اصول اسلام کے خلاف قائم کر دی تھی یہ تھی کہ وہ عرفات جو حج کا اصلی عبادت گاہ عام تھا نہیں جاتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم اہل حرم ہیں ہم حدود حرم سے باہر نہیں جا سکتے' یہ ہمارے خاندان کی توہین ہے اس لیے وہ صرف مزدلفہ تک جا کر ٹھہر جاتے تھے باقی تمام عرب عرفات میں جمع ہوتے تھے اور وہاں سے چل کر مزدلفہ اور منیٰ میں آتے تھے چونکہ اسلام کا اصول اصلی مساوات عامہ ہے اور عبادت میں سب یکساں ہیں اس لیے حکم آیا

---

1. قرآن مجید میں جناح کا جو لفظ ہے اس کا ترجمہ لفظی "نقصان" ہے اس بنا پر ترجمہ یہ ہونا چاہیے کہ صفا و مروہ کے طواف میں کچھ برائی نہیں لیکن جناح کا لفظ واجب اور مستحب کے معنوں میں بھی آیا ہے۔
2. بخاری کتاب الحج باب "وتزودوا فان خیر الزاد التقوی"
3. تفسیر بیضاوی بحوالہ ابن ابی حاتم ۔ سورۃ الحج ۲۲:۳۷

جو لوگ حالت مسافرت میں مر جاتے ان کے لیے گواہی اور شہادت کا قانون قرآن میں مقرر کیا گیا۔ گواہی کو چھپانا بھی (بڑا گناہ) جرم تھا چنانچہ سورۂ بقرہ و مائدہ میں اس کی پوری تفصیل ہے۔ غزوۂ بدر کے بعد مسلمانوں کی تعداد میں کافی ترقی ہوتی گئی خاندان کے خاندان مسلمان ہو گئے اس لیے وراثت کے مخصوص قانون کی ضرورت ہوئی پھر وصیت کے قاعدہ میں بڑی دقت یہ تھی کہ ناگہانی موت کے موقع پر تقسیم جائیداد کا کوئی اصول جاری کرنا ممکن نہ تھا مثلاً جہاد میں سینکڑوں مسلمان شریک ہوتے تھے اب کس کو معلوم ہے کہ کس کو شہادت ہوگی اس حالت میں وصیت نہ کر جانے سے ورثہ داروں میں جس کا قابو چل جاتا وہ جائیداد پر قبضہ کر لیتا چنانچہ غزوۂ احد میں یہی موقع پیش آیا۔ سعد بن الربیع جو بہت دولت مند صحابی تھے (اس جنگ میں) شہید ہوئے ان کی بیوی آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آئیں کہ سعد آپ کی خدمت میں شہید ہوئے انہوں نے دو لڑکیاں چھوڑی ہیں لیکن سعد کے بھائی نے سعد کی ساری جائیداد پر قبضہ کر لیا آنحضرت ﷺ نے فرمایا "خدا فیصلہ کرے گا" پھر (غالباً احد میں) یہ آیت نازل ہوئی [1] جس میں وراثت کے تمام احکام مذکور ہیں۔

﴿ يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ ﴾ (نساء)

خدا تم کو تمہاری اولاد کی نسبت حکم دیتا ہے کہ مرد کو دو لڑکیوں کے برابر حصہ ملے (آخر تک)

آنحضرت ﷺ نے سعد کے بھائی کو بلا کر فرمایا کہ سعد کے متروکہ میں سے دو تہائی ان کی بیٹیوں اور آٹھواں حصہ ان کی بیوی کو دو اس کے بعد جو بچ رہے وہ تمہارا حق ہے۔

اہل عرب عورتوں کو وراثت سے محروم رکھتے تھے اور کہتے تھے کہ وراثت اس کا حق ہے جو تلوار چلانے والا ہو۔ دنیا کی اور اکثر قوموں میں بھی یہی دستور تھا یہ پہلا قانون ہے کہ اس صنف ضعیف کی دادرسی کی گئی۔

وصیت:

احکام وراثت کے بعد بھی وصیت کی اجازت باقی رہی لیکن چونکہ اس سے مستحقین وراثت کی حق تلفی کا اندیشہ تھا اس لیے وصیت کی تحدید کی ضرورت تھی۔ روایت میں ہے حضرت سعد بن ابی وقاص بیمار ہوئے آنحضرت ﷺ ان کی عیادت کو گئے انہوں نے عرض کی کہ میں مر رہا ہوں اور میرے صرف ایک ہی لڑکی ہے چاہتا ہوں کہ دو تہائی مال خیرات کر دوں" آنحضرت ﷺ نے اجازت نہیں دی انہوں نے کہا تو نصف؟ آپ ﷺ نے اس کو بھی قبول نہیں کیا انہوں نے کہا

۱؎ [illegible] حدیث میں [illegible] حضرت جابر [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] کتاب الفرائض [illegible] ترمذی [illegible]
[illegible]
[illegible] سعد بن ربیع [illegible]
[illegible]

ایک تہائی" آپ ﷺ نے فرمایا "یہ بھی بہت ہے وارثوں کو غنی چھوڑ کر مرنا اس سے اچھا ہے کہ وہ بھیک مانگتے پھریں"۔[1] تاہم یہ مقدار آپ ﷺ نے جو قرار دی اس وقت سے وصیت ایک ثلث سے زیادہ ممنوع ہو گئی۔

وقف:

وقف شریعت کا بہت بڑا مسئلہ ہے اسلام سے پہلے اس مسئلہ کو کسی مذہب نے صاف نہیں کیا اس کا دوسرے مذاہب کے قوانین میں شائبہ تک موجود نہیں ہے۔ اسی بنا پر شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں دعویٰ کیا ہے کہ اسلام طریقہ وقف کا موجد ہے۔ اسلام میں وقف کی تاریخ نہایت قدیم ہے۔ آنحضرت ﷺ نے ہجرت کے پہلے ہی سال مدینہ میں مسجد نبوی کی بنیاد جس زمین میں رکھی تھی وہ دو یتیموں کی ملکیت تھی آپ ﷺ نے قیمت دینی چاہی لیکن انہوں نے کہا۔

﴿لا واللہ لا نطلب ثمنہ الا الی اللہ﴾

نہیں ہم خدا کی قسم! قیمت نہ لیں گے ہم اس کی قیمت خدا ہی سے لیں گے۔

یہ اسلام کا پہلا وقف تھا اور نہایت سادہ صورت میں تھا چنانچہ امام بخاری اسی حدیث کو وقف مشاع (مشترک جائیداد کا وقف) کے ثبوت میں لاتے ہیں اس کے بعد سنہ ۳ھ یا سنہ ۴ھ میں جب یہ آیت نازل ہوئی۔

﴿لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون﴾

تم نیکی اس وقت تک نہیں پا سکتے جب تک خدا کی راہ میں وہ چیز نہ دو جو تم کو سب سے محبوب ہے۔

تو ابو طلحہ انصاری آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آئے اور عرض کی "یارسول اللہ! بیرحا[2] مجھ کو سب سے زیادہ محبوب ہے میں اس کو خدا کی راہ میں صدقہ کرتا ہوں اور اس کا ثواب اور اجر خدا سے چاہتا ہوں آپ جس مصرف میں چاہیں اس کو رکھیں"۔ چنانچہ آپ کے مشورہ سے انہوں نے اس کا منافع اپنے اعزہ پر وقف کیا۔

اب تک وقف کے لیے جو الفاظ استعمال ہوئے تھے وہ صرف یہ تھے کہ "ذاتی تصرف سے نکال کر خدا کی ملکیت میں دیا گیا" لیکن سنہ ۷ھ میں فتح خیبر کے بعد اس کی حقیقت بالکل واضح کر دی گئی۔ خیبر میں حضرت عمرؓ کو ایک زمین ملی تھی حضرت عمرؓ نے اس کو وقف کرنا چاہا۔ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ نے فرمایا۔

﴿ان شئت حبست اصلھا و تصدقت بھا﴾

اگر چاہو اصل جائیداد باقی رکھو اور منافع صدقہ کر دو۔

چنانچہ اسی شرط کے ساتھ وہ جائیداد وقف ہوئی۔[3]

﴿انہ لا یباع اصلھا ولا یوھب ولا یورث﴾

اصل جائیداد نہ بیچی جائے نہ ہبہ کی جائے اور نہ وراثت میں بانٹی جائے۔

---

1. بخاری جلد ا کتاب الوصایا۔
2. ایک زمین کا نام ہے جو مدینہ میں واقع تھی۔
3. یہ تمام تفصیلیں بخاری باب الوقف میں ہیں۔

خَطِئًا﴾ (نساء)

کسی مسلمان کو سزاوار نہیں کہ کسی دوسرے مسلمان کو مار ڈالے لیکن غلطی سے، اگر کسی مسلمان کو غلطی سے قتل کیا تو ایک مسلمان غلام آزاد اور خون بہا اس کے وارثوں کو ادا کرنا چاہیے لیکن یہ کہ وہ معاف کر دیں تو خیر، اگر مقتول خود مسلمان ہو اور ہو کسی دشمن قوم سے تو صرف ایک غلام آزاد کرنا، اور اگر ایسی قوم سے ہو جس سے تم نے معاہدہ کیا ہو تو خون بہا دینا اور ایک غلام آزاد کرنا چاہیے اگر قاتل کو یہ مقدور نہ ہو تو پے در پے دو مہینے کے روزے رکھنے چاہئیں کہ خدا اس کی طرف رجوع ہو خدا علم اور حکمت والا ہے اور جو کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرے تو اس کی جزا دوزخ ہے ہمیشہ اس میں رہے گا خدا اس پر غضب اور لعنت بھیجے گا اور اس کے لیے بڑا عذاب اس نے مہیا کیا ہے۔

حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ قصاص و قتل کے متعلق یہ سب سے آخری حکم ہے۔ حفاظت جان کا اعلان فتح مکہ کے موقع پر ہوا، جب آپ نے ارشاد فرمایا کہ "زمانۂ جاہلیت کے تمام خون میرے دونوں پاؤں کے نیچے ہیں۔" اس کے بعد قتل خطا مشابہ بہ قتل عمد کے خون بہا کی تحدید فرمائی۔ قتل خطا کا خون بہا اہل قریہ کے لیے ۴۰۰ دینار مقرر کیا۔[۱]

سنہ ۶ ھ تک رہزنوں کے لیے کوئی حد مقرر نہ تھی۔ سنہ ۶ ھ میں عکل اور عرینہ کے قبیلے کے کچھ لوگ مدینہ آ کر مسلمان ہوئے یہاں کی آب و ہوا ان کو راس نہ آئی تو آنحضرت ﷺ نے شہر سے باہر چراگاہ میں ان کو قیام کی اجازت دی۔ ایک دن موقع پا کر مسلمان چرواہوں کو طرح طرح سے عذاب دے کر بڑی بے دردی سے مار ڈالا اور مویشی لوٹ کر لے گئے وہ گرفتار ہو کر آئے تو آنحضرت ﷺ نے بھی ان کو اسی طرح عذاب کے ساتھ قتل کا حکم دیا، گو یہ برابر کا انتقام تھا تاہم اس میں کسی قدر شدت تھی اس لیے خدائے پاک کی طرف سے عتاب ہوا اور ڈاکوؤں کے لیے مخصوص احکام نازل ہوئے۔[۲]

﴿إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَنْ يُقَتَّلُوا أَوْ يُصَلَّبُوا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ مِنْ خِلَافٍ أَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْأَرْضِ﴾ (مائدہ)

ان لوگوں کی سزا جو خدا اور اس کے رسول سے لڑائی لڑتے ہیں اور ملک میں فساد پھیلاتے ہیں یہ ہے کہ قتل کیے جائیں یا پھانسی دیئے جائیں یا ان کے ادھر کے ہاتھ اور ادھر کے پاؤں کاٹ ڈالے جائیں یا ملک سے الگ کر دیئے جائیں (یعنی قید ہوں یا جلا وطن کیے جائیں)

جان کے بعد مال کا درجہ ہے اسلام سے پہلے عرب میں چوروں کے لیے قطع ید کی سزا جاری تھی اسلام نے بھی اس کو باقی رکھا ﴿وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا﴾ سنہ ۸ ھ میں فتح مکہ کے موقع پر قبیلہ مخزوم کی ایک عورت نے اس جرم کا ارتکاب کیا چونکہ وہ ایک شریف خاندان سے تھی اس لیے مسلمانوں میں بڑا اضطراب پیدا ہوا حضرت اسامہ بن زیدؓ آنحضرت ﷺ کے بہت چہیتے تھے ان سے سفارش کرائی گئی آپ ﷺ بہت برہم ہوئے اور لوگوں کو جمع کر کے ایک خطبہ دیا جس میں فرمایا کہ "تم سے پہلے لوگوں کی ہلاکت کا یہی سبب ہوا کہ وہ نیچے طبقے کے لوگوں پر تو احکام جاری

---

۱ ابوداؤد کتاب الدیات باب فی دیۃ الخطا شبہ العمد۔

۲ بخاری [illegible] الاعطا۔

۳ بخاری کتاب الحدود والمحاربہ۔

جو شخص پاک دامن عورتوں پر زنا کی تہمت لگائیں پھر چار گواہ نہ لاسکیں تو ان کو اسی ۸۰ درے مارو اور پھر کبھی ان کی گواہی قبول نہ کرو۔

دنیا میں تین چیزیں ہیں: جان، مال اور آبرو۔ جن حدود و تعزیرات کا اوپر ذکر ہوا وہ انہی تین چیزوں کے تحفظ کے لیے ہیں، اسی لیے آنحضرت ﷺ نے ان قوانین کے نزول کے بعد حجۃ الوداع کے موقع پر حرم کے اندر حرام کی تاریخوں میں فرمایا:

''مسلمانو! ہر مسلمان کی جان، مال اور آبرو اسی طرح قابل حرمت ہے جس طرح اس محترم شہر مکہ میں اس ماہ حرام کے اندر یہ مقدس دن قابل حرمت ہے۔''

حلال و حرام

ماکولات میں حلال و حرام:

عرب میں کھانے پینے میں کسی چیز کا پرہیز نہ تھا اور نہ کوئی شے حلال یا حرام تھی، مردار اور حشرات الارض تک کھاتے تھے، البتہ بعض بعض جانور جن کو بتوں کے نام پر چھوڑ دیتے تھے ان کا ذبح کرنا گناہ سمجھتے تھے۔ بعض جانوروں میں یہ نذر مانتے تھے کہ ان کو صرف مرد کھا سکتے ہیں، عورتیں نہیں، اگر بچہ مردہ پیدا ہوتا تو مرد و عورت دونوں کھا سکتے ہیں اور زندہ ہوتا تو صرف مرد، غرض اسی قسم کے اور بعض بہت سے توہمات و رسوم تھیں، سورۂ انعام میں جو مکہ میں نازل ہوئی تھی ان رسوم کا بہ تفصیل ذکر ہے۔ اسلام کے اکثر احکام گو مدینہ میں اترے لیکن ماکولات کی حلت و حرمت کے احکام مکہ ہی میں اترنے شروع ہو چکے تھے، چنانچہ سورۂ انعام میں مشرکین کی ان رسوم کی تردید کے بعد یہ حکم آیا:

﴿قُلْ لَّآ اَجِدُ فِیْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ یَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ یَّكُوْنَ مَیْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِیْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰهِ بِهٖ فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ﴾ (انعام)

کہہ دے کہ جو وحی اتری ہے اس میں کسی کھانے والے پر کوئی شے حرام نہیں ہے، ہاں اگر حرام ہے تو مردہ یا بہتا ہوا خون یا سور کا گوشت کیونکہ یہ چیزیں ناپاک ہیں یا وہ گناہ (کا جانور) جو غیر خدا کے نام پر چڑھایا جائے وہ بھی حرام ہے لیکن جو بھوک سے بے بس ہو، نہ قانون شکنی اور گناہ کے ارادہ سے تو بھی ان میں سے کچھ کھالے تو تیرا پروردگار معاف کرنے والا اور رحم والا ہے۔

مشرکین کو سب سے زیادہ تعجب اس پر ہوا کہ جو آپ سے مر جائے اس کو حرام کہتے ہیں اور جس کو خود اپنے ہاتھ سے ماریں اس کو حلال جانتے ہیں حالانکہ دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ اس پر یہ آیت اتری۔

﴿فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَیْهِ اِنْ كُنْتُمْ بِاٰیٰتِهٖ مُؤْمِنِیْنَ ۔ وَمَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَیْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَیْكُمْ﴾ (انعام)

جو جانور خدا کا نام لے کر ذبح کیا گیا ہو وہ کھاؤ اگر تم اس کے احکام پر یقین رکھتے ہو، جو خدا کا نام لے کر ذبح کیا گیا وہ نہ کھاؤ تم کو کیا ہے؟ جو حرام کیا ہے اس کو تو وہ بیان کر چکا۔

اس کے بعد مکہ معظمہ ہی میں سورۂ نحل کی آیت ﴿فَكُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ﴾ نازل ہوئی جس میں اسی حکم سابق کا اعادہ کیا گیا اور یہی چار چیزیں یعنی مردار، خون، سور اور بتوں پر چڑھاوے حرام بتائی گئیں۔ مدینہ طیبہ آ کر پہلے سورۂ بقرہ میں ﴿إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ﴾ تیسری بار یہ محرمات اعادہ بیان کیے گئے۔ عرب میں حلال و حرام کی تمیز کمی وحشت و جہالت کے علاوہ اس کا ایک سبب عام غربت اور افلاس تھی اس لیے مسلمانوں کی مالی حالت جیسے جیسے درست ہوتی جاتی تھی حلال و حرام کی تفریق بڑھتی جاتی تھی لوگ عموماً مردار اسی کو سمجھتے تھے جو بیمار ہو کر اپنی موت سے مر جائے اس لیے اگر اور کسی سبب سے جانور مر جاتا تو اس کو حرام نہ سمجھتے ہجرت کے چار پانچ سال کے بعد سورۂ مائدہ میں مردار (میتہ) کی تفصیل بیان کی گئی یعنی یہ کہ یا وہ گلا گھٹنے سے مرا ہو (منخنقہ) یا گردن ٹوٹنے سے مرا ہو (الموقوذۃ) یا اوپر سے گر کے مرا ہو (المتردیۃ) یا کسی جانور کو سینگ لگ کر مر گیا ہو (النطیحۃ) یا کسی جانور نے اس کو پھاڑا ہو (ما اکل السبع) صرف وہ جانور حلال ہے جس کو تم نے ذبح کیا (ما ذکیتم)۔

سنہ ۶ھ میں جب مسلمانوں کو خیبر کی فتوحات اور جاگیریں ہاتھ آئیں تو جانوروں میں بھی حلال و حرام کی تفریق کی گئی اور اعلان کیا گیا کہ آج سے گدھا اور درندے جانور اور پنجہ دار پرند حرام ہیں۔ ۸ھ میں فتح مکہ کے بعد طے کے قبیلہ نے جو عیسائی تھا اسلام قبول کیا اور شام کے بعض عیسائی مسلمان ہوئے۔ یہ لوگ شکاری کتے پالتے تھے اور ان سے شکار کرتے تھے۔ اسلام لانے پر ان کو معلوم ہوا کہ مردہ جانور حرام ہیں۔ انہوں نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں اپنا سوال عرض کیا اس پر یہ آیت اتری۔

﴿يَسْأَلُونَكَ مَاذَا أُحِلَّ لَهُمْ قُلْ أُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبَاتُ﴾

تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ان کے لیے کیا حلال کیا گیا۔ کہہ دے کہ تمام ستھری چیزیں۔

اس کے بعد یہ تفصیل ہے کہ شکاری جانور اگر سدھے ہوئے ہوں اور خدا کا نام لے کر چھوڑے جائیں تو ان کا شکار کیا ہوا کھانا حلال ہے۔

شراب کی حرمت:

ناقدین کا خیال ہے کہ اسلام کی اشاعت کی بڑی وجہ یہ ہوئی کہ اس کے اکثر احکام (مثلاً تعدد ازدواج وغیرہ) نفس پرستی کے موید تھے اس لیے عرب کو اس کے قبول کرنے میں کوئی انکار نہ تھا بلکہ اسلام وہی کہتا تھا جو وہ خود چاہتے تھے اس بحث کی تحقیق آگے آئے گی یہاں صرف تاریخی حیثیت سے شراب کی حرمت کا واقعہ ذکر کرنا مقصود ہے۔

عرب کو شراب سے بڑھ کر کوئی چیز محبوب نہ تھی تمام ملک اس مرض میں مبتلا تھا عرب کی شاعری کا موضوع اعظم شراب ہے مصلحت کے لحاظ سے اسلام کے تمام احکام بتدریج آئے ہیں اس لیے شراب بھی بتدریج حرام کی گئی۔

مدینہ میں شراب خوری کا رواج کس قدر زیادہ تھا بڑے بڑے شرفاء و صلحاء شراب پیتے تھے عرب میں ایسے بھی نیک لوگ تھے جنہوں نے شراب پینی چھوڑ دی تھی وہ اس کو خلاف اخلاق سمجھتے تھے ابھی تک اسلام نے اس کے متعلق کوئی فیصلہ نہ سنایا تھا۔ لوگوں نے پوچھنا شروع کیا کہ شراب کے متعلق کیا حکم ہے حضرت عمرؓ نے کہا۔

۱ حوالوں کے لیے ان آیتوں کے شان نزول تفسیروں میں دیکھو۔

﴿اللّٰھم بین لنا فی الخمر بیانا شافیا﴾

اے خدا! شراب کے بارے میں ہمارے لیے شافی بیان کر دے۔

اس پر یہ آیت اتری۔

﴿یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ قُلْ فِیْھِمَآ اِثْمٌ کَبِیْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُھُمَآ اَکْبَرُ مِنْ نَّفْعِھِمَا﴾ (بقرہ-۲۶)

لوگ تم سے شراب اور جوئے کی بابت پوچھتے ہیں کہہ دو کہ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور فائدے بھی ہیں لیکن فائدے سے گناہ بڑھ کر ہے۔

اس آیت کے نازل ہونے کے بعد بھی لوگ شراب پیتے رہے۔ ایک دفعہ ایک انصاری نے حضرت علیؓ اور حضرت عبدالرحمنؓ بن عوف کی دعوت کی جس میں شراب بھی تھی، کھانے کے بعد مغرب کا وقت آ گیا اور حضرت علیؓ نے نماز پڑھائی لیکن نشہ کے خمار میں کچھ کا کچھ پڑھ گئے (حضرت عمرؓ نے پھر دعا کی کہ خدایا شراب کے بارے میں صاف صاف بیان کر دے) اس پر یہ آیت اتری۔

﴿لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ وَاَنْتُمْ سُکٰرٰی حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ﴾ (نساء)

نشہ کی حالت میں تم نماز نہ پڑھو یہاں تک کہ جو تم کہو اس کو سمجھنے بھی لگو۔

اس آیت کے نازل ہونے کے بعد جب نماز کا وقت آتا تھا تو آنحضرت ﷺ کے حکم سے ایک منادی اعلان کرتا تھا کہ "کوئی نشہ باز نماز میں شامل نہ ہونے پائے"[1] لیکن چونکہ عام حکم نہ تھا اس لیے نماز کے سوا باقی اوقات میں لوگ بے تکلف پیتے پلاتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے پھر وہی دعا کی۔ اسی زمانہ میں کچھ لوگ شراب پی کر اس قدر بدمست ہوئے کہ آپس میں مار پیٹ تک نوبت[2] پہنچی، اس پر یہ آیت اتری۔[3]

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْہُ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ۔ اِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّوْقِعَ بَیْنَکُمُ الْعَدَاوَۃَ وَالْبَغْضَآءَ فِی الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ وَیَصُدَّکُمْ عَنْ ذِکْرِ اللّٰہِ وَعَنِ الصَّلٰوۃِ فَھَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَھُوْنَ﴾ (مائدہ)

مسلمانو! یہ شراب، جوا، بت اور قمار کے تیر ناپاک ہیں اور شیطان کے کام ہیں تو تم اس سے باز آؤ کہ تم کو فلاح حاصل ہو، شیطان تو صرف یہ چاہتا ہے کہ تم لوگوں میں شراب اور جوئے کے ذریعہ سے دشمنی اور بغض ڈال دے اور تم کو خدا کی یاد سے اور نماز سے روک دے تو کیا اب تم باز آتے ہو؟

ان آیتوں کے نزول کے بعد شراب قطعاً حرام ہو گئی۔ اس وقت آنحضرت ﷺ نے مدینہ کی گلی کوچوں میں منادی کرا دی کہ آج سے شراب حرام ہے لیکن بایں ہمہ شراب کی تجارت اور خرید و فروخت جاری تھی کیونکہ ابھی یہ بھی حرام

---

1. یہ پورا واقعہ ابوداؤد کتاب الاشربہ میں مذکور ہے۔
2. صحیح مسلم جلد دوم ص ۲۴۸ فضائل سعد ابن ابی وقاص۔
3. ابوداؤد میں پوری آیتیں نہیں مذکور ہیں بلکہ چند لفظ نقل کر کے پوری آیت کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔

ہوئی۔ آپ نے مسجد نبوی میں لوگوں کو جمع کر کے اس کا اسی وقت اعلان کیا[1] اس کے بعد ہی سال فتح مکہ کے زمانہ میں آپ نے علی الاعلان ان چیزوں کی تجارت کی ممانعت فرمائی جن کا کھانا یا رکھنا ناجائز ہے۔ آپ نے فرمایا۔

﴿ان اللہ ورسولہ حرم بیع الخمر والمیتۃ والخنزیر والاصنام﴾[2]

خدا اور اس کے رسول نے شراب، مردہ، سور اور بتوں کی خرید و فروخت حرام کر دی۔

غور کرو! شراب کی حرمت کس طرح اعلان عام کے ساتھ عمل میں آئی۔ یہاں بحث ابھی تک یہ نہیں متعین ہوا کہ یہ کس سال کا واقعہ ہے۔ محدثین اور ارباب روایات اس امر میں نہایت مختلف الآراء ہیں[3]

حافظ ابن حجر فتح الباری کتاب التفسیر سورۂ مائدہ باب لیس علی الذین آمنوا میں لکھتے ہیں۔

﴿والذی یظہر ان تحریمہا کان عام الفتح سنۃ ثمان لما روی احمد من طریق عبدالرحمن بن وعلۃ قال سألت ابن عباس عن بیع الخمر فقال کان لرسول اللہ ﷺ صدیق من ثقیف او دوس فلقیہ یوم الفتح براویۃ خمر یہدیہا الیہ فقال یا فلان اما علمت ان اللہ حرمہا﴾ (فتح)

اور ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ شراب کی حرمت فتح مکہ کے زمانہ ۸ھ میں ہوئی اور اس کی دلیل یہ ہے کہ امام احمد نے عبدالرحمن بن وعلہ کی سند سے روایت کی ہے کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے پوچھا کہ شراب کا بیچنا کیسا ہے تو انہوں نے کہا کہ آنحضرت ﷺ کے ایک دوست تھے جو ثقیف یا دوس کے قبیلہ سے تھے وہ آنحضرت ﷺ سے فتح مکہ میں ملے اور ایک مشک شراب تحفہ پیش کی آپ نے فرمایا تم کو معلوم نہیں کہ خدا نے شراب کو حرام کر دیا ہے۔

ہماری رائے میں حافظ ابن حجر کا خیال اور ان کا استدلال صحیح نہیں۔ اس روایت سے صرف اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ ان صاحب کو شراب کی حرمت کا حال فتح مکہ تک نہیں معلوم ہوا تھا[4] یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت تک حرمت نازل بھی نہیں ہوئی تھی۔ بہت سے احکام ہیں جن کی خبر دور کے رہنے والوں کو بہت دیر کے بعد ہوئی۔

علاوہ اس کے خود بعض روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ فتح مکہ سے پہلے شراب کی حرمت نازل ہو چکی تھی یہ کسی

---

1. صحیح بخاری، تفسیر آیۃ ربوا، و صحیح مسلم باب تحریم الخمر میں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ سورۂ بقرہ کے نزول کے بعد جس میں حرمت الربوا کا حکم ہے یہ اعلان فرمایا تھا یہ آیتیں سب سے آخر میں نازل ہوئی ہیں۔ (س)
2. صحیح بخاری و مسلم باب تحریم بیع الخمر والمیتۃ والخنزیر والاصنام۔
3. سیرۃ النبی ﷺ جلد اول میں حرمت شراب کی دو تاریخیں دو مختلف مقامات پر لکھی گئی ہیں، صفحہ ۲۸۸ میں ۳ھ اور صفحہ ۴۲۵ میں ۴ھ لکھا گیا ہے۔ پہلا بیان عام ارباب سیر کا ہے، دوسرا حافظ ابن حجر کی تحقیق ہے، لیکن مصنف سیرۃ النبی ﷺ کی اصلی تحقیق یہاں مذکور ہوئی ہے اور وہ اس باب میں عام محدثین کے ساتھ ہیں جیسا کہ آگے نقل کرتے ہیں۔ (س)
4. مصنف کا یہ قیاس بالکل درست ہے جن صاحب کا یہ واقعہ ہے وہ قبیلہ ثقیف یا دوس سے تھے۔ ثقیف کا قبیلہ ۹ھ میں مسلمان ہوا اور دوس کو بہت پہلے اسلام لا چکے تھے لیکن مدینہ سے بہت دور آباد تھا، اس کے علاوہ ایک اور نکتہ بھی ہے جس کی طرف ہمارے محدثین نے توجہ نہیں کی ہے وہ یہ ہے جیسا کہ ہم متن میں پہلے لکھ آئے ہیں کہ شراب کے پینے کا حکم تو ۴ھ میں حرام ہو چکا تھا لیکن شراب کی تجارت بند نہیں ہوئی تھی

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ کریں)

یہ آیت جب اتری تو آپ ﷺ نے مسجد میں تمام مسلمانوں کو جمع کر کے یہ حکم سنایا۔[1] سنہ ۹ھ میں اہل نجران سے جو معاہدات صلح ہوئے ان میں ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ سود نہ لیں گے۔[2] ذی الحجہ سنہ ۱۰ھ میں حجۃ الوداع کے موقع پر اس آیت کے نزول سے پہلے تمام ملک عرب میں جس قدر سودی معاملات تھے آپ ﷺ نے سب کو کالعدم قرار دیا۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ سود کی حرمت کا حکم اسلام کے سلسلہ احکام کی سب سے آخری کڑی ہے۔[3]

---

1. صحیح بخاری و مسلم باب تحریم تجارۃ الخمر
2. ابو داؤد باب اخذ الجزیہ
3. صحیح بخاری تفسیر آیت ربوا (بقرہ)

دفعتاً پھیل گئی اور شرف ہمرکابی کے لیے تمام عرب امنڈ آیا (سنیچر کے دن) ذوقعدہ کی ۲۶ تاریخ کو آپ ﷺ نے غسل فرمایا[1] اور چادر اور تہہ باندھی نماز ظہر کے بعد مدینہ سے باہر نکلے اور تمام ازواج مطہرات کو ساتھ چلنے کا حکم دیا۔ مدینہ سے چھ میل کے فاصلہ پر ذوالحلیفہ ایک مقام ہے جو مدینہ کی میقات ہے۔ یہاں پہنچ کر شب بھر اقامت فرمائی اور دوسرے دن دوبارہ غسل فرمایا[2] حضرت عائشہؓ نے اپنے ہاتھ سے آپ کے جسم مبارک میں عطر ملا[3] اس کے بعد آپ ﷺ نے دو رکعت نماز ادا کی پھر قصواء پر سوار ہو کر احرام باندھا اور بلند آواز سے یہ الفاظ کہے۔

﴿لبیک اللھم لبیک لا شریک لک لبیک ان الحمد والنعمة لک والملک لا شریک لک﴾

اے خدا ہم تیرے سامنے حاضر ہیں اے خدا تیرا کوئی شریک نہیں ہم حاضر ہیں تمام تعریف اور نعمت سب تیری ہی ہے اور سلطنت میں تیرا کوئی شریک نہیں۔

حضرت جابرؓ جو اس حدیث کے راوی ہیں ان کا بیان ہے کہ میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو آگے پیچھے دائیں بائیں جہاں تک نظر کام کرتی تھی آدمیوں کا جنگل نظر آتا تھا (کم و بیش ایک لاکھ مسلمان شریک حج تھے)۔ آنحضرت ﷺ جب لبیک فرماتے تھے تو ہر طرف سے اسی صدائے غلغلہ انگیز کی آواز بازگشت آتی تھی اور تمام دشت و جبل گونج اٹھتے تھے۔

فتح مکہ میں آپ ﷺ نے جن منازل میں نماز ادا کی تھی وہاں برکت کے خیال سے لوگوں نے مسجدیں بنالی تھیں آنحضرت ﷺ ان مساجد میں نماز ادا کرتے جاتے تھے۔ سرف پہنچ کر غسل فرمایا دوسرے دن (اتوار کے روز ذوالحجہ کی چار تاریخ کو صبح کے وقت) مکہ معظمہ میں داخل ہوئے۔ مدینہ سے مکہ تک کا یہ سفر نو دن میں طے ہوا۔ خاندان ہاشم کے لڑکوں نے آمد آمد کی خبر سنی تو خوشی سے باہر نکل آئے آپ ﷺ نے فرط محبت سے اونٹ پر کسی کو آگے اور کسی کو پیچھے بٹھا لیا[4] کعبہ پر نظر پڑی تو فرمایا کہ "اے خدا! اس گھر کو اور زیادہ عزت اور شرف دے" پھر کعبہ کا طواف کیا طواف سے فارغ ہو کر مقام ابراہیم میں دوگانہ ادا کیا اور یہ آیت پڑھی۔

﴿وَاتَّخِذُوا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى﴾ (بقرہ)

اور مقام ابراہیم کو سجدہ گاہ بناؤ۔

صفا پر پہنچے تو یہ آیت پڑھی۔

(پچھلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ)

کے گئے گھوڑے اور ان کے سینہ پر محبت سے ہاتھ رکھ کر کہا بھتیجے! پوچھو کیا پوچھتے ہو؟ پھر نہایت تفصیل سے حج نبوی کے تمام حالات بیان کئے (اوقات کی تعیین بھی بخاری و مسلم میں حضرت ابن عباسؓ، انسؓ اور حضرت عائشہؓ کی روایتوں میں ہے اور امام نسائی نے کتاب المناسک میں آنحضرت ﷺ کے اوقات و تاریخ کے لیے خاص باب باندھا ہے۔ باب الوقت الذی خرج فیہ النبی ﷺ" میں"

[1] صحیح بخاری و مسلم۔

[2] غسل کا ذکر طبقات ابن سعد ذکر حجۃ الوداع میں ہے (ص ۱۲۴) (کم و بیش ایک لاکھ مسلمان شریک حج تھے)

[3] (نسائی باب استعمال الحج)

﴿إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللَّهِ﴾

صفا اور مروہ خدا کی نشانیاں ہیں۔

(یہاں سے) کعبہ نظر آتا تو یہ الفاظ فرماتے۔

﴿لا إله إلا الله وحده لا شريك له له الملك وله الحمد يحيي ويميت وهو على كل شيء قدير لا إله إلا الله وحده أنجز وعده ونصر عبده وهزم الأحزاب وحده﴾ (ابوداؤد)

خدا کے سوا کوئی خدا نہیں اس کا کوئی شریک نہیں اس کے لیے سلطنت اور ملک اور حمد ہے وہ مارتا اور جلاتا ہے اور وہ تمام چیزوں پر قادر ہے کوئی خدا نہیں مگر وہ اکیلا خدا اس نے اپنا وعدہ پورا کیا اور اپنے بندہ کی مدد کی اور اکیلے تمام قبائل کو شکست دی

صفا سے اتر کر آپ مروہ پر تشریف لائے یہاں بھی دعا و تہلیل کی۔ اہل عرب ایام حج میں عمرہ ناجائز سمجھتے تھے صفا و مروہ کے طواف و سعی سے فارغ ہو کر آپ نے ان لوگوں کو جن کے ساتھ قربانی کے جانور نہیں تھے عمرہ تمام کر کے احرام اتارنے کا حکم دیا۔ بعض صحابہ نے گذشتہ رسوم مالوفہ کی بنا پر اس حکم کی بجا آوری میں معذرت کی آنحضرت ﷺ نے فرمایا "اگر میرے ساتھ قربانی کے جانور نہ ہوتے تو میں بھی ایسا ہی کرتا۔" حضرت علیؓ کچھ پہلے یمن بھیجے گئے تھے اسی وقت وہ یمنی حاجیوں کا قافلہ لے کر مکہ میں وارد ہوئے تھے چونکہ ان کے ساتھ قربانی کے جانور تھے اس لیے انہوں نے احرام نہیں اتارا جمعرات کے روز آٹھویں تاریخ کو آپ نے تمام مسلمانوں کے ساتھ منیٰ میں قیام فرمایا دوسرے دن نویں ذی الحجہ کو جمعہ کے روز صبح کی نماز پڑھ کر منیٰ سے روانہ ہوئے۔

قریش کا معمول تھا کہ جب مکہ سے حج کے لیے نکلتے تھے تو عرفات کے بجائے مزدلفہ میں قیام کرتے تھے جو حرم کے حدود میں تھا ان کا خیال تھا کہ قریش نے اگر حرم کے سوا کسی اور مقام میں مناسک حج ادا کیے تو ان کی شان یکتائی میں فرق آ جائے گا لیکن اسلام کو جو مساوات عام قائم کرنی تھی اس کے لحاظ سے یہ تخصیص روا نہیں رکھی جا سکتی تھی۔ اس لیے (خدا نے حکم دیا) ﴿ثم أفيضوا من حيث أفاض الناس﴾ آپ ﷺ (بھی عام مسلمانوں کے ساتھ) عرفات میں آئے[1] اور یہ اعلان کرا دیا[2]

﴿قفوا على مشاعركم فإنكم على إرث من إرث أبيكم إبراهيم﴾

اپنے مقدس مقامات میں ٹھہرو کہ تم اپنے باپ ابراہیمؑ کی وراثت ہو۔

یعنی عرفہ میں حاجیوں کا قیام حضرت ابراہیمؑ کی یادگار ہے اور انہی نے اس مقام کو اس غرض خاص کے لیے متعین کیا ہے۔ عرفات میں ایک مقام نمرہ ہے وہاں آپ ﷺ نے ایک کمل کے خیمہ میں قیام فرمایا دوپہر ڈھل گئی تو ناقہ پر (جس کا نام قصواء تھا) سوار ہو کر میدان میں آئے اور ناقہ کے اوپر ہی سے خطبہ پڑھا۔

(آج پہلا دن تھا کہ اسلام اپنے جاہ و جلال کے ساتھ نمودار ہوا اور جاہلیت کی تمام بے ہودہ مراسم کو مٹا دیا اس

---

۱ صحیح بخاری باب الوقوف بعرفہ۔

۲ ابوداؤد باب موضع الوقوف بعرفہ۔

آج سلامتی کا بادشاہ تمام دنیا کو صلح کا پیغام سناتا ہے۔

﴿ان دماءکم واموالکم علیکم حرام کحرمۃ یومکم ھذا فی شھرکم ھذا فی بلدکم ھذا الی یوم تلقون ربکم﴾ [1]

تمہارا خون اور تمہارا مال تا قیامت اسی طرح حرام ہے جس طرح یہ دن اس مہینہ میں اور اس شہر میں حرام ہے۔

اسلام سے پہلے جتنے مذاہب دنیا میں پیدا ہوئے تھے ان کی بنیاد خود صاحب شریعت کے تحریری اصول پر نہ تھی ان کو خدا کی طرف سے جو باتیں ملی تھیں بندوں کی ہوس پرستیوں نے ان کی حقیقت گم کر دی تھی ابدی مذہب کا پیغمبر اپنی زندگی کے بعد ہدایات ربانی کا مجموعہ خود اپنے ہاتھ سے اپنی امت کو سپرد کرتا ہے اور تاکید کرتا ہے۔

﴿وانی قد ترکت فیکم ما لن تضلوا بعدہ ان اعتصمتم بہ کتاب اللہ﴾ (مسلم)

میں تم میں ایک چیز چھوڑ جاتا ہوں اگر تم نے اس کو مضبوط پکڑ لیا تو گمراہ نہ ہو گے وہ چیز کیا ہے؟ کتاب اللہ

اس کے بعد آپ نے چند اصولی احکام کا اعلان فرمایا۔ [2]

﴿ان اللہ عز وجل قد اعطی کل ذی حق حقہ فلا وصیۃ لوارث﴾

خدا نے ہر حقدار کو (از روئے وراثت) اس کا حق دے دیا اب کسی کو وارث کے حق میں وصیت جائز نہیں۔

﴿الولد للفراش وللعاھر الحجر وحسابھم علی اللہ﴾

لڑکا اس کا ہے جس کے بستر پر پیدا ہوا زناکار کے لیے پتھر ہے اور ان کا حساب خدا کے ذمہ ہے۔

﴿من ادعی الی غیر ابیہ وانتمی الی غیر موالیہ فعلیہ لعنۃ اللہ﴾

جو لڑکا اپنے باپ کے علاوہ کسی اور کے نسب سے ہونے کا دعویٰ کرے اور جو غلام اپنے مولیٰ کے سوا کسی اور طرف اپنی نسبت کرے اس پر خدا کی لعنت ہے۔

﴿الا لا یحل لامراۃ ان تعطی من مال زوجھا شیئا الا باذنہ الدین مقضی والعاریۃ مؤداۃ والمنحۃ مردودۃ والزعیم غارم﴾

ہاں عورت کو اپنے شوہر کے مال میں سے اس کی اجازت کے بغیر کچھ دینا جائز نہیں، قرض ادا کیا جائے، عاریت واپس کی جائے، عطیہ لوٹا دینا چاہئے، ضامن تاوان کا ذمہ دار ہے۔

پھر فرما کر آپ ﷺ نے مجمع عام کی طرف خطاب کیا۔

﴿انتم مسئولون عنی فما انتم قائلون﴾ (صحیح مسلم باب حجۃ النبی)

تم سے خدا کے ہاں میری نسبت پوچھا جائے گا تو تم کیا جواب دو گے؟

صحابہؓ نے عرض کیا "ہم کہیں گے کہ آپ نے خدا کا پیغام پہنچا دیا اور اپنا فرض ادا کر دیا"۔ آپ نے آسمان کی

---

[1] (صحیح بخاری و مسلم و ابوداؤد وغیرہ) "منیٰ"

[2] (سنن ابن ماجہ باب الوصایا و مسند ابو امامہ، ترمذی وغیرہ، یہ خطبہ منیٰ کا ہے لیکن محمد بن اسحاق نے بھی اس کی روایت کی ہے کہ یہ عرفہ کے خطبہ میں آپ ﷺ نے فرمائے)

تھے۔ آج وہ دن آیا کہ اس انقلاب عظیم کے لئے اشہر حرم کی تعیین کر دی جائے۔ آپ نے فرمایا:

﴿السنة اثنا عشر شهرا منها اربعة حرم ثلاثة متواليات ذو القعدة و ذو الحجة و المحرم و رجب شهر مضر الذي بين جمادى و شعبان﴾ (صحیح بخاری)

سال کے بارہ مہینے ہیں جن میں چار مہینے قابل احترام ہیں۔ تین تو متواتر مہینے ہیں ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور محرم، اور چوتھا رجب مضر کا مہینہ جو جمادی الثانی اور شعبان کے بیچ میں ہے۔

دنیا میں عدل و انصاف اور جور و ظلم کا محور صرف تین چیزیں ہیں: جان، مال اور آبرو۔ آنحضرت ﷺ کل کے خطبہ میں گو ان کے متعلق ارشاد فرما چکے تھے لیکن عرب کے صدیوں کے زنگ دور کرنے کے لیے مکرر تاکید کی ضرورت تھی۔ آج آپ نے اس کے لیے عجیب بلیغ انداز اختیار فرمایا۔ لوگوں سے مخاطب ہو کر پوچھا: "کچھ معلوم ہے آج کون سا دن ہے؟" لوگوں نے عرض کی کہ خدا اور اس کے رسول کو زیادہ علم ہے۔ آپ ﷺ دیر تک چپ رہے، لوگ سمجھے کہ شاید آپ ﷺ اس دن کا کوئی اور نام رکھیں گے۔ دیر تک سکوت کے بعد فرمایا: "کیا آج قربانی کا دن نہیں ہے؟" لوگوں نے کہا ہاں بے شک ہے۔ پھر ارشاد ہوا: "یہ کون سا مہینہ ہے؟" لوگوں نے پھر اسی طریقہ سے جواب دیا۔ آپ ﷺ نے پھر دیر تک سکوت کیا اور فرمایا: "کیا یہ ذوالحجہ کا مہینہ نہیں ہے؟" لوگوں نے کہا: "ہاں بے شک ہے۔" پھر پوچھا: "یہ کون سا شہر ہے؟" لوگوں نے بدستور جواب دیا۔ آپ ﷺ نے اسی طرح دیر تک سکوت کے بعد فرمایا: "کیا یہ بلدۃ الحرام نہیں ہے؟" لوگوں نے عرض کی "ہاں بے شک ہے۔" جب سامعین کے دل میں یہ خیال پوری طرح جاگزیں ہو چکا کہ آج کا دن بھی، مہینہ بھی اور خود شہر بھی محترم ہے، یعنی اس دن، اس مہینہ، اس مقام میں جنگ اور خونریزی جائز نہیں، تب فرمایا:

﴿فان دماءكم و اموالكم و اعراضكم عليكم حرام كحرمة يومكم هذا في شهركم هذا في بلدكم هذا﴾ (صحیح بخاری)

تو تمہارا خون، تمہارا مال اور تمہاری آبرو تا قیامت اسی طرح محترم ہے جس طرح یہ دن اس مہینہ میں اور اس شہر میں محترم ہے۔

قوموں کی بربادی ہمیشہ آپس کے جنگ و جدال اور باہمی خونریزیوں کا نتیجہ رہی ہے۔ وہ پیغمبر جو ایک لازوال قومیت کا بانی بن کر آیا تھا اس نے اپنے پیروؤں سے آخری عہد لیا۔

﴿الا لا ترجعوا بعدي ضلالا يضرب بعضكم رقاب بعض و ستلقون ربكم فيسئلكم عن اعمالكم﴾ (صحیح بخاری)

ہاں! میرے بعد گمراہ نہ ہو جانا کہ خود ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو، تم کو خدا کے سامنے حاضر ہونا پڑے گا اور وہ تم سے تمہارے اعمال کی باز پرس کرے گا۔

ظلم و ستم کا ایک عالمگیر پہلو یہ تھا کہ اگر خاندان میں کسی ایک شخص سے کوئی گناہ سرزد ہوتا تو اس خاندان کا ہر شخص اس جرم کا قانونی مجرم سمجھا جاتا تھا اور اکثر اصلی مجرم کے روپوش یا فرار ہو جانے کی صورت میں بادشاہ کا جس پر قابو چلتا تھا اس کو سزا دیتا تھا۔ باپ کے جرم میں بیٹے کو سولی دی جاتی تھی اور بیٹے کے جرم کا [illegible] باپ کو

جاتا تھا، یہ سخت ظالمانہ قانون تھا جو مدت سے دنیا میں حکمران تھا، اگرچہ قرآن مجید نے لا تزر وازرة وزر اخرى کہہ کر قانون کی رو سے اس ظلم کی ہمیشہ کے لیے بیخ کنی کر دی تھی لیکن اس وقت جب دنیا کا آخری پیغمبر ایک نیا نظام سیاست ترتیب دے رہا تھا، اس اصول کو فراموش نہیں کر سکتا تھا، آپ نے فرمایا۔

﴿ الا لا يجني جان الا على نفسه، الا لا يجني جان على ولده ولا مولود على والده ﴾ (ابن ماجہ و ترمذی)

ہاں! مجرم اپنے جرم کا آپ ذمہ دار ہے، اب باپ کے جرم کا ذمہ دار بیٹا نہیں اور بیٹے کے جرم کا جواب دہ باپ نہیں۔

عرب کی بدامنی اور نظام ملک کی بے ترتیبی کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ ہر شخص اپنی خداوندی کا آپ مدعی تھا، اور دوسرے کی ماتحتی، اور فرمانبرداری کو اپنے لیے ننگ و عار جانتا تھا، ارشاد ہوا

﴿ ان امر عليكم عبد مجدع اسود يقودكم بكتاب الله فاسمعوا له واطيعوا ﴾ (صحیح مسلم)

اگر کوئی حبشی بریدہ غلام بھی تمہارا امیر ہو اور وہ تم کو خدا کی کتاب کے مطابق لے چلے تو اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کرو۔

ریگستان عرب کا ذرہ ذرہ اس وقت اسلام کے نور سے منور ہو چکا تھا اور خانہ کعبہ ہمیشہ کے لیے ملت ابراہیمی کا مرکز بن چکا تھا، اور فتنہ پرداز شیطان کی تمنائیں پامال ہو چکی تھیں اس بنا پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

﴿ الا ان الشيطان قد ايس ان يعبد في بلدكم هذا ابدا ولكن ستكون له طاعة فيما تحتقرون من اعمالكم فيرضى به ﴾ (ابن ماجہ، ترمذی)

ہاں شیطان اس بات سے مایوس ہو چکا ہے کہ اب تمہارے اس شہر میں اس کی پرستش قیامت تک نہ کی جائے گی لیکن البتہ چھوٹی چھوٹی باتوں میں اس کی پیروی کرو گے اور وہ اس پر خوش ہوگا۔

سب سے آخر میں آپ ﷺ نے اسلام کے فرائض اولین یاد دلائے۔

﴿ اعبدوا ربكم وصلوا خمسكم وصوموا شهركم واطيعوا اذا امركم تدخلوا جنة ربكم ﴾ (مسند احمد ج ۵ ص ۲۵۱، مستدرک حاکم ج ۱ ص ۳۸۹)

اپنے پروردگار کو پوجو، پنجگانہ نماز پڑھو، مہینہ بھر کے روزے رکھو، اور میرے احکام کی اطاعت کرو، خدا کی جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔

یہ فرما کر آپ ﷺ نے مجمع کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا۔

﴿ الا هل بلغت ﴾

کیوں میں نے پیغام خدا پہنچا دیا؟

سب بول اٹھے ہاں! فرمایا:

﴿ اللهم اشهد ﴾

اے خدا تو گواہ رہنا۔

پھر لوگوں کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا:

﴿فلیبلغ الشاھد الغائب﴾

جو لوگ اس وقت موجود ہیں وہ ان کو بتا دیں جو موجود نہیں۔

(خطبہ [1] کے اختتام پر آپ ﷺ نے تمام مسلمانوں کو الوداع کہی)

اس کے بعد آپ قربان گاہ کی طرف تشریف لے گئے اور فرمایا کہ "قربانی کے لیے منیٰ کی کچھ تخصیص نہیں ہے بلکہ منیٰ اور مکہ کی ایک ایک گلی میں قربانی ہو سکتی ہے"۔ آپ ﷺ کے ساتھ قربانی کے سو اونٹ تھے۔ کچھ تو آپ ﷺ نے خود اپنے ہاتھ سے ذبح کیے اور باقی حضرت علیؓ کے سپرد کر دیئے کہ وہ ذبح کریں اور حکم دیا کہ گوشت پوست جو کچھ ہو سب خیرات کر دیا جائے یہاں تک کہ قصاب کی مزدوری بھی اس سے ادا نہ کی جائے الگ سے دی جائے۔

قربانی سے فارغ ہو کر آپ ﷺ نے معمرؓ بن عبداللہ کو بلایا اور سر کے بال منڈوائے اور فرط محبت سے کچھ بال خود اپنے دست مبارک سے ابو طلحہؓ انصاری اور ان کی بیوی ام سلیم اور بعض ان لوگوں کو جو پاس [3] بیٹھے تھے عنایت فرمائے اور باقی ابو طلحہؓ سے فرمایا اپنے ہاتھ سے تمام مسلمانوں میں ایک ایک دو دو کر کے تقسیم کر دیں۔ اس کے بعد آپ مکہ معظمہ تشریف لے گئے۔ خانہ کعبہ کا طواف کیا۔ اس سے فارغ ہو کر چاہ زمزم کے پاس آئے۔

چاہ زمزم سے حاجیوں کو پانی پلانے کی خدمت خاندان عبدالمطلب سے متعلق تھی۔ چنانچہ اس وقت اسی خاندان کے لوگ پانی نکال کر لوگوں کو پلا رہے تھے۔ آپ نے فرمایا "بنی عبدالمطلب! اگر مجھ کو یہ خوف نہ ہوتا کہ مجھ کو ایسا کرتے دیکھ کر اور لوگ بھی تمہارے ہاتھ سے ڈول چھین کر خود اپنے ہاتھ سے پانی نکال کر پینے لگیں گے تو میں خود اپنے ہاتھ سے پانی نکال کر پیتا"۔

حضرت عباسؓ نے ڈول میں پانی نکال کر پیش کیا۔ آپ ﷺ نے قبلہ رخ ہو کر کھڑے کھڑے پانی پیا۔ پھر یہاں سے منیٰ واپس تشریف لے گئے اور وہیں نماز ظہر ادا فرمائی۔ [4]

بقیہ ایام تشریق یعنی ۱۳ ذی الحجہ تک آپ ﷺ نے مستقل اقامت منیٰ ہی میں فرمائی۔ ہر روز زوال کے بعد رمی جمار کی غرض سے تشریف لے جاتے اور پھر واپس آ جاتے۔ ابوداؤد (باب الخطبۃ بمنیٰ) میں ایک حدیث ہے جس سے

---

۱ معلوم ہوتا ہے کہ یہ خطبہ بہت بڑا تھا۔ صحیح مسلم (باب الحج) میں روایت ہے کہ اس خطبہ میں آپ نے بہت سی باتیں فرمائیں۔ بخاری (حجۃ الوداع) میں ہے کہ آپ نے اس میں دجال کا بھی ذکر فرمایا تھا لیکن یہ تعیین نہیں کہ کس دن کے خطبہ میں یہ فرمایا۔

۲ صحیح بخاری باب الخطبۃ ایام منیٰ۔

۳ صحیح مسلم و ابوداؤد

۴ حضرت ابن عمرؓ کی حدیث بخاری و مسلم دونوں میں ہے کہ آپ نے ظہر کی نماز منیٰ میں پڑھی لیکن حضرت جابرؓ کی جو طویل حدیث صحیح مسلم میں ہے اس میں تصریح ہے کہ آپ نے مکہ میں نماز ظہر پڑھی۔ حضرت عائشہؓ کی ایک روایت سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے اس بنا پر محدثین میں ان دونوں قولوں کی باہمی تطبیق اور وجوہ ترجیح میں اختلاف ہے۔ علامہ ابن حزم نے دوسری روایت کو ترجیح دی ہے، اور علامہ ابن قیم نے زاد المعاد میں پہلے قول کو ترجیح ثابت کیا ہے۔ فریقین کے دلائل کے بعد ہم نے ابن قیم کا فیصلہ قبول کیا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ۱۲ ذی الحجہ کو بھی منیٰ میں ایک خطبہ دیا تھا، جس کے الفاظ مختصراً وہی ہیں جو پہلے خطبوں میں گزر چکے ہیں۔ ۱۳ ذی الحجہ کو سہ شنبہ کے دن زوال کے بعد آپ نے یہاں سے نکل کر وادی محصب[1] میں قیام کیا اور شب کو اسی مقام پر آرام فرمایا، پچھلے پہر اٹھ کر مکہ معظمہ تشریف لے گئے اور خانہ کعبہ کا آخری طواف کر کے وہیں صبح کی نماز ادا کی، اس کے بعد قافلہ اسی وقت اپنے اپنے مقام کو روانہ ہو گیا اور آپ نے مہاجرین و انصار کے ساتھ مدینہ کی طرف مراجعت فرمائی، راہ میں ایک مقام خم پڑا جو جحفہ سے تین میل پر ہے، یہاں ایک تالاب ہے عربی میں تالاب کو غدیر کہتے ہیں اور اس لیے اس مقام کا نام عام روایتوں میں غدیر خم آتا ہے، آپ نے یہاں تمام صحابہ کو جمع کر کے ایک مختصر سا خطبہ دیا۔

﴿اما بعد الا ایها الناس فانما انا بشر یوشك ان یاتی رسول ربی فاجیب و انا تارك فیكم الثقلین اولهما كتاب الله فیه الهدی والنور فخذوا كتاب الله واستمسكوا به و اهل بیتی اذكركم الله فی اهل بیتی﴾

حمد و ثنا کے بعد! اے لوگو! میں بھی بشر ہوں ممکن ہے کہ خدا کا فرشتہ جلد آ جائے اور مجھے قبول کرنا پڑے (یعنی موت) میں تمہارے درمیان دو بھاری چیزیں چھوڑتا ہوں، ایک خدا کی کتاب جس کے اندر ہدایت اور روشنی ہے، خدا کی کتاب کو مضبوطی سے پکڑو اور دوسری چیز میرے اہل بیت ہیں، میں اپنے اہل بیت کے بارے میں تمہیں خدا کو یاد دلاتا ہوں۔

آخری جملہ کو آپ نے تین دفعہ مکرر فرمایا، یہ صحیح مسلم (مناقب حضرت علیؓ) کی روایت ہے۔ نسائی، مسند امام احمد، ترمذی، طبرانی، طبری، حاکم وغیرہ میں کچھ اور فقرے بھی ہیں جن میں حضرت علیؓ کی منقبت ظاہر کی گئی ہے، ان روایتوں میں ایک فقرہ اکثر مشترک ہے۔

﴿من كنت مولاه فعلی مولاه، اللهم وال من والاه وعاد من عاداه﴾

جس کو میں محبوب ہوں علیؓ بھی اس کو محبوب ہونا چاہیے، الٰہی جو علیؓ سے محبت رکھے اس سے تو بھی محبت رکھ اور جو علیؓ سے عداوت رکھے اس سے تو بھی عداوت رکھ۔

احادیث میں خاص یہ تصریح نہیں کہ ان الفاظ کے کہنے کی ضرورت کیا پیش آئی۔ بخاری میں ہے کہ اسی زمانہ میں حضرت علیؓ یمن بھیجے گئے تھے جہاں سے واپس آ کر وہ حج میں شامل ہوئے تھے۔ یمن میں انہوں نے اپنے اختیار سے ایک ایسا واقعہ کیا تھا جس کو ان کے بعض ہمراہیوں نے پسند نہیں کیا، ان میں سے ایک صاحب نے آ کر رسول اللہ ﷺ سے شکایت کی، آپ ﷺ نے فرمایا: "علی کو اس سے زیادہ کا حق تھا"[2] عجب نہیں کہ اسی قسم کے شکوک رفع کرنے کے لیے اس موقع پر آپ نے یہ الفاظ فرمائے۔

مدینہ کے قریب پہنچ کر ذوالحلیفہ میں شب بسر کی، صبح کے وقت ایک طرف سے آفتاب نکلا اور دوسری طرف کوکب نبوی مدینہ منورہ میں داخل ہوا، سواد مدینہ پر نظر پڑی تو یہ الفاظ فرمائے۔

﴿الله اكبر لا اله الا الله وحده لا شريك له له الملك وله الحمد وهو على كل شیء قدير، آئبون تائبون عابدون ساجدون لربنا حامدون، صدق الله وعده و نصر عبده وهزم

---

1. اسی کا دوسرا نام ابطح اور خیف بنی کنانہ ہے۔
2. صحیح بخاری بعث علی الی الیمن و ترمذی مناقب حضرت علیؓ۔

وفات ربیع الاول ۱۱ھ مطابق مئی ۶۳۲ء

﴿إِنَّكَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُم مَّيِّتُونَ﴾ (زمر)

روح قدسی کو عالم جسمانی میں اسی وقت تک رہنے کی ضرورت تھی کہ تکمیل شریعت اور تزکیہ نفوس کا عظیم الشان کام درجہ کمال تک پہنچ جائے۔ حجۃ الوداع میں یہ فرض اہم ادا ہو چکا، توحید کامل اور مکارم اخلاق کے اصول عملاً قائم کر کے عرفات کے مجمع عام میں اعلان کر دیا گیا کہ:

﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي﴾
آج کے دن میں نے تمہارے لیے دین کو کامل کر دیا اور اپنی نعمتیں پوری کر دیں۔

سورہ نصر کا نزول خاص میں خاص صحابہؓ کو آنحضرت ﷺ کے قرب وفات کی اطلاع دے چکا تھا[1] اور آپ ﷺ حکم ربانی ﴿فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ﴾ (نصر) کے مطابق زیادہ تر اوقات تسبیح و تہلیل میں بسر فرماتے تھے۔[2] آپ معمولاً ہر سال رمضان مبارک میں دس دن اعتکاف میں بیٹھتے تھے لیکن رمضان ۱۰ھ میں بیس دن اعتکاف میں بیٹھے۔ سال میں ایک دفعہ ماہ رمضان میں آپ ﷺ پورا قرآن حضرت جبریلؑ کو سناتے تھے لیکن وفات کے سال دو دفعہ یہ شرف حاصل ہوا۔[3] حجۃ الوداع کے موقع پر مناسک حج کی تعلیم کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ نے یہ اعلان بھی فرمایا کہ "مجھے امید نہیں کہ آئندہ سال تم سے مل سکوں"۔ بعض روایتوں میں یہ لفظ اس طرح وارد ہوئے ہیں "شاید میں اس کے بعد حج نہ کر سکوں"۔[4] غدیر خم کے خطبہ میں بھی اسی قسم کے الفاظ ادا ہوئے۔

غزوۂ احد کے بیان میں گزر چکا ہے کہ شہدائے احد کے جنازہ کی نماز نہیں پڑھی گئی تھی۔ تمام غزوات میں صرف غزوۂ احد ہی ایک ایسا غزوہ ہے جس میں مسلمانوں نے سب سے زیادہ بے کسی کے ساتھ جان دی۔ اس لیے ان کی یاد آپ کے دل میں اس وقت بھی موجود تھی۔

حجۃ الوداع کے موقع پر تمام مسلمانوں کو اپنے فیض دیدار سے مشرف فرمایا اور ان کو حسرت کے ساتھ الوداع کیا۔ شہدائے احد جو بل (دفنم) احباب کے عزم و جان نواز سے فیض یاب تھے، آٹھ برس کے بعد آخری دفعہ آپ نے ان کو بھی اپنی زیارت سے مشرف کرنا ضروری سمجھا، چنانچہ اسی زمانہ میں ان کی قبر پر تشریف لے گئے اور ان کے لیے دعائے خیر فرمائی اور اس رقت انگیز طریقہ سے ان کو الوداع کیا کہ جس طرح ایک مرنے والا اپنے زندہ عزیزوں کو وداع کرتا ہے۔[5] اس کے بعد ایک خطبہ دیا جس میں فرمایا "میں تم سے پہلے حوض پر جا رہا ہوں اس کی وسعت اتنی ہے جتنی ایلہ سے جحفہ تک

---

1. صحیح بخاری تفسیر اذا جاء۔
2. اس قسم کی روایتیں طبرانی، ابن جریر، ابن مردویہ میں ہیں لیکن مختصراً صحیح بخاری تفسیر اذا جاء میں بھی مذکور ہیں۔
3. صحیح بخاری باب الاعتکاف و باب کان یعرض القرآن۔
4. صحیح مسلم و ابوداؤد و نسائی کتاب الحج۔
5. صحیح بخاری کتاب الجنائز و صحیح مسلم باب اثبات الحوض

مجھ کو تمام دنیا کے خزانوں کی کنجی دی گئی ہے مجھے خوف نہیں ہے کہ میرے بعد تم شرک کرو گے لیکن اس سے ڈرتا ہوں کہ دنیا میں نہ مبتلا ہو جاؤ اور اس کے لیے آپس میں کشت و خون نہ کرو تو پھر اسی طرح ہلاک ہو جاؤ جس طرح تم سے پہلی قومیں ہلاک ہو گئیں"۔ راوی کا بیان ہے کہ یہ آخری دفعہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو خطبہ دیتے ہوئے سنا۔

غزوات میں گزر چکا ہے کہ حضرت زید ؓ بن حارثہ کو حدود شام کے عربوں نے شہید کر ڈالا تھا آنحضرت ﷺ ان سے اس کا قصاص لینا چاہتے تھے آغاز علالت سے ایک روز پہلے آپ ﷺ نے اسامہ ؓ بن زید کو مامور کیا کہ وہ فوج لے کر جائیں اور ان شریروں سے اپنے باپ کا انتقام لیں۔ [1] (۱۸ یا ۱۹) صفر ۱۱ھ [2] میں آدھی رات کو آپ ﷺ جنت

---

[1] واقدی اور ابن اسحاق کا بیان ہے کہ اس غزوہ میں آنحضرت ﷺ نے حضرت ابوبکر ؓ و عمر ؓ کو بھی جانے کا حکم دیا تھا لیکن یہ روایتیں بے سند ہیں اس لیے علامہ ابن تیمیہ نے اس سے شدت کے ساتھ انکار کیا ہے حضرت عمر ؓ کے متعلق تو نہیں کہا جا سکتا لیکن حضرت ابوبکر ؓ کو آپ نے ایام علالت میں امام نماز مقرر فرمایا اور یہ صحیح روایت سے ثابت ہے اس بنا پر اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ پہلے ابوبکر ؓ کو جانے کا حکم ہوا تھا تو معلوم ہوتا ہے کہ بعد کو آپ نے ان کو مستثنیٰ کر لیا۔

[2] (آنحضرت ﷺ کی ابتدائے مرض کے دن، مدت علالت اور تاریخ وفات کی تعیین میں روایات مختلف ہیں۔ امر مختلف فیہ سے پہلے ان امور کو متعین کر دینا چاہیے جن پر تمام روایات کا اتفاق ہے اور جن پر گویا محدثین اور ارباب سیر کا اجماع عام ہے اور وہ یہ ہیں (۱) سال وفات ۱۱ھ ہے (۲) مہینہ ربیع الاول کا تھا (۳) یکم سے ۱۲ تک کوئی تاریخ تھی (۴) دو شنبہ کا دن تھا (صحیح بخاری ذکر وفات کتاب الجنائز) زیادہ تر روایات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ کل ۱۳ دن بیمار رہے اس بنا پر اگر یہ تحقیقی طور سے متعین ہو جائے کہ آپ نے کس تاریخ کو وفات فرمائی تو تاریخ آغاز مرض بھی متعین کی جا سکتی ہے۔ حضرت عائشہ ؓ کے گھر بروایت صحیح ۸ روز (ایک دوشنبہ سے دوسرے دوشنبہ تک) بیمار رہے اور پھر وفات فرمائی اس لیے ایام علالت کی مدت آٹھ روز تو یقینی ہے عام روایات کے رو سے پانچ دن اور جائیں اور یہ قرآن سے بھی معلوم ہوتا ہے اس لیے ۱۳ دن مدت علالت صحیح ہے۔ علالت کے ۵ دن آپ نے دوسری ازواج کے حجروں میں بسر فرمائے۔ اس حساب سے علالت کا آغاز چہار شنبہ سے ہوتا ہے

تاریخ وفات کی تعیین میں راویوں کا اختلاف ہے کتب حدیث کا تمام تر دفتر چھان ڈالنے کے بعد بھی تاریخ وفات کی تصریح کوئی روایت احادیث میں نہیں مل سکی ارباب سیر کے ہاں تین روایتیں ہیں یکم ربیع الاول، دوم ربیع الاول اور ۱۲ ربیع الاول۔ ان تینوں روایتوں میں باہم ترجیح دینے کے لیے اصول روایت و درایت دونوں سے کام لینا ہے اور روایت دوم ربیع الاول کی روایت ہشام بن محمد بن سائب کلبی اور ابو مخنف کے واسطے سے مروی ہے (طبری صفحہ ۱۸۱۵) اس روایت کو گو اکثر قدیم مورخوں (مثلاً یعقوبی و مسعودی وغیرہ) نے قبول کیا ہے لیکن محدثین کے نزدیک یہ دونوں مشہور دروغ گو اور غیر معتبر ہیں یہ روایت واقدی سے بھی ابن سعد و طبری نے نقل کی ہے (ج ۲ وفات) لیکن واقدی کی مشہور ترین روایت جس کو اس نے متعدد اشخاص سے نقل کیا ہے وہ ۱۲ ربیع الاول کی ہے البتہ بیہقی نے دلائل میں باسناد صحیح سلیمان التیمی سے دوم ربیع الاول کی روایت نقل کی ہے (زرقانی، ابن سید الناس وفات) لیکن یکم ربیع الاول کی روایت ثقہ ترین ارباب سیر موسیٰ بن عقبہ سے اور مشہور محدث امام لیث مصری سے مروی ہے (فتح الباری وفات) امام سہیلی نے روض الانف میں اسی روایت کو اقرب الی الحق لکھا ہے (جلد دوم وفات) اور سب سے پہلے امام مذکور ہی نے روایت ۱۲ کی غلطی دریافت کی کہ ۱۲ ربیع الاول کی روایت قطعاً ناقابل تسلیم ہے کیونکہ دو باتیں قطعی طور پر ثابت ہیں ۱ روز وفات دوشنبہ کا دن تھا (صحیح بخاری ذکر وفات و صحیح مسلم کتاب الصلوٰۃ) ۲ اس سے تقریباً تین مہینے پہلے ذی الحجہ ۱۰ھ کی نویں تاریخ کو جمعہ کا دن تھا (صحاح قصہ حجۃ الوداع صحیح بخاری تفسیر الیوم اکملت لکم دینکم) ۹ ذی الحجہ ۱۰ھ روز جمعہ سے ۱۲ ربیع الاول

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ کریں)

کمزور محسوس کی تو آپ جہاں چاہیں قیام فرمائیں لیکن ضعف اس قدر ہو گیا تھا کہ چلا نہیں جاتا تھا حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ دونوں بازو تھام کر بمشکل حضرت عائشہؓ کے حجرے میں لائے۔

(آمد وفات کی) قوت جب تک رہی آپ ﷺ مسجد میں نماز پڑھانے کی غرض سے تشریف لاتے رہے سب سے آخری نماز جو آپ ﷺ نے پڑھائی وہ مغرب [2] کی نماز تھی سر میں درد تھا اس لیے سر میں رومال باندھ کر آپ ﷺ تشریف لائے اور نماز ادا کی جس میں سورہ والمرسلات عرفا (قرأت فرمائی) عشاء [3] کی نماز کا وقت آیا تو دریافت فرمایا کہ نماز ہو چکی؟ لوگوں نے عرض کی کہ سب کو حضور کا انتظار ہے لگن میں پانی بھروا کر غسل فرمایا پھر اٹھنا چاہا تو غش آ گیا افاقہ کے بعد پھر فرمایا کہ نماز ہو چکی؟ لوگوں نے پھر وہی جواب دیا آپ ﷺ نے پھر غسل فرمایا اور پھر جب اٹھنا چاہا تو غش آ گیا افاقہ ہوا تو پھر دریافت فرمایا اور لوگوں نے وہی جواب دیا تیسری دفعہ جسم مبارک پر پانی ڈالا پھر جب اٹھنے کا ارادہ کیا تو پھر غش طاری ہو گئی جب افاقہ ہوا تو ارشاد ہوا کہ ابوبکرؓ نماز پڑھائیں (حضرت عائشہؓ نے معذرت کی کہ یا رسول اللہ! ابوبکر نہایت رقیق القلب ہیں آپ کی جگہ ان سے کھڑا نہ ہوا جائے گا آپ ﷺ نے پھر یہی حکم دیا کہ ابوبکر نماز پڑھائیں) چنانچہ کئی دن تک حضرت ابوبکرؓ نے نماز پڑھائی۔

---

[1] صحیح بخاری (باب مرض وفات) (اسی صحیح نے بروایات صحیح نقل کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی طرف سے حضرت فاطمہؓ نے [illegible] اجازت طلب کی تھی۔

[2] یہ حدیث بخاری و مسلم، ابوداؤد، ترمذی اور نسائی باب القراءۃ فی المغرب میں مذکور ہے تو حضرت عائشہؓ کی روایت آتی ہے جس میں مذکور ہے کہ آخری نماز مسجد میں ظہر کی آپ ﷺ نے پڑھائی حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں ان دونوں میں اس طرح تطبیق دی ہے کہ مغرب کا واقعہ اندرون حجرہ نبوی کا واقعہ ہے جیسا کہ نسائی میں ہے (جلد ۸ صفحہ ۱۰۳) لیکن آگے چل کر حافظ موصوف کی نظر ترمذی کی روایت پر پڑی جس میں مذکور ہے کہ آنحضرت ﷺ نے باہر نکل کر نماز پڑھائی [illegible] (جلد ۸ صفحہ ۱۰۴) لیکن [illegible] حجرۂ نبوی میں اتنی جگہ تھی کہ کوئی جماعت ہو سکے [illegible] علاوہ حجرۂ نبوی میں اتنی گنجائش کہاں تھی علاوہ [illegible] پڑھائی [illegible] صحیح یہ ہے کہ نماز مسجد نبوی میں پڑھی گئی جیسا کہ [illegible] روایت کا منشاء ہے [illegible] مغرب تھی یا ظہر اس کی تطبیق یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی مسلسل امامت کا اختتام مغرب کی نماز پر ہوا جیسا کہ [illegible] ظہر کی نماز جو آنحضرت ﷺ نے مسجد میں آ کر ادا فرمائی وہ اتفاقی تھی اصل میں امام پہلے سے حضرت ابوبکرؓ تھے آنحضرت ﷺ آ کر بعد میں شریک ہو گئے تھے [illegible] آپ کی آخری نماز تھی بعض صحابہؓ سے یہ مذکور ہے کہ آخری نماز صبح کی تھی [illegible] واقعہ [illegible] آخری بار کی صحیح ہے [illegible]

[3] صحیح بخاری و مسلم میں بروایت حضرت عائشہؓ یہ تفصیل ہے (دیکھو کتاب الصلوٰۃ اور وفات)

[4] [illegible] آنحضرت ﷺ [illegible]

نہیں رہی ہے۔ (اسی دن ظہر کی نماز کے وقت آپ ﷺ کی طبیعت کچھ سکون پذیر ہوئی) آپ ﷺ نے حکم دیا کہ پانی کی سات مشکیں آپ پر ڈالی جائیں۔ غسل فرما چکے تو حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ تھام کر مسجد میں لائے جماعت کھڑی ہو چکی تھی اور حضرت ابوبکرؓ نماز پڑھا رہے تھے آہٹ پا کر حضرت ابوبکرؓ پیچھے ہٹے آپ ﷺ نے اشارہ سے روکا اور ان کے پہلو میں بیٹھ کر نماز پڑھائی (یعنی آپ ﷺ کو دیکھ کر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت ابوبکرؓ کو دیکھ کر اور لوگ ارکان ادا کرتے جاتے تھے)۔

(نماز کے بعد آنحضرت ﷺ نے ایک خطبہ دیا جو آپ ﷺ کی زندگی کا سب سے آخری خطبہ تھا آپ ﷺ نے فرمایا

"خدا نے اپنے ایک بندہ کو اختیار عطا فرمایا ہے کہ خواہ وہ دنیا کی نعمتوں کو قبول کرے یا خدا کے پاس (آخرت میں) جو کچھ ہے اس کو قبول کرے لیکن اس نے خدا ہی کے پاس کی چیزیں قبول کیں"۔

یہ سن کر حضرت ابوبکرؓ رو پڑے لوگوں نے ان کی طرف تعجب سے دیکھا کہ آپ ﷺ تو ایک شخص کا واقعہ بیان کرتے ہیں، یہ رونے کی کون سی بات ہے لیکن رازدار نبوت سمجھ چکا تھا کہ وہ بندہ خود محمد رسول اللہ ﷺ ہیں آپ نے پھر تقریر کا سلسلہ آگے بڑھایا اور فرمایا

"سب سے زیادہ میں جس کی دولت اور صحبت کا ممنون ہوں وہ ابوبکرؓ ہیں۔ اگر میں دنیا میں کسی کو اپنی امت میں سے اپنا دوست بنا سکتا تو میں ابوبکر کو بناتا، لیکن اسلام کا رشتہ دوستی کے لیے کافی ہے۔ مسجد کے رخ کوئی دریچہ ابوبکرؓ کے دریچہ کے سوا باقی نہ رکھا جائے، ہاں تم سے پہلی قوموں نے اپنے پیغمبروں اور بزرگوں کی قبروں کو عبادت گاہ بنا لیا ہے دیکھو تم ایسا نہ کرنا، میں منع کرتا ہوں"

زمانہ علالت میں انصار آپ ﷺ کی عنایات اور مہربانیوں کو یاد کر کے روتے تھے ایک دفعہ اسی حالت میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عباسؓ کا گزر ہوا انہوں نے انصار کو روتے دیکھا تو وجہ دریافت کی انہوں نے بیان کی کہ "حضور ﷺ کی مجلسیں یاد آتی ہیں" ان میں سے ایک صاحب نے جا کر آنحضرت ﷺ سے یہ واقعہ بیان کیا آج اس کی تلافی کا موقع تھا اس لیے اس کے بعد آپ ﷺ نے انصار کی نسبت لوگوں کی طرف خطاب کر کے فرمایا ایہا الناس! میں انصار کے معاملہ میں تم کو وصیت کرتا ہوں، عام مسلمان بڑھتے جائیں گے لیکن انصار اسی طرح کم ہو کر رہ جائیں گے جیسے کھانے میں نمک، وہ اپنی طرف سے اپنا فرض ادا کر چکے اب تمہیں ان کا فرض ادا کرنا ہے، وہ میرے (جسم میں بمنزلہ

۱　صحیح بخاری کراہیات و صحیح مسلم کتاب الصلوٰۃ

۲　روایتوں میں یا تصریح یہ مذکور نہیں ہے کہ یہ کس دن کے ظہر کا واقعہ ہے لیکن صحیح مسلم باب النہی عن بناء المساجد علی القبور میں حضرت جندبؓ کی روایت ہے کہ "حضرت ابوبکرؓ کی شان میں جو الفاظ آپ ﷺ نے فرمائے تھے ان کا بیان آگے آتا ہے وہ وفات سے پانچ روز پیشتر فرمائے تھے" اور یہ کہ مرض الموت کا خطبہ اسی نماز ظہر کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا تھا جیسا کہ صحیح بخاری و صحیح مسلم میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے اس لیے یہ وفات سے پانچ روز پہلے جمعرات کا واقعہ تھا، حافظ ابن حجر نے بھی فتح الباری میں یہ فیصلہ کیا ہے" ۔"

۳　صحیح بخاری و مسلم مناقب ابی بکرؓ نیز صحیح مسلم باب النہی عن بناء المساجد علی القبور میں ہے۔

محدود ہو گئے ہیں۔ جو تمہارے نفع و نقصان کا متولی ہو (یعنی جو خلیفہ ہو) اس کو چاہیے کہ ان میں جو نیکوکار ہوں ان کو قبول کرے اور جن سے خطا ہوتی ہو ان کو معاف کر دے۔"[1]

اوپر گزر چکا ہے کہ رومیوں کی طرف جس فوج کو بھیجنا آنحضرت ﷺ نے تجویز کیا تھا اس کی سرداری اسامہؓ بن زید کو تفویض فرمائی تھی۔ اس پر لوگوں نے (ابن سعد نے تصریح کی ہے کہ وہ منافقین تھے) شکایت کی کہ بڑے بڑے لوگوں کے ہوتے ہوئے نوجوان کو یہ منصب کیوں عطا ہوا؟ آنحضرت ﷺ نے اس مسئلہ کی نسبت ارشاد فرمایا۔

"اگر اسامہؓ کی سرداری پر تم کو اعتراض ہے تو اس کے باپ (زیدؓ) کی سرداری پر بھی تم معترض تھے۔ خدا کی قسم وہ اس منصب کا مستحق تھا اور وہ مجھے سب سے زیادہ محبوب تھا اور اب اس کے بعد یہ سب سے زیادہ محبوب ہے۔"[2]

اسلام اور دیگر مذاہب میں ایک نہایت دقیق فرق یہ ہے کہ اسلام شریعت کے تمام احکام کا واضع اور حاکم براہ راست خدائے پاک کو قرار دیتا ہے، پیغمبر کا صرف اسی قدر فرض ہے کہ ان احکام الٰہی کو اپنے قول و عمل کے ذریعہ سے بندوں تک پہنچا دے چونکہ دوسرے مذاہب میں یہ نکتہ شرک و تحریف سے مستور ہو چکا تھا اور اس کے نتائج پیش نظر تھے اس لیے تنبیہ فرمایا۔

"حلال و حرام کی نسبت میری طرف نہ کی جائے میں نے وہی چیز حلال کی ہے جو خدا نے اپنی کتاب میں حلال کی ہے اور وہی چیز حرام کی ہے جو خدا نے حرام کی ہے۔"

انسان کی جزا و سزا کی بنیاد خود اس کے ذاتی عمل پر ہے، آپ ﷺ نے فرمایا۔

"اے پیغمبر خدا کی بیٹی فاطمہ! اور اے پیغمبر خدا کی پھوپھی صفیہ! خدا کے ہاں کے لیے کچھ کر لو، میں تمہیں خدا سے نہیں بچا سکتا۔"[3]

خطبہ سے فارغ ہو کر آپ ﷺ حجرہ عائشہؓ میں واپس تشریف لائے۔

آپ ﷺ کو حضرت فاطمہ زہراؓ سے بے حد محبت تھی (اثنائے علالت میں) ان کو بلا بھیجا، تشریف لائیں تو ان سے چپکے کان میں باتیں کیں، وہ رونے لگیں، پھر بلا کر چپکے کان میں کچھ کہا تو ہنس پڑیں۔ حضرت عائشہؓ نے دریافت کیا تو کہا "پہلی دفعہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں اسی مرض میں انتقال کروں گا جب میں رونے لگی تو فرمایا کہ میرے خاندان میں سب سے پہلے تمہیں مجھ سے آ کر ملو گی تو ہنسنے لگی۔"[4]

---

[1] صحیح بخاری مناقب انصار۔

[2] صحیح بخاری ذکر مناقب زید بن حارثہؓ۔

[3] یہ اور اس کے اوپر کی حدیث مسند دارمی (باب اختلاف الفقہاء) میں ہے، طبقات ابن سعد جزء وفات میں بسند حسن مروی ہے لیکن ان روایتوں میں مذکور ہے کہ صبح کی نماز کے بعد آپ ﷺ نے یہ فرمایا لیکن بخاری کے حوالہ سے گزر چکا ہے کہ آپ ﷺ نے ظہر کی نماز میں شرکت فرمائی تھی اور اس کے بعد خطبہ دیا تھا دوسری قطعی سند اور ابن سعد کی روایت میں یہ ہے کہ وفات کے دن صبح کی نماز ... کو بیان کرتے ہیں حافظ ابن حجر نے روایات سے ثابت کیا ہے کہ وفات کے دن صبح کو آپ ﷺ نے صرف پردہ اٹھا کر جھانکا تھا باہر تشریف لانے اور نماز میں شرکت فرمائی ہو۔

[4] صحیح بخاری باب الوفات۔

فدک اور خیبر کی نسبت ابتدا ہی سے شیعہ اور اہلسنت میں اختلاف ہے۔ شیعہ کہتے ہیں کہ یہ آپ کی ذاتی جائیداد تھی اور وراثت کے طور پر اہل بیت میں تقسیم ہونی چاہیے تھی۔ اہلسنت کہتے ہیں کہ یہ بطور ریاست اسلامی آپ کے قبضے میں تھی اور زائل ہو گئی تو آپ ﷺ نے خود فرما دیا تھا کہ "ہمارا متروکہ وہ صدقہ ہے۔"

اصل یہ ہے کہ یہ اختلاف خود صحابہ کے وقت میں پیدا ہو چکا تھا۔ حضرت عباسؓ (آپ کے چچا) حضرت فاطمہ (صاحبزادی) اور اکثر ازواج مطہرات[1] مدعی تھیں کہ ان جائیدادوں کو بطور وراثت تقسیم ہونا چاہیے۔ حضرت ابوبکرؓ، عمرؓ اور دیگر اکابر صحابہ نے کہا کہ یہ وقف عام ہے۔ آنحضرت ﷺ خود اپنی زندگی میں جس طرح اور جن مصارف میں ان کی آمدنی صرف کرتے تھے اس میں تغیر نہ ہوگا[2]۔ آنحضرت ﷺ نے اپنے زمانہ حیات میں ان تینوں جائیدادوں کی آمدنی مختلف مدوں میں متعین کر دی تھی۔ بنونضیر کی جائیداد کی آمدنی ہنگامی ضروریات کے لیے مخصوص تھی۔ فدک کی آمدنی مسافروں کے لیے وقف تھی۔ خیبر کی آمدنی کو آپ تین حصوں میں تقسیم فرماتے تھے، دو حصے عام مسلمانوں کے لیے تھے اور ایک حصہ ازواج مطہرات کو سالانہ مصارف کے لیے ملتا تھا اس میں سے بھی جو بچ جاتا وہ غریب مہاجرین کی اعانت میں کام آتا[3]۔ آخر میں حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ کے اصرار پر مدینہ کی جائیداد ان دونوں کی تولیت میں دے دی تھی لیکن حضرت علیؓ نے اس پر قبضہ کر لیا تھا۔ خیبر اور فدک بدستور حضرت عمر بن عبدالعزیز کے زمانہ تک خلفاء کے ہاتھ میں رہے۔[4]

جانور:

ارباب سیر نے آپ ﷺ کے اسپ خاص اور مویشی اور دواب کی تفصیل اس طرح لکھی ہے جس سے ایک والی ملک کے اصطبل اور دواب خانہ کا دھوکا ہوتا ہے۔

طبری نے ان تمام جانوروں کے نام اور حالات تفصیل سے لکھے ہیں، اور اگر وہ قابل اعتبار ہوتے تو حقیقت میں نہایت دلچسپ تھے لیکن اس کے متعلق طبری کی جس قدر روایتیں ہیں سب بلا استثنا واقدی سے ماخوذ ہیں۔ پچھلے مصنفین جن میں بڑے بڑے محدثین ہیں مثلاً عمری، دمیاطی، حافظ عراقی وغیرہ نے بھی یہ تفصیل لکھی ہے اور چونکہ یہ مصنفین اکثر سلسلہ سند نہیں لکھتے اس لیے اکثر لوگ ان کے مستند ہونے کی بنا پر اس واقعہ کو صحیح خیال کرتے ہیں لیکن جب تحقیق کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی تمام روایتوں کا سلسلہ سند واقدی سے آگے نہیں بڑھتا۔

حضرت عائشہؓ کی روایت اوپر گزر چکی ہے۔

﴿ما ترک رسول اللہ ﷺ دینارا ولا درھما ولا بعیرا ولا شاۃ﴾

آنحضرت ﷺ نے نہ دینار چھوڑا نہ درہم نہ اونٹ نہ بکری۔

---

1. (صحیح بخاری کتاب الفرائض)
2. (یہ مکالمہ بخاری کے متعدد ابواب میں مذکور ہے دیکھو کتاب الفرائض)
3. سنن ابی داؤد باب صفایا رسول اللہ ﷺ
4. فتوح البلدان، حضرت عمر بن عبدالعزیز نے پھر فدک سادات کو واپس دے دیا تھا۔

صحیح بخاری باب الجہاد میں عمرو بن حارث (ام المومنین جویریہؓ کے بھائی) سے روایت ہے۔

﴿ما ترک النبی ﷺ الا بغلتہ البیضاء وسلاحہ وارضا ترکہا صدقۃ﴾

آنحضرت ﷺ نے کچھ نہیں چھوڑا بجز اپنے سفید خچر اور ہتھیار اور ایک زمین کے جو وقف عام ہو گئی۔

ان روایتوں سے معلوم ہوا کہ متروکات خاصہ میں صرف ایک جانور تھا۔ ان صحیح اور مسلم روایت کے ہوتے آنحضرت ﷺ کے اسباب اور دواب کی اتنی بڑی فہرست جو طبری وغیرہ نے درج کی ہے اور جو ایک تاجدار سلطنت کے شایان حال ہے کیونکر تسلیم کی جا سکتی ہے۔

احادیث صحیحہ کے استقرا سے اس قدر ضرور ثابت ہوتا ہے کہ عمروؓ بن حارث کی مختصر فہرست سے زائد چیزیں بھی آپ ﷺ کے قبضہ میں آئیں لیکن اس سے عمرو کی روایت پر اثر نہیں پڑ سکتا کیونکہ عمرو صرف اس بات کے مدعی ہیں کہ وفات کے وقت یہی سرمایہ تھا۔ ممکن ہے کہ یہ چیزیں وفات سے پہلے آپ نے حسب عادت ہبہ یا خیرات کر دی ہوں بہرحال ان دونوں روایات صحیح (مختلف اوقات میں) حسب ذیل جانور آپ کے دائرہ ملک میں آئے۔

لحیف: ایک گھوڑا تھا جو ابی بن عباس کے باغ میں بندھا رہتا تھا بخاری نے کتاب الجہاد میں اس کا ذکر کیا ہے۔

عفیر: ایک گدھا تھا حضرت معاذؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے مجھ کو اپنے ساتھ اس پر بٹھایا تھا (بخاری کتاب الجہاد)

عضباء و قصواء: نہایت تیز رو اونٹنی تھی۔ قصواء بھی اسی کا نام ہے (طبری صفحہ ۱۷۸۳ میں ہے کہ اسی کو آپ ﷺ نے ہجرت کے وقت حضرت ابوبکرؓ سے خریدا تھا اور اسی پر سوار ہو کر آپ ﷺ نے ہجرت فرمائی تھی اور مدینہ پہنچ کر حضرت ابوایوبؓ کے مکان کے پاس جا کر بیٹھ گئی تھی [۱] حجۃ الوداع کا خطبہ بھی آپ ﷺ نے اسی کی پشت پر دیا تھا) [۲] یہ معرکوں میں بازی لے جاتی تھی ایک دفعہ ایک بدو باہر سے آیا اس کی سواری میں ایک اونٹ تھا جو ابھی جوان بھی نہیں ہوا تھا۔ عضباء کا اس سے مقابلہ ہوا اور وہ آگے نکل گیا صحابہ کو ملال ہوا آپ ﷺ نے فرمایا کہ "یہ خدا کا فرض ہے کہ دنیا کی کوئی چیز جب سر اٹھاتی ہے تو اس کو پست کر دے" (بخاری کتاب الجہاد)

دلدل: جس کا ذکر اکثر روایتوں میں ہے یہی خچر کا نام ہے جس کا ذکر عمرو بن حارثؓ کی روایت میں ہے چنانچہ بخاری کے شارحین نے تصریح کی ہے یہ خچر مقوقس مصری نے آپ کو تحفہ میں بھیجا تھا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ ابن العلماء (رئیس ایلہ) نے بھی آپ ﷺ کو ایک سفید خچر (غزوہ تبوک کے موقع پر [۳] تحفۃً بھیجا تھا) غزوہ حنین میں جس سفید خچر پر آپ ﷺ سوار تھے وہ فروہ بن نفاثہ جذامی نے ہدیۃً بھیجا تھا ارباب سیر نے اسی خچر کو دلدل سمجھا ہے لیکن یہ غلط ہے [۴] صحیح مسلم میں اس کی تصریح موجود ہے [۵]

---

۱ صحیح بخاری ذکر ہجرت۔

۲ صحیح مسلم ابوداؤد ذکر حجۃ الوداع۔

۳ کتاب الجہاد باب بغلۃ النبی ﷺ۔

۴ فتح الباری ذکر غزوۂ حنین جلد ۸ صفحہ ۲۳۔

۵ باب غزوۂ حنین۔

میں بھی شریک تھیں۔ ۱ے

خدام خاص:

صحابہؓ میں سے بعض حیثیت سے ایسے تھے جو دنیا کے سب کام کاج چھوڑ کر ہر وقت خدمت اقدس میں حاضر رہتے اور خاص خاص کام انجام دیتے۔ ان کے نام حسب ذیل ہیں:

(۱) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ مشہور صحابی ہیں، فقہ حنفی کے بانی اول گویا وہی ہیں، امام ابو حنیفہؒ کی فقہ کا سلسلہ انہی کی روایت اور استنباطات پر ختم ہوتا ہے۔ مکہ معظمہ میں قرآن مجید کی اشاعت آنحضرت ﷺ کے ابتدائی زمانے میں انہی نے کی۔ ستر سورتیں خود آنحضرت ﷺ کی زبان مبارک سے سن کر یاد کی تھیں۔

یہ آنحضرت ﷺ کے رازدار بھی تھے اور جب آنحضرت ﷺ سفر میں جاتے تو خواب گاہ، وضو اور مسواک کا اہتمام انہی کے متعلق ہوتا۔ جب آپ ﷺ مجلس سے اٹھتے تو جوتیاں پہناتے، راہ میں آگے آگے عصا لے کر چلتے، جب آپ ﷺ کہیں کسی مجلس میں جا کر بیٹھتے تو نعلین مبارک اتار کر بغل میں رکھ لیتے، پھر اٹھنے کے وقت سامنے لا کر رکھ دیتے۔ جلوت و خلوت میں ساتھ رہتے تھے، آنحضرت ﷺ کے اخلاق و عادات کا نمونہ بن گئے تھے۔ ۲ے

۲۔ حضرت بلالؓ جو دنیا ان کو مؤذن کے لقب سے جانتی ہے، حبشی الاصل غلام تھے، مکہ میں ایمان لائے تھے اور جس جوش و خروش سے ایمان لائے تھے اس کا مختصر ذکر آغاز کتاب میں گزر چکا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے ان کو خرید کر آزاد کر دیا تھا۔ اس وقت سے برابر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں رہے۔ آپ ﷺ کا خانگی انتظام انہی کے سپرد تھا۔ بازار سے سودا سلف لانا، قرض وغیرہ لینا، پھر ادا کرنا، مہمانوں کے کھانے پینے کا انتظام کرنا، یہ تمام کام انہی سے متعلق تھے۔ ۳ے

۳۔ حضرت انسؓ بن مالک بھی آپ ﷺ کے خادم خاص تھے۔ آنحضرت ﷺ جب مدینہ تشریف لائے تو وہ نہایت کمسن تھے، ان کی ماں خدمت اقدس میں ان کو لائیں اور عرض کی "یا رسول اللہ یہ میرا بیٹا ہے، لائی ہوں کہ خدمت گزاری کرے۔" ۴ے

حضرت انسؓ نے دس برس تک آپ ﷺ کی خدمت کی۔ لوگوں کے پاس آنا جانا، چھوٹے چھوٹے کام کرنا، وضو کا پانی لانا، ان کے فرائض تھے۔ چونکہ ابھی کمسن تھے ان سے کام بن نہیں آتے تھے لیکن آپ ﷺ نے ان سے کبھی باز پرس نہ فرمائی۔ ۵ے

۱ے یہ تمام حالات طبقات ابن سعد تذکرۂ ام ایمن سے ماخوذ ہیں۔

۲ے یہ پوری تفصیل باختصار اس حدیث میں ہے مگر صحیح بخاری باب مناقب عبداللہ بن مسعودؓ میں بھی مذکور ہے۔

۳ے ابو داؤد جلد دوم کتاب الخراج باب قبول ہدایا المشرکین۔

۴ے صحیح مسلم فضائل انس۔

۵ے ابو داؤد کتاب الادب۔

شمائل

شکل و لباس و طعام و مذاق طبیعت

حلیہ اقدس:

آپ ﷺ میانہ قد اور موزوں اندام تھے، رنگ سفید سرخی مائل تھا، پیشانی چوڑی اور ابرو پیوستہ تھے، بینی مبارک درازی مائل تھی، چہرہ ہلکا تھا، بہت پرگوشت نہ تھا، دہانہ کشادہ تھا، دندان مبارک بہت پیوستہ نہ تھے، گردن اونچی، سر بڑا اور سینہ کشادہ اور فراخ تھا، سر کے بال نہ بہت پیچیدہ تھے نہ بالکل سیدھے تھے، ریش مبارک گھنی تھی، چہرہ گول کٹا ہوا تھا، آنکھیں سیاہ سرمگیں اور پلکیں بڑی بڑی تھیں، شانے پرگوشت اور موٹے، جوڑوں کی ہڈیاں بڑی تھیں، سینہ مبارک میں ناف تک بالوں کی ہلکی تحریر تھی، شانوں اور کلائیوں پر بال تھے، ہتھیلیاں پرگوشت اور چوڑی، کلائیاں لمبی اور پاؤں کی ایڑیاں نازک اور ہلکی تھیں، پاؤں کے تلوے بیچ سے ذرا خالی تھے نیچے سے پانی نکل جاتا تھا۔ [۱]

صحابہؓ میں آپ ﷺ کے حسن و خوبروئی کا بہت چرچا تھا، حضرت عبداللہ بن سلامؓ جو پہلے یہودی تھے جب پہلی دفعہ چہرہ اقدس پر ان کی نظر پڑی ہے تو بول اٹھے: "خدا کی قسم یہ جھوٹے کا چہرہ نہیں" [۲] جابرؓ بن سمرہ ایک صحابی ہیں ان سے کسی نے پوچھا آپ ﷺ کا چہرہ تلوار سا چمکتا تھا؟ بولے "نہیں بلکہ آفتاب و خورشید کی طرح" [۳] یہی صحابی روایت کرتے ہیں کہ ایک شب کو جب مطلق ابر نہ تھا اور چاند نکلا تھا، میں کبھی آپ کو دیکھتا تھا، کبھی چاند کو، بالآخر میں نے فیصلہ کیا کہ آپ مجھے چاند سے زیادہ خوبرو معلوم ہوتے تھے۔ [۴] حضرت براءؓ صحابی کہتے ہیں میں نے کسی جوڑے والے کو سرخ لباس میں آپ سے زیادہ خوبصورت نہیں دیکھا۔ [۵]

آپ ﷺ کے پسینہ میں ایک قسم کی خوشبو تھی۔ [۶] چہرۂ مبارک پر پسینہ کے قطرے موتی کی طرح ڈھلکتے تھے جسم مبارک کی جلد نہایت نرم تھی۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ کا رنگ نہایت کھلتا تھا آپ ﷺ کا پسینہ موتی معلوم ہوتا تھا۔ میں نے دیبا و حریر بھی آپ کی جلد سے زیادہ نرم نہیں دیکھے اور مشک و عنبر میں آپ ﷺ کے بدن سے زیادہ خوشبو نہ تھی۔ [۷]

(یہ جو مشہور ہے کہ آپ کے سایہ نہ تھا اس کی کوئی سند نہیں ہے۔)

---

۱ یہ حلیہ تفصیل کے ساتھ ترمذی، مسند ابن حنبل جلد ا صفحہ ۱۱۶ وغیرہ میں ہے اور مختصراً بخاری و مسلم باب صفۃ النبی ﷺ میں بھی ہے۔

۲ (ترمذی ابواب الزہد صفحہ ۴۰۴)

۳ مشکوٰۃ باب صفۃ النبی ﷺ بحوالہ مسلم

۴ (مشکوٰۃ باب مذکور بحوالہ ترمذی و دارمی)

۵ (صحیح مسلم باب مذکور)

۶ (صحیح مسلم باب مذکور)

۷ بخاری شمائل ۸ (مشکوٰۃ باب مذکور بحوالہ بخاری و مسلم)

گفتگو میں اکثر نگاہ آسمان کی طرف ہوتی تھی آواز بلند تھی حضرت ام ہانیؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ کعبہ میں قرآن مجید پڑھتے تھے اور ہم لوگ گھروں میں پلنگوں پر لیٹے لیٹے سنتے تھے۔ [۱]

حضرت خدیجہؓ کے پہلے شوہر سے ایک صاحبزادے تھے جن کا نام ہند تھا وہ نہایت خوش تقریر تھے جس چیز کا بیان کرتے اس کی تصویر کھینچ دیتے" حضرت امام حسنؓ نے ان سے پوچھا "آنحضرت ﷺ کیونکر تقریر فرماتے تھے" انہوں نے کہا "آپ ﷺ ہمیشہ متفکر رہتے تھے، اکثر چپ رہتے اور بے ضرورت کبھی گفتگو نہ فرماتے ایک ایک فقرہ الگ اور صاف اور واضح ہوتا تھا، ہاتھ سے اشارہ کرتے تو پورا ہاتھ اٹھاتے" کسی بات پر تعجب کرتے تو ہتھیلی کا رخ پلٹ دیتے" تقریر میں کبھی ہاتھ پر ہاتھ مارتے، بات کرتے کرتے جب کبھی مسرت کی کیفیت طاری ہوتی تو آنکھیں نیچی ہو جاتیں، ہنستے بہت کم تھے، ہنسی آتی تو مسکرا دیتے" اور یہی آپ ﷺ کی ہنسی تھی"۔ [۲] جریر بن عبد اللہؓ کا بیان ہے کہ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ آنحضرت ﷺ نے مجھ کو دیکھا ہو اور مسکرا نہ دیا ہو۔ روایتوں میں آیا ہے کہ کبھی کبھی جب آپ ﷺ کو زیادہ ہنسی آتی تو ڈاڑھ کے دانت (نواجذ) نظر آنے لگتے لیکن ابن القیم وغیرہ نے لکھا ہے کہ یہ طرز ادا کا مبالغہ ہے ورنہ کبھی آپ ﷺ اس زور سے نہیں ہنسے کہ نواجذ نظر آئیں۔

لباس:

لباس کے متعلق کسی قسم کا التزام نہ تھا، عام لباس چادر، قمیص اور تہمد تھی، پاجامہ کبھی استعمال نہیں فرمایا لیکن امام احمد اور اصحاب سنن اربعہ نے روایت کی ہے کہ آپ ﷺ نے منیٰ کے بازار میں پاجامہ خریدا تھا۔ حافظ ابن قیم نے لکھا ہے کہ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ استعمال بھی فرمایا ہوگا۔ موزوں کی عادت نہ تھی لیکن نجاشی نے جو سیاہ موزے بھیجے تھے آپ ﷺ نے استعمال فرمائے۔ بظاہر روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ چرمی تھے۔ عمامہ کا شملہ کبھی دوش مبارک پر کبھی دونوں شانوں کے بیچ میں پڑا رہتا تھا، کبھی تحت الحنک کے طور پر لپیٹ لیتے تھے، عمامہ اکثر سیاہ رنگ کا ہوتا تھا، عمامہ کے نیچے سر سے لپٹی ہوئی ٹوپی ہوتی تھی اونچی ٹوپی کبھی استعمال نہیں فرمائی (۔ عمامہ کے نیچے ٹوپی کا التزام تھا، فرماتے تھے کہ ہم میں اور مشرکین میں یہی امتیاز ہے کہ ہم ٹوپیوں پر عمامہ باندھتے ہیں) [۳]

چادر:

لباس میں سب سے زیادہ یمن کی دھاری دار چادریں [۴] پسند تھیں جن کو عربی میں حبرہ کہتے ہیں۔

عبا:

بعض اوقات شامی عبا استعمال کی ہے جس کی آستینیں اس قدر تنگ تھیں کہ جب وضو کرنا چاہا تو چڑھ نہ سکی اور ہاتھ کو آستین سے نکالنا پڑا۔ نوشیروانی قبا بھی جس کی جیب اور آستینوں پر دیبا کی سنجاف تھی استعمال کی ہے۔

---

۱ ابن ماجہ باب ما جاء فی القراءۃ فی صلوۃ اللیل۔

۲ شمائل ترمذی۔ ۳ ابوداود کتاب اللباس۔

۴ صحیح بخاری، باب اللباس

کمبل:

جب انتقال ہوا تو حضرت عائشہؓ نے کمبل جس میں پیوند لگے ہوئے تھے اور گاڑھے کی ایک تہبند نکال کر دکھائی کہ انہی کپڑوں میں آپ ﷺ نے وفات پائی۔

حلۂ حمراء:

روایتوں میں آیا ہے کہ آپ ﷺ نے حلۂ حمراء بھی استعمال کیا ہے حمراء کے معنی سرخ کے ہیں اس لئے عام محدثین نے وہی عام معنی لیے ہیں لیکن ابن القیم نے اصرار کے ساتھ دعویٰ کیا ہے کہ سرخ لباس آپ ﷺ نے کبھی نہیں پہنا اور نہ آپ ﷺ مردوں کے لیے اس کو جائز رکھتے تھے حلۂ حمراء ایک قسم کی یمنی چادر تھی جس میں سرخ دھاریاں بھی ہوتی تھیں اس بنا پر اس کو حمراء کہتے تھے اور یمنی کپڑوں کی بھی استعمال کرتے تھے عام محدثین سمجھتے ہیں کہ اس تخصیص کا کوئی ثبوت نہیں زرقانی میں یہ بحث نہایت تفصیل سے مذکور ہے۔ مختلف روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے سیاہ، سرخ، سبز، زعفرانی ہر رنگ کے کپڑے پہنے ہیں لیکن سفید رنگ بہت مرغوب تھا[1] بعض اوقات اس قسم کی چادر بھی استعمال فرمائی ہے جس پر کجاوے کی شکلیں بنی ہوئی تھیں[2]۔ نعلین مبارک اس طرز کے تھے جس کو اس ملک میں چپل کہتے ہیں، یعنی صرف ایک تلا ہوتا تھا جس میں تسمے لگے ہوتے تھے۔ بچھونا چمڑے کا گدا ہوتا تھا جس میں روئی کے بجائے کھجور کے پتے ہوتے تھے چارپائی بان کی بنی ہوئی تھی جس سے کبھی جسم پر بدھیاں پڑ جاتی تھیں۔

انگوٹھی:

جب آپ ﷺ نے نجاشی اور قیصر روم کو خط لکھنا چاہا تو لوگوں نے عرض کی کہ سلاطین مہر کے بغیر کوئی تحریر قبول نہیں کرتے اس بنا پر چاندی کی انگوٹھی بنوائی جس میں اوپر تلے تین سطروں میں محمد رسول اللہ لکھا ہوا تھا بعض صحابہؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ صرف مہر لگانے کے وقت اس کا استعمال کرتے تھے اور داہنے ہاتھ کی انگلی میں پہنتے تھے۔

خود و زرہ:

لڑائیوں میں زرہ اور مغفر بھی پہنتے تھے، اُحد کے معرکہ میں جسم مبارک پر دو زرہیں تھیں۔ تلوار کا قبضہ کبھی چاندی کا بھی ہوتا تھا۔

غذا اور طریقۂ طعام:

اگرچہ زہد اور قناعت کی وجہ سے لذیذ اور پرتکلف کھانے کبھی نصیب نہ ہوتے یہاں تک کہ (جیسا کہ صحیح بخاری کتاب الاطعمہ میں ہے) تمام عمر آپ ﷺ نے چپاتی کی صورت تک نہیں دیکھی تاہم بعض کھانے آپ کو نہایت

---

1. ابوداؤد کتاب اللباس [illegible]
2. ابوداؤد جلد ۲ کتاب اللباس باب لبس الصوف والشعر۔

مرغوب تھے سرکہ، شہد، حلوا، روغن زیتون، کدو خصوصیت کے ساتھ پسند تھے سالن میں کدو ہوتا تو پیالہ میں اس کی قاشیں انگلیوں سے ڈھونڈتے تھے' ایک دفعہ حضرت ام ہانیؓ کے گھر تشریف لے گئے اور پوچھا کہ کچھ کھانے کو ہے؟ بولیں کہ سرکہ ہے' فرمایا: کہ جس گھر میں سرکہ ہو اس کو نادار نہیں کہہ سکتے۔ عرب میں ایک کھانا ہوتا ہے جس کو حیس کہتے ہیں' یہ گھی میں پنیر اور کھجور ڈال کر پکایا جاتا ہے آپ کو یہ بہت مرغوب تھا۔

ایک دفعہ حضرت امام حسنؓ اور عبداللہ بن عباسؓ حضرت سلمیٰ کے پاس گئے اور کہا کہ آج ہم کو وہ کھانا پکا کر کھلاؤ جو آنحضرت ﷺ کو بہت مرغوب تھا بولیں تم کو وہ کیا پسند آئے گا؟! لوگوں نے اصرار کیا تو انہوں نے جو کا آٹا پیس کر ہانڈی میں چڑھا دیا اوپر سے روغن زیتون اور زیرہ اور کالی مرچیں ڈال دیں' پک گیا تو لوگوں کے سامنے رکھا اور کہا کہ یہ آپ ﷺ کی محبوب ترین غذا تھی۔

گوشت کے اقسام میں سے آپ ﷺ نے دنبہ، مرغ، بٹیر (حباری) اونٹ، بکری، بھیڑ، گورخر، خرگوش، مچھلی کا گوشت کھایا ہے۔ دست کا گوشت بہت پسند تھا شمائل ترمذی میں حضرت عائشہؓ کا قول نقل کیا ہے کہ دست کا گوشت فی نفسہٖ آپ ﷺ کو چنداں مرغوب نہ تھا' بات یہ تھی کہ کئی کئی دن تک گوشت نصیب نہیں ہوتا تھا اس لیے جب کبھی مل جاتا تو آپ ﷺ چاہتے تھے کہ جلد پک کر تیار ہو جائے۔ دست کا گوشت جلدی گل جاتا ہے اس لیے آپ ﷺ اسی کی فرمائش کرتے لیکن متعدد روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ یوں بھی آپ ﷺ کو یہ گوشت پسند تھا۔

حضرت صفیہؓ کے نکاح میں جب آپ ﷺ نے ولیمہ کا کھانا کھلایا تو صرف کھجور اور ستو تھا' تربوز کو کھجور کے ساتھ ملا کر کھاتے تھے' ککڑیاں پسند تھیں' ایک دفعہ معوذ بن عفراءؓ کی صاحبزادی نے کھجور اور ککڑیاں خدمت میں پیش کیں (بعض اوقات روٹی کے ساتھ بھی کھجور تناول فرمائی ہے)

پانی' دودھ' شربت:

ٹھنڈا پانی نہایت مرغوب تھا' دودھ کبھی خالص نوش فرماتے کبھی اس میں پانی ملا دیتے' کشمش' کھجور' انگور پانی میں بھگو دیا جاتا' کچھ دیر کے بعد وہ پانی نوش جان فرماتے' کھانے کے ظروف میں ایک لکڑی کا پیالہ تھا جو لوہے کے تاروں سے بندھا ہوا تھا' روایت میں اسی قدر ہے قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ٹوٹ گیا ہوگا اس لیے تاروں سے جوڑ دیا ہوگا۔

معمولات طعام:

دستر خوان پر جو کھانا آتا اگر ناپسند ہوتا تو اس میں ہاتھ نہ ڈالتے لیکن اس کو برا نہ کہتے' جو سالن سامنے ہوتا اسی میں ہاتھ ڈالتے ادھر ادھر ہاتھ نہ بڑھاتے اور اس سے اوروں کو بھی منع فرماتے' کھانا کبھی مسند یا تکیہ پر ٹیک لگا کر نہ کھاتے اور اس کو ناپسند فرماتے۔ میز یا خوان پر کبھی نہیں کھایا۔ خوان زمین سے کسی قدر اونچی میز ہوتی تھی عجم اسی پر کھانا رکھ کر کھاتے تھے چونکہ یہ بھی فخر اور امتیاز کی علامت تھی یعنی امراء اور اہل جاہ کے ساتھ مخصوص تھی اس لیے آپ ﷺ نے اس پر کھانا پسند

نہیں فرمایا۔ کھانا صرف تین انگلیوں سے کھاتے [1] گوشت کو کبھی کبھی چھری سے کاٹ کر بھی کھاتے۔ صحیح بخاری میں یہ روایت موجود ہے۔ [2] ابوداؤد میں ایک حدیث ہے کہ گوشت چھری سے نہ کاٹو کہ یہ اہل عجم کا شعار ہے لیکن ابوداؤد نے خود اس حدیث کو ضعیف کہا ہے۔ اس حدیث کے ایک راوی ابومعشر نجیح ہیں جن کی نسبت بخاری نے لکھا ہے کہ وہ منکر الحدیث ہیں اور انہی کی منکرات میں حدیث مذکور بھی ہے۔ [3]

خوش لباسی:

گو تکلف اور جاہ پسندی سے آپ ﷺ کو نفرت تھی لیکن کبھی کبھی نہایت قیمتی اور خوش نما لباس بھی زیب تن فرماتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ جب حروریہ کے پاس سفیر بنا کر بھیجے گئے تو وہ یمن کے نہایت قیمتی کپڑے پہن کر گئے۔ حروریہ نے کہا کیوں ابن عباس! یہ کیا لباس ہے؟ بولے کہ تم اس پر معترض ہوتے ہو میں نے آنحضرت ﷺ کو بہتر سے بہتر کپڑوں میں دیکھا ہے۔ [4]

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نہایت متقشف تھے، ایک دفعہ بازار سے ایک شامی جبہ مول لیا، گھر پر آ کر دیکھا تو اس میں سرخ دھاریاں تھیں، جا کر واپس کر آئے۔ کسی نے یہ واقعہ حضرت اسماءؓ (حضرت عائشہؓ کی بہن) سے کہا، انہوں نے آنحضرت ﷺ کا جبہ منگوا کر لوگوں کو دکھایا جس کی جیبوں اور آستینوں اور دامن پر دیبا کی سنجاف تھی۔ [5] (بعض امراء و سلاطین نے آنحضرت ﷺ کو بیش قیمت کپڑے ہدیے بھیجے آپ ﷺ نے قبول فرمایا اور کبھی کبھی زیب تن کیے)

مرغوب رنگ:

رنگوں میں زرد رنگ بہت پسند تھا۔ حدیثوں میں ہے کہ کبھی کبھی آپ تمام کپڑے یہاں تک کہ عمامہ بھی اسی رنگ کا رنگوا کر پہنتے تھے۔ [6] (سفید رنگ بھی بہت پسند تھا فرماتے تھے کہ یہ رنگ سب رنگوں میں اچھا ہے)

نامرغوب رنگ:

سرخ لباس ناپسند فرماتے تھے، ایک دفعہ عبداللہ بن عمروؓ سرخ کپڑے پہن کر آئے تو فرمایا یہ کیا لباس ہے؟ عبداللہؓ نے جا کر آگ میں ڈال دیا۔ آپ ﷺ نے سنا تو فرمایا کہ جلانے کی ضرورت نہ تھی کسی عورت کو دے دیا ہوتا۔ [7]

---

1. غذا کے متعلق زیادہ تر روایات شمائل ترمذی و زاد المعاد ابن قیم سے ماخوذ ہیں۔
2. کتاب الاطعمہ باب القطع بالسکین۔
3. قسطلانی شرح صحیح بخاری جلد ۸ صفحہ ۲۲۵ مصر۔
4. ابوداؤد کتاب اللباس باب لبس الصوف والشعر۔
5. ابوداؤد باب الرخصۃ فی العلم وخیط الحریر۔
6. ابوداؤد باب فی المصبوغ۔
7. ابوداؤد فی الحمرۃ۔

عرب میں سرخ رنگ کی مٹی ہوتی تھی جس کو مغرہ کہتے ہیں اس سے کپڑے رنگا کرتے تھے یہ رنگ آپ ﷺ کو نہایت ناپسند تھا ایک دفعہ حضرت زینبؓ اس سے کپڑے رنگ رہی تھیں آپ ﷺ گھر میں آئے دیکھا تو واپس چلے گئے حضرت زینبؓ سمجھ گئیں کپڑے دھو ڈالے تو آنحضرت ﷺ دوبارہ تشریف لائے اور جب دیکھ لیا کہ اس رنگ کی کوئی چیز نہیں تب گھر میں قدم رکھا۔ [۱]

ایک دن ایک شخص سرخ پوشاک پہن کر آیا تو آپ ﷺ نے اس کے سلام کا جواب نہیں دیا۔ ایک دفعہ صحابہ نے سواری کے اونٹوں پر سرخ رنگ کی چادریں ڈال دی تھیں آپ ﷺ نے فرمایا میں یہ دیکھنا نہیں چاہتا کہ یہ رنگ تم پر چھا جائے فوراً صحابہ نہایت تیزی سے دوڑے اور چادریں اتار کر پھینک دیں۔ [۲]

خوشبو کا استعمال:

خوشبو آپ ﷺ کو بہت پسند تھی کوئی شخص خوشبو کی چیز ہدیۃً بھیجتا تو کبھی رد نہ فرماتے۔ ایک خاص قسم کی خوشبو عطر ہوتا ہے جس کو سُک کہتے ہیں یہ ہمیشہ آپ ﷺ کے استعمال میں رہتا تھا صحابہ کہتے ہیں کہ جس گلی کوچہ سے آپ ﷺ نکل جاتے وہ معطر ہو جاتا۔ اکثر فرمایا کرتے کہ مردوں کی خوشبو ایسی ہونی چاہیے کہ خوشبو پھیلے اور رنگ نظر نہ آئے اور عورتوں کی ایسی کہ خوشبو نہ پھیلے اور رنگ نظر آئے۔ [۳]

لطافت اور نفاست:

مزاج میں لطافت تھی ایک شخص کو میلے کپڑے پہنے دیکھا تو فرمایا کہ اس سے اتنا نہیں ہوتا کہ کپڑے دھو لیا کرے۔ [۴] ایک دفعہ ایک شخص خراب کپڑے پہنے ہوئے خدمت میں حاضر ہوا آپ ﷺ نے پوچھا کہ کچھ مقدور ہے؟ بولا ہاں۔ ارشاد ہوا کہ خدا نے نعمت دی ہے تو صورت سے بھی اس کا اظہار ہونا چاہیے۔ [۵] عرب تہذیب و تمدن سے نا آشنا تھے مسجد میں آتے تو بعض نماز میں دیواروں پر یا سامنے زمین پر تھوک دیتے آپ ﷺ اس کو نہایت ناپسند فرماتے دیواروں پر تھوک کے دھبوں کو خود چھڑی کی نوک سے کھرچ ڈالتے۔ ایک دفعہ تھوک کا دھبہ دیوار پر دیکھا تو اس قدر غصہ آیا کہ چہرہ مبارک سرخ ہو گیا ایک انصاری عورت نے دھبہ کو مٹایا اور اس جگہ خوشبو لا کر مل دی آپ ﷺ نہایت خوش ہوئے اور اس کی تحسین کی۔ [۶]

کبھی کبھی مجلس عام میں خوشبو کی انگیٹھیاں جلائی جاتی تھیں جن میں اگر اور کبھی کبھی کافور ہوتا۔ [۷] ایک دفعہ ایک

---

۱ ابوداؤد۔

۲ یہ تمام واقعے ابوداؤد کتاب اللباس میں ہیں۔

۳ شمائل ترمذی۔

۴ ابوداؤد کتاب اللباس باب فی غسل الثوب۔

۵ ابوداؤد کتاب اللباس۔

۶ نسائی کتاب المساجد۔

۷ نسائی کتاب الطیب باب البخور۔

عورت نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا کہ خضاب لگانا کیسا ہے؟ بولیں کچھ مضائقہ نہیں لیکن میں تو اس لیے ناپسند کرتی ہوں کہ میرے حبیب رسول اللہ ﷺ کو حنا کی بو ناگوار تھی۔ [۱]

آپ عطر مشک اور عنبر کا استعمال فرماتے۔

ایک شخص کے بال پریشان دیکھے تو فرمایا کہ اس سے اتنا نہیں ہوسکتا کہ بالوں کو درست کرلے۔ [۲] ایک دفعہ اون کی چادر اوڑھی پسینہ آیا تو اتار کر رکھ دی۔ [۳] ایک دن لوگ مسجد نبوی میں آئے چونکہ مسجد تنگ تھی اور کاروباری لوگ میلے کپڑوں میں چلے آتے تھے پسینہ آیا تو تمام مسجد میں بو پھیل گئی آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ نہا کر آتے تو اچھا ہوتا۔ اسی دن سے غسل جمعہ ایک شرعی حکم بن گیا۔ [۴]

مسجد نبوی میں جھاڑو دینے کا التزام تھا۔ ام محجن نام ایک عورت جھاڑو دیا کرتی تھی۔ ابن ماجہ میں روایت ہے کہ آپ نے حکم دیا کہ مساجد میں بچے اور مجنون نہ جانے پائیں اور خرید و فروخت نہ ہونے پائے نیز یہ بھی حکم دیا کہ مساجد میں جمعہ کے دن خوشبو کی انگیٹھیاں جلائی جائیں۔ اہل عرب بدویت کے اثر سے نظافت اور صفائی کا نام نہیں جانتے تھے۔ اس بنا پر اس خاص باب میں آپ کو نہایت اہتمام کرنا پڑتا تھا۔

عرب کی عادت تھی (اور آج بھی بدویوں میں عموماً پائی جاتی ہے) کہ راستہ میں بول و براز کرتے تھے۔ آنحضرت ﷺ اس کو نہایت ناپسند فرماتے اور اس سے منع کرتے تھے۔ احادیث میں کثرت سے روایتیں موجود ہیں کہ آپ ﷺ نے ان لوگوں پر لعنت کی ہے جو راستہ میں یا درخت کے سایہ میں بول و براز کرتے ہیں۔ اعراب کا دستور تھا کہ کاہلی کی وجہ سے کسی برتن میں پیشاب کرلیا کرتے تھے آپ اس سے بھی منع فرماتے تھے۔ [۵]

عرب میں پیشاب کے بعد استنجا کرنے یا پیشاب سے کپڑوں کے بچانے کا مطلق دستور نہ تھا آپ ایک دفعہ راہ میں جارہے تھے دو قبریں نظر آئیں فرمایا کہ ان میں سے ایک پر اس لیے عذاب ہو رہا ہے کہ وہ اپنے کپڑوں کو پیشاب سے محفوظ نہیں رکھتا تھا۔ [۶]

ایک دفعہ آپ ﷺ مسجد میں تشریف لائے دیواروں پر جابجا تھوک کے دھبے تھے آپ کے ہاتھ میں کھجور کی چھڑی تھی اس سے کھرچ کر تمام دھبے مٹائے پھر لوگوں کی طرف خطاب کر کے غصہ کے لہجہ میں فرمایا کہ کیا تم پسند کرتے ہو کہ کوئی شخص تمہارے سامنے آکر تمہارے منہ پر تھوک دے؟ جب کوئی شخص نماز پڑھتا ہے تو خدا اس کے سامنے اور فرشتے اس کے داہنی جانب ہوتے ہیں اس لیے انسان کو سامنے یا داہنی جانب تھوکنا نہ چاہیے۔ [۷]

---

۱ نسائی صفحہ ۸۵۰ باب کراہیۃ ریح الحنا

۲ ابوداؤد کتاب اللباس۔

۳ ابوداؤد کتاب اللباس۔

۴ اس مضمون کی متعدد حدیثیں بخاری شریف (غسل جمعہ) میں باختلاف الفاظ و واقعات مذکور ہیں۔

۵ ترغیب و ترہیب کتاب الطہارۃ۔

۶ صحیح بخاری عذاب قبر۔

۷ ترغیب و ترہیب

ایک صحابی نے ایک نماز میں جبکہ وہ امام نماز تھے تھوک دیا آنحضرت ﷺ دیکھ رہے تھے فرمایا کہ یہ شخص اب نماز نہ پڑھائے۔ نماز کے بعد یہ صاحب خدمت اقدس میں آئے اور پوچھا کہ کیا آپ نے یہ حکم دیا ہے؟ فرمایا کہ ہاں تم نے خدا اور پیغمبر کو اذیت دی۔ ل

بودار چیزوں مثلاً پیاز، لہسن اور مولی سے نفرت تھی۔ حکم تھا کہ یہ چیزیں کھا کر لوگ مسجد میں نہ آئیں۔ بخاری میں حدیث ہے کہ جو شخص پیاز لہسن کھائے وہ ہمارے پاس نہ آئے اور ہمارے ساتھ نماز نہ پڑھے۔ اپنے زمانہ خلافت میں ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے خطبہ میں کہا کہ تم لوگ پیاز اور لہسن کھا کر مسجد میں آتے ہو حالانکہ میں نے آنحضرت ﷺ کو دیکھا تھا کہ کوئی شخص یہ چیزیں کھا کر مسجد میں آتا تو آپ حکم دیتے کہ مسجد سے نکال کر بقیع پہنچا دیا جائے۔ ؎

سواری کا شوق:

گھوڑے کی سواری آپ ﷺ کو نہایت مرغوب تھی۔ آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے الخیل معقود فی نواصیہا الخیر۔ گھوڑوں کے علاوہ گدھے، خچر، اونٹ پر آپ ﷺ نے سواری فرمائی ہے۔ آپ ﷺ کے خاص سواری کے گھوڑے کا نام لحیف تھا۔ گدھے کا نام عفیر اور خچر کا نام دلدل تھا اور اونٹنیوں کا نام قصواء اور عضباء تھا۔

اسپ دوانی:

مدینہ سے باہر ایک میدان تھا جس کی سرحد حفیاء سے ثنیۃ الوداع تک ۶ میل تھی یہاں گھوڑ دوڑ کی مشق کرائی جاتی تھی۔ گھوڑے جو مشق کے لیے تیار کرائے جاتے تھے ان کی تیاری کا یہ طریقہ تھا کہ پہلے ان کو خوب دانہ گھاس کھلاتے تھے جب وہ موٹے تازے ہو جاتے تو ان کی غذا کم کرنی شروع کرتے اور گھر میں باندھ کر چار جامے کس دیتے، پسینہ آتا اور خشک ہوتا۔ روزانہ یہی کارروائی رہتی، رفتہ رفتہ جس قدر گوشت چڑھ گیا تھا خشک ہو کر ہلکا پھلکا پھریرا بدن نکل آتا۔ یہ مشق چالیس دن میں ختم ہوتی۔

آنحضرت ﷺ کی سواری کا ایک گھوڑا تھا جس کا نام سبحہ تھا ایک دفعہ اس کو آپ ﷺ نے بازی میں دوڑایا اس نے بازی جیتی تو آپ ﷺ کو خاص مسرت ہوئی۔ ؎

گھوڑ دوڑ کا اہتمام حضرت علیؓ کے سپرد تھا انہوں نے اپنی طرف سے سراقہ بن مالک کو یہ خدمت سپرد کی اور اس کے چند قاعدے مقرر کئے جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔ ؎

۱۔ گھوڑوں کی صفیں قائم کی جائیں اور تین دفعہ پکار دیا جائے کہ جس کو لگام درست کرنی یا پیچھے کو ساتھ رکھنا یا زین

ل ترغیب و ترہیب باب البصاق فی المسجد۔

۲ مسلم و نسائی وابن ماجہ۔

۳ نسائی صفحہ ۵۲۱ باب حب الخیل۔

۴ دارقطنی جلد ۲ صفحہ ۵۵۵ کتاب السبق بین الخیل، مسند احمد و بیہقی میں بھی یہ واقعہ مذکور ہے۔

۵ یہ پوری تفصیل دارقطنی صفحہ ۵۵۵ کتاب السبق بین الخیل میں ہے جس کو محدثانہ حیثیت سے یہ روایت ضعیف ہے۔

معمولات

ترمذی نے شمائل میں حضرت علیؓ سے روایت کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنے اوقات کے تین حصے کر دیے تھے، ایک عبادت الٰہی کے لیے، دوسرا عام خلق کے لیے، اور تیسرا اپنی ذات کے لیے۔

صبح سے شام تک کے معمولات

معمول تھا کہ نماز فجر پڑھ کر (جو نماز پڑھی) آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتے یہاں تک کہ آفتاب اچھی طرح نکل آتا[1] (اور یہی وقت دربار نبوت کا ہوتا۔ لوگ پاس آ کر بیٹھتے اور آپ ﷺ ان کو مواعظ و نصائح تلقین فرماتے)[2]

اکثر صحابہؓ سے پوچھتے کہ کسی نے کوئی خواب دیکھا ہے؟ کسی نے دیکھا ہوتا تو عرض کرتے آپ ﷺ اس کی تعبیر بیان فرماتے تھے[3] کبھی خود اپنا خواب بیان فرماتے تھے[4] اس کے بعد ہر قسم کی گفتگو ہوتی لوگ جاہلیت کے قصے بیان کرتے شعر پڑھتے ہنسی خوشی کی باتیں کرتے۔ آنحضرت ﷺ صرف مسکرا دیتے[5] اکثر اسی وقت مال غنیمت اور وظائف و خراج وغیرہ کی تقسیم فرماتے۔[6]

بعض روایتوں میں ہے کہ جب دن کچھ چڑھ جاتا تو چاشت کی کبھی چار کبھی آٹھ رکعت نماز ادا فرماتے۔ گھر جا کر گھر کے دھندے میں مشغول رہتے پھٹے کپڑوں کو سیتے جوتا ٹوٹ جاتا تو اپنے ہاتھ سے گانٹھ لیتے دودھ دوہتے۔[7]

نماز عصر پڑھ کر ازواج مطہرات میں سے ایک ایک کے پاس جاتے اور ذرا ذرا دیر ٹھہرتے پھر جس کی باری ہوتی وہیں رات بسر فرماتے۔ تمام ازواج مطہرات وہیں جمع ہو جاتیں۔ عشاء تک صحبت رہتی[8] پھر نماز عشاء کے لیے مسجد میں تشریف لے جاتے اور واپس آ کر سو رہتے۔ ازواج رخصت ہو جاتیں۔ نماز عشاء کے بعد بات چیت کرنی ناپسند فرماتے۔[9]

خواب:

عام معمول یہ تھا کہ آپ ﷺ اول وقت نماز عشاء پڑھ کر آرام فرماتے تھے۔ سوتے وقت اکثر قرآن مجید کی

---

[1] صحیح مسلم باب [illegible] ﷺ [illegible]۔
[2] جامع ترمذی۔
[3] صحیح مسلم کتاب التعبیر۔
[4] صحیح بخاری کتاب التعبیر۔
[5] نسائی باب قعود الامام فی مصلاہ۔
[6] بخاری اور حدیث کی کتابوں میں متعدد جزئی واقعات مذکور ہیں۔
[7] صحیح بخاری باب ما یکون الرجل فی مہنۃ اہلہ، مسند ابن حنبل، مسند عائشہ۔
[8] صحیح مسلم باب القسم بین الزوجات۔
[9] بخاری صفحہ [illegible]۔

کوئی سورۃ (بنی اسرائیل، زمر، حدید، حشر، صف، تغابن، جمعہ) پڑھ کر سوتے۔ شمائل ترمذی میں ہے کہ آرام فرماتے وقت یہ الفاظ فرماتے۔

﴿اللّٰھم باسمک اموت واحیٰی﴾

خدایا تیرا نام لے کر مرتا ہوں اور زندہ ہوتا ہوں۔

جاگتے تو فرماتے:

﴿الحمد للّٰہ الذی احیانا بعد ما اماتنا والیہ النشور﴾

اس خدا کا شکر جس نے موت کے بعد زندہ کیا اور اسی کی طرف حشر ہوگا۔

آدھی رات یا پہر رات رہے جاگ اٹھتے۔ مسواک ہمیشہ سرہانے رہتی تھی، اٹھ کر پہلے مسواک فرماتے، پھر وضو کرتے اور عبادت میں مشغول ہوتے۔ آپ ﷺ کی سجدہ گاہ[1] آپ کے سرہانے ہوتی تھی۔ ہمیشہ داہنی کروٹ اور داہنا ہاتھ رخسار کے نیچے رکھ کر سوتے لیکن جب کبھی سفر میں پچھلے پہر منزل پر اتر کر آرام فرماتے تو معمول تھا کہ داہنا ہاتھ اونچا کر کے چہرہ اس پر ٹیک کر سوتے کہ گہری نیند نہ آجائے۔ نیند میں کسی قدر خراٹے کی آواز آتی تھی۔

بچھونے میں کوئی التزام نہ تھا، کبھی معمولی بستر پر، کبھی کھال پر، کبھی چٹائی پر اور کبھی خالی زمین پر آرام فرماتے۔[2]

عبادت شبانہ:

آنحضرت ﷺ کے خانگی معمولات اور اوراد سے حضرت عائشہؓ کے برابر کوئی واقف نہ تھا، ان سے مروی ہے کہ جب سورۂ مزمل کی ابتدائی آیتیں نازل ہوئیں تو آپ ﷺ نے اس قدر نمازیں پڑھیں کہ پاؤں پر ورم آگیا، بارہ مہینے تک یہ آیتیں باقی رہیں، سال بھر کے بعد جب بقیہ آیتیں اتریں تو قیام لیل جو اب تک فرض تھا نفل ہو گیا۔

شب کو آٹھ رکعت متصل پڑھتے جن میں صرف آٹھویں رکعت میں قعدہ کرتے پھر ایک اور رکعت پڑھتے اور اس میں بھی جلسہ کرتے پھر دو رکعتیں اور ادا کرتے۔ اس طرح گیارہ رکعتیں ہو جاتیں۔ لیکن جب عمر زیادہ ہو گئی اور جسم ذرا بھاری ہو گیا تو سات رکعتیں پڑھتے جن کے بعد دو رکعتیں اور ادا کرتے۔ کبھی کبھی رات کو اتفاقاً نیند کا غلبہ ہوتا اور اس معمول میں فرق آتا تو دن میں بارہ رکعتیں پڑھ لیتے تھے۔[3]

ابوداؤد میں حضرت عائشہؓ سے ایک روایت ہے اس کے الفاظ یہ ہیں۔

''عشاء کی نماز جماعت سے پڑھ کر گھر چلے آتے اور یہاں چار رکعتیں پڑھ کر خواب راحت فرماتے، وضو کا پانی اور مسواک سرہانے رکھ دی جاتی، سو کر اٹھتے پہلے مسواک فرماتے پھر وضو کرتے اور جائے نماز پر آ کر آٹھ رکعتیں ادا کرتے''

---

[1] یعنی سجدہ کا مقام جہاں عبادت کے وقت آپ ﷺ سجدہ کرتے تھے۔

[2] یہ پوری تفصیل زرقانی میں مختلف کتابوں کے حوالے سے مذکور ہے۔

[3] سنن ابوداؤد باب صلوٰۃ اللیل۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کہتے ہیں کہ ایک دن میں اپنی خالہ میمونہؓ (آنحضرت ﷺ کی ازواج مطہرات میں تھیں) کے یہاں خاص اس غرض سے رہا کہ دیکھوں آپ رات کو کس طرح نماز پڑھتے ہیں زمین پر فرش بچھا ہوا تھا آپ نے اس پر آرام فرمایا' میں سامنے آڑا سویا' قریباً رات ڈھلے آپ آنکھیں ملتے ہوئے اٹھے۔ آل عمران کی اخیر دس آیتیں پڑھیں' پانی کی مشک لٹکی ہوئی تھی اس سے وضو کیا' پھر نماز شروع کی' میں بھی وضو کر کے بائیں پہلو میں کھڑا ہو گیا' آپ نے ہاتھ پکڑ کر داہنی جانب پھیر دیا۔ ۱۳ رکعتیں پڑھ کر آپ سو رہے' یہاں تک کہ سانس کی آواز آنے لگی' صبح ہوتے حضرت بلالؓ نے اذان دی آپ اٹھے فجر کی سنتیں ادا کیں' پھر مسجد میں تشریف لے گئے۔

معمولات نماز:

ابتدا میں آپ ﷺ ہر نماز کے لیے نیا وضو کرتے تھے لیکن جب یہ گراں گزرنے لگا تو صرف ہر وقت مسواک رہ گئی۔ فتح مکہ میں آپ ﷺ نے سب سے پہلے ایک وضو سے کئی نمازیں پڑھیں [1] تاہم عادتاً آپ اکثر نئے وضو کے ساتھ نماز ادا فرماتے تھے۔ وضو میں عام معمول یہ تھا کہ پہلے تین بار ہاتھ دھوتے پھر کلی کرتے اور ناک میں پانی ڈالتے' اس کے بعد تین تین بار منہ' ہاتھ دھوتے' سر کا مسح کرتے اور تین بار پاؤں کو دھوتے [2] بعض اوقات کسی عضو کو تین بار اور کسی عضو کو دو بار اور کسی عضو کو ایک بار دھوتے۔ [3]

سنن ونوافل زیادہ تر گھر ہی میں ادا فرماتے' اذان صبح ہی کے ساتھ اٹھتے اور فجر کی دو رکعت سنت نہایت اختصار کے ساتھ ادا کرتے' یہاں تک کہ حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ مجھے بعض اوقات یہ خیال ہوتا تھا کہ آپ ﷺ نے سورۂ فاتحہ پڑھی یا نہیں [4] لیکن فرض کی دو رکعتوں میں عموماً طویل سورتیں پڑھتے۔ حضرت عبداللہ بن سائبؓ سے مروی ہے کہ ایک بار آپ ﷺ نے مکہ میں نماز فجر میں سورۂ مومنون پڑھی' اسی طرح کبھی واللیل اذا یغشی اور کبھی سورۂ ق پڑھتے۔ صحابہ کا اندازہ ہے کہ آپ ﷺ صبح کی نماز میں ساٹھ سے لے کر سو آیتوں تک پڑھتے تھے۔

ظہر وعصر میں اگرچہ بہ نسبت فجر کے تخفیف فرماتے تھے تاہم ابتدا کی دو رکعتوں میں سورۂ فاتحہ کے ساتھ اتنی بڑی سورہ پڑھتے کہ آدمی بقیع تک جاتا تھا اور وہاں اپنا کام کرتا تھا پھر پلٹ کر گھر آتا تھا اور وضو کرتا تھا اور پہلی رکعت میں جا کر شامل ہو جاتا تھا۔ صحابہؓ نے اندازہ کیا تو معلوم ہوا کہ ظہر کی اول دو رکعتوں میں آپ ﷺ اس قدر قیام فرماتے ہیں جس میں ﴿الم تنزیل السجدہ﴾ کے برابر سورہ پڑھی جا سکتی ہے۔ اخیر کی دو رکعتوں میں یہ مقدار نصف رہ جاتی تھی۔ عصر کی دونوں پہلی رکعتوں میں ظہر کی آخری رکعتوں کے برابر قیام فرماتے تھے اور اخیر کی دو رکعتوں میں پہلی رکعتوں کی نصف مقدار رہ جاتی تھی حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ ظہر کی پہلی رکعت میں تیس آیتوں کے برابر اور

---

1. صحیح مسلم ومسند ج ۵ ص ۳۳۵۔
2. مسلم جلد اول ص ۱۰۹ باب صفۃ الوضوء وکمالہ۔
3. مسلم ج ۱ ص ۱۰۹ باب آخر فی صفۃ الوضوء۔
4. مسلم جلد اول [illegible] باب [illegible]۔

دوسری رکعت میں پندرہ آیتوں کے یا اس کے نصف کے برابر اور عصر میں پندرہ آیتوں کے برابر پڑھا کرتے تھے۔
جابر بن سمرہ کہتے ہیں کہ ظہر میں آپ ﷺ ﴿سبح اسم ربك الاعلى﴾ پڑھتے تھے
مغرب کی نماز میں والمرسلات اور سورہ طور پڑھتے تھے۔ [1]
عشاء کی نماز میں ﴿والتين والزيتون﴾ اور اسی کے برابر کی سورتیں پڑھتے تھے۔ تہجد کی نماز میں بڑی بڑی سورتیں پڑھتے تھے مثلاً سورۂ بقرہ، سورۂ آل عمران اور نساء۔
جمعہ کی پہلی رکعت میں سورہ جمعہ ﴿يسبح لله ما في السموات﴾ اور دوسری رکعت میں ﴿اذا جاءك المنافقون﴾ اور کبھی ﴿سبح اسم ربك الاعلى اور هل اتاك حديث الغاشية﴾ عیدین میں بھی یہی دونوں سورتیں یعنی ﴿سبح اسم ربك الاعلى اور هل اتاك﴾ پڑھتے تھے اور اتفاق سے اگر عید اور جمعہ ایک ساتھ پڑ جاتا تو دونوں نمازوں میں یہی سورتیں پڑھا کرتے تھے جمعہ کے دن کی نماز فجر میں ﴿الم تنزيل السجدة اور هل اتى على الانسان حين من الدهر﴾ پڑھنے کا معمول تھا۔ [2]

معمولات خطبہ:

وعظ و پند اور ارشاد و ہدایت کے لیے آپ ﷺ اکثر خطبہ دیا کرتے تھے، بالخصوص جمعہ کے لیے تو خطبہ لازمی تھا۔ جمعہ کے خطبات میں معمول یہ تھا کہ جب لوگ جمع ہو جاتے تو آپ ﷺ نہایت سادگی کے ساتھ گھر سے نکلتے، مسجد میں داخل ہوتے تو لوگوں کو سلام کرتے پھر منبر پر تشریف لے جاتے تو لوگوں کی طرف رخ کر کے سلام کرتے اور اذان کے بعد فوراً خطبہ شروع کر دیتے، پہلے ہاتھ میں ایک عصا ہوتا تھا لیکن جب منبر بن گیا تو ہاتھ میں عصا لینا چھوڑ دیا، خطبہ بہت نہایت مختصر اور جامع ہوتا تھا، فرمایا کرتے تھے کہ نماز کا طول اور خطبہ کا اختصار آدمی کے تفقہ کی دلیل ہے، جمعہ کے خطبہ میں عموماً سورۂ "ق" پڑھتے تھے۔ [3] اس میں قیامت اور حشر و نشر کا بہ تفصیل ذکر ہے۔
خطبہ ہمیشہ حمد خداوندی کے ساتھ شروع کرتے تھے، اگر اثنائے خطبہ میں کوئی کام پیش آ جاتا تو منبر سے اتر کر اس کو کر لیتے، پھر منبر پر جا کر خطبہ کو پورا فرماتے۔ ایک بار آپ ﷺ خطبہ دے رہے تھے، اسی حالت میں ایک آدمی نے آ کر کہا "یا رسول اللہ! میں مسافر آدمی ہوں اپنے دین کی حقیقت سے ناواقف ہوں اس کے متعلق پوچھنے آیا ہوں" آپ ﷺ منبر سے اتر آئے، ایک کرسی رکھ دی گئی اس پر بیٹھ گئے اور اس کو تعلیم و تلقین کی پھر جا کر خطبہ کو پورا کیا۔ [4] ایک بار آپ ﷺ خطبہ دے رہے تھے، حضرت امام حسین سرخ کپڑے پہنے ہوئے مسجد میں آ گئے، چونکہ کم سنی کی وجہ سے لڑکھڑاتے آتے تھے، آنحضرت ﷺ نے دیکھا تو ضبط نہ ہو سکا، منبر سے اتر آئے اور گود میں اٹھا لیا اور یہ آیت پڑھی [5] ﴿انما

---

[1] مسلم جلد ۱ صفحہ [illegible] باب القراءة في الظهر والعصر وغیرہ۔
[2] یہ تمام روایتیں صحیح مسلم کتاب الصلوٰۃ و کتاب الجمعہ والعیدین میں مذکور ہیں۔
[3] صحیح مسلم۔
[4] ادب المفرد طبع مصر صفحہ [illegible] باب الکلام علی المنبر۔
[5] جامع ترمذی مناقب حسنین۔

جنازہ کی نماز پڑھتے اس کے بعد اگر دفن ہونا چاہتے تو ٹھہر جاتے ورنہ واپس چلے آتے لیکن صحابہؓ کو آنحضرت ﷺ کی یہ تکلیف بھی گوارا نہ ہوئی اس لیے خود جنازہ آپ ﷺ کے مکان تک لانے لگے اور یہی معمول ہو گیا۔ [۱]

عیادت کے لیے جب کسی بیمار کے پاس تشریف لے جاتے تو اس کو تسکین دیتے پیشانی اور نبض پر ہاتھ رکھتے [۲] اس کی صحت کے لیے دعا فرماتے [۳] اور کہتے لا باس طہور ان شاء اللہ گھبرانے کی بات نہیں خیریت ہے کوئی جو بات ان کے خلاف کہتا تو ناپسند فرماتے۔ ایک دفعہ ایک اعرابی مدینہ میں آ کر بیمار پڑ گیا آپ ﷺ اس کی عیادت کو تشریف لے گئے اور کلمات تسکین ادا فرمائے اس نے کہا تم نے خیریت کہا شدید تپ ہے جو قبر میں ملا کر چھوڑے گی۔ آپ ﷺ نے فرمایا "ہاں اب یہی ہو گا"۔ [۴]

معمولات ملاقات:

معمول یہ تھا کہ کسی سے ملنے کے وقت ہمیشہ پہلے خود سلام اور مصافحہ کرتے، کوئی شخص اگر جھک کر آپ ﷺ کے کان میں کچھ بات کہتا تو اس وقت تک اس کی طرف سے رخ نہ پھیرتے جب تک وہ خود منہ نہ ہٹا لے۔ مصافحہ میں بھی یہی معمول تھا یعنی کسی سے ہاتھ ملاتے تو جب تک وہ خود نہ چھوڑ دے اس کا ہاتھ نہ چھوڑتے۔ مجلس میں بیٹھتے تو آپ کے زانو کبھی ہمنشینوں سے آگے نکلے ہوئے نہ ہوتے۔ [۵]

جو شخص حاضر ہونا چاہتا دروازے پر کھڑے ہو کر پہلے "السلام علیکم" کہتا پھر پوچھتا کہ کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟ (خود بھی آپ ﷺ کسی سے ملنے جاتے تو اسی طرح اجازت مانگتے) کوئی شخص اس طریقے کے خلاف کرتا تو آپ ﷺ اس کو واپس کر دیتے، ایک دفعہ بنو عامر کا ایک شخص آیا اور دروازہ پر کھڑا ہو کر پکارا کہ اندر آ سکتا ہوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "جا کر اس کو اجازت طلبی کا طریقہ سکھاؤ"۔ یعنی پہلے سلام کرے تب اجازت مانگے۔

ایک دفعہ صفوان بن امیہ نے جو قریش کے رئیس اعظم تھے آنحضرت ﷺ کے پاس اپنے بھائی کلدہ کے ہاتھ دودھ، ہرن کا بچہ اور ککڑیاں بھیجیں کلدہ یوں ہی بے اجازت چلے آئے آپ ﷺ نے فرمایا کہ واپس جاؤ اور سلام کر کے اندر آؤ۔ [۶]

ایک دفعہ حضرت جابرؓ زیارت کو آئے اور دروازہ پر دستک دی، آپ ﷺ نے پوچھا کون ہے؟ بولے "میں" آپ ﷺ نے فرمایا "میں میں" یعنی یہ کیا طریقہ ہے نام بتانا چاہیے۔

جب آپ ﷺ خود کسی کے گھر پر جاتے تو دروازہ کے دائیں یا بائیں جانب کھڑے ہو جاتے اور السلام علیکم کہہ

---

۱ مسند احمد بن حنبل جلد ۳ صفحہ ۶۶۔
۲ صحیح بخاری باب وضع الید علی المریض
۳ صحیح بخاری باب دعاء العائد للمریض۔
۴ صحیح بخاری باب علامات النبوۃ
۵ ترمذی [illegible]۔
۶ ابوداؤد، کتاب الادب جلد ۲ صفحہ [illegible] مطبوعہ مصر

کر اذن طلب فرماتے (راوی کا بیان ہے کہ آپ ﷺ ٹھیک دروازہ کے سامنے اس وجہ سے نہ کھڑے ہوتے کہ اس وقت تک دروازوں پر پردہ ڈالنے کا رواج نہ تھا) اگر صاحب خانہ اذن نہ دیتا تو پلٹ آتے چنانچہ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ سعدؓ بن عبادہ کے گھر تشریف لے گئے اور باہر کھڑے ہو کر اذن طلبی کے لیے "السلام علیکم ورحمۃ اللہ" کہا، سعد نے اس طرح آہستہ سلام کا جواب دیا کہ آنحضرت ﷺ نے نہیں سنا۔ حضرت سعدؓ کے فرزند قیس بن سعدؓ نے کہا کہ آپ رسول اللہ ﷺ کو اندر آنے کی اجازت کیوں نہیں دیتے؟ حضرت سعدؓ نے کہا چپ رہو، رسول اللہ ﷺ بار بار سلام کریں گے جو ہمارے لیے برکت کا سبب ہوگا۔ آنحضرت ﷺ نے دوبارہ السلام علیکم کہا اور سعدؓ نے پھر اسی طرح جواب دیا۔ آنحضرت ﷺ نے تیسری دفعہ پھر اسی طریقہ سے اذن طلب کیا اور جب کوئی جواب نہ ملا تو آپ واپس چلے۔ حضرت سعدؓ نے جب آپ ﷺ کو جاتے دیکھا تو دوڑ کر گئے اور عرض کی کہ میں آپ کا سلام سن رہا تھا لیکن آہستہ جواب دیتا تھا کہ آپ ﷺ بار بار سلام فرمائیں۔[1]

کسی کے گھر تشریف لے جاتے تو ممتاز مقام پر بیٹھنے سے پرہیز فرماتے، ایک بار آپ ﷺ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے مکان پر تشریف لے گئے انہوں نے آپ کے بیٹھنے کے لیے چمڑے کا ایک گدا ڈال دیا لیکن آپ ﷺ زمین پر بیٹھ گئے اور گدا آنحضرت ﷺ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے درمیان آگیا۔[2]

معمولات عامہ:

(ہر کام میں داہنی طرف سے یا داہنے ہاتھ سے کام کرنا آپ ﷺ کو محبوب تھا، جوتا پہلے داہنے پاؤں میں پہنتے، مسجد میں پہلے داہنا پاؤں رکھتے، مجلس میں کوئی چیز تقسیم فرماتے تو داہنی طرف سے، اسی طرح کسی کام کو شروع کرنا چاہتے تو پہلے بسم اللہ کہہ لیتے)

---

[1] [illegible]

[2] [illegible]

صبح کی مجلسوں میں کبھی کبھی آپ ﷺ وعظ فرماتے۔ ترمذی اور ابوداؤد میں عرباض بن ساریہؓ سے روایت ہے۔

﴿وعظنا رسول اللہ ﷺ یوما بعد صلوٰۃ الغداۃ موعظۃ بلیغۃ ذرفت منہا العیون ووجلت منہا القلوب﴾ [1]

رسول اللہ ﷺ نے ایک دن صبح کی نماز کے بعد ایک بلیغ وعظ کہا جس سے آنکھیں اشکبار ہوگئیں اور دل کانپ اٹھے۔

نماز کے بعد جو مجلس منعقد ہوتی اس میں وعظ و نصیحت اور اسی قسم کی جزئی باتوں پر گفتگو ہوتی تھی لیکن ان اوقات کے علاوہ آپ ﷺ خاص طور پر حقائق و معارف کے اظہار کے لیے مجالس منعقد فرماتے تھے یہی مجالس ہیں جن کی نسبت احادیث میں یہ الفاظ آتے ہیں۔

﴿کان یوما بارزا للناس﴾ [2]

آنحضرت ﷺ ایک دن عام طور پر لوگوں کے لیے باہر نکلے تھے۔

چونکہ افادہ عام ہوتا تھا اس لیے آپ ﷺ چاہتے تھے کہ کوئی شخص فیض سے محروم نہ رہنے پائے اس بناء پر جو لوگ ان مجالس میں آکر واپس چلے جاتے ان پر آپ ﷺ نہایت ناراض ہوتے آپ ﷺ ایک مرتبہ صحابہ کے ساتھ مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے کہ تین شخص آئے، ایک صاحب نے حلقہ میں تھوڑی سی جگہ خالی پائی، وہیں بیٹھ گئے دوسرے صاحب کو درمیان میں موقع نہیں ملا اس لیے سب کے پیچھے بیٹھے لیکن تیسرے صاحب واپس چلے گئے آنحضرت ﷺ جب فارغ ہوئے تو فرمایا کہ ان میں سے ایک نے خدا کی طرف پناہ لی خدا نے بھی اس کو پناہ دی ایک نے حیا کی خدا بھی اس سے شرمایا ایک نے خدا سے منہ پھیرا خدا نے بھی اس سے منہ پھیر لیا [3]

پند و نصائح کتنے ہی مؤثر طریقے سے بیان کیے جائیں لیکن ہمیشہ سنتے سنتے آدمی اکتا جاتا ہے اور نصائح بے اثر ہو جاتے ہیں اس بناء پر آنحضرت ﷺ وعظ و نصائح کی مجلس ناغہ دے کر منعقد فرماتے تھے۔ بخاری میں ابن مسعودؓ سے روایت ہے۔

﴿کان النبی ﷺ یتخولنا بالموعظۃ فی الایام کراھۃ السآمۃ علینا﴾

آنحضرت ﷺ ہم لوگوں کو ناغہ دے کر نصیحت فرماتے تھے کہ ہم لوگ اکتا نہ جائیں۔

عورتوں کے لیے مخصوص مجلس:

ان مجالس کا فیض زیادہ تر مردوں تک محدود تھا اور عورتوں کو موقع کم ملتا تھا اس بناء پر عورتوں نے درخواست کی کہ ہمارے لیے خاص دن مقرر فرما دیا جائے آنحضرت ﷺ نے یہ درخواست منظور کی اور ان کے وعظ و ارشاد کے لیے

[1] ترمذی صفحہ ۴۳۰۔

[2] سنن ابن ماجہ صفحہ ۱۴۲۔

[3] بخاری جلد اصفحہ ۱۶ کتاب العلم۔

نے تقریر یہ کہہ کے ختم کی کہ اگر میرا اور میرے ساتھی کا مقابلہ ہو تو اس میں تمہارا کیا جاتا ہے؟ مخاطب نے جواب دیا میری رائے میں کچھ ثواب نہ ملے گا۔ تیسرے آدمی نے یہ گفتگو سن کر کہا میرے نزدیک اس میں کوئی حرج نہیں اس پر دونوں میں اختلاف ہوا، آنحضرت ﷺ نے ان کی گفتگو سن کر فرمایا "ثواب اور شہرت دونوں میں کوئی مخالفت نہیں۔" ۱

عام خیال یہ تھا کہ تقدیر کے مطلب کے بیان کرنے کا نام تقدیر ہے تقدیر میں جو کچھ لکھا ہوگا اس کو کوئی عمل خلاف نہیں کر سکتا۔ آنحضرت ﷺ نے ایک مجلس میں جو منعقد ہوئی تھی اس خیال کی تردید کی اور فرمایا کہ اعمال تو خود تقدیر ہیں انسان کو خدا جن اعمال کی توفیق دیتا ہے وہی اس کا نوشتۂ تقدیر ہیں اس لیے توکل قوت عمل کے بیکار کر دینے کا نام نہیں چنانچہ صحابہ ایک جنازہ میں شریک تھے آنحضرت ﷺ تشریف لائے اور صحابہ جمع ہو گئے آپ ﷺ کے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی اس سے زمین کریدنے لگے پھر فرمایا تم میں کوئی ایسا نہیں ہے جس کی جگہ جنت یا دوزخ میں لکھی نہ جا چکی ہو۔ ایک شخص نے کہا تو ہم اپنی تقدیر پر توکل کر کے عمل کیوں نہ چھوڑ دیں جو شخص سعادت مند ہوگا وہ خود بخود سعادت مندوں میں داخل ہو جائے گا اور جو شخص بدبخت ہوگا وہ بدبختوں سے مل جائے گا آپ ﷺ نے فرمایا سعادت مند وہ لوگ ہیں جن کو سعادت مندوں کے عمل کی توفیق دی جاتی ہے اور بدبخت وہ ہیں جن کے لیے شقاوت کے کام کے اسباب مہیا ہو جاتے ہیں۔ ۲

مجالس میں شگفتہ مزاجی:

باوجود اس کے کہ ان مجالس میں سرتاسر ہدایت، ارشاد، اخلاق اور تزکیہ نفس کی باتیں ہوتی تھیں اور صحابہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں اس طرح بیٹھتے تھے [illegible] تاہم یہ مجلسیں شگفتہ مزاجی کے اثرات سے خالی نہ تھیں ایک دن آپ ﷺ نے ایک مجلس میں بیان فرمایا کہ جنت میں ایک شخص نے کھیتی کرنے کی خواہش کی، خدا نے کہا کیا تمہاری خواہشیں پوری نہیں ہوئی ہیں؟ اس نے کہا ہاں لیکن میں چاہتا ہوں کہ خود بوؤں اور ساتھ ہی تیار ہو جائے چنانچہ اس نے بیج ڈالے فوراً دانا اگا، بڑھا اور کٹنے کے قابل ہو گیا۔ ایک بدو بیٹھا ہوا تھا اس نے کہا یہ سعادت صرف قریش یا انصاری کو نصیب ہوگی جو زراعت پیشہ ہیں لیکن ہم لوگ تو کاشتکار نہیں، آپ ﷺ ہنس پڑے۔ ۳

ایک دفعہ ایک صاحب خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ میں تباہ ہو گیا۔ ارشاد ہوا کیوں؟ بولے میں نے رمضان میں بیوی سے ہمبستری کی، آپ ﷺ نے فرمایا ایک غلام آزاد کرو، بولے غریب ہوں غلام کہاں سے لاؤں؟ ارشاد ہوا دو مہینے کے روزے رکھو، بولے یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا، فرمایا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلاؤ، بولے اتنا مقدور نہیں۔ اتفاق سے کہیں سے زنبیل بھر کر کھجوریں آ گئیں آپ ﷺ نے فرمایا لو غریبوں کو خیرات کر دو، عرض کی کہ خدا کی قسم جس نے آپ ﷺ کو پیغمبر بنا کر بھیجا ہے مدینہ میں مجھ سے بڑھ کر کوئی غریب نہیں، آپ ﷺ بے ساختہ ہنس پڑے اور فرمایا جاؤ تم

---

۱ ابو داؤد جلد ۲ صفحہ ۱۱۲۔

۲ بخاری جلد ۲ صفحہ ۷۴۰ تفسیر سورۂ واللیل۔

۳ بخاری جلد ۲ صفحہ ۱۱۲۴ باب کلام الرب مع اہل الجنۃ۔

خود ہی کھالو۔ [۱]

فیض صحبت:

ایک دفعہ حضرت ابوہریرہؓ نے عرض کی کہ ہم جب خدمت اقدس میں حاضر ہوتے ہیں تو دنیا ہیچ معلوم ہوتی ہے لیکن جب گھر میں بال بچوں تک پہنچتے ہیں تو حالت بدل جاتی ہے آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر ایک سا حال رہتا تو فرشتے تمہاری زیارت کو آتے۔ [۲]

ایک دفعہ حضرت حنظلہؓ خدمت اقدس میں آئے اور کہا یا رسول اللہ ﷺ! میں منافق ہو گیا ہوں میں جب خدمت اقدس میں حاضر ہوتا ہوں اور آپ ﷺ دوزخ و جنت کا ذکر فرماتے ہیں تو یہ چیزیں آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہیں لیکن بال بچوں میں آ کر سب بھول جاتا ہوں ارشاد ہوا کہ اگر باہر نکل کر بھی وہی حالت رہتی تو فرشتے تم سے مصافحہ کرتے۔ [۳]

---

۱ بخاری صفحہ ۹۵۸ باب فضل الفقر علی الغنی۔
۲ ترمذی شریف باب ماجاء فی صفۃ الجنۃ و نعیمہا، ترمذی کے نزدیک یہ حدیث قوی نہیں۔
۳ ترمذی ابواب الزہد و صحیح مسلم کتاب التوبہ۔

خطابتِ نبوی ﷺ

خطابت — و تقریر نبوت کا نہایت ضروری عنصر ہے اسی بنا پر جب خدا نے حضرت موسیٰؑ کو فرعون کے پاس پیغمبر بنا کر بھیجا تو ان کو یہ دعا مانگنی پڑی۔

﴿وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ ٥ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ﴾

خداوند میری زبان کی گرہ کھول کہ لوگ میری بات سمجھیں۔

لیکن سید الانبیاء ﷺ کو خود بارگاہ الٰہی سے یہ وصف کامل عطا کیا گیا تھا چنانچہ آپ ﷺ نے تحدیث نعمت کے طور پر فرمایا۔

﴿انا افصح العرب بعثت بجوامع الكلم﴾

میں فصیح ترین عرب ہوں میں کلمات جامعہ دے کر مبعوث ہوا ہوں۔

عرب میں اگرچہ ہر قبیلہ فصاحت و بلاغت کا مدعی تھا تاہم تمام عرب میں دو قبیلے اس وصف میں نمایاں امتیاز رکھتے تھے قریش اور بنو ہوازن، قریش خود آنحضرت ﷺ کا قبیلہ تھا اور بنو ہوازن کے قبیلہ میں آپ نے پرورش پائی تھی اس لیے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے۔

﴿انا اعربكم انا من قريش ولساني لسان بني سعد بن بكر﴾ [1]

میں تم میں فصیح تر ہوں قریشی ہوں اور میری زبان بنو سعد کی زبان ہے۔ [2]

طرز بیان:

آنحضرت ﷺ نہایت سادہ طریقہ پر خطبہ دیتے تھے آپ ﷺ جب اپنے حجرے سے خطبہ دینے کے لیے نکلتے تھے تو سلاطین کی طرح نہ آپ ﷺ کے ساتھ چاؤش ہوتے تھے نہ آپ ﷺ خطباء کا لباس پہنتے تھے ہاتھ میں صرف ایک عصا ہوتا تھا اور کبھی کبھی کمان پر ٹیک لگا کر خطبہ دیتے تھے۔ [3] اس وجہ سے کہ مسجد میں جب آپ ﷺ خطبہ دیتے تو دست مبارک میں عصا ہوتا تھا اور میدان جنگ میں خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوتے تو کمان پر ٹیک لگاتے تھے۔

جمعہ اور عید کا خطبہ تو معین تھا لیکن اس کے علاوہ خطبہ کا کوئی وقت مقرر نہ تھا جب ضرورت پیش آتی آپ ﷺ فی البدیہہ خطبہ کے لیے تیار ہو جاتے تھے یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ نے زمین پر، منبر پر، اونٹ پر جس جگہ جیسا موقع پیش آیا ہے خطبہ دیا ہے ضرورت کے لحاظ سے اگرچہ آپ ﷺ کو کبھی کبھی طویل خطبہ بھی دینا پڑتا تھا تاہم آپ ﷺ کے خطبے عموماً مختصر ہوتے تھے۔

عام نصائح اور پند کی باتیں گو آپ ﷺ اختیاری تقریروں میں بیان فرماتے لیکن جب کلام کو خاص طور پر موثر بنانا

---

۱ الفائق ج باب۔

۲ طبقات ابن سعد ج اول۔

۳ بنو سعد قبیلہ ہوازن کی ایک شاخ ہے۔

۴ ابو داؤد کتاب الصلوٰۃ باب الرجل یخطب علی قوس۔

نکالا ہے۔ آپ ﷺ نے صفا پر چڑھ کر پکارا "یا صباحاہ" یہ وہ لفظ ہے جو عرب میں اس وقت بولا جاتا ہے جب صبح کے وقت کوئی قبیلہ کسی قبیلہ پر دفعۃً غارت گری کے لیے ٹوٹ پڑتا ہے تمام لوگ یہ لفظ سن کر چونک اٹھے اور آپ ﷺ کے گرد جمع ہو گئے آپ ﷺ نے فرمایا۔

﴿ أرأيتم إن أخبرتكم أن خيلا تخرج من سفح هذا الجبل أكنتم مصدقي؟ ﴾

تو اگر میں تمہیں یہ خبر دوں کہ اس پہاڑ کے دامن سے ایک فوج نکلا چاہتی ہے تو کیا تم میری تصدیق کرو گے؟

سب نے جواب دیا "ہاں" اب تک آپ کی نسبت ہم کو کسی قسم کی دروغ گوئی کا تجربہ نہیں ہوا ہے جب آپ نے یہ اقرار لے لیا تو فرمایا۔

﴿ فإني نذير لكم بين يدي عذاب شديد ﴾

میں تمہیں ایک سخت عذاب سے ڈراتا ہوں جو تمہارے سامنے ہے۔

ابولہب نے نہایت استخفاف کے ساتھ کہا "کیا ہم کو اسی لیے جمع کیا تھا" یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ [1]

غزوہ حنین میں آپ ﷺ نے تمام مال غنیمت مؤلفۃ القلوب کو دے دیا اور انصار بالکل محروم رہ گئے تو چند نوجوانوں کو یہ نہایت ناگوار ہوا اور انہوں نے کہا "خدا پیغمبر کی مغفرت کرے، قریش کو دیتا ہے اور ہم کو چھوڑ دیتا ہے حالانکہ ہماری تلواروں سے خون ٹپک رہا ہے۔" آنحضرت ﷺ کو خبر ہوئی تو تمام انصار کو ایک خیمہ میں جمع کر کے اصل حقیقت دریافت فرمائی لوگوں نے کہا چند نوجوانوں نے یہ کہا ہے لیکن ہم میں جو لوگ صاحب الرائے اور سردار ہیں انہوں نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔" اب آپ ﷺ نے اس موقع پر کھڑے ہو کر ایک خطبہ دیا۔

﴿ يا معشر الأنصار ألم أجدكم ضلالا فهداكم الله بي وكنتم متفرقين فألفكم الله بي وعالة فأغناكم الله بي ﴾

اے گروہ انصار! کیا میں نے تم کو گمراہ نہیں پایا پھر خدا نے میری وجہ سے تمہیں ہدایت دی، تم متفرق تھے خدا نے میری وجہ سے تم کو متحد کر دیا، تم محتاج تھے خدا نے میری وجہ سے تم کو غنی کر دیا۔

انصار ہر بات پر کہتے جاتے تھے "خدا اور اس کا رسول بہت امین ہے" آپ ﷺ نے فرمایا "یہ کیوں نہیں کہتے کہ اے محمد! تم اس حالت میں آئے تھے کہ لوگ تمہاری تکذیب کرتے تھے ہم نے تمہاری تصدیق کی، تمہارا کوئی مددگار نہ تھا ہم نے تمہاری مدد کی، تم گھر سے نکالے ہوئے تھے ہم نے تم کو گھر دیا، تم محتاج تھے ہم نے تمہاری غم خواری کی"۔ اس کے بعد آپ نے اصل اعتراض کا جواب دیا۔

﴿ أترضون أن يذهب الناس بالشاة والبعير وتذهبون بالنبي إلى رحالكم فوالله لما تنقلبون به خير مما ينقلبون ﴾

کیا تم یہ نہیں پسند کرتے کہ لوگ اونٹ اور بکریاں لے کر جائیں اور تم اپنے گھروں میں پیغمبر کو لے کر جاؤ، خدا کی قسم تم جو چیز لے کر واپس جاتے ہو وہ اس سے بہتر ہے جس کو وہ لوگ لے کر جاتے ہیں۔

---

[1] [illegible] نزول [illegible] صحیح بخاری [illegible]

اس پر تمام انصار پکار اٹھے "رضینا" یعنی ہم سب راضی ہیں۔[1] اس خطبہ کے وجوہ بلاغت پر گو غور کیا جائے تو ایک مختصر سا رسالہ تیار ہو سکتا ہے۔ واقعات حیثیت سے آپ ﷺ نے صرف فتح مکہ کے موقع پر ایک تقریر کی تھی جس کے چند چند فقرے احادیث کی کتابوں میں مذکور ہیں۔ مکہ عرب کے نزدیک نہایت مقدس شہر تھا، حرم ایک دارالامان تھا، جس میں کبھی خونریزی نہیں ہو سکتی تھی فتح مکہ میں سب سے پہلے اس کے دامن عظمت پر خون کا دھبہ لگایا گیا اور چونکہ مذہب کے ہاتھ سے لگایا گیا تھا اس لیے خیال پیدا ہو سکتا تھا کہ ہمیشہ کے لیے اس کا یہ احترام مٹ جائے۔ آنحضرت ﷺ کو انہی دونوں پہلوؤں پر اپنی تقریر میں زور دینا تھا، چنانچہ آپ نے بہ ترتیب ان ہی کی طرف توجہ کی۔ سب سے پہلے آپ ﷺ نے صحابہ کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا۔

﴿ان الله حرم مكة يوم خلق السموات والارض فهي حرام بحرام الله الى يوم القيمة لم تحل لاحد قبلي ولا تحل لاحد بعدي ولم تحلل لي قط الا ساعة من الدهر لا ينفر صيدها ولا يعضد شوكها ولا يختلى خلاها ولا تحل لقطتها الا لمنشد﴾

خدا نے جس دن آسمان اور زمین کو پیدا کیا اسی دن مکہ کو حرام کر دیا، پس وہ بحرمت خدا حرام ہے، وہ میرے پہلے نہ کسی پر حلال ہوا اور نہ میرے بعد حلال ہوگا اور میرے لیے بھی صرف چند گھنٹوں کے ہرگز حلال نہیں ہوا، اس کے شکاروں کو بھگایا جا سکتا ہے نہ اس کا کانٹا کاٹا جا سکتا ہے نہ اس کی گھاس کاٹی جا سکتی ہے نہ اس کی گم شدہ چیز اٹھائی جا سکتی ہے بجز اس شخص کے جو اس کو مشتہر کرنا چاہتا ہے۔

آنحضرت ﷺ کا سب سے اہم اور بالشان خطبہ وہ ہے جو آپ ﷺ نے حجۃ الوداع میں دیا تھا، یہ خطبہ صرف احکام کا ایک سادہ مجموعہ ہے جس کو قدرتاً خشک اور روکھا پھیکا ہونا چاہیے تاہم سلاست، روانی اور شستگی الفاظ کے لحاظ سے یہ خطبہ بھی اور خطبوں سے کم نہیں، آپ نے حمد و نعت کے بعد اس خطبہ کی اہمیت اس طرح ظاہر کی۔

﴿ايها الناس اسمعوا فاني لا ادري لعلي لا القاكم بعد عامي هذا في موقفي هذا في شهركم هذا في بلدكم هذا﴾

لوگو! سنو! کیونکہ شاید میں اس سال کے بعد اس جگہ اس مہینے میں اس شہر میں تم سے نہ مل سکوں۔

سادہ سا جملہ یہ تھا کہ "غالباً یہ میری عمر کا آخری سال ہے" لیکن اس تفصیل اور اس طرز بیان نے اس مضمون کو اور بھی زوردار بنا دیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ مسلمانوں کی عزت، آبرو، جان و مال سب مسلمانوں پر حرام ہے۔ اس مطلب کو اس بلیغ طریقے سے ادا کیا ہے۔

﴿اتدرون اي يوم هذا؟ قالوا الله ورسوله اعلم قال فان هذا يوم حرام افتدرون اي بلد هذا؟ قالوا الله ورسوله اعلم قال بلد حرام قال اتدرون اي شهر هذا؟ قالوا الله ورسوله اعلم قال شهر حرام﴾

کیا جانتے ہو کہ یہ کون سا دن ہے؟ لوگوں نے کہا خدا اور رسول کو اس کا علم ہے آپ ﷺ نے فرمایا یہ یوم الحرام

[1] صحیح بخاری غزوۂ حنین۔

ہے کیا جانتے ہو کہ یہ کون سا شہر ہے؟ لوگوں نے کہا خدا اور رسول کو اس کا علم ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا بلد الحرام ہے۔ کیا جانتے ہو یہ کون سا مہینہ ہے؟ لوگوں نے کہا خدا اور رسول کو اس کا علم ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا شہر حرام ہے۔

اس طرح جب لوگوں کے دل میں اس دن، اس مہینہ اور اس شہر کی حرمت کا خیال تازہ ہو گیا تو آپ ﷺ نے اصل مقصود کو بیان فرمایا۔

﴿ان اللہ حرم علیکم دماءکم و اموالکم و اعراضکم کحرمۃ یومکم ھذا فی شہرکم ھذا فی بلدکم ھذا لا ترجعوا بعدی کفارا یضرب بعضکم رقاب بعض﴾

خدا نے تمہارا خون، تمہارا مال، تمہاری آبرو تم پر اس مہینہ میں اس شہر میں اس دن کی حرمت کی طرح حرام کیا میرے بعد کافر نہ ہو جانا کہ تم میں ہر ایک دوسرے کی گردن مارے۔

آپ ﷺ نے ان الفاظ میں مساوات کی تعلیم دی ہے۔

﴿ان ربکم واحد وان اباکم واحد کلکم من آدم و آدم من تراب ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم﴾

تمہارا خدا ایک، تمہارا باپ ایک، تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی کے تھے خدا کے نزدیک تم میں شریف تر وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔

عرب کا عام ذریعہ معاش غارت گری تھی، لیکن شہر حرم کے چار مہینے تک وہ لوگ بیکار نہیں رہ سکتے تھے اس لیے ان مہینوں کو اول بدل لیا کرتے تھے جس کو نسی کہتے ہیں، قرآن مجید نے اس کی ممانعت کی۔

﴿اِنَّمَا النَّسِیْٓءُ زِیَادَۃٌ فِی الْکُفْرِ﴾

نسی کفر میں اضافہ کرنا ہے۔

آپ نے اپنے خطبہ میں اس کا اعلان ان الفاظ میں فرمایا۔

﴿ان الزمان قد استدار کہیئتہ یوم خلق اللہ السموات و الارض﴾

زمانہ پھیر کھا کر اسی مرکز پر آ گیا جیسا کہ اس دن تھا جب خدا نے آسمان و زمین کو پیدا کیا تھا۔

ان حیثیتوں کے علاوہ آپ ﷺ کی حیثیت ایک معلم اور واعظ کی تھی آپ نے اس حیثیت سے جو خطبے دیئے ہیں وہ اگرچہ نہایت سادہ ہیں تاہم ان میں بھی بلاغت کا اسلوب موجود ہے ایک اخلاقی واعظ کے لیے وسیع و ترکیب شاندار الفاظ اور تشبیہ و استعارہ کی ضرورت نہیں ہوتی، اس کو صرف سادہ الفاظ، واضح جملے اور مختصر ترکیبوں سے مطالب کو ذہن نشین کرنا پڑتا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اس حیثیت سے جو خطبے دیئے ہیں وہ تمام تر اسی قسم کے ہیں مدینہ آ کر سب سے پہلا فقرہ جو زبان مبارک سے نکلا یہ تھا۔

﴿یا ایہا الناس افشوا السلام واطعموا الطعام وصلوا والناس نیام تدخلوا الجنۃ بسلام﴾

اثر انگیزی:

خطبات نبوی ﷺ کی تاثیر اور رقت انگیزی میں درحقیقت معجزانہ اثر تھا، پتھر سے پتھر دل بھی ان کو سن کر چند لمحوں میں موم ہو جاتے تھے۔ مکہ میں ایک دفعہ آپ ﷺ نے سورۂ والنجم کی آیتیں تلاوت کر کے سنائیں تو یہ اثر ہوا کہ آپ کے ساتھ مسلمان تو مسلمان بڑے بڑے کفار بھی سجدہ میں گر پڑے۔ ١

آنحضرت ﷺ کے زمانہ جاہلیت کے ایک دوست جو جھاڑ پھونک کیا کرتے تھے یہ سن کر کہ نعوذ باللہ آپ کو جنون ہے بغرض علاج آئے۔ آپ ﷺ نے ان کے سامنے مختصر سی تقریر کی۔ انہوں نے کہا کہ ذرا اس کو پھر تو دہرانا۔ غرض آپ نے کئی بار تقریر دہرائی تو آخر میں انہوں نے کہا "میں نے شاعروں کے قصیدے اور کاہنوں کے کلام سنے ہیں لیکن یہ تو چیز ہی اور ہے۔" ٢

ایک دفعہ ایک مسلم قبیلہ ہجرت کر کے مدینہ آیا۔ آپ ﷺ نے ان کی امداد کی ضرورت بتائی۔ مسجد نبوی میں تمام مسلمان جمع ہوئے تو آپ ﷺ نے ایک خطبہ دیا جس میں قرآن مجید کی یہ آیت پڑھی کہ تمام انسان ایک ہی نسل سے ہیں یعنی

﴿یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ﴾

اے لوگو! اس خدا سے ڈرو جس نے ایک ذات سے تم سب کو پیدا کیا۔

پھر سورۂ حشر کی یہ آیت تلاوت کی

﴿وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ﴾

اس کے بعد فرمایا "درہم، کپڑا، غلہ بلکہ چھوہارے کا ایک ٹکڑا جو ہو راہ خدا میں دو۔" مدینہ کے مسلمانوں کی مالی حالت جیسی کچھ تھی وہ سیرت کے ہر صفحے سے ظاہر ہے لیکن باایں ہمہ آپ ﷺ کی رقت انگیز اور موثر تقریر سے یہ عالم پیدا ہو گیا کہ ہر صحابی کے پاس جو کچھ تھا اس نے سامنے رکھ دیا۔ بعضوں نے اپنے کپڑے اتار دیئے، کسی نے گھر کا غلہ لا کر دے دیا۔ ایک انصاری گئے اور گھر سے اشرفیوں کا ایک توڑا اٹھا لائے جو اس قدر بھاری تھا کہ بمشکل ان سے اٹھ سکتا تھا۔ راوی کا بیان ہے کہ تھوڑی دیر کے بعد آپ ﷺ کے سامنے غلہ اور کپڑے کے دو بڑے ڈھیر لگ گئے اور خوشی سے آپ ﷺ کا چہرہ کندن کی طرح دمکنے لگا۔ ٣

سخت سے سخت اشتعال انگیز اوقات میں آپ ﷺ کے چند فقرے معاملہ کو رفع دفع کر کے جوش محبت کا دریا بہا دیتے تھے۔ اوس و خزرج کی سالہا سال کی عداوتیں اسی اعجاز کی بدولت مبدل بہ محبت ہو گئیں۔ غزوۂ بدر سے پہلے ایک دفعہ آپ ﷺ سوار ہو کر نکلے۔ مسلمان اور منافقین یکجا بیٹھے ہوئے تھے۔ مسلمانوں نے تو ادب سے سلام کیا لیکن منافقین نے ایک گستاخانہ فقرہ استعمال کیا۔ یہ چنگاری تھی جس نے خرمن میں آگ لگا دی۔ قریب تھا کہ جنگ و جدل برپا ہو جائے لیکن آپ ﷺ کے چند فقروں نے آگ پر پانی ڈال دیا۔ ٤

---

١ صحیح مسلم کتاب الجمعہ۔

٢ صحیح مسلم باب تخفیف الصلوٰۃ والخطبۃ۔

٣ صحیح مسلم باب الصدقۃ۔

٤ صحیح بخاری باب التسلیم فی مجلس فیہ اخلاط۔

غزوہ مصطلق سے واپسی میں ایک واقعہ پر بعض منافقین نے اشتعال پیدا کیا اور بہت ممکن تھا کہ مہاجرین و انصار باہم دست و گریبان ہو جائیں کہ عین وقت پر آنحضرت ﷺ کو خبر ہوئی آپ ﷺ تشریف لائے تو اس طرح تقریر فرمائی کہ چند لمحوں میں مہاجرین و انصار پھر شیر و شکر تھے۔ ۱ واقعہ افک میں اوس و خزرج میں اس قدر اختلاف پیدا ہوا کہ خاص مسجد نبوی میں شاید تلواریں نیام سے نکل پڑتیں آپ ﷺ منبر پر تشریف فرما تھے آپ نے مختصر تقریر فرمائی اور اثر یہ تھا کہ برادرانہ محبت کی لہریں پھر جاری ہو گئیں۔ ۲

غزوہ حنین میں مال غنیمت کی تقسیم پر جب انصار میں آزردگی پیدا ہوئی تھی اس وقت آپ ﷺ نے جس پیرایہ انداز میں تقریر فرمائی ہے اس کو مختصر سا ذکر وہ پڑھ چکا ہے۔ اس تقریر کا کیا اثر ہوا؟ یہ تو آگاہ وہی انصار جو چند لمحے پہلے کبیدہ خاطر ہو رہے تھے اس قدر روئے کہ ان کی داڑھیاں تر ہو گئیں اور دل کا سارا غبار آب کوثر کے ان قطروں سے دھل گیا۔ ۳

فتح مکہ کے موقع پر انصار کی توقع کے خلاف جب آپ ﷺ نے رؤسائے قریش کی جان بخشی فرمائی تو ان میں سے وہ لوگ جن کی آنکھوں میں حلم نبوی ﷺ کا جلوہ نہ تھا معترض ہوئے کہ "آخر آپ کو اپنے وطن و خاندان کی محبت آ ہی گئی" آپ ﷺ کو یہ معلوم ہوا تو تمام انصار کو جمع کر کے دریافت کیا کہ کیا یہ سچ ہے جو تم نے کہا ہے؟ عرض کی ہاں یا رسول اللہ! فرمایا "وطن و خاندان کی محبت میرے پیش نظر تھی؟ میں خدا کا بندہ اور اس کا قاصد ہوں میں نے اللہ کی طرف ہجرت کی اور تمہاری طرف اب میرا جینا تمہارا جینا ہے اور میرا مرنا تمہارا مرنا ہے۔" یہ سن کر انصار پر رقت طاری ہو گئی اور رونے لگے۔

وعظ و نصیحت میں جو خطبات آپ ارشاد فرماتے تھے وہ بھی اسی قدر موثر ہوتے تھے۔ ایک صحابی موقع کی تصویر ان الفاظ میں کھینچتے ہیں

﴿وعظنا رسول الله ﷺ يوما بعد صلوة الغداة موعظة بليغة ذرفت منها العيون و وجلت منها القلوب﴾ [ترمذی ابواب العلم]

صبح کی نماز کے بعد آنحضرت ﷺ نے ایک دن نہایت موثر وعظ کہا کہ آنکھیں اشکبار ہو گئیں اور دل کانپ اٹھے۔

ایک اور مجلس وعظ کے تاثر کی کیفیت حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ بیان کرتی ہیں۔

﴿قام رسول الله ﷺ خطيبا فذكر فتنة القبر التي يفتتن بها المرء فلما ذكر ذلك ضج المسلمون ضجة﴾ ۴

آنحضرت ﷺ خطبہ دینے کو کھڑے ہوئے اور اس میں قبر کے فتنہ کا ذکر کیا جس میں انسان کی آزمائش کی جاتی ہے تو

۱۔ صحیح بخاری تفسیر منافقین و امن غزوہ مذکور۔
۲۔ صحیح بخاری واقعہ افک
۳۔ صحیح مسلم فتح مکہ۔
۴۔ صحیح بخاری باب عذاب قبر

جب بیان کیا تو مسلمان چیخ اٹھے۔

حضرت ابوہریرہؓ اور ابوسعیدؓ سے مروی ہے کہ ایک دفعہ آپ خطبہ دے رہے تھے کہ آپ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ نکلے ﴿والذی نفسی بیدہ﴾ قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے، یہ الفاظ آپ نے تین دفعہ فرمائے اور پھر جھک گئے۔ لوگوں پر یہ اثر ہوا کہ جو جہاں تھا وہیں سر جھکا کر رونے لگا۔ راوی کہتے ہیں کہ ہم کو بھی ہوش نہ رہا کہ آپ ﷺ کس بات پر کھا رہے ہیں۔[1]

حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ ایک دن آپ نے خطبہ دیا یہ خطبہ اس قدر موثر تھا کہ میں نے ایسا خطبہ نہیں سنا، اثنائے تقریر میں آپ نے فرمایا "اے لوگو! جو میں جانتا ہوں اگر تم وہ جانتے تو ہنستے کم اور روتے زیادہ" اس فقرہ کا ادا ہونا تھا کہ لوگوں کی یہ حالت ہوگئی کہ منہ پر کپڑے ڈال کر بے اختیار رونے لگے۔[2]

1. سنن نسائی کتاب الزکوٰۃ۔
2. صحیح بخاری تفسیر سورہ مائدہ۔

عبادات نبوی ﷺ

﴿فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ وَاِلٰی رَبِّکَ فَارْغَبْ﴾

اے محمد! جب تجھے فرصت ملے عبادت کے لیے کمر سے جھاڑو اور پھر رب سے دل لگاؤ۔

دنیا میں آنحضرت ﷺ کے سوا اور کوئی پیغمبر ایسا نہیں گزرا جس کے متعلق صحیح طور پر معلوم ہو سکے کہ اس کا طریقہ عبادت کیا تھا؟ اس کے کون کون سے اوقات اس کے لیے مخصوص تھے؟ اور اس کی عبادتوں کی کیفیت کیا تھی؟ گذشتہ انبیاء میں حضرت نوح بلکہ آدم سے لے کر حضرت موسیٰ تک کے حالات تو اس قدر مذکور ہیں ان کی زندگی کا یہ باب صحف بنی اسرائیل سے مفقود ہے۔ انجیل میں حضرت عیسیٰ کے متعلق کہیں کہیں صرف اس قدر ملتا ہے کہ وہ کبھی کبھی دعائیں مانگا کرتے تھے لیکن جب کہ ان مذاہب کے پیروؤں نے اپنے پیغمبروں کے ساتھ یہ قلت اعتنائی برتی ہے کہ ضروری امور بھی جن پر دین و شریعت کا دار و مدار ہے ان کو محفوظ نہیں رکھ سکے۔ یہ دین اسلام کو فخر ہے کہ انہوں نے نہ صرف اپنے پیغمبر کے اوقات عبادات ان کے طریقے ان کے نوافل اور ان کی کیفیات غرض ان کی ایک ایک جزئیات کو محفوظ رکھا ہے۔

دعا اور نماز:

آنحضرت ﷺ نبوت سے پہلے بھی عبادات الٰہی میں مصروف رہتے تھے اور غار حرا میں جا کر کئی کئی دن قیام اور مراقبہ کرتے تھے۔[1] نبوت کے ساتھ آپ ﷺ کو نماز کا طریقہ بھی بتایا گیا لیکن چونکہ کفار قریش کا ڈر تھا اس سبب چھپ کر نماز ادا کرتے تھے۔ نماز کا وقت جب آتا کسی پہاڑ کی گھاٹی میں چلے جاتے اور وہاں نماز پڑھ لیتے۔ ایک دفعہ آپ ﷺ حضرت علیؓ کے ساتھ کسی درہ میں نماز پڑھ رہے تھے اتفاق سے ابوطالب آ نکلے۔ انہوں نے دیکھا تو پوچھا "بھتیجے! یہ تم کیا کر رہے ہو؟" آپ ﷺ نے ان کو اسلام کی دعوت دی۔[2]

چاشت کی نماز آپ ﷺ سب کے سامنے حرم میں ادا کرتے تھے کیونکہ یہ نماز قریش کے مذہب میں بھی جائز تھی۔[3] صحیح بخاری میں ہے کہ ایک دن آپ ﷺ حرم میں نماز پڑھ رہے تھے اور وہاں قریش بیٹھے ہوئے تھے ابوجہل نے کہا "کاش اس وقت کوئی جاتا اور اونٹ کی اوجھ نجاست سمیت اٹھا لاتا اور محمد جب سجدہ میں جاتے تو ان کی گردن پر ڈال دیتا"۔ چنانچہ اس تجویز کے مطابق عقبہ نے انجام دیا۔[5] نماز میں جب آپ ﷺ جہر سے قرات

---

۱ اضافہ مصحح ہے۔

۲ صحیح بخاری باب بدء الوحی۔

۳ مسند ابن حنبل جلد ۱ صفحہ ۱۵۔

۴ ایضاً۔

۵ صحیح بخاری [illegible]

فرماتے تو کفار برا بھلا کہتے۔ [1] ایک دفعہ آپ ﷺ حرم میں نماز ادا کر رہے تھے بعض اشقیاء نے چاہا کہ آپ ﷺ کے ساتھ گستاخی سے پیش آئیں۔ [2] ایک دفعہ ایک شقی نے گلے میں پھانسی ڈال دی۔ [3] لیکن باایں ہمہ مزاحمت کثرت مشاغل یاد الٰہی اپنے فرض سے باز نہیں آتا تھا۔

راتوں کو اٹھ اٹھ کر آپ ﷺ نمازیں پڑھا کرتے تھے اس عبادت شبانہ کے متعلق مختلف روایتیں ہیں۔ ایک راوی کا بیان ہے کہ آپ ﷺ رات بھر نماز میں کھڑے رہتے، دوسرے راوی کہتے ہیں کہ آپ ﷺ کچھ دیر سوتے پھر کچھ دیر اٹھ کر نماز میں مصروف ہوتے پھر سو جاتے پھر اٹھ بیٹھتے اور نماز ادا کرتے غرض صبح تک یہی حالت قائم رہتی۔ ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ آدھی رات کے بعد آپ ﷺ اٹھتے تھے اور ۱۳ رکعتیں ادا کرتے تھے حضرت عائشہؓ کی روایت ۹ رکعت کی ہے محدثین نے ان سب میں تطبیق دی ہے کہ آپ ﷺ ان طریقوں میں سے ہر ایک طریقے سے نماز ادا کرتے تھے ہر راوی نے اپنا مشاہدہ بیان کیا ہے [4] عام طور پر آخر میں آپ ﷺ کا طرز عمل وہی تھا جو حضرت عائشہؓ اور ابن عباسؓ کی زبانی عبادت شبانہ کے عنوان میں گزر چکا ہے۔

فرائض پنج گانہ کے علاوہ آپ ﷺ کم از کم سنن و نوافل کی ۳۹ رکعتیں روزانہ معمولاً ادا کرتے تھے۔ دو صبح، چار چاشت، چھ ظہر، چار عصر (چار پہلے اور دو بعد نماز، حسب روایت حضرت عائشہؓ) دو مغرب، چھ عشاء، تیرہ تہجد و وتر ان کے علاوہ صلوٰۃ الاوابین، سنت تحیۃ المسجد وغیرہ الگ تھیں تمام سنن میں سب سے زیادہ صبح کی دو رکعتوں کے آپ ﷺ سختی سے پابند تھے [5] کسی وقت کی سنت خلاف معمول اگر چھوٹ جاتی تو اس کی قضا پڑھتے حالانکہ اصل شریعت کی رو سے اس کی ضرورت عام امت کے لئے نہیں۔ ایسا واقعہ حضرتؐ کو صرف ایک ہی دفعہ پیش آیا ہے ظہر و عصر کے درمیان ایک وفد خدمت اقدس میں باریاب ہوا جس کی وجہ سے آپ ﷺ ظہر کے بعد کی دو رکعت نہ پڑھ سکے نماز عصر کے بعد آپ ﷺ نے بعض ازواج مطہرات کے حجروں میں جا کر دو رکعت نماز ادا کی چونکہ یہ نماز بالکل خلاف معمول تھی اس لئے ازواج مطہرات نے استفسار کیا آپ ﷺ نے واقعہ بیان فرمایا عام امت کے لئے ایک فوت کی قضا ایک دفعہ کافی ہے لیکن چونکہ آپ جس چیز کو شروع کرتے تھے پھر اس کو ترک کرنا پسند نہیں فرماتے تھے اس لئے ام المومنین حضرت عائشہؓ و ام سلمہؓ کا بیان ہے کہ آپ نے اس قضا کو تمام عمر ادا کیا۔ [6]

رمضان کا مہینہ آپ ﷺ کی عبادتوں کے لئے سب سے زیادہ ذوق افزا تھا حضرت ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ آپ ﷺ فیاض تو تھے ہی لیکن جب رمضان کا مہینہ آتا اور جبرئیلؑ قرآن سنانے آتے تو آپ ﷺ کی فیاضی

---

1. صحیح بخاری تفسیر سورہ بنی اسرائیل۔
2. ابن ہشام ذکر قبل ہجرت۔
3. صحیح بخاری باب [illegible]۔
4. اس بحث کو زرقانی نے شرح مواہب میں بہ تفصیل لکھا ہے جلد ۷ صفحہ ۵۸۔
5. صحیح بخاری باب نوافل سفر۔
6. مسند احمد جلد ۶ و صحیح مسلم باب الصلوٰۃ بعد العصر۔

کی کوئی حد نہ تھی آپ ﷺ کی فیاضی ہوا سے بھی آگے نکل جاتی تھی۔ رمضان کے آخری عشرہ میں آپ ﷺ اور زیادہ عبادت گزار ہو جاتے تھے۔ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ جب رمضان کا آخری عشرہ آتا تو آپ ﷺ رات بھر بیدار رہتے تھے اور سب سے بے تعلق ہو جاتے تھے اہل بیت کو نماز کے لئے جگاتے تھے۔[1] اس اخیر عشرہ میں آپ ﷺ عموماً اعتکاف میں بیٹھا کرتے تھے یعنی ہر وقت مسجد میں بیٹھے رہتے اور ہمہ وقت عبادت گزاری میں مصروف رہتے تھے۔[2]

قرآن مجید کی تلاوت روزانہ فرمایا کرتے تھے ابوداؤد کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ تلاوت کا وقت نماز عشاء کے بعد تھا۔[3] روزانہ سورتوں کی تعداد مقرر تھی اسی تعداد کے موافق آپ ﷺ تلاوت کر لیا کرتے تھے۔ رمضان میں پورے قرآن کا دور کرتے تھے۔[4] کبھی رات کو اٹھ کر کوئی مؤثر سورہ یا چند آیات تلاوت کرتے تھے حضرت ابن عباسؓ کہتے تھے کہ ایک دفعہ رات کو میں نے دیکھا کہ آپ ﷺ پچھلے پہر بیدار ہوئے آنکھیں ملتے ہوئے اٹھے رات کے ستارے ہر طرف جھلملا رہے تھے آپ ﷺ نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا اور یہ آیتیں پڑھیں۔[5]

﴿إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِأُولِي الْأَلْبَابِ ۝ الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَٰذَا بَاطِلًا سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ رَبَّنَا إِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ أَخْزَيْتَهُ ۖ وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ ۝ رَبَّنَا إِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُنَادِي لِلْإِيمَانِ أَنْ آمِنُوا بِرَبِّكُمْ فَآمَنَّا ۚ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّئَاتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْأَبْرَارِ ۝ رَبَّنَا وَآتِنَا مَا وَعَدْتَنَا عَلَىٰ رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۗ إِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيعَادَ ۝ فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ أَنِّي لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِنْكُمْ مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَىٰ ۖ بَعْضُكُمْ مِنْ بَعْضٍ ۖ فَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَأُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأُوذُوا فِي سَبِيلِي وَقَاتَلُوا وَقُتِلُوا لَأُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَأُدْخِلَنَّهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ثَوَابًا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ عِنْدَهُ حُسْنُ الثَّوَابِ﴾ (آل عمران)

آسمان اور زمین کی پیدائش اور شب و روز کے انقلاب میں ان دانش مندوں کے لئے نشانیاں ہیں جو اٹھتے بیٹھتے اور پہلو پر لیٹے ہوئے اللہ کو یاد کرتے ہیں اور آسمان و زمین میں غور کرتے ہیں کہ خدایا تو نے یہ (کارخانہ عالم) بے فائدہ نہیں پیدا کیا تو پاک ہے ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا خدایا جس کو تو دوزخ میں داخل کرے اس کو تو نے رسوا کر دیا گنہگاروں کا کوئی مددگار نہیں خدایا ہم نے ایک پکارنے والے کی آواز سنی جو ایمان کی طرف بلاتا تھا کہ اپنے پروردگار پر ایمان لاؤ تو ہم ایمان لائے خدایا تو ہمارے گناہ بخش دے ہماری برائیوں پر پردہ ڈال اور نیکوں کے

1. صحیح بخاری کتاب الصوم۔
2. ابوداؤد باب صوم۔
3. صحیح بخاری باب الاعتکاف۔
4. ابوداؤد باب شہر رمضان۔
5. صحیح بخاری بدء الوحی۔
6. صحیح بخاری و صحیح مسلم سورۂ [illegible]۔

ساتھ دینے سے انکار؟ خداوندا! تو نے اپنے رسولوں کے ذریعہ ہم سے جس چیز کا وعدہ کیا ہے وہ ہم کو عنایت کر اور قیامت کے دن ہمیں رسوا نہ کرنا تو اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔ پروردگار نے ان کی دعا سن لی اور وہ قبول کر لی کہ میں کسی کام کرنے والے کے کام کو ضائع نہیں کرتا مرد ہو یا عورت تم ایک دوسرے سے ہو جنہوں نے ہجرت کی یا اپنے گھروں سے نکالے گئے اور میری راہ میں ستائے گئے ہیں اور وہ لڑے ہیں اور مارے گئے ہیں میں ان سب کے گناہوں کو مٹا دوں گا اور ان کو جنت میں پہنچا دوں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اللہ کی طرف سے ان کو یہ جزا ملے گی اور اللہ ہی کے پاس اچھی جزا ہے۔

اسی موقع پر آپ یہ الفاظ بھی کہا کرتے تھے جو سرتاپا اثر اور روحانیت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

﴿اللهم لك الحمد انت نور السموات والارض ولك الحمد انت قيام السموات والارض ولك الحمد انت رب السموات والارض ومن فيهن انت الحق ووعدك الحق وقولك الحق ولقاءك الحق والجنة حق والنار حق والساعة حق اللهم لك اسلمت وبك امنت وعليك توكلت واليك انبت وبك خاصمت واليك حاكمت فاغفر لي ما قدمت وما اخرت وما اسررت وما اعلنت انت الهي لا اله الا انت﴾

خداوندا! تیری حمد ہو تو آسمان و زمین کا نور ہے تیری ہی حمد ہو تو آسمان و زمین اور جو کچھ ان میں ہے سب کا پروردگار ہے تو حق ہے تیرا وعدہ حق ہے تیری بات حق ہے تجھ سے ملنا حق ہے جنت حق ہے دوزخ حق ہے قیامت حق ہے خداوندا! میں نے تیرے ہی آگے سر جھکایا ہے تجھی پر ایمان لایا ہوں تجھی پر میں نے بھروسہ کیا ہے تیری ہی طرف رجوع ہوا ہوں تیرے ہی زور سے جھگڑتا ہوں تجھی سے فیصلہ چاہتا ہوں تو میرا اگلا اور پچھلا کھلا اور چھپا ہر ایک گناہ معاف کر تو ہی میرا معبود ہے تیرے سوا کوئی اور معبود نہیں۔ (صحیح مسلم، باب الدعاء فی صلوٰۃ اللیل)

کبھی گھر کے لوگ جب سو جاتے آپ ﷺ چپ چاپ بستر سے اٹھتے اور دعا و مناجات الٰہی میں مصروف ہو جاتے۔ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ ایک رات میری آنکھ کھلی تو آپ ﷺ کو بستر پر نہ پایا۔ سمجھی کہ آپ ﷺ کسی اور بیوی کے حجرے میں تشریف لے گئے۔ اندھیرے میں ہاتھ سے ادھر ادھر ٹٹولا تو دیکھا کہ پیشانی اقدس خاک پر ہے اور آپ ﷺ سر بسجود دعا میں مصروف ہیں۔ یہ دیکھ کر حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ مجھ کو اپنے شبہ پر ندامت ہوئی اور دل میں کہا سبحان اللہ! میں کس خیال میں ہوں اور آپ کس عالم میں۔[1] کبھی کبھی راتوں کو اٹھ کر آپ تنہا قبرستان میں تشریف لے جاتے تھے اور دعا و زاری کرتے تھے ایک دفعہ آپ کے پیچھے پیچھے حضرت عائشہؓ گئیں تو دیکھا کہ آپ جنت البقیع میں داخل ہوئے اور دعا کی۔[2]

دعا اور نماز کے بعد آپ ﷺ سو جاتے یہاں تک کہ خراٹے کی آواز سنائی دیتی کہ دفعتاً جب صبح نمودار ہوتا آپ بیدار ہوتے، صبح کی سنت ادا کر کے مسجد کو تشریف لے جاتے اور اس وقت یہ الفاظ زبان مبارک پر ہوتے۔

﴿اللهم اجعل في قلبي نورا وفي لساني نورا واجعل في سمعي نورا واجعل في بصري

---

1. سنن نسائی باب الغیرۃ۔
2. سنن نسائی باب الاستغفار للمومنین۔

سوراً و اجعل فی عظمی نوراً و من امامی نوراً و اجعل من فوقی نوراً و تحتی نوراً و اعطنی نوراً (صحیح مسلم باب الدعاء فی صلوٰۃ اللیل)

خدایا میرے دل میں نور پیدا کر اور میری زبان میں اور میری قوت سامعہ میں نور پیدا کر آنکھوں میں نور پیدا کر اور میرے پیچھے اور میرے آگے نور پیدا کر میرے اوپر اور میرے نیچے نور پیدا کر اور مجھ کو نور عطا کر۔

ارکان نماز میں سب سے کم وقفہ رکوع کے بعد قیام میں ہوتا ہے لیکن حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ رکوع کے بعد اتنی دیر تک کھڑے رہتے تھے کہ ہم لوگ کہتے تھے آپ ﷺ سجدہ میں جانا بھول گئے۔ ۱ جو چیز نماز کی حضوری میں خلل ڈالتی تھی اس سے احتراز فرماتے تھے ایک دفعہ چادر اوڑھ کر نماز ادا فرمائی جس میں دونوں طرف حاشیے تھے نماز میں اتفاق سے ان حاشیوں پر نظر پڑ گئی نماز سے فارغ ہو کر فرمایا کہ یہ لے جا کر فلاں شخص (ابوجہم) کو دے آؤ اور ان سے انبجانی مانگ لاؤ، حاشیوں نے نماز کی حضوری میں خلل ڈالا۔ ۲

ایک دفعہ دروازے پر منقش پردہ پڑا ہوا تھا نماز میں اس پر نگاہ پڑی تو حضرت عائشہؓ سے فرمایا کہ اس کو ہٹا دو اس کے نقش و نگار حضور قلب میں خلل انداز ہوتے ہیں۔ ۳

روزہ:

انبیاء اور داعیان مذہب نے تکمیل روحانیت کے لیے تقلیل غذا بلکہ ترک غذا (روزہ) کو اسباب ضروری میں شمار کیا ہے ہندوستان کے ریاضت کش اور بعض داعیان مذاہب تو اس راہ میں حد افراط سے بھی آگے نکل گئے ہیں لیکن داعی اسلام کا طرز عمل اس باب میں افراط اور تفریط کے بیچ میں تھا۔ اسلام سے پہلے اہل عرب عاشورہ کے دن روزہ رکھتے تھے آنحضرت ﷺ بھی معمولاً اس دن روزہ رکھتے تھے بعض حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مکہ کے قیام کے زمانہ میں آپ ﷺ متواتر کئی کئی مہینوں تک روزہ رکھتے تھے لیکن مدینہ آ کر اس معمول میں فرق آ گیا مدینہ میں یہودی بھی عاشورہ کا روزہ رکھتے تھے آپ ﷺ نے بھی رکھا بلکہ تمام مسلمانوں کو اس دن روزہ رکھنے کی تاکید فرمائی لیکن جب رمضان کے روزے فرض ہوئے تو عاشورا کا روزہ نفل رہ گیا۔

رمضان کے علاوہ پورے مہینہ کا روزہ مدینہ میں آپ ﷺ نے کبھی نہیں رکھا صرف ایک شعبان مستثنیٰ ہے اس میں قریب قریب پورے مہینہ بھر آپ ﷺ روزے رکھتے اس طرح سال میں دو مہینے شعبان اور رمضان تو پورے روزوں میں گزرتے تھے سال کے بقیہ مہینوں میں یہ کیفیت رہتی تھی کہ روزہ رکھنے پر آتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ اب آپ کبھی روزہ ترک نہ کریں گے پھر روزہ توڑ دیتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ اب کبھی روزہ نہ رکھیں گے مہینے کے نصف اول میں جن کو ایام بیض کہتے ہیں آپ ﷺ اکثر روزوں سے رہتے تھے مہینہ میں تین دن اور دوشنبہ اور جمعرات کو آپ ﷺ معمولاً روزے رکھا کرتے تھے بعض روایتوں میں ہے کہ جمعہ کا روزہ بھی معمولات میں سے تھا ان کے علاوہ محرم کے

---

۱ مسند ابن حنبل جلد ۳ صفحہ ۲۰۲۔

۲ صحیح بخاری جلد اول صفحہ ۵۲ کتاب الصلوٰۃ باب اذا صلی فی ثوب لہ اعلام۔

۳ صحیح بخاری کتاب اللباس باب التصاویر۔

تک قدم نہیں رکھا جب تک حضرت بلالؓ نے آ کر یہ اطلاع نہ دی کہ یا رسول اللہ! خدا نے آپ کو سبکدوش کیا۔ ۱

حج:

اسلام سے پہلے آپ ﷺ نے جس قدر حج کیے ان کی گنتی تعداد متعین نہیں کی جا سکتی۔ ابن الاثیر نے لکھا ہے کہ چونکہ قریش معمولاً ہر سال حج کیا کرتے تھے اس لیے قرینہ غالب یہی ہے کہ آنحضرت ﷺ بھی ہر سال حج ادا کرتے ہوں گے۔ ترمذی ۲ میں ہے کہ قیام مکہ کے زمانہ میں آپ ﷺ نے دو حج کئے تھے اور ابن ماجہ اور حاکم میں ہے کہ تین حج کئے تھے لیکن یہ سب روایتیں ۳ مرسل ہیں۔ مدینہ کے زمانہ قیام میں متفق ثابت ہے کہ صرف ایک حج ۱۰ھ میں کیا ۴ یہی حجۃ الوداع ہے جس کا ذکر بہ تفصیل پہلے گزر چکا ہے۔

حج کے علاوہ آپ ﷺ نے عمرے بھی ادا کئے ہیں۔ ہجرت کے بعد چار عمرے ثابت ہیں۔ ایک عمرہ ذیقعدہ کے مہینہ میں، ایک حدیبیہ کے سال، ایک غزوہ حنین کے بعد اور چوتھا حجۃ الوداع ۵ کے ساتھ۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ حجۃ الوداع والے عمرہ کے سوا تمام عمرے آپ ﷺ نے ذیقعدہ کے مہینہ میں ادا کئے۔ ایک دفعہ حضرت ابن عمرؓ سے کسی نے پوچھا کہ آنحضرت ﷺ نے کتنے عمرے کئے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا "چار عمرے، ان میں سے ایک ماہ رجب میں" حضرت عائشہؓ نے یہ سنا تو کہا "خدا ابوعبدالرحمن (ابن عمر کی کنیت) پر رحم فرمائے آپ ﷺ نے کوئی عمرہ ایسا نہیں کیا جس میں وہ شریک نہ ہوں، آنحضرت ﷺ نے رجب میں کوئی عمرہ نہیں کیا"۔ ۶

سال حدیبیہ میں سب سے پہلی دفعہ جب آپ ﷺ عمرہ ادا کرنے کے لیے روانہ ہوئے تھے تو کفار قریش نے قدم قدم پر روکنے کی کوشش کی، صحابہ ان کی مدافعت کرتے آپ ﷺ سے پیچھے رہ گئے لیکن آپ ﷺ کو خانہ کعبہ کی زیارت کا یہ ذوق و شوق تھا کہ اپنے ہمراہیوں کا انتظار کئے بغیر بے خطر آپ ﷺ سب سے آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے، تو جان نثاروں نے ابوقتادہ انصاری کو بھیجا کہ وہ جا کر ہماری جانب سے سلام عرض کریں اور یہ درخواست کریں کہ "آپ ﷺ ذرا توقف فرمائیں، ہمیں یہ ڈر ہے کہ دشمن کہیں ہمارے اور آپ کے درمیان حائل نہ ہو جائیں"۔ آپ ﷺ نے ان کی یہ درخواست قبول فرمائی۔ ۷

دوام ذکر الٰہی:

قرآن مجید نے اہل ایمان کا یہ وصف خاص بیان کیا ہے۔

۱ ابوداؤد باب [illegible]۔
۲ باب کم حج النبی ﷺ۔
۳ زرقانی جلد ۸ صفحہ ۱۹۰۔
۴ صحیح مسلم، ابوداؤد، ابن ماجہ، ترمذی باب کم حج النبی ﷺ
۵ جامع ترمذی۔
۶ باب عمرۃ، بخاری و مسلم کتاب الحج۔
۷ صحیح بخاری صفحہ ۲۴۵ باب جزاء الصید۔

﴿الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ﴾ (آل عمران)

جو خدا کو اٹھتے بیٹھتے لیٹے یاد کرتے ہیں

﴿لَا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ﴾

جن کو اشغال دنیوی خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتے (نور)

اور قرآن کا مبلغ ان اوصاف کا خود بہترین مظہر تھا، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آنحضرت ﷺ ہر لحظہ اور ہر لمحہ خدا کی یاد میں مصروف رہتے تھے۔[1] ربیعہؓ بن کعب اسلمی رات کو آپ ﷺ کے آستانہ پر پہرہ دیتے تھے، وہ بیان کرتے ہیں کہ آپ ﷺ کی تسبیح و تہلیل کی آواز سنتے سنتے میں تھک جاتا تھا اور مجھے نیند آ جاتی تھی۔[2] اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے، کھاتے پیتے، سوتے جاگتے، وضو کرتے، نئے کپڑے پہنتے، سوار ہوتے، سفر میں جاتے، واپس آتے، گھر میں داخل ہوتے، مسجد میں قدم رکھتے، غرض ہر حالت میں دل و زبان ذکر الٰہی میں مصروف رہتے۔ چنانچہ ان مواقع پر احادیث میں مختلف اوقات و حالات کے لیے کثرت سے ادعیہ ماثورہ منقول ہیں۔ اخیر زندگی میں جب سورہ اذا جاء اتری جس میں تحمید و تسبیح کا حکم ہے تو امہات المومنین کا بیان ہے کہ ہر وقت اور ہر حالت میں زبان مبارک پر تسبیح و تہلیل جاری رہتی تھی۔[3]

حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ "آپ ﷺ اکثر یہ دعا ﴿رب اغفر لی وتب علی انک انت التواب الغفور﴾ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد پڑھا کرتے تھے۔ ہم نے گنا تو ایک ایک نشست میں سو سو دفعہ یہ الفاظ آپ ﷺ کی زبان سے ادا ہوئے۔[4] سفر اور کوچ کی بے اطمینانی میں بھی آپ ﷺ یاد الٰہی سے غافل نہیں رہتے تھے، سواری پر بیٹھے بیٹھے نفل ادا کرتے تھے اور اس کی پروا نہیں کرتے تھے کہ قبلہ کی طرف رخ ہے یا نہیں۔ سواری کا جانور جدھر کو جا رہا ہوتا آپ ﷺ ادھر ہی منہ کئے نماز کی نیت کر لیتے کہ ﴿فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ﴾ "جدھر رخ کرو ادھر ہی خدا کا منہ ہے۔"[5]

ذوق و شوق:

آپ ﷺ اصحاب کی محفل میں یا امہات المومنینؓ کے حجروں میں بات چیت میں مشغول ہوتے کہ دفعتاً اذان کی آواز آتی تو آپ اٹھ کھڑے ہوتے۔[6] رات کا ایک معتدبہ حصہ گو شب بیداری میں گزرتا تھا تاہم صبح کے وقت ادھر مؤذن نے اللہ اکبر کہا ادھر آپ بستر سے اٹھ بیٹھے۔[7] شب کے وقت جس ذوق و شوق اور وجد کی حالت میں

---

1. ابوداؤد کتاب الطہارۃ۔
2. مسند ابن حنبل جلد ۴ صفحہ ۵۹۔
3. ابن سعد جز حالات۔
4. ترمذی و ابن ماجہ ابواب الدعوات۔
5. صحیح بخاری و صحیح مسلم و ابوداؤد وغیرہ۔
6. صحیح بخاری باب من کان فی حاجۃ اہلہ جلد صفحہ ۹۳۔
7. صحیح بخاری من نام عند السحر۔

نماز پڑھتے اس کا نقشہ حضرت عائشہؓ نے ان الفاظ میں کھینچا ہے "کبھی پوری پوری رات آنحضرت ﷺ کھڑے رہ کر سورۂ بقرہ، سورۂ آل عمران، سورۂ نساء (قرآن کی سب سے بڑی سورتیں ہیں) پڑھتے، جب کوئی خوف اور خشیت کی آیت آتی، خدا سے دعا مانگتے اور پناہ طلب کرتے کوئی رحمت اور بشارت کی آیت آتی تو اس کے حصول کی دعا مانگتے۔[1] قرات کی تردد سے فرماتے کہ دور دور تک آواز جاتی اور لوگ اپنے بستروں پر پڑے پڑے آپ ﷺ کی آواز سنتے[2] کبھی کبھی کوئی ایسی آیت آجاتی کہ آپ اس کے ذوق و شوق میں محو ہو جاتے۔ حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ آپ ﷺ نے نماز میں یہ آیت پڑھی۔

﴿إِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَإِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾

اگر تو سزا دے تو تیرے بندے ہیں اور اگر معاف کر دے تو تو غالب اور حکمت والا ہے۔

تو بار بار صبح تک آپ ﷺ یہی آیت پڑھتے رہ گئے۔[3]

زید بن خالد جہنی ایک صحابی بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک دفعہ ارادہ کیا کہ آج شب میں آپ ﷺ کو نماز پڑھتے دیکھوں گا (غالباً یہ کسی سفر کا واقعہ ہے) نماز کا وقت آیا تو آپ ﷺ نماز کے لیے کھڑے ہوئے، پہلے دو رکعتیں معمولی ادا کیں پھر دو رکعتیں بہت ہی لمبی اور بڑی دیر تک پڑھیں پھر دو دو رکعتیں کر کے آٹھ رکعتیں بتدریج چھوٹی چھوٹی پڑھیں اور سب کے آخر میں وتر ادا کی۔[4] خبابؓ کی روایت ہے کہ ایک شب آپ ﷺ نماز کے لیے کھڑے ہوئے تو صبح تک مصروف رہے۔[5]

حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ ایک شب مجھ کو آنحضرت ﷺ کے ساتھ نماز پڑھنے کا اتفاق ہوا آپ نے سورۂ بقرہ شروع کی (قرآن کی یہ سب سے بڑی سورۃ ہے) میں سمجھا آپ ﷺ سو آیتوں تک پڑھیں گے لیکن آپ ان کو پڑھ کر آگے بڑھے میں نے دل میں کہا شاید پوری سورۃ آپ ﷺ ایک ہی رکعت میں ختم کرنا چاہتے ہیں چنانچہ آپ نے جب اس سورہ کو ختم کیا تو میں نے خیال کیا کہ اب آپ رکوع کریں گے لیکن آپ نے فوراً ہی سورۂ آل عمران شروع کر دی یہ بھی ختم ہو چکی تو سورۂ نساء شروع کی (یہ تینوں سورتیں مل کر سوا پانچ پاروں کے قریب ہیں) بہت ٹھہر ٹھہر کر نہایت سکون اور اطمینان سے آپ قرات کر رہے تھے اور ہر آیت کے مضمون کے مطابق بیچ بیچ میں تسبیح اور دعا کرتے جاتے تھے اس کے بعد آپ نے رکوع کیا رکوع میں قیام ہی کے برابر توقف فرمایا پھر کھڑے ہوئے اور اتنی ہی دیر تک کھڑے رہے پھر سجدہ کیا اور سجدہ میں بھی اسی قدر تاخیر فرمائی۔[6]

---

1. مسند ابن حنبل جلد ۶ صفحہ ۹۲
2. ابن ماجہ باب ماجاء فی صلوٰۃ اللیل۔
3. ایضاً۔
4. صحیح مسلم صلوٰۃ الابرار۔
5. نسائی احیاء اللیل۔
6. صحیح مسلم طول فی صلوٰۃ اللیل۔

میدان جنگ میں یاد الہٰی:

عین اس وقت جب دونوں طرف سے فوجیں برسرپیکار ہوتی تھیں، تیروسنان اور تیغ وخنجر کی چمک سے آنکھیں خیرہ ہورہی ہوتی تھیں اور ہر طرف سے شور دار وگیر برپا ہوتا، آپ ﷺ نہایت خضوع وخشوع اور اطمینان قلب کے ساتھ دعا وزاری اور گریہ زاری میں مصروف ہوتے۔ سپاہی شجاعت کے فخر وغرور سے پیشانیوں پر بل ڈالے ہوئے دشمنوں کے مقابلہ میں ہوتے لیکن خود سپہ سالار کی پیشانی زمین نیاز پر ہوتی۔ بدر، احد، خندق، خیبر، تبوک تمام بڑے بڑے معرکوں میں آپ کی یہی کیفیت تھی۔

معرکہ ہائے جنگ میں سپہ سالاروں کو اپنے بہادر سپاہیوں کی قوت پر ناز ہوتا ہے لیکن اسلام کے قائد اعظم کو صرف خدائے ذوالجلال کی قوت پر ناز تھا۔ عالم اسباب کے لحاظ سے گو آپ ﷺ نے اصول جنگ کے مطابق ہر میدان میں اپنی فوجیں مرتب کیں لیکن اصلی اعتماد اور بھروسہ اسباب کائنات سے ماوراء قادر مطلق کی ذات پر تھا۔ بدر میں دو صحابی حاضر ہوتے ہیں اور عرض کرتے ہیں کہ یا رسول اللہ! ہم کو کافروں نے اس شرط پر رہا کیا ہے کہ ہم جنگ میں شرکت نہ کریں، ارشاد ہوتا ہے کہ "ہم کو صرف خدا کی مدد درکار ہے"۔[1] بدر کا میدان خون سے لالہ زار ہو رہا ہے اور آپ خشوع وخضوع سے دونوں ہاتھ پھیلا کر بارگاہ ایزدی میں عرض کر رہے ہیں کہ "خدایا! اپنا وعدہ نصرت پورا کر"۔ محویت اور بےخودی میں ردائے مبارک کندھے سے گر پڑتی ہے اور آپ ﷺ کو خبر نہیں ہوتی۔ کبھی سجدے میں گر پڑتے ہیں اور عرض کرتے ہیں کہ "خدایا! اگر آج یہ چند نفوس مٹ گئے تو پھر تو قیامت تک نہ پوجا جائے گا"۔[2] اسی اثنا میں حضرت علیؓ تین دفعہ میدان جنگ سے حاضر خدمت ہوتے ہیں، وہ ہر دفعہ یہ دیکھتے ہیں کہ وہ مقدس پیشانی خاک پر ہے۔[3]

غزوہ احد کے خاتمہ پر ابو سفیان مسرت سے ہبل کی جے پکارتا ہے لیکن آپ ﷺ اس دل شکستگی کے عالم میں بھی حضرت عمرؓ کو حکم دیتے ہیں کہ تم بھی کہو۔

﴿الله مولانا ولا مولی لکم الله اعلی واجل﴾

خدا ہمارا آقا ہے تمہارا کوئی آقا نہیں، خدا عالی اور بلند ہے۔

غزوہ احزاب میں آپ خود اپنے دست مبارک سے خندق کھودنے میں مصروف تھے اور لب مبارک پر یہ الفاظ جاری تھے۔

﴿اللھم لا خیر الا خیر الآخرۃ فبارک فی الانصار والمھاجرۃ﴾

خدایا بھلائی صرف آخرت کی بھلائی ہے، انصار اور مہاجرین کو برکت عطا کر۔

دشمن اس شدت سے حملہ پر حملہ کر رہے تھے کہ کسی مسلمان کا اپنی جگہ سے ہٹنا ممکن نہ تھا، یہی محاصرہ ۲۴ دن تک قائم رہا لیکن اس مدت میں صرف ایک بار یا زیادہ سے زیادہ چار وقت کی نمازیں قضا ہو گئیں۔ ایک دن عصر کے وقت

[1] صحیح مسلم باب الوفاء بالعہد۔
[2] صحیح بخاری و صحیح مسلم غزوہ بدر۔
[3] سیرۃ جلد اول صفحہ ۵۰۔

دشمنوں نے اس زور کا حملہ کیا کہ ایک لمحہ کے لیے بھی مہلت نہ مل سکی آخر عصر کا وقت ختم ہو گیا آپ کو سخت رنج ہوا حملہ رکنے پر سب سے پہلے باجماعت نماز ادا کی۔

غزوۂ خیبر میں جب آپ ﷺ خیبر کے قریب پہنچے تو زبان مبارک سے یہ الفاظ نکلے اللہ اکبر خربت خیبر۔ اللہ اکبر! خیبر ویران ہو چکا۔ عمارتیں نظر آئیں تو صحابہؓ سے ارشاد کیا کہ ٹھہر جاؤ پھر یہ دعا مانگی۔

﴿اللهم انا نسئلك خير هذه القرية و خير اهلها و خير ما فيها و نعوذ بك من شرها و شر اهلها و شر ما فيها﴾ (ابن ہشام)

اے اللہ! ہم تجھ سے اس آبادی کی اس آبادی کے رہنے والوں کی اس آبادی کی چیزوں کی بھلائی چاہتے ہیں اور ان سب کی برائیوں سے تیری پناہ کے طالب ہوتے ہیں۔

حنین کے معرکہ میں بارہ ہزار فوج آپ کے ساتھ تھی لیکن اول ہی حملہ میں اس کے پاؤں اکھڑ گئے۔ اس فوج کا سالار اگر معمولی آدمیوں کے بھروسہ پر میدان جنگ میں اترتا تو شاید وہ سب سے پہلے بھاگ کر اپنی جان بچاتا لیکن آپ ﷺ کو جس قوت پر اعتماد تھا آپ اس کو اس تنہائی میں بھی اسی طرح اپنا مددگار سمجھتے تھے۔ جس طرح فوج و لشکر کے ساتھ تھی اس وقت جب دس ہزار قدر انداز تیروں کا مینہ برساتے ہوئے سیلاب کی طرح بڑھتے چلے آتے تھے اور آپ ﷺ کے پہلو میں چند جان نثاروں کے سوا کوئی اور باقی نہیں رہ گیا تھا آپ سواری سے اترے اور فرمایا "میں خدا کا بندہ اور پیغمبر ہوں" پھر بارگاہ الٰہی میں دست بدعا ہو کر نصرت موعودہ کی درخواست کی، دفعۃً ہوا کا رخ پلٹ گیا اور نسیم فتح علم اسلام کو لہرانے لگی۔ دس ہزار دشمن کے بے پناہ تیروں کو یکہ و تنہا مناجات و زاری کی سپر پر روکنے کی جرأت پیغمبروں کے سوا اور کس سے ظاہر ہو سکتی ہے۔

اس موقع کا سب سے موثر منظر نماز خوف کا منظر ہے۔ سامنے دشمن پرے جمائے کھڑے ہیں اور حملہ کے منتظر ہیں کہ دفعۃً نماز کا وقت آ جاتا ہے اور آپ امام بن کر آگے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ صحابہ کی ایک جماعت مقتدی ہو کر نماز میں مصروف ہو جاتی ہے اور دوسری دشمنوں کا سامنا روک لیتی ہے۔ صلح حدیبیہ کے زمانہ میں اس سے بھی زیادہ خطرناک موقع پیش آیا۔ آنحضرت ﷺ مکہ کے پاس عسفان میں خیمہ زن تھے۔ قریش کے مشہور جنرل خالد بن ولید آس پاس کی پہاڑیوں میں دشمنوں کی فوج کا ایک دستہ لیے ہوئے موقع کی تاک میں تھے اور قریش کی یہ قرارداد تھی کہ مسلمان جب نماز کے لیے کھڑے ہوں تو ٹھیک اسی وقت ان پر بے خبری میں حملہ کیا جائے۔ خدا تعالیٰ کا یہ منشا تھا کہ قصر صلوٰۃ کی ایک عمدہ تقریب پیدا ہو گئی چنانچہ قصر کی آیتیں نازل ہوئیں عصر کا وقت آیا تو آپ ﷺ نماز کے لیے کھڑے ہوئے، دشمن اپنی فوج کا پرا لیے آپ ﷺ کے سامنے تھے صحابہ دو حصوں میں منقسم ہو گئے ایک حصہ نے آپ ﷺ کے پیچھے نماز کی صفیں قائم کیں اور دوسرا حصہ دشمنوں کے مقابل کھڑا ہو گیا۔ پہلی جماعت فارغ ہو کر پیچھے ہٹ کر دشمنوں کے مقابل آ گئی اور دوسری ترتیب کے ساتھ پیچھے ہٹ کر آپ ﷺ کے ساتھ نماز میں شامل ہو گئی۔ یہ تمام تبدیلیاں مقتدیوں کی صفوں میں ہو رہی ہیں لیکن خود سپہ سالار افواج تمام تلواروں کے سامنے ہیں تمام خطرات سے بے پروا عبادت

١۔ صحیح بخاری و صحیح مسلم غزوۂ حنین۔

نے اپنے جواب میں اسی شبہ کو دفع فرمایا اور بتایا کہ ان کا مقتضا محبت الٰہی ہے خشیت الٰہی نہیں اسی لیے آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے۔

﴿وجعلت قرة عيني في الصلوة﴾
میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔

لوگوں کے سناٹے میں اٹھ کر آپ ﷺ کبھی دعا و زاری میں مصروف ہوتے کبھی قبرستان کی طرف نکل جاتے اور فرمایا کرتے تھے کہ نصف شب کے سکوت میں خدا آسمان دنیا پر نزول فرماتا ہے[1] عبادت شبانہ کا خاتمہ صبح کی دو رکعتوں پر ہوتا تھا جن کی نسبت آپ ﷺ کا ارشاد تھا کہ "ان کے معاوضہ میں دنیا و مافیہا کی نعمتیں بھی میرے سامنے ہیچ ہیں"۔[2]

ایک دفعہ ایک غزوہ میں کوئی عورت گرفتار ہو کر آئی اس کا بچہ گم ہو گیا تھا محبت کا یہ جوش تھا کہ کوئی بچہ مل جاتا تو دوڑ کر سینہ سے لگا لیتی اور اس کو دودھ پلاتی آپ ﷺ نے دیکھا تو حاضرین سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ "کیا یہ ہو سکتا ہے کہ یہ عورت خود اپنے بچہ کو آگ میں ڈال دے؟" لوگوں نے عرض کی "ہرگز نہیں" فرمایا "تو خدا کو اپنے بندوں سے اس سے زیادہ محبت ہے جتنی اس کو اپنے بچہ سے ہے"۔[3]

اسی طرح کا ایک اور واقعہ گزر چکا ہے کہ آپ ﷺ ایک غزوہ سے واپس آرہے تھے ایک عورت اپنے بچے کو گود میں لے کر خدمت اقدس میں آئی اور عرض کی "یا رسول اللہ! ایک ماں کو اپنے بچہ سے جس قدر محبت ہوتی ہے کیا خدا کو اپنے بندوں سے اس سے زیادہ محبت نہیں ہے؟" فرمایا ہاں بیشک ہے اس نے کہا کوئی ماں تو اپنے بچے کو آگ میں ڈالنا گوارا نہیں کرتی یہ سن کر فرط اثر سے آپ ﷺ پر گریہ طاری ہو گیا پھر سر اٹھا کر فرمایا خدا صرف اس بندہ کو عذاب دے گا جو سرکشی سے ایک کو دو کہتا ہے۔[4]

ایک دفعہ آپ ﷺ صحابہؓ کی مجلس میں تشریف فرما تھے ایک صاحب ایک چادر میں ایک پرند کے بچوں کو لپیٹے ہوئے آئے اور عرض کی کہ یا رسول اللہ! میں نے ایک جھاڑی سے ان بچوں کو اٹھا کر کپڑے میں لپیٹ لیا اس کی ماں نے یہ دیکھا تو میرے سر پر منڈلانے لگی میں نے ذرا سا کپڑے کو کھول دیا تو وہ فوراً بچوں پر گر پڑی ارشاد ہوا کہ کیا اپنے بچوں کے ساتھ ماں کی اس محبت پر تم کو تعجب ہے؟ قسم ہے اس ذات کی جس نے مجھ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے جو محبت اس ماں کو اپنے بچوں کے ساتھ ہے خدا کو اپنے بندوں سے بدرجہا زیادہ ہے۔[5]

آپ ﷺ محبت الٰہی کے سامنے دنیا کی تمام محبتوں کو ہیچ سمجھتے تھے وفات سے پانچ دن پہلے آپ ﷺ نے

---

1. صحیح بخاری۔
2. صحیح مسلم کتاب الصلوٰۃ۔
3. صحیح بخاری صفحہ ۸۸۹ باب رحمۃ الولد۔
4. سنن ابن ماجہ باب ما یرجی من رحمۃ اللہ۔
5. مشکوٰۃ بحوالہ ابوداؤد باب سعۃ رحمۃ اللہ۔

صحابہؓ کے مجمع میں ایک خطبہ دیا اس میں فرمایا "میں خدا کے سامنے اس بات سے برأت کرتا ہوں کہ تم میں سے (یعنی انسانوں میں سے) کوئی میرا دوست ہو کیونکہ خدا نے مجھے اپنا دوست بنالیا جس طرح ابراہیم کو اس نے اپنا دوست بنالیا تھا اگر میں اپنی امت میں سے کسی کو دوست بنا سکتا تو ابوبکرؓ کو بناتا۔ ۱

وفات کے وقت زبان مبارک سے جو فقرہ بار بار ادا ہو رہا تھا یہ تھا۔

﴿ اَللّٰهُمَّ الرَّفِيْقَ الْاَعْلٰى ﴾

خدایا! صرف رفیق اعلیٰ مطلوب ہے۔

یہ الفاظ تھے کہ حضرت عائشہؓ نے کہا کہ "اب آپ ہم لوگوں کو چھوڑ دیں گے"۔ ۲

اس "رفاقت علویٰ" کے راز سے جو کسی قدر آشنا ہیں وہ اس فقرہ کی یہ تشریح کرتے ہیں۔

"انبیاء علیہم السلام چوں از مقام دعوت فارغ گشتند و متوجہ عالم بقا میشوند و مصلحت رجوع الی الخلق اتمام می شود بشوق تمام بجناب رفیق الاعلیٰ بر آوردہ بکلیت متوجہ حق جل شانہ گشتند و مراتب قرب میسر نمائید" ۳

توکل علی اللہ:

توکل کے یہ معنی ہیں کہ انسان کوششوں کے نتائج اور واقعات عالم کے فیصلے کو خدا کے سپرد کردے۔ اسباب و علل کے پردے اس کے سامنے سے اٹھ جائیں اور اسے براہ راست ہر چیز اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں نظر آئے بظاہر اسباب و علل کو ناموافق ہوں مگر یہ غیر متزلزل یقین پیدا ہو کہ یہ ناموافق حالات اس کے کام میں ذرہ برابر موثر نہیں ہو سکتے بلکہ ہستی قوت و قدرت عالم اسباب سے ماورا ہستی کے ہاتھ میں ہے انسان کا استقلال عزم جرأت و بے باکی یہ تمام چیزیں اسی ایک اصل کی پرتو ہیں اس کی بدولت مشکل اوقات میں بھی دامن صبر اس کے ہاتھ سے نہیں چھوٹتا پر خطر سے پر خطر راستوں میں بھی جبن اور ضعف ہمت اس کے قلب میں راہ نہیں پاتا شدید سے شدید حالات میں بھی اس کے دل پر مایوسی کا بادل نہیں چھاتا۔

آنحضرت ﷺ کے سوانح زندگی کا ایک ایک حرف پڑھ جاؤ تم کو صاف نظر آئے گا کہ اس آسمان کے نیچے شدائد اور مصیبتوں کی کوئی ایسی صنف نہ ہوگی جو آپ کی راہ میں حائل نہ ہوئی ہو لیکن آپ ﷺ کا دل کبھی اضطراب و انتشار، مایوسی و ناامیدی اور خوف و بیم سے آشنا نہ ہوا۔ مکہ کی تنہائیوں میں، مصائب کے ہجوم میں، دشمنوں کے نرغہ میں، حنین و احد کے خونریز معرکوں میں ہر جگہ توکل و اعتماد علی اللہ کا ایک ہی جلوہ نظر آتا ہے۔ ابوطالب سمجھاتے ہیں کہ "جان پدر! اس کام سے ہاتھ اٹھاؤ" آپ ﷺ فرماتے ہیں "عم محترم! میری تنہائی کا خیال نہ کیجئے حق زیادہ دیر تک تنہا نہیں رہے گا مجموعہ عرب ایک دن اس کے ساتھ ہوگا" ایک اعرابی کے جواب میں آپ فرماتے ہیں کہ "خدا مجھے

۱ صحیح مسلم مناقب ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ۔

۲ صحیح بخاری باب الوفات

۳ مکتوبات ربانی مجدد الف ثانی مکتوب ۔

تنہا نہیں چھوڑے گا۔[1] مکہ میں ایک مصیبت زدہ مایوس صحابی سے ارشاد ہوتا ہے "خدا کی قسم عنقریب وہ وقت آتا ہے جب یہ دین مرتبہ کمال کو پہنچ جائے گا اور خدا کے سوا کسی اور کا ڈر نہیں رہے گا۔"[2]

ایک مرتبہ حرم میں بیٹھ کر کفار نے باہم مشورہ کیا کہ محمد اب جیسے ہی یہاں قدم رکھیں ان کی بوٹی بوٹی اڑا دی جائے، حضرت فاطمہؓ ان کی یہ تقریریں سن رہی تھیں، دوڑی ہوئی آپ ﷺ کے پاس آئیں اور واقعہ عرض کیا، آپ ﷺ نے ان کو تسکین دی اور وضو کے لیے پانی مانگا، وضو کر کے آپ ﷺ بے خطر حرم کی سمت روانہ ہو گئے جب خاص حرم میں پہنچے اور کفار کی نظر آپ ﷺ پر پڑی تو خود بخود ان کی نگاہیں جھک گئیں۔[3]

جلد اول میں پڑھ چکے ہو کہ شب ہجرت میں قریش کے بہادر خون آشام ارادوں کے ساتھ کاشانہ اقدس کا محاصرہ کیے ہوئے تھے لیکن آپ ﷺ نے نہایت سکون و اطمینان کے ساتھ اپنے عزیز قوت بازو علی مرتضیٰؓ کو اپنی جگہ بستر پر لٹا دیا، حالانکہ اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ قتل گاہ ہے بستر خواب نہیں لیکن اس کے ساتھ یہ بھی معلوم تھا کہ ایک اور قادر کل ہستی ہے جو تخت قتل کو فرش گل بنا سکتی ہے، جان کا لالا ہوتے ہوئے نہایت بے پروائی سے فرمایا کہ تم کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔[4]

گھر کے چاروں طرف دشمنان قریش محاصرہ کیے ہوئے تھے اور خیال ہو سکتا تھا کہ صبح امید کے انتظار میں مکہ کے بہادر عجب نہیں کہ کوچوں اور گلیوں میں مشتاق تیغ بکف پھر رہے ہوں لیکن آپ ﷺ نے اُسی کے اعتماد پر ان تمام ناموافق حالات کی موجودگی میں گھر سے باہر قدم نکالا۔ اس وقت سورہ یٰسین کی ابتدائی آیتیں زبان مبارک پر تھیں جن میں نبوت کی اور اپنے راہ راست پر ہونے کی تصدیق ہے۔ آخری آیت یہ تھی۔

﴿وَجَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ سَدًّا وَمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَأَغْشَيْنَاهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ﴾ (یٰس)

ہم نے ان کے آگے اور ان کے پیچھے دیوار کھڑی کر دی ہیں ہم نے ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے کہ وہ نہیں دیکھتے ہیں۔

مکہ سے نکل کر آپ ﷺ نے مع حضرت ابوبکرؓ کے غار ثور میں پناہ لی۔ قریش میں خون آشامی کے ساتھ اب اپنی ناکامی کا غصہ بھی تھا اور اس لیے اس وقت ان کے انتقام کے جذبات میں غیر معمولی تلاطم ہوگا، وہ آپ ﷺ کے تعاقب میں نشان قدم کو دیکھتے ہوئے ٹھیک اس غار کے پاس پہنچ گئے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس پرخطر حالت میں کسی کے حواس بجا رہ سکتے ہیں، چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے گھبرا کر عرض کی کہ "یا رسول اللہ! دشمن اس قدر قریب ہیں کہ اگر ذرا نیچے جھک کر اپنے پاؤں کی طرف دیکھیں گے تو ہم پر نظر پڑ جائے گی۔" لیکن آپ ﷺ نے روحانیت کی پرسکون آواز میں فرمایا "ان دو کو کیا غم ہے جن کے ساتھ تیسرا خدا ہو۔" پھر[5] جیسا کہ قرآن مجید میں ہے فرمایا:

﴿لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا﴾

---

[1] یہ دونوں واقعے ابن ہشام میں ہیں۔
[2] صحیح بخاری جز جلد اول۔
[3] مسند احمد جلد اول صفحہ ۳۶۸
[4] ابن ہشام و طبری
[5] صحیح بخاری ہجرت

غور کرو خدا ہمارے ساتھ ہے۔

بجز نبوت کے سوا اس روحانی سکون کا جلوہ اور کہاں نظر آ سکتا ہے؟

قریش کے اس اعلان کے بعد کہ جو محمد کو زندہ یا ان کا سر کاٹ کر لائے گا اس کو سو اونٹ ملیں گے سراقہ بن جعشم نے آپ ﷺ کا تعاقب کیا اور اس قدر قریب پہنچ گیا کہ وہ آپ ﷺ کو پا سکتا تھا حضرت ابوبکرؓ بار بار گھبرا کر ادھر دیکھ رہے تھے لیکن آپ ﷺ نے ایک دفعہ بھی مڑ کر نہیں دیکھا کہ سراقہ کس ارادہ سے آ رہا ہے یہاں دل پر وہی سکینت طاری تھی اور لب ہائے مبارک تلاوت قرآن میں مصروف تھے۔[1]

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ مدینہ آ کر آپ ﷺ کی زندگی ہر قسم کے خطروں سے محفوظ ہو گئی تھی لیکن واقعہ یہ ہے کہ گو اسلام کو یہاں اعوان و انصار کی ایک معتدبہ تعداد مل گئی تھی لیکن اسی کے ساتھ ان دشمنوں کا سامنا بھی تھا جو دشمنانِ مکہ سے زیادہ خطرناک تھے مکہ میں قریش گو آپ ﷺ کے دشمن تھے لیکن ان میں اور رسول اللہ ﷺ میں نسبی تعلقات تھے جو کبھی کبھی نسبی غمخواری اور مواسات پر بھی مائل کر دیتے تھے لیکن مدینہ کے منافقین اور یہود کو مواسات و ہمدردی کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی تھی علاوہ بریں یہود و منافقین مدینہ اور قریش مکہ میں باہم آنحضرت ﷺ کے قتل و ہلاکت کی سازشیں شروع ہو گئی تھیں[2] اس بنا پر صحابہؓ جاں نثاری کی غرض سے باری باری راتوں کو پہرہ دیا کرتے تھے اسی زمانہ میں ایک رات صحابہ آپ کے خیمہ کا پہرہ دے رہے تھے کہ یہ آیت نازل ہوئی۔

﴿وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ﴾ (مائدہ)

اور اللہ لوگوں سے تیری حفاظت کرے گا۔

اور آپ نے اسی وقت خیمہ سے سر باہر نکال کر یہ فرمایا۔[2]

﴿ايها الناس انصرفوا فقد عصمنى الله﴾

لوگو واپس جاؤ میری حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے لیا ہے۔

غزوہ نجد سے واپسی میں آپ ﷺ نے ایک مقام پر پڑاؤ کیا۔ یہاں بہت سے درختوں کے جھنڈ تھے دوپہر کا وقت تھا سب لوگ درختوں کے سایہ میں ادھر ادھر سو رہے تھے آپ بھی ایک درخت کے نیچے تنہا استراحت فرما تھے۔ آپ ﷺ کی تلوار ایک درخت سے لٹکی تھی کہ دفعۃً ایک بدو جو شاید اسی موقع کی تاک میں تھا چپکے سے آیا اور آپ ﷺ کی تلوار اتار کر نیام سے باہر کی اور آپ ﷺ کے سامنے آیا کہ دفعۃً آپ ہوشیار ہوئے دیکھا کہ ایک بدو تیغ بکف کھڑا ہے بدو نے پوچھا "اے محمد! اب مجھ سے تم کو کون بچا سکتا ہے؟" ایک پر اطمینان صدا آئی کہ "اللہ"![3]

ایک دفعہ ایک شخص گرفتار ہو کر پیش ہوا کہ یہ آپ ﷺ پر حملہ کی نیت میں تھا آپ ﷺ نے فرمایا "اس کو چھوڑ دو[4] کہ یہ مجھ کو قتل کرنا بھی چاہتا تو نہیں کر سکتا تھا" یہ اسی بات کی طرف اشارہ تھا کہ میری حفاظت کا ذمہ دار کوئی

---

1. سیرت جلد اول ملاحظہ فرمائیے۔
2. جامع ترمذی تفسیر مائدہ۔
3. صحیح بخاری کتاب الجہاد۔
4. مسند ابن حنبل جلد ۳ صفحہ ۴۷۱۔

ہو رہے۔ خیبر میں جس یہودیہ نے آپ کو زہر دیا تھا اس سے دریافت کیا کہ "تم نے یہ حرکت کیوں کی؟" اس نے جواب دیا کہ "آپ کے قتل کرنے کے لیے" آپ نے فرمایا کہ "خدا تم کو اس پر مسلط نہ کرتا"۔ ۱

احد اور حنین کے معرکوں میں جب میدان جنگ تھوڑی دیر کے لیے جان نثاروں سے خالی ہو گیا تھا آپ ﷺ کا استقلال توکل علی اللہ و سکینہ روحانی کی معجزانہ مثال ہے۔ یہ توکل اور اعتماد علی اللہ کی یک رخی تصویر ہے اس کا دوسرا رخ بھی پہلے سے کم موثر نہیں ہے۔ آپ پر فقر و فاقہ کے مختلف دور گزرے کوئی دن ایسا آتا کہ مسجد نبوی کا صحن زر و مال سے معمور ہو جاتا اور پھر متصل کئی کئی دن ایسے آتے کہ فاقہ سے شکم مبارک پر دو دو تین تین پتھر بندھے ہوتے حالانکہ بالکل ممکن تھا کہ آج کو سرمایہ کل کے مصارف کے لیے اٹھا رکھا جائے لیکن تمام عمر آپ ﷺ کا طرز عمل اس کے خلاف رہا کبھی ایک دن کی آمدنی دوسرے دن کے لیے اٹھا نہیں رکھی گئی ضروریات اور بقدر کفاف اخراجات کے بعد جو کچھ بچ جاتا وہ شام تک اہل استحقاق پر صرف کر دیا جاتا تھا ترمذی میں حضرت انسؓ سے روایت ہے۔

﴿ان رسول اللہ ﷺ کان لا یدخر لغد﴾

آنحضرت ﷺ کل کے لیے کوئی چیز اٹھا نہیں رکھتے تھے۔

اتفاق سے یا بھولے سے اگر کوئی چیز گھر میں رہ جاتی تو آپ ﷺ کو سخت تکلیف ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ آپ ﷺ اس وقت تک گھر میں تشریف نہیں لے جاتے تھے جب تک یہ نہ معلوم ہو جاتا کہ اب وہاں خدا کی برکت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ۲ اس قسم کے متعدد واقعات جود و سخا کے عنوان میں مذکور ہیں۔

نزع کے وقت جب انسان ہر چیز کو فراموش کر دیتا ہے آپ ﷺ کو یاد آیا کہ حضرت عائشہؓ کے پاس کچھ اشرفیاں رکھوائی تھیں وہ پڑی ہوئی ہیں۔ اس نازک موقع پر بھی یہ آپ ﷺ کو توکل علی اللہ کی شان کے خلاف نظر آیا ارشاد ہوا کہ "عائشہ! کیا محمد خدا سے بدگمان ہو کر مرے گا جاؤ پہلے ان کو خیرات کر دو"۔ ۳

صبر و شکر:

رنج و غم کے حوادث اور آلام و مصائب ہر کسی کی زندگی میں پیش آتے ہیں لیکن انسان کے روحانی کمال کا جوہر یہ ہے کہ ایک طرف حصول مقصد اور کامیابی کے نشہ میں سرشار اور از خود رفتہ نہ ہو دوسری طرف مصائب و آلام کی تلخی کو خندہ پیشانی اور کشادہ دلی کے ساتھ گوارا کر سکے اور یہ یقین رکھے کہ انسان کا فرض صرف عمل ہے کامیابی و ناکامی دونوں کا سر رشتہ کسی بالا تر ہستی کے ہاتھ میں ہے۔ قرآن مجید نے اس آیت میں اسی نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔

﴿مَا أَصَابَ مِنْ مُصِيبَةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي أَنْفُسِكُمْ إِلَّا فِي كِتَابٍ مِنْ قَبْلِ أَنْ نَبْرَأَهَا إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ ۝ لِكَيْلَا تَأْسَوْا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ ۝ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ

---

۱ صحیح مسلم باب السم۔

۲ صحیح بخاری باب من صلی بالناس فذکر حاجۃ فتخطاہم و مسند احمد جلد ۲ صفحہ [illegible]۔

۳ ابو داؤد باب قبول ہدایا المشرکین۔

۴ مسند احمد بن حنبل جلد [illegible]۔

یعنی اگر یہ تعبد و تسبیح و تحمید پہلے اس مرتبہ کے حصول کے لیے تھی تو اب اس مرتبہ کے حصول پر شکر گزاری اور احسان مندی کے اعتراف میں ہے۔

دنیا کے اہل علم رجال جن کو روحانیت کا کوئی حصہ نہیں دیا گیا اپنی ہر کامیابی کو اپنی قوت بازو، اپنے حسن تدبیر اور اپنے ذاتی رعب و داب کی طرف منسوب کرتے ہیں لیکن مقربین الٰہی کی اصطلاح میں یہ تخیل شرک و کفر کے ہم پایہ ہے، ان کو ہر کامیابی اور مسرت کے واقعہ کے اندر خود قدرت کا دست غیر مرئی کام کرتا ہوا نظر آتا ہے، حدیث میں ہے۔[1]

﴿انه كان اذا جاءه امر سرور او بشر به خر ساجدا شاكرا لله تعالىٰ﴾

آنحضرت ﷺ کے پاس جب کوئی خوشی کی خبر آتی تھی تو خدا تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کے لیے آپ ﷺ فوراً سجدہ میں گر پڑتے تھے۔

قبیلہ ہمدان کے اسلام لانے کی خبر جب آپ ﷺ کو پہنچی تو آپ نے سجدہ شکر ادا کیا۔[2] اسی طرح ایک دفعہ اور کسی بات کی آپ ﷺ کو خبر دی گئی تو آپ فوراً سجدہ میں چلے گئے۔ گھر ہی کے دروازے سے جب آپ ﷺ کو یہ معلوم ہوا کہ جو مجھ پر درود بھیجے گا اس پر خدا درود بھیجے گا تو اس درجہ منزلت پر آپ ﷺ نے سجدہ شکر ادا کیا۔[3]

حضرت سعدؓ بیان کرتے ہیں کہ ہم لوگ آنحضرت ﷺ کے ساتھ مکہ سے مدینہ طیبہ روانہ ہوئے اور جب مقام عزورا کے قریب پہنچے تو سواری سے اتر گئے اور ہاتھ اٹھا کر دیر تک بارگاہ الٰہی میں دعا کی پھر سجدہ میں گئے اور دیر تک اسی حالت میں پڑے رہے، پھر سر اٹھا کر دوبارہ دعا کے لئے ہاتھ پھیلائے اور پھر دیر تک سجدہ میں رہے پھر اٹھ کر تضرع کے ساتھ دعا شروع کی اور اس کے بعد تیسری بار تک پڑے رہے، اس دعا اور سجدہ سے فارغ ہو کر آپ ﷺ نے صحابہؓ سے فرمایا میں نے اپنی امت کی مغفرت کے لیے خدا سے دعا مانگی تھی جس کا ایک حصہ مقبول ہوا میں شکر کے لیے سجدہ میں گرا پھر مزید درخواست کی اس نے وہ بھی قبول کی میں سجدہ شکر بجا لایا اور پھر دعا و زاری کی اس نے اس کو بھی درجہ استجابت بخشا اور پھر میں سجدہ میں گر پڑا۔[5]

سورہ والضحیٰ میں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے اس وصف کو نمایاں فرمایا ہے۔

﴿وَالضُّحٰى ۝ وَاللَّيْلِ اِذَا سَجٰى ۝ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى ۝ وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى ۝ وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى ۝ اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى ۝ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۝ وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى ۝ فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ۝ وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ۝ وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ﴾ (ضحیٰ۔۱)

(اے پیغمبر!) دن کے پہلے پہر کی قسم، اور رات کی قسم جب وہ چھا جائے کہ تیرے پروردگار نے نہ تجھ کو چھوڑا

1. ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی سجود الشکر۔
2. زاد المعاد بحوالہ بیہقی بسند علیٰ شرط البخاری واصلہ فی البخاری۔
3. زاد المعاد بحوالہ ابن ماجہ۔
4. مسند احمد عن عبدالرحمٰن بن عوف۔
5. ابوداؤد کتاب الجہاد۔

دوسرا پہلو نہیں ہوتا تھا تاہم یہ تمام شدائد اس لیے گوارا تھے کہ صبر کی لذت اور اعلیٰ نعمت کی خوشگواری اور اس کے بڑے فائدہ کی مسرت سے کہیں زیادہ تھی۔

لیکن سب سے زیادہ حوصلہ شکن اور صبر آزما اس تیر کا نشانہ ہے جو دشمنوں کے نہیں بلکہ دوستوں کے ہاتھ سے لگا ہو۔ نے دو وقعہ پیدا ہوا کہ بعض جدید نوجوانوں نے آپ ﷺ کے کسی فعل پر جو کسی مصلحت پر مبنی تھا اعتراض کیا۔ اس موقع پر بھی صبر کا رشتہ آپ ﷺ کے ہاتھ سے نہ چھوٹا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ غنائم حنین کے متعلق ایک دو انصاریوں نے اعتراض کیا کہ آنحضرت ﷺ نے یہ دوسروں کو کیوں دے دیا حق تو ہمارا تھا۔ آپ ﷺ کو اس کی خبر پہنچی فرمایا۔

﴿رحمة الله علی موسی قد اوذی باکثر من ذالک فصبر﴾ (باب غزوہ حنین)

موسیٰ پر خدا کی رحمت ہو وہ اس سے بھی زیادہ اپنے دوستوں کی طرف سے ستائے گئے ہیں لیکن انہوں نے صبر کیا۔

❁❁❁

اخلاقِ نبوی

﴿إِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ﴾

حضرت رسالت پناہ ﷺ کی حیات اقدس کا یہ وہ حصہ ہے جہاں آ کر آپ ﷺ کی زندگی تمام انبیائے کرام اور مصلحین عالم سے علیحدہ نظر آتی ہے، تاریخی ہستی کا ثبوت ایک طرف اگر یہ سوال کیا جائے کہ ان اخلاق و فضائل کا خود عملی ثبوت کیا تھا تو دنیا اس کے جواب سے عاجز ہو جائے گی، یہ کہ تمام مصلحین اخلاق میں گوتم بدھ اور مسیح کا درجہ سب سے بڑا ہے، لیکن کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ ہندوستان کا یہ مصلح اعظم (بدھ) عملاً خود کیا تھا کوروشلم کے دیہاتی اخلاق کا واعظ (مسیح) دنیا کو اخلاق کا بہترین درس دیتا تھا لیکن اس کی زندگی کا ایک واقعہ بھی اس کے زریں مقولوں کی تائید میں ہم کو معلوم ہے؟ لیکن کلام ربانی پکار کر کہتا ہے۔

﴿لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ﴾ (صف)

جو نہیں کرتے وہ کہتے کیوں ہو؟

یہ خود اپنی تعلیم کا آپ ثبوت تھا انسانوں کے مجمع عام میں وہ جو کچھ کہتا تھا گھر کے خلوت کدہ میں وہ اسی طرح نظر آتا تھا اخلاق و عمل کا جو نکتہ وہ دوسروں کو سکھاتا تھا وہ خود اس کا عملی پیکر بن جاتا تھا بیوی سے بڑھ کر انسان کے اخلاق کا اور کون راز داں ہو سکتا ہے چند صاحبوں نے آ کر حضرت عائشہؓ سے درخواست کی کہ حضرت ﷺ کے اخلاق بیان کیجئے انہوں نے پوچھا کیا تم قرآن نہیں پڑھتے؟ ﴿إن خلق رسول الله ﷺ كان القرآن﴾ آپ کا اخلاق ہمہ تن قرآن تھا۔[1]

موجودہ صحائف آسمانی اپنے داعیوں کے بہترین اقوال کا مجموعہ ہیں لیکن کیا ان کا ایک حرف بھی اپنے معلمین کے عمل کا مدعی ہے؟ قرآن مجید لاکھوں مخالفین اور ہزاروں منافقین کے مجمع میں اپنے داعی حق کی نسبت کہتا تھا۔

﴿إِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ﴾

اے محمد تم اخلاق کے بڑے درجہ پر ہو۔

بے درد دشمن آج تیرہ سو برس کے بعد آپ ﷺ کو مشتعل کہتے ہیں، لیکن اس وقت جب یہ سب کچھ ہو رہا تھا قرآن خود دشمنوں کے مجمع میں آپ کی نسبت کیا شہادت دے رہا تھا۔

﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ لِنتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ﴾ (آل عمران)

خدا کی عنایت سے تم ان سے نرمی سے پیش آتے ہو اگر تم کہیں کج خلق اور سخت دل ہوتے تو یہ لوگ تمہارے آس پاس سے ہٹ جاتے۔

دوسری جگہ کہتا ہے۔

﴿لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ﴾ (توبہ)

---

1 ابو داؤد باب الصلوٰۃ فی اللیل۔

مداومت عمل:

اخلاق کا سب سے مقدم اور ضروری پہلو یہ ہے کہ انسان جس کام کو اختیار کرے اس پر قدر استقلال کے ساتھ قائم رہے کہ گویا وہ اس کی فطرت ثانیہ بن جائے' انسان کے سوا تمام دنیا کی مخلوقات صرف ایک ہی قسم کا کام کر سکتی ہے اور وہ فطرتاً اس پر مجبور ہے' آفتاب صرف روشنی بخشتا ہے' اس سے تاریکی کا صدور نہیں ہو سکتا' رات تاریکی ہی پھیلاتی ہے' وہ روشنی کی علت نہیں' درخت اپنے موسم ہی میں پھلتے ہیں' اور پھول ایام بہاری ہی میں پھولتے ہیں' حیوانات کا ایک ایک فرد اپنے نوعی افعال و اخلاق سے ایک سر مو تجاوز نہیں کر سکتا' لیکن انسان خدا کی طرف سے مختار پیدا ہوا ہے' وہ آفتاب بھی ہے اور رات کی تاریکی بھی' اس کے جوہر کا درخت ہر موسم میں پھلتا ہے اور اس کے اخلاق کے پھول ایام بہار کے پابند نہیں' وہ حیوانات کی طرح کسی ایک ہی خاص قسم کے افعال و اخلاق پر مجبور نہیں اس کو اختیار دیا گیا ہے اور یہی اختیار اس کے مکلف اور ذمہ دار ہونے کا راز ہے۔ لیکن اخلاق کا ایک دقیق نکتہ یہ ہے کہ انسان اپنے لیے اخلاق حسنہ کا جو پہلو پسند کرے اس کی اس شدت سے پابندی کرے اور اس طرح دائمی اور غیر متبدل طریقے سے اس پر عمل کرے کہ گویا وہ اپنے اختیار کے باوجود اس کام کے کرنے پر مجبور ہے' اور لوگ دیکھتے دیکھتے یہ یقین کر لیں کہ اس شخص سے اس کے علاوہ اور کوئی بات سرزد ہو ہی نہیں سکتی گویا اس سے یہ افعال اس طرح صادر ہوتے ہیں جیسے آفتاب سے روشنی' درخت سے پھل' پھول سے خوشبو' کہ یہ خصوصیات ان سے کسی حالت میں الگ نہیں ہو سکتیں' اس کا نام استقامت حال اور مداومت عمل ہے۔

آنحضرت ﷺ اپنے تمام کاموں میں اسی اصول کی پابندی فرماتے تھے' جس کام کو جس طریقہ سے جس وقت آپ ﷺ نے شروع فرمایا' اس پر برابر شدت کے ساتھ قائم رہتے تھے' سنت کا لفظ ہماری شریعت میں اسی اصول سے پیدا ہوا ہے' سنت وہ فعل ہے جس پر آنحضرت ﷺ نے ہمیشہ مداومت فرمائی ہے' اور بغیر کسی قوی مانع کے کبھی اس کو ترک نہیں فرمایا' اس بنا پر جس قدر سنن ہیں وہ در حقیقت آپ ﷺ کی استقامت حال اور مداومت عمل کی ناقابل انکار مثالیں ہیں' آپ کے معمولات کا ذکر اس سے پہلے ہو چکا ہے' جس سے یہ معلوم ہوا ہوگا کہ آپ ﷺ کے تمام اخلاق و اعمال کس قدر پختہ اور مستحکم تھے کہ کبھی تمام عمر ان میں ایک ذرہ فرق نہیں پیدا ہوا' ایک دفعہ ایک شخص نے آنحضرت ﷺ کے عبادات و اعمال کے متعلق حضرت عائشہؓ سے دریافت کیا کہ کیا آپ کسی خاص دن یہ کرتے تھے؟ انہوں نے جواب دیا ﴿ لا کان عمله ديمة ﴾ "آپ ﷺ کا عمل جھڑی ہوتا تھا" یعنی جس طرح بادل کی جھڑی جب برسنے پر آتی ہے تو نہیں رکتی' اس طرح آپ ﷺ کا حال تھا کہ جو بات ایک دفعہ آپ نے اختیار کر لی ہمیشہ اس کی پابندی کی' پھر فرمایا ﴿ وايكم يستطيع ما كان النبي ﷺ يستطيع ﴾ "آنحضرت ﷺ جو کر سکتے تھے وہ تم میں سے کون کر سکتا ہے"۔[۱]

دوسری روایت میں ہے۔

﴿ وكان اذا عمل عملا اثبته ﴾[۲]

جب آنحضرت ﷺ کوئی کام کرتے تھے تو اس پر مداومت فرماتے تھے۔

---

[۱] صحیح بخاری کتاب الرقاق۔

[۲] ابوداؤد کتاب الصلوۃ و صحیح بخاری کتاب الادب۔

اس سے آنحضرت ﷺ کا خود ارشاد ہے۔

﴿ان احب العمل الی اللہ ادومہ﴾ [1]

خدا کے نزدیک سب سے محبوب وہ کام ہے جس پر سب سے زیادہ انسان مداومت کرے۔

آپ ﷺ راتوں کو اٹھ کر عبادت کیا کرتے تھے۔ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے کبھی رات کی عبادت ترک نہیں کی اگر کبھی مزاج اقدس ناساز یا سست ہوتا تو بیٹھ کر ادا کرتے تھے۔ [2]

جریرؓ بن عبداللہ ایک صحابی ہیں جن کو دیکھ کر آپ ﷺ محبت سے مسکرا دیا کرتے تھے ان کا بیان ہے کہ کبھی ایسا نہ ہوا کہ میں خدمت اقدس میں حاضر ہوا ہوں اور آپ ﷺ نے مسکرا نہ دیا ہو۔ [3]

جس کام کے کرنے کا جو وقت آپ ﷺ نے مقرر کر لیا تھا اس میں کبھی تخلف نہ ہوا نماز اور تسبیح و تہلیل کے اوقات، نوافل کی تعداد، خواب اور بیداری کے مقررہ ساعات، ہر شخص سے ملنے جلنے کے طرز و انداز میں کبھی فرق نہیں آیا اب وہی مسلمانوں کی زندگی کا دستور العمل ہے۔

حسن خلق:

حضرت علیؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت انسؓ، حضرت ہندؓ بن ابی ہالہ وغیرہ جو مدتوں آپ ﷺ کی خدمت میں رہے تھے ان سب کا متفقہ بیان ہے کہ آپ ﷺ نہایت نرم مزاج، خوش اخلاق اور نیک سیرت تھے آپ ﷺ کا چہرہ ہنستا تھا وقار و متانت سے گفتگو فرماتے تھے کسی کی خاطر شکنی نہیں کرتے تھے۔

معمول یہ تھا کہ کسی سے ملنے کے وقت ہمیشہ پہلے خود سلام اور مصافحہ فرماتے کوئی شخص جھک کر آپ ﷺ کے کان میں کچھ بات کہتا تو اس وقت تک اس کی طرف سے رخ نہ پھیرتے جب تک وہ خود منہ نہ ہٹالے مصافحہ میں بھی یہی معمول تھا یعنی کسی سے ہاتھ ملاتے تو جب تک وہ خود نہ چھوڑ دے اس کا ہاتھ نہ چھوڑتے مجلس میں بیٹھتے تو آپ ﷺ کے زانو کبھی ہم نشینوں سے آگے نکلے ہوئے نہ ہوتے۔ [4]

اکثر ایسا ہوتا کہ لونڈی غلام خدمت اقدس میں پانی لے کر آتے کہ آپ اس میں ہاتھ ڈال دیں تاکہ متبرک ہو جائے جاڑوں کے دن اور صبح کا وقت ہوتا تاہم آپ ﷺ کبھی انکار نہ فرماتے۔ [5]

ایک دفعہ آپ ﷺ سعدؓ بن عبادہ سے ملنے گئے واپس آنے لگے تو انہوں نے اپنے صاحبزادہ قیسؓ کو ساتھ کر دیا کہ آنحضرت ﷺ کے ہمرکاب جائیں آنحضرت ﷺ نے قیسؓ سے کہا تم بھی میرے اونٹ پر سوار ہو لو انہوں نے ادب کے لحاظ سے تامل کیا آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ یا سوار ہو لو یا گھر واپس جاؤ وہ واپس چلے گئے۔ [6]

---

[1] ایضاً۔

[2] ابوداؤد باب قیام اللیل۔

[3] صحیح مسلم مناقب جریر بن عبداللہ۔

[4] ابوداؤد و ترمذی۔

[5] صحیح مسلم باب قرب النبی ﷺ من الناس۔

[6] سنن ابوداؤد کتاب الادب۔

ایک دفعہ نجاشی کے ہاں سے ایک سفارت آئی آپ ﷺ نے اس کو اپنے ہاں مہمان رکھا اور خود بہ نفس نفیس مہمانداری کے تمام کام انجام دیئے صحابہؓ نے عرض کی کہ ہم یہ خدمت انجام دیں گے ارشاد ہوا کہ ان لوگوں نے میرے دوستوں کی خدمت گذاری کی ہے اس لیے میں خود ان کی خدمت گذاری کرنا چاہتا ہوں۔[1]

عتبانؓ بن مالک جو اصحاب بدر میں تھے ان کی بینائی میں فرق آ گیا تھا آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آ کر درخواست کی کہ میں اپنے محلہ کی مسجد میں نماز پڑھاتا ہوں' لیکن جب بارش ہو جاتی ہے تو مسجد تک جانا مشکل ہو جاتا ہے اس لیے اگر آپ میرے گھر میں تشریف لا کر نماز پڑھ لیتے تو میں اس جگہ کو سجدہ گاہ بنا لیتا' دوسرے دن صبح کے وقت آپ ﷺ حضرت ابوبکرؓ کو ساتھ لے کر ان کے گھر گئے اور دروازہ پر ٹھہر کر اذن مانگا' اندر سے جواب آیا تو گھر میں تشریف لے گئے اور دریافت فرمایا کہ کہاں نماز پڑھوں؟ انہوں نے جگہ بتا دی آپ ﷺ نے تکبیر کہہ کر دو رکعت نماز ادا کی نماز کے بعد لوگوں نے کھانے کیلئے اصرار کیا' خزیرہ ایک کھانا ہوتا ہے قیمہ پر آٹا چھڑک کر تیار کرتے ہیں' وہ سامنے آیا' محلہ کے تمام لوگ کھانے میں شریک ہوئے' حاضرین میں سے کسی نے کہا "مالک بن دخشن (دخشم) نظر نہیں آتے" ایک نے کہا "وہ منافق ہے" ارشاد فرمایا "یہ نہ کہو وہ لا الہ الا اللہ کہتے ہیں" لوگوں نے کہا "ہاں ان کا میلان منافقین کی طرف ہے" آپ ﷺ نے فرمایا "جو شخص خدا کی مرضی کے لیے لا الہ الا اللہ کہتا ہے خدا اس پر آگ کو حرام کر دیتا ہے"۔[2]

ابتدائے ہجرت میں خود آنحضرت ﷺ اور تمام مہاجرین انصار کے گھر مہمان رہے تھے دس دس آدمیوں کی ایک ایک جماعت ایک ایک گھر میں مہمان اتاری گئی تھی' مقدادؓ بن الاسود کہتے ہیں کہ میں اس جماعت میں تھا جس میں خود آنحضرت ﷺ شامل تھے' گھر میں چند بکریاں تھیں جن کے دودھ پر گذارا تھا' دودھ دوہ چکتا تو سب لوگ اپنے اپنے حصہ کا پی لیتے اور آپ کے لئے پیالہ میں چھوڑ دیتے' ایک شب کا واقعہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی تشریف آوری میں تاخیر ہوئی' لوگ دودھ پی کر سو رہے۔ آپ ﷺ نے آ کر دیکھا تو پیالہ خالی پایا' خاموش ہو رہے پھر فرمایا خدایا! جو آج کھلا دے اس کو تو بھی کھلا دے' حضرت مقدادؓ چھری لے کر کھڑے ہوئے کہ بکری کو ذبح کر کے گوشت پکائیں' آپ ﷺ نے روکا اور بکری کو دوبارہ دوہ کر جو کچھ نکلا اسی کو پی کر سو رہے[3] اور کسی کو اس فعل پر ملامت نہ کی۔

ابوشعیبؓ ایک انصاری تھے' ان کا غلام بازار میں گوشت کی دوکان رکھتا تھا' ایک دن وہ خدمت اقدس میں آئے آپ ﷺ صحابہؓ کے حلقہ میں تشریف فرما تھے اور چہرہ سے بھوک کا اثر پیدا تھا' ابوشعیبؓ نے جا کر غلام سے کہا کہ پانچ آدمیوں کا کھانا تیار کرو' کھانا تیار ہو چکا تو آ کر آنحضرت ﷺ سے درخواست کی کہ صحابہؓ کے ساتھ قدم رنجہ فرمائیں' کل پانچ آدمی تھے' راہ میں ایک اور شخص ساتھ ہو لیا' آنحضرت ﷺ نے ابوشعیبؓ سے کہا کہ یہ شخص بے کہے ساتھ ہو لیا ہے تم اجازت دو تو یہ بھی ساتھ آئے ورنہ رخصت کر دیا جائے' انہوں نے کہا آپ ان کو بھی ساتھ لائیں۔[4]

---

1. شرح الشفاء للخفاجی بحوالہ دلائل بیہقی جلد ۱ صفحہ ۴۲۰۔
2. بخاری جلد اول صفحہ ۶۰ کتاب الصلوۃ۔
3. مسند ابن حنبل جلد ۶ صفحہ ۳۔
4. بخاری صفحہ ۸۱۲۔

اتری کہ اس حالت میں مقاربت ناجائز ہے اس بنا پر آپ ﷺ نے حکم دیا کہ مقاربت کے سوا کوئی چیز منع نہیں، یہودیوں نے آپ ﷺ کا حکم سنا تو بولے کہ یہ شخص بات بات میں ہماری مخالفت کرتا ہے، صحابہ آپ ﷺ کی خدمت میں آئے کہ یہود جب یہ کہتے ہیں تو ہم مقاربت بھی کیوں نہ کریں، رخسارہ مبارک غصہ سے سرخ ہو گیا، دونوں صاحب چلے گئے آپ نے ان کے پاس کچھ کھانے کی چیزیں بھیجیں اس وقت ان کو تسکین ہوئی کہ آپ ناراض نہ تھے۔[1]

کسی شخص کی کوئی بات ناپسند آتی تو اکثر اس کے سامنے اس کا تذکرہ نہ فرماتے ایک دفعہ ایک صاحب عرب کی دستور کے مطابق زعفران لگا کر خدمت میں حاضر ہوئے آپ ﷺ نے کچھ نہ فرمایا جب وہ اٹھ کر چلے گئے تو لوگوں سے کہا کہ ان سے کہہ دینا کہ یہ رنگ دھو ڈالیں۔[2]

ایک دفعہ ایک شخص نے باریابی کی اجازت چاہی آپ ﷺ نے فرمایا اچھا آنے دو، وہ اپنے قبیلہ کا اچھا آدمی نہیں ہے، لیکن جب وہ خدمت مبارک میں حاضر ہوا تو نہایت نرمی کے ساتھ اس سے گفتگو فرمائی، حضرت عائشہؓ کو اس پر تعجب ہوا اور آپ ﷺ سے دریافت فرمایا کہ آپ تو اس کو اچھا نہیں سمجھتے تھے، پھر اس رفق و ملاطفت کے ساتھ کلام کیا، آپ ﷺ نے فرمایا خدا کے نزدیک سب سے برا وہ شخص ہے جس کی بدزبانی کی وجہ سے لوگ اس سے ملنا جلنا چھوڑ دیں۔[3] یہود جس درجہ شقی اور دشمن اسلام تھے، اس کا اندازہ گذشتہ واقعات سے ہو چکا ہوگا، بایں ہمہ آنحضرت ﷺ ان سنگ دلوں کے ساتھ ہمیشہ نرمی اور لطف کا برتاؤ کرتے اور ان سے دادو ستد رکھتے، سخت سے سخت غصہ کی حالت میں صرف اس قدر فرماتے "اس کی پیشانی خاک آلود ہو"۔[4]

حضرت جابرؓ بن عبداللہ انصاری کہتے ہیں کہ مدینہ میں ایک یہودی رہتا تھا جس سے میں قرض لیا کرتا تھا، ایک سال اتفاق سے کھجوریں نہیں پھلیں اور قرض ادا نہ ہو سکا اس پر پورا سال گذر گیا، بہار آئی تو یہودی نے تقاضا شروع کیا اب کی بار بھی پھل کم آئے، میں نے آئندہ فصل کی مہلت مانگی اس نے انکار کیا، میں نے آنحضرت سے آ کر تمام واقعات بیان کیے، آپ ﷺ چند صحابہؓ کے ساتھ خود یہودی کے گھر تشریف لے گئے اور سمجھایا کہ مہلت دے دو، اس نے کہا "ابوالقاسم! میں کبھی مہلت نہ دوں گا" آپ ﷺ نخلستان میں تشریف لے گئے اور ایک چکر لگا کر پھر یہودی کے پاس آئے اور اس سے گفتگو کی لیکن وہ کسی طرح راضی نہ ہوا، بالآخر آپ ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ چبوترہ پر (جو مسقف تھا) فرش بچھا دو اس پر آرام فرمایا اور سو گئے، سو کر اٹھے تو پھر یہودی سے خواہش کی کہ مہلت دے دو، اس شقی نے اب بھی نہ مانا، آپ ﷺ درختوں کے جھنڈ میں جا کر کھڑے ہو گئے اور جابر سے کہا کہ کھجوریں توڑنی شروع کرو، آنحضرت ﷺ کی برکت سے اتنی کھجوریں نکلیں کہ یہودی کا قرض ادا کر کے بچ رہیں۔[5]

مجلس نبوی میں جگہ بہت کم ہوتی تھی، جو لوگ پہلے سے آ کر بیٹھ جاتے تھے ان کے بعد جگہ باقی نہیں رہتی تھی

---

[1] ابوداؤد باب مواکلۃ الحائض

[2] ابوداؤد جلد ۲ کتاب الادب

[3] صحیح بخاری و ابوداؤد جلد ۲ کتاب الادب

[4] ادب المفرد امام بخاری

[5] بخاری صفحہ ۸۱۸ باب الرطب والتمر

﴿إِنَّمَا أَنَا قَاسِمٌ وَخَازِنٌ وَاللّٰهُ يُعْطِي﴾ [1] (بخاری)

میں تو صرف بانٹنے والا اور خازن ہوں دینے والا اللہ ہے۔

ایک دفعہ ایک شخص خدمت اقدس میں آیا اور دیکھا کہ دور تک آپ ﷺ کی بکریوں کا ریوڑ پھیلا ہوا ہے اس نے آپ ﷺ سے درخواست کی اور آپ ﷺ نے سب کی سب دے دیں اس نے اپنے قبیلہ میں جا کر کہا کہ اسلام قبول کرلو محمد ﷺ ایسے فیاض ہیں کہ مفلس ہو جانے کی پروا نہیں کرتے۔ [2]

ایک دفعہ ایک شخص نے کچھ مانگا آپ ﷺ نے فرمایا اس وقت میرے پاس کچھ نہیں ہے تم میرے ساتھ آؤ حضرت عمرؓ بھی ساتھ تھے عرض کی کہ آپ کے پاس کچھ موجود نہیں تو آپ پر کیا ذمہ داری ہے۔ ایک اور صاحب حاضر تھے انہوں نے کہا یا رسول اللہ! آپ دیئے جایئے اور عرش والے خدا سے نہ ڈریے وہ آپ کو محتاج نہ کرے گا آپ ﷺ فرط بشاشت سے مسکرا دیئے۔ [3]

عام فیاضی کا یہ معمول تھا کہ جو شخص آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتا اگر آپ ﷺ کے پاس کچھ سرمایہ موجود ہوتا تو اس کو کچھ نہ کچھ ضرور عطا فرماتے ورنہ وعدہ فرماتے۔ اس معمول کی بنا پر لوگ اس قدر دلیر ہو گئے تھے کہ ایک مرتبہ عین اقامت نماز کے وقت ایک بدو آیا اور آپ ﷺ کا دامن پکڑ کر کہا کہ میری ایک معمولی سی حاجت باقی رہ گئی ہے خوف ہے کہ میں اس کو بھول نہ جاؤں اس کو پورا کر دیجئے چنانچہ آپ ﷺ اس کے ساتھ تشریف لے گئے اور اس کی حاجت برآری کر کے آئے تو نماز پڑھی۔ [4]

بعض اوقات ایسا ہوتا کہ ایک شخص سے ایک چیز خریدتے قیمت چکا دینے کے بعد پھر وہ چیز اس کو بطور عطیہ کے عنایت فرماتے چنانچہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ سے ایک اونٹ خریدا اور پھر اسی وقت اس کو عبداللہ بن عمرؓ کو دے دیا۔ [5] حضرت جابرؓ کے ساتھ بھی اسی قسم کا واقعہ مذکور ہے۔ [6]

کھانے پینے کی چیزوں میں معمولی سے معمولی چیز بھی تنہا نہ کھاتے بلکہ تمام صحابہ کو شریک فرما لیتے۔ کسی غزوہ میں ۱۳۰ صحابی ہمراہ تھے آپ ﷺ نے ایک بکری خرید کر ذبح کروائی اور کلیجی کے بھوننے کا حکم دیا وہ تیار ہوئی تو تمام صحابہ کو تقسیم فرمائی جو لوگ موجود نہ تھے ان کا حصہ الگ نکلوا رکھا۔ [7] جو چیز آنحضرت ﷺ کے پاس آتی جب تک صرف نہ ہو جاتی آپ ﷺ کو چین نہ آتا بے قراری سی رہتی ام المومنین ام سلمہؓ بیان کرتی ہیں کہ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ گھر

---

۱ [illegible]
۲ [illegible]
۳ [illegible]
۴ [illegible]
۵ [illegible]
۶ [illegible]
۷ [illegible]

افلاس و تنگدستی کی شکایت کر کے عرض کی کہ اسباب کے غزوہ میں جو کنیزیں آئی ہیں ان میں سے ایک مجھ کو مل جائے، آپ ﷺ نے فرمایا "بدر کے یتیم تم سے پہلے درخواست کر چکے"۔ ١

ایک دفعہ حضرت علیؓ نے کسی امر کی درخواست کی تو فرمایا یہ نہیں ہو سکتا کہ تم کو دوں اور اہل صفہ کو اس حال میں چھوڑ دوں کہ وہ بھوک سے اپنے پیٹ لپیٹے پھرتے ہیں۔ ٢

ایک دفعہ ایک عورت نے ایک چادر لا کر پیش کی، آپ ﷺ کو ضرورت تھی آپ ﷺ نے لے لی، ایک صاحب حاضر خدمت تھے انہوں نے کہا کیا اچھی چادر ہے۔ آپ ﷺ نے اتار کر ان کو دے دی، جب اٹھ کر چلے گئے تو لوگوں نے ان کو ملامت کی کہ تم جانتے ہو کہ آنحضرت ﷺ کو چادر کی ضرورت تھی یہ بھی جانتے ہو کہ آنحضرت ﷺ کسی کا سوال رد نہیں کرتے، انہوں نے جواب دیا میں نے تو برکت کے لیے لی ہے کہ مجھ کو اسی چادر کا کفن دیا جائے۔ ٣

زہد و قناعت کے عنوان سے جو واقعات لکھے گئے ہیں ان سے ظاہر ہو گا کہ آنحضرت ﷺ کس عسرت اور تنگ دستی میں بسر فرماتے تھے۔ ۷ھ کے بعد فتوحات کو وسعت حاصل ہوئی ہے۔ عرب میں باغات سب سے بڑی جائداد تھی۔ ۳ھ میں یہودیان بنو نضیر میں سے مخیریق نامی ایک شخص نے اپنے سات باغ میثب، صائفہ، دلال، حسنیٰ، برقہ، مشربہ ام ابراہیم مرتے وقت آنحضرت ﷺ کو وصیت کر دیئے تھے آپ ﷺ نے سب کو خیرات کر دیا یعنی وہ خدا کی راہ میں وقف تھے جو کچھ پیدا ہوتا تھا وہ غرباء اور مساکین کو دے دیا جاتا تھا۔ ٤ ٥

ایک صحابی نے شادی کی، سامان ولیمہ کے لیے گھر میں کچھ نہ تھا، آنحضرت ﷺ نے ان سے فرمایا کہ عائشہ کے پاس جاؤ اور آٹے کی ٹوکری مانگ لاؤ، وہ گئے اور جا کر لے آئے، حالانکہ کاشانۂ نبوت میں اس ذخیرہ کے سوا شام کے کھانے کو کچھ نہ تھا۔ ٦ ایک دفعہ ایک غفاری آ کر مہمان ہوا، رات کو کھانے کے لیے صرف بکری کا دودھ تھا، وہ آپ ﷺ نے اس کو نذر کر دیا، یہ تمام رات خانۂ نبوی میں فاقہ سے گزری حالانکہ اس سے پہلی شب میں بھی یہاں فاقہ ہی تھا۔ ٧

مہمان نوازی:

(عرب کے مختلف اطراف اور صوبوں سے جوق در جوق وفود بارگاہ نبوی میں آتے تھے، علاوہ بریں صحابہ

---

١ ابو داؤد جلد ۲ صفحہ ۳۴۳۔

٢ مسند احمد جلد ۱ صفحہ ۱۰۶۔

٣ صحیح بخاری باب حسن الخلق والسخاء وما یکرہ من البخل۔

٤ فتح الباری شرح کتاب الفرائض۔

٥ اصابہ تذکرہ مخیریق۔

٦ مسند احمد جلد ۴ صفحہ ۵۸۔

٧ مسند احمد جلد ۶ صفحہ ۳۹۷۔

دودھ کا وہ پیالہ دو کہ سب کو تقسیم کر دوں۔[1]

آنحضرت ﷺ کے گھر میں ایک پیالہ اس قدر بھاری تھا کہ اس کو چار آدمی اٹھا سکتے تھے۔ جب دوپہر ہوتی تو وہ پیالہ آتا اور اصحاب صفہ اس کے گرد بیٹھ جاتے یہاں تک کہ جب زیادہ مجمع ہو جاتا تو آنحضرت ﷺ کو اکڑوں بیٹھنا پڑتا کہ لوگوں کے لیے جگہ نکل آئے۔[2]

مقدادؓ کا بیان ہے کہ میں اور میرے دو رفیق اس قدر تنگ دست تھے کہ بھوک سے بینائی جاتی رہی۔ ہم لوگوں نے اپنے تکفل کی درخواست کی لیکن کسی نے منظور نہیں کیا آخر ہم لوگ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ ﷺ دولت خانہ میں لے گئے اور تین بکریوں کو دکھا کر فرمایا کہ ان کا دودھ پیا کرو، چنانچہ ہم میں ہر شخص دودھ دوہ کر اپنا اپنا حصہ پی لیا کرتا تھا۔[3]

ایک دن اصحاب صفہ کو لے کر حضرت عائشہؓ کے گھر پہنچے اور فرمایا کھانے کو جو کچھ ہو لاؤ، چونی کا پکا ہوا کھانا سامنے لا کر رکھا گیا آپ ﷺ نے کھانے کی کوئی اور چیز طلب کی تو چھوہارے کا حریرہ پیش ہوا اس کے بعد بڑے پیالہ میں دودھ حاضر کیا گیا اور یہی سامان مہمانی کی آخری قسط تھی۔[4]

گداگری اور سوال سے نفرت:

باوجود اس کے کہ آپ ﷺ کا ابر کرم ہر وقت برستا رہتا تھا تاہم کسی کا بے ضرورت شدید سوال کرنا آپ ﷺ پر سخت گراں ہوتا تھا ارشاد فرماتے کہ اگر کوئی شخص لکڑی کا گٹھا پیٹھ پر لاد لائے اور بیچ کر اپنی آبرو بچائے تو اس سے بہتر ہے کہ لوگوں سے سوال کرے۔[5]

ایک دفعہ ایک انصاری آئے اور کچھ سوال کیا آپ ﷺ نے فرمایا تمہارے پاس کچھ نہیں ہے؟ بولے کہ بس ایک بچھونا ہے جس کا کچھ حصہ اوڑھ لیتا ہوں کچھ بچھا لیتا ہوں اور ایک پانی پینے کا پیالہ ہے آپ ﷺ نے دونوں چیزیں منگوائیں پھر فرمایا یہ چیزیں کون خریدتا ہے؟ ایک شخص نے ایک درہم لگایا آپ ﷺ نے فرمایا اس سے بڑھ کر بھی کوئی دام لگاتا ہے؟ ایک صاحب نے ایک کے دو کر دیئے۔ آپ ﷺ نے دونوں چیزیں ان کے ہاتھ بیچ دیں اور درہم انصاری کو دے کر کہا کہ ایک درہم کا کھانا خرید کر گھر میں دے آؤ اور دوسرے سے کلہاڑی خریدو اور جنگل سے لکڑیاں لا کر شہر میں بیچو۔ چند دن کے بعد وہ خدمت اقدس میں آئے تو دس درہم ان کے پاس جمع ہو گئے تھے اس سے کچھ کپڑا خریدا کچھ کا غلہ مول لیا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا یہ اچھا ہے یا یہ کہ قیامت میں چہرہ پر گدائی کا داغ لگا کر جاتے۔[6]

---

1. ترمذی صفحہ ۲۰۱۔
2. ابو داؤد کتاب الاطعمہ۔
3. صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۲۱۱۔
4. ابو داؤد کتاب الادب۔
5. صحیح بخاری کتاب الصدقات صفحہ ۱۹۸۔
6. ابو داؤد ترمذی صدقات۔

خیال ہوتا ہے کہ کہیں صدقہ کی کھجور نہ ہو اس لیے ڈال دیتا ہوں"۔[1]

ایک دفعہ راستہ میں ایک کھجور ہاتھ آ گئی فرمایا اگر صدقہ کا شبہ نہ ہوتا تو میں اس کو کھا جاتا۔[2] ایک بار امام حسنؓ نے صدقہ کی کھجوروں میں سے منہ میں ایک کھجور ڈال لی آپ ﷺ نے ڈانٹ کر کہا "کیا تمہیں یہ خبر نہیں کہ ہمارا خاندان صدقہ نہیں کھاتا"۔[3] پھر منہ سے اگلوا دیا۔

آپ ﷺ کے سامنے جب کوئی شخص کوئی چیز لے کر آتا تو دریافت فرماتے کہ ہدیہ ہے یا صدقہ؟ اگر ہدیہ کہتا قبول فرماتے اور اگر یہ کہتا کہ صدقہ تو آپ ﷺ ہاتھ روک لیتے اور دوسرے صاحبوں کو عنایت فرما دیتے۔

ہدایا اور تحفے قبول کرنا:

دوست واحباب کے ہدایا اور تحفے آپ ﷺ قبول فرماتے تھے بلکہ آپ ﷺ نے اس کو زیادہ محبت کا بہترین ذریعہ فرمایا ہے۔

﴿تہادوا تحابوا﴾ (حدیث)

باہم ایک دوسرے کو ہدیہ بھیجو تو باہم محبت ہوگی۔

اسی لیے صحابہؓ عموماً کھانے پینے کی چیزیں آپ ﷺ کے گھر بھیجا کرتے تھے اور خصوصیت کے ساتھ اس دن بھیجتے تھے جس دن آپ ﷺ حجرہ عائشہؓ میں قیام فرماتے تھے۔[4] اوپر گزر چکا ہے کہ کوئی چیز آپ ﷺ کے سامنے پیش کی جاتی تو آپ ﷺ دریافت فرماتے تھے کہ یہ صدقہ ہے یا ہدیہ؟ اگر ہدیہ ہوتا تو قبول فرماتے ورنہ احتراز کرتے۔ ایک دفعہ ایک عورت نے ایک چادر خدمت اقدس میں پیش کی۔ آپ ﷺ نے لے لی اسی وقت ایک صاحب نے مانگ لی آپ ﷺ نے ان کو عنایت فرما دی۔[5]

آس پاس کے ملوک وسلاطین بھی آپ ﷺ کو تحفے بھیجا کرتے تھے۔ حدود شام کے ایک رئیس نے ایک سفید خچر تحفہ دیا تھا عزیز مصر نے بھی ایک خچر مصر سے بھیجا تھا۔ ایک امیر نے آپ ﷺ کو موزے بھیجے تھے۔ ایک دفعہ قیصر روم نے آپ ﷺ کی خدمت میں ایک پوستین بھیجی جس میں دیبا کی سنجاف لگی ہوئی تھی آپ ﷺ نے ذرا دیر کے لیے پہن لی پھر اتار کر حضرت جعفرؓ (حضرت علیؓ کے بھائی) کے پاس بھیج دی۔ وہ پہن کر خدمت اقدس میں آئے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں نے اس لیے نہیں بھیجی کہ تم خود پہنو عرض کی پھر کیا کروں ارشاد فرمایا کہ اپنے بھائی نجاشی کو بھیج دو۔[6] حضرت جعفرؓ ایک مدت یعنی فتح خیبر تک حبش میں رہے تھے اور نجاشی نے انہی سے اسلام کی تعلیم پائی تھی۔

---

1. بخاری جلد ا صفحہ ۳۲۸ کتاب اللقطہ۔
2. بخاری جلد ا صفحہ ۳۲۸ کتاب اللقطہ۔
3. بخاری جلد ا صفحہ ۲۰۰ کتاب الصدقات۔
4. بخاری مناقب عائشہؓ۔
5. صحیح بخاری کتاب الصدقہ۔
6. صحیح بخاری کتاب الہبۃ۔

ہدایا اور تحفے دینا:

جن لوگوں کے ہدایا اور تحفے قبول فرماتے تھے ان کو ان کا صلہ بھی ضرور عطا فرماتے تھے۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے۔

﴿کان یقبل الهدیة ویثیب علیها﴾

آنحضرت ﷺ ہدیہ قبول فرماتے تھے اور اس کا معاوضہ دیتے تھے

یمن کا مشہور بادشاہ ذی یزن جس نے حبشی حکومت مٹا کر ایران کے زیر اثر عربی حکومت قائم کی تھی اس نے آنحضرت ﷺ کو ایک قیمتی حلہ بھیجا جس کو اس نے ۳۳ اونٹوں کے بدلہ میں خریدا تھا آپ ﷺ نے قبول فرمایا اور پھر اس کو ایک حلہ ہدیۃً بھیجا جو ۲۰ سے کچھ زیادہ اونٹ دے کر خریدا گیا تھا۔[1]

ایک دفعہ قبیلہ بنی فزارہ کے ایک شخص نے آپ ﷺ کی خدمت میں ہدیۃً ایک اونٹنی پیش کی آپ ﷺ نے اس کا صلہ دیا تو وہ سخت ناراض ہوا۔ آپ ﷺ نے منبر پر کھڑے ہو کر خطاب عام کیا اور فرمایا کہ تم لوگ مجھے ہدیے دیتے ہو اور میں بقدر استطاعت اس کا صلہ دیتا ہوں تو ناراض ہوتے ہو؟ آئندہ قریش انصار ثقیف اور دوس کے سوا کسی قبیلہ کا ہدیہ قبول نہ کروں گا۔[2]

حضرت ابو ایوب انصاریؓ جن کے مکان میں آپ ﷺ چھ مہینے تک فروکش رہے تھے آپ ﷺ اکثر ان کو بچا ہوا کھانا بھیجا کرتے[3] ہمسایوں اور پڑوسیوں کے گھروں میں بھی تحفے بھیجتے تھے۔ اصحاب صفہ اکثر آپ ﷺ کے تحفوں سے مشرف ہوا کرتے تھے۔

عدم قبول احسان:

کبھی کسی کا احسان گوارا نہ فرماتے۔ حضرت ابوبکرؓ سے بڑھ کر جاں نثار کون ہو سکتا تھا؟ تاہم ہجرت کے وقت جب انہوں نے سواری کے لیے ناقہ پیش کیا تو آپ ﷺ نے قیمت ادا کی۔[4] مدینہ میں مسجد کے لیے جو زمین درکار تھی مالکان زمین نے مفت نذر کرنی چاہی تھی لیکن آپ ﷺ نے قیمت دے کر لی۔ ایک دفعہ عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت عمرؓ دونوں ہم سفر تھے عبداللہ بن عمرؓ کی سواری کا اونٹ سرکش تھا اور آنحضرت ﷺ کے ناقہ سے آگے نکل نکل جاتا تھا عبداللہ بن عمرؓ روکتے تھے لیکن وہ قابو نہ آتا تھا حضرت عمرؓ بار بار عبداللہ بن عمرؓ کو ڈانٹتے تھے آنحضرت ﷺ نے حضرت عمرؓ سے کہا یہ اونٹ میرے ہاتھ بیچ ڈالو انہوں نے کہا کہ نذر ہے آپ ﷺ نے فرمایا نہیں دام لو انہوں نے دوبارہ عرض کی کہ یوں ہی حاضر ہے آپ ﷺ نے انکار کیا بالآخر حضرت عمرؓ نے دام لینے منظور کئے۔ آپ ﷺ نے

---

[1] صحیح بخاری کتاب الہبہ صفحہ ۳۰۳۔
[2] ادب المفرد امام بخاری ص ۹۸۔
[3] مسلم کتاب الاطعمہ۔
[4] [illegible]

خرید کر عبداللہ بن عمرؓ کو دیا کہ اب یہ تمہارا ہے۔[1]

عدم تشدد:

حضرت معاذ بن جبلؓ (جو اکابر صحابہؓ میں سے تھے) ایک محلہ میں امامت کرتے اور نماز فجر میں بڑی بڑی سورتیں پڑھتے تھے ایک شخص نے آنحضرت ﷺ سے شکایت کی کہ وہ اس قدر لمبی نماز پڑھتے ہیں کہ میں ان کے پیچھے نماز پڑھنے سے قاصر رہتا ہوں' ابو مسعود انصاریؓ کا بیان ہے کہ میں نے آنحضرت ﷺ کو کبھی اس قدر غضب ناک نہیں دیکھا جس قدر اس موقع پر دیکھا۔ آپ ﷺ نے لوگوں سے خطاب کر کے فرمایا ''بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو لوگوں کو متنفر کر دیتے ہیں' جو شخص تم میں سے نماز پڑھائے مختصر پڑھائے کیونکہ نماز میں بوڑھے' کمزور' کام والے بھی طرح کے آدمی ہوتے ہیں۔''[2]

حدود قصاص میں نہایت احتیاط فرماتے اور جہاں تک ممکن ہوتا درگزر کرتا چاہتے۔ ماعزؓ اسلمی ایک صاحب تھے جو زنا میں مبتلا ہو گئے تھے لیکن فوراً مسجد میں آئے اور کہا یارسول اللہ! میں نے بدکاری کی' آپ ﷺ نے منہ پھیر لیا وہ دوسری سمت آئے آپ ﷺ نے اور طرف منہ پھیر لیا آپ ﷺ بار بار منہ پھیر لیتے اور وہ بار بار سامنے آ کر زنا کا اقرار کرتے' بالآخر آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم کو جنون تو نہیں ہے؟ بولے نہیں پھر پوچھا تمہاری شادی ہو چکی ہے؟ بولے ہاں' آپ ﷺ نے فرمایا تم نے صرف ہاتھ لگایا ہوگا؟ بولے نہیں بلکہ مجامعت کی' آخر مجبور ہو کر آپ ﷺ نے حکم دیا کہ سنگسار کیے جائیں۔[3]

ایک دفعہ ایک شخص نے آ کر عرض کی کہ مجھ سے گناہ سرزد ہوا آپ حد (سزا) کا حکم دیں' آپ ﷺ چپ رہے اور نماز کا وقت آ گیا' نماز کے بعد انہوں نے پھر آ کر وہی درخواست کی آپ ﷺ نے فرمایا' کیا تم نے نماز نہیں پڑھی؟ بولے ہاں پڑھی' ارشاد فرمایا کہ تو خدا نے تمہارا گناہ معاف کر دیا۔[4]

ایک دفعہ قبیلہ غامد کی ایک عورت آئی اور اظہار کیا کہ میں نے بدکاری کی' آپ ﷺ نے فرمایا ''واپس جاؤ'' دوسرے دن پھر آئی اور بولی کہ کیا آپ مجھ کو ماعزؓ کی طرح چھوڑ دینا چاہتے ہیں؟ خدا کی قسم مجھ کو حمل رہ گیا ہے' پھر فرمایا واپس جاؤ' وہ چلی گئی تیسرے دن پھر واپس آئی' آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بچے کے پیدا ہونے تک انتظار کرو' بچہ جب پیدا ہوا تو بچہ کو گود میں لیے ہوئے آئی (یعنی اب زنا کی سزا دینے میں کیا تامل ہے؟) آپ ﷺ نے فرمایا کہ دودھ پینے کی مدت تک انتظار کرو' جب دودھ چھوٹ جائے تب آنا' جب رضاعت کا زمانہ گزر گیا تو پھر حاضر ہوئی' اب آپ ﷺ نے مجبور ہو کر سنگسار کرنے کا حکم دیا۔ لوگوں نے اس پر پتھر برسانے شروع کئے ایک صاحب کا پتھر اس کے چہرہ پر لگا اور

---

1. بخاری صفحہ ۲۸۹۔
2. بخاری کتاب الصلوٰۃ باب من شکا امامہ اذا طول صفحہ ۱۰۶۰۔
3. یہ حدیث بخاری کے مختلف ابواب میں ہے موقع کے لیے صفحہ ۱۰۰۸ دیکھنا چاہیے۔
4. بخاری صفحہ ۱۰۰۹۔

وصال کا طریقہ مدت سے جاری تھا یعنی کئی کئی دن متصل روزے رکھتے تھے۔ صحابہؓ نے بھی اس کا ارادہ کیا لیکن آپ ﷺ نے سختی سے روکا۔ حضرت عبداللہ بن عمروؓ نہایت مرتاض زاہد تھے انہوں نے عہد کر لیا تھا کہ ہمیشہ دن کو روزے رکھیں گے اور رات بھر عبادت کریں گے آنحضرت ﷺ کو خبر ہوئی تو بلا بھیجا اور پوچھا کہ کیا یہ خبر صحیح ہے؟ عرض کی "ہاں" فرمایا کہ "تم پر تمہارے جسم کا حق ہے، آنکھ کا حق ہے، بیوی کا حق ہے، مہینہ میں تین دن کے روزے کافی ہیں۔ عبداللہ بن عمروؓ نے کہا مجھ کو اس سے زیادہ کی طاقت ہے، فرمایا کہ اچھا تیسرے دن رکھ لو، میں اس سے بھی زیادہ طاقت رکھتا ہوں، ارشاد فرمایا کہ ایک دن بیچ دے کر رکھو، یہی داؤدؑ کا روزہ تھا اور یہی افضل الصیام ہے۔ انہوں نے عرض کی کہ مجھ کو اس سے بھی زیادہ قدرت ہے، ارشاد ہوا بس اس سے زیادہ بہتر نہیں۔ ١

ایک روایت میں ہے کہ عبداللہ بن عمروؓ کی روزہ داری کا چرچا ہوا تو آنحضرت ﷺ خود ان کے پاس تشریف لے گئے انہوں نے استقبال کیا اور چمڑے کا گدا بچھا دیا، آپ ﷺ زمین پر بیٹھ گئے اور ان سے کہا کہ کیا تم کو مہینہ میں تین روزے بس نہیں کرتے؟ عرض کی نہیں، فرمایا پانچ؟ بولے نہیں، غرض آپ ﷺ بار بار تعداد بڑھاتے جاتے اور وہ اس پر راضی نہ ہوتے، بالآخر آپ ﷺ نے فرمایا کہ بہتر صوم یہ ہے کہ ایک دن افطار کرو ایک دن روزہ رکھو۔ ٢

ایک دفعہ حضرت ابوہریرہؓ نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! میں جوان آدمی ہوں اور اتنا مقدور نہیں کہ نکاح کروں، نہ اپنے نفس پر اطمینان ہے، آنحضرت ﷺ چپ رہے، حضرت ابوہریرہؓ نے پھر انہی الفاظ کا اعادہ کیا، آپ ﷺ چپ رہے، سہ بارہ کہا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ خدا کا لکھا ٹل نہیں سکتا۔ ٣

قبیلہ باہلہ کے ایک صاحب آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر واپس گئے پھر سال بھر کے بعد آنے کا اتفاق ہوا لیکن اتنے ہی زمانہ میں ان کی شکل و صورت اس قدر بدل گئی کہ آنحضرت ﷺ ان کو نہ پہچان سکے، انہوں نے اپنا نام بتایا تو آنحضرت ﷺ نے تعجب سے پوچھا کہ تم تو نہایت خوش جمال تھے تمہاری صورت کیوں بگڑ گئی؟ انہوں نے کہا جب سے آپ سے رخصت ہوا متصل روزے رکھتا ہوں، آپ ﷺ نے فرمایا اپنی جان کو کیوں عذاب میں ڈالا، رمضان کے علاوہ ہر مہینہ میں ایک دن کا روزہ کافی ہے۔ انہوں نے کہا میں اس سے زیادہ کی قوت رکھتا ہوں آپ ﷺ نے ایک دن کا اور اضافہ کر دیا انہوں نے اور اضافہ کی درخواست کی آپ ﷺ نے تین دن کر دیے۔ ان کو اس سے بھی تسکین نہ ہوئی تو آپ ﷺ نے شہر حرام کے روزوں کا حکم دیا۔ ٤ ایک دن چند صحابہؓ خاص اس غرض سے ازواج مطہرات کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ آنحضرت ﷺ کی عبادت کے حالات دریافت کریں، وہ سمجھتے تھے کہ آنحضرت ﷺ رات دن عبادت کے سوا کچھ نہ کرتے ہوں گے، حالات سنے تو ان کے معیار کے موافق نہ تھے بولے کہ بھلا ہم کو آنحضرت ﷺ سے کیا نسبت؟ ان کے اگلے پچھلے گناہ سب خدا نے معاف کر دیے ہیں، پھر ایک صاحب نے کہا کہ میں رات بھر نماز پڑھا کروں گا، دوسرے صاحب بولے میں عمر بھر روزہ رکھوں گا، ایک اور صاحب نے کہا میں کبھی شادی نہیں کروں گا،

١ صحیح بخاری کتاب الصوم۔
٢ بخاری کتاب النکاح۔
٣ بخاری کتاب [illegible]۔
٤ ابوداؤد صفحہ [illegible]۔

آنحضرت ﷺ سن رہے تھے فرمایا کہ "خدا کی قسم میں تم سے زیادہ خدا سے ڈرتا ہوں تاہم روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں' نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں' عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں' جو شخص میرے طریقہ پر نہیں چلتا وہ میرے گروہ سے خارج ہے"۔ [1]

کسی غزوہ میں ایک صحابی کا ایک غار پر گزر ہوا جس میں پانی تھا اور آس پاس کچھ بوٹیاں تھیں خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تو عرض کی "یا رسول اللہ! مجھ کو ایک غار مل گیا ہے جس میں ضرورت کی سب چیزیں ہیں میرا دل چاہتا ہے کہ وہاں گوشہ نشین ہو کر ترک دنیا کر لوں" آپ ﷺ نے فرمایا "میں یہودیت یا نصرانیت لے کر دنیا میں نہیں آیا میں آسان اور سہل ابراہیمی مذہب لے کر آیا ہوں"۔ [2]

عیب جوئی اور مداحی کی ناپسندیدگی:

مداحی اور تعریف کو بھی (گو دل سے ہو) ناپسند فرماتے تھے۔ ایک دفعہ مجلس اقدس میں ایک شخص کا تذکرہ تھا' حاضرین میں سے ایک شخص نے ان کی بہت تعریف کی' آپ ﷺ نے فرمایا "تم نے اپنے دوست کی گردن کاٹی" یہ الفاظ چند بار فرمائے پھر ارشاد کیا کہ "تم کو اگر کسی کی خواہی نخواہی مدح کرنی ہو تو یوں کہو کہ میرا ایسا خیال ہے"۔ [3] ایک دفعہ ایک شخص کسی حاکم کی مدح کر رہا تھا' حضرت مقداد بھی موجود تھے انہوں نے زمین سے خاک اٹھا کر اس کے منہ میں جھونک دی اور کہا کہ ہم کو رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا ہے کہ مداحوں کے منہ میں خاک بھر دیں۔ [4] ایک دفعہ آپ ﷺ مسجد میں تشریف لائے' ایک شخص نماز پڑھ رہا تھا۔ محجن ثقفی سے پوچھا یہ کون ہے محجن نے ان کا نام بتایا اور بہت تعریف کی ارشاد فرمایا "دیکھو یہ نہ سننے پائے ورنہ تباہ ہو جائے گا"۔ یعنی دل میں غرور پیدا ہوگا جو موجب ہلاکت ہوگا۔ [5]

ایک دفعہ اسود بن سریع جو شاعر تھے خدمت عالی میں آئے اور عرض کی کہ "میں نے خدا کی حمد اور حضور کی مدح میں کچھ اشعار کہے ہیں"۔ فرمایا کہ ہاں اللہ کو حمد پسند ہے۔ اسود نے اشعار پڑھنے شروع کیے اسی اثناء میں کوئی صاحب باہر سے آ گئے آپ ﷺ نے اسود کو روک دیا' وہ کچھ دیر باتیں کر کے چلے گئے پھر اسود نے پڑھنے شروع کیے وہ صاحب پھر آ گئے آپ ﷺ نے اسود کو پھر روک دیا' دو تین دفعہ یہی اتفاق ہوا' اسود نے عرض کی کہ یہ کون صاحب ہیں جن کے لیے آپ ﷺ مجھ کو بار بار روک دیتے ہیں' فرمایا کہ یہ وہ شخص ہے جو فضول باتیں پسند نہیں کرتا۔ [6]

اس موقع پر یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ حسانؓ کو منبر پر بٹھا کر ان کے اشعار سنتے تھے اور فرماتے تھے ﴿اللھم ایدہ بروح القدس﴾ حالانکہ یہ اشعار آنحضرت ﷺ کی مدح میں ہوتے تھے لیکن واقعہ یہ ہے کہ حسان کے

---

1. صحیح بخاری کتاب النکاح۔
2. مسند ابن حنبل جلد ۵ صفحہ ۲۶۶۔
3. بخاری ادب المفرد صفحہ ۴۹۔
4. ایضاً صفحہ ۹۷۔
5. ایضاً صفحہ ۹۹۔
6. ایضاً صفحہ ۹۹۔

اشعار کفار کے مطاعن کا جواب تھے عرب میں شعراء کو یہ رتبہ حاصل تھا کہ زورِ کلام سے جس شخص کو چاہتے ذلیل اور جس کو چاہتے معزز کر دیتے۔ ابن الزبعری اور کعب بن اشرف وغیرہ نے اس طریقہ سے آنحضرت ﷺ کو ضرر پہنچانا چاہا تھا حسانؓ کی مداحی ان کا ردِ عمل تھا۔

سادگی اور بے تکلفی:

معمول تھا کہ مجلس سے اٹھ کر گھر میں تشریف لے جاتے تو کبھی کبھی ننگے پاؤں چلے جاتے اور جوتی وہیں چھوڑ جاتے۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ پھر واپس تشریف لائیں گے۔[1] روز روز کنگھا کرنا ناپسند فرماتے۔ ارشاد تھا کہ ایک دن بیچ دے کر کنگھا کرنا چاہیے۔

کھانے پینے اوڑھنے اٹھنے بیٹھنے کسی چیز میں تکلف نہ تھا۔ کھانے میں جو سامنے آتا تناول فرماتے پہننے کو موٹا جھوٹا جو مل جاتا پہن لیتے زمین پر چٹائی پر فرش پر جہاں جگہ ملتی بیٹھ جاتے۔[2] آپ ﷺ کے لیے آٹے کی بھوسی کبھی صاف نہیں کی جاتی تھی[3] کرتہ کا تکمہ اکثر کھلا رکھتے تھے لباس میں تمائش کو ناپسند فرماتے تھے سامان آرائش سے آپ ﷺ طبعاً نفور تھے غرض ہر چیز میں سادگی اور بے تکلفی پسند خاطر تھی۔[4]

امارت پسندی سے اجتناب:

اسلام رہبانیت اور جوگی پن کا سخت مخالف ہے ﴿لا رھبانیۃ فی الاسلام﴾ اسی بنا پر آپ ﷺ ہر قسم کے جائز حظوظ دنیوی سے متمتع ہونا جائز رکھتے تھے اور خود بھی کبھی کبھی ان چیزوں سے تمتع اٹھاتے تھے تاہم ناز و نعمت، تکلف و عیش پرستی کو ناپسند فرماتے تھے اور اوروں کو بھی اس سے روکتے۔

ایک دفعہ ایک شخص نے حضرت علیؓ کی دعوت کی اور کھانا پکوا کر گھر بھیج دیا۔ حضرت فاطمہ زہراؓ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ بھی تشریف لاتے اور ہمارے ساتھ کھاتے تو خوب ہوتا حضرت علیؓ گئے اور آپ ﷺ سے جا کر عرض کی آپ ﷺ تشریف لائے لیکن دروازہ پر پہنچے تو یہ دیکھ کر کہ گھر میں دیواروں پر پردے لٹکے ہوئے ہیں واپس چلے گئے (حضرت علیؓ نے واپسی کی وجہ دریافت کی تو فرمایا پیغمبر کی شان کے خلاف ہے کہ وہ کسی زیب و زینت کے مکان میں داخل ہو۔[5] فرمایا کرتے کہ گھر میں ایک بستر اپنے لیے ایک بیوی کے لیے اور ایک مہمان کے لیے کافی ہے چوتھا شیطان کا حصہ ہے[6])

---

[1] ابوداؤد جلد دوم صفحہ ۲۱۸۔

[2] دیکھو شمائل۔

[3] صحیح بخاری کتاب الاطعمہ صفحہ ۸۱۵۔

[4] صحاح کی کتاب اللباس میں متعدد واقعات ہیں۔

[5] ابوداؤد جلد ۲ صفحہ ۱۷۰۔

[6] ابوداؤد کتاب اللباس جلد ۲ ص ۲۱۸

کو زعفران سے رنگ کر پہنتیں تو بہتر ہوتا۔[1]

ایک دفعہ نجاشی نے کچھ زیورات آنحضرت ﷺ کی خدمت میں بھیجے ان میں ایک انگوٹھی بھی تھی جس میں حبشی پتھر کا ایک نگینہ جڑا تھا آپ ﷺ کے چہرہ پر کراہت کے آثار ظاہر ہوتے تھے اور لکڑی سے اس کو چھوتے تھے ہاتھ نہیں لگاتے تھے۔

ایک دفعہ کسی نے ریشم کا شلوکہ ہدیتاً بھیجا آپ ﷺ نے پہن لیا اور اس کو پہن کر نماز ادا فرمائی نماز سے فارغ ہو کر نہایت کراہت اور نفرت کے ساتھ نوچ کر اتار ڈالا پھر فرمایا "پرہیزگاروں کے لیے یہ کپڑا مناسب نہیں"۔

تواضع اور خاکساری کی بنا پر اکثر معمولی کپڑے استعمال فرماتے تھے۔ حضرت عمرؓ کو خیال تھا کہ جمعہ و عیدین میں یا سفراء کے ورود کے موقع پر آپ ﷺ شان وتجمل کے کپڑے زیب تن فرمائیں۔ اتفاق سے ایک بار راستہ میں ایک ریشمی کپڑا (حلہ سیراء) بک رہا تھا حضرت عمرؓ نے موقع پا کر عرض کیا یا رسول اللہ! یہ کپڑا حضور خرید لیں اور جمعہ میں اور سفراء کی آمد کے موقع پر زیب تن فرمائیں ارشاد فرمایا کہ "یہ وہ پہنے جس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں"۔ اکثر موٹے جھوٹے اور بھیڑ کے بال کے بنے ہوئے کپڑے پہنتے تھے اور انہی کپڑوں میں وفات پائی۔[2]

بستر کمبل کا تھا یا کبھی چمڑے کا جس میں کھجور کی چھال بھری ہوتی تھی کبھی معمولی کپڑا دوہرا تہہ کر دیا جاتا تھا۔ حضرت حفصہؓ بیان کرتی ہیں کہ ایک شب کو میں نے بستر مبارک چار تہہ کر کے بچھا دیا کہ ذرا نرم ہو جائے صبح اٹھ کر آنحضرت ﷺ نے ناگواری ظاہر فرمائی۔[3]

۹ھ میں جب کہ یمن سے شام تک صرف اسلامی حکومت تھی فرمانروائے اسلام کے گھر میں صرف ایک کھری چارپائی اور چمڑے کا سوکھا ہوا مشکیزہ تھا۔[4] حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ جب آپ ﷺ نے وفات پائی تو تھوڑے سے جو کے سوا گھر میں کھانے کو کچھ نہ تھا۔[5] صحابہؓ سے فرمایا کرتے تھے کہ "دنیا میں انسان کے لیے اتنا کافی ہے جتنا ایک مسافر کو زادِ راہ کے لئے"۔[6] ایک دفعہ ایک بوریے پر آرام فرما رہے تھے جب اٹھے تو لوگوں نے دیکھا کہ پہلوئے مبارک پر نشان پڑ گئے ہیں عرض کی یا رسول اللہ! کیا ہم لوگ کوئی گدا بنوا کر حاضر کریں ارشاد ہوا کہ مجھ کو دنیا سے کیا غرض؟ مجھ کو دنیا سے اس قدر تعلق ہے جس قدر اس سوار کو جو تھوڑی دیر کے لیے راہ میں کسی درخت کے سایہ میں بیٹھ جاتا ہے پھر اس کو چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا ہے۔[7]

---

1. مسند ابن حنبل جلد ۶ صفحہ ۱۱۱۔
2. یہ کل تمام واقعات صحیح بخاری کتاب اللباس سے ماخوذ ہیں۔
3. شمائل ترمذی۔
4. صحیح بخاری کتاب اللباس۔
5. مسند ابن حنبل جلد ۶ صفحہ ۱۰۸۔
6. [illegible]
7. جامع ترمذی ابواب الزہد۔

ایلاء کے زمانہ میں حضرت عمرؓ جب مشربہ میں گئے اور اسباب کی کوٹھری کی ہر طرف نظر ڈالی تو ان کو نظر آیا کہ سرور عالم ﷺ کے بیت اقدس میں دنیاوی ساز و سامان کی کیا کیفیت ہے؟ جسم مبارک پر صرف ایک تہبند ہے ایک کھری چارپائی بچھی ہے سرہانے ایک تکیہ پڑا ہے جس میں خرمے کی چھال بھری ہے ایک طرف مٹھی بھر جو رکھے ہیں ایک کونے میں پائے مبارک کے پاس کسی جانور کی کھال پڑی ہے چند مشکیزے کی کھالیں سر کے پاس کھونٹی پر لٹک رہی ہیں یہ دیکھ کر حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے آنحضرت ﷺ نے رونے کا سبب دریافت فرمایا عرض کی یا رسول اللہ! میں کیوں نہ روؤں چارپائی کے بان سے جسم اقدس میں بدھیاں پڑ گئی ہیں یہ آپ کے اسباب کی کوٹھری ہے اس میں جو سامان ہے وہ نظر آ رہا ہے قیصر و کسریٰ تو باغ و بہار کے مزے لوٹیں اور آپ خدا کے پیغمبر اور برگزیدہ ہو کر آپ کے سامان خانہ کی یہ کیفیت ہو ارشاد ہوا کہ اے ابن خطاب! کیا تم کو یہ پسند نہیں کہ وہ دنیا لیں اور ہم آخرت لیں۔[1]

مساوات:

آپ ﷺ کی نظر میں امیر و غریب چھوٹے بڑے آقا و غلام سب برابر تھے۔ سلمانؓ و صہیبؓ و بلالؓ کہ سب کے سب غلام رہ چکے تھے آپ ﷺ کی بارگاہ میں رؤسائے قریش سے کم رتبہ نہ تھے ایک دفعہ حضرت سلمانؓ و بلالؓ ایک موقع پر جمع تھے اتفاق سے ابوسفیان نکلے ان لوگوں نے کہا ابھی تلوار نے اس دشمن خدا کی گردن پر پورا قبضہ نہیں پایا ہے حضرت ابوبکرؓ نے ان لوگوں سے کہا سردار قریش کی شان میں یہ الفاظ! پھر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آئے اور واقعہ بیان کیا آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہیں تم نے ان لوگوں کو ناراض تو نہیں کیا ان لوگوں کو ناراض کیا تو خدا کو ناراض کیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے فوراً جا کر ان بزرگوں سے کہا بھائیو! آپ لوگ مجھ سے ناراض تو نہیں ہوئے ان لوگوں نے کہا نہیں خدا آپ کو معاف کرے۔[2] قبیلۂ مخزوم کی ایک عورت چوری کے جرم میں گرفتار ہوئی اسامہ بن زید جن سے آنحضرت ﷺ نہایت محبت رکھتے تھے لوگوں نے ان کو سفارش کی غرض سے خدمت نبوی میں بھیجا آپ ﷺ نے فرمایا اسامہ کیا تم حدود خداوندی میں سفارش کرتے ہو" پھر آپ ﷺ نے لوگوں کو جمع کر کے خطاب فرمایا "تم سے پہلے کی امتیں اسی لیے برباد ہو گئیں کہ جب معزز آدمی کوئی جرم کرتا تو تسامح کرتے اور معمولی آدمی کوئی جرم کرتا تو سزا پاتا۔ خدا کی قسم اگر محمد کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو اس کے بھی ہاتھ کاٹے جاتے۔"[3]

غزوۂ بدر میں دوسرے قیدیوں کے ساتھ آپ ﷺ کے چچا حضرت عباسؓ بھی گرفتار ہو کر آئے تھے قیدیوں کو زرفدیہ لے کر رہا کیا جاتا تھا بعض خیر خواہ انصار نے اس خیال سے کہ آپ ﷺ سے قرابت قریبہ رکھتے تھے عرض کی کہ یا رسول اللہ اجازت دیجئے کہ ہم اپنے بھانجے (عباسؓ) کا زرفدیہ معاف کر دیں آپ ﷺ نے فرمایا نہیں ایک درہم بھی

---

1. صحیح مسلم کتاب الطلاق باب فی الایلاء۔
2. صحیح مسلم فضائل سلمان و صہیب۔
3. بخاری غزوۂ فتح۔

معاف نہ کرو۔[۱] مجلس میں جو چیزیں آتیں ہمیشہ داہنی طرف سے اس کی تقسیم شروع فرماتے اور ہمیشہ اس میں امیر و غریب صغیر و کبیر سب کی مساوات کالحاظ ہوتا۔

ایک دفعہ خدمت اقدس میں صحابہ کا مجمع تھا اتفاق سے داہنی طرف حضرت عبداللہ بن عباسؓ بیٹھے ہوئے تھے جو بہت کمسن تھے بائیں جانب بڑے بڑے معمر صحابہ تھے۔ کہیں سے دودھ آیا آپ ﷺ نے نوش فرما کر عبداللہ بن عباسؓ سے کہا تم اجازت دو تو میں ان لوگوں کو دوں انہوں نے عرض کی اس عطیہ میں میں ایثار نہیں کر سکتا چونکہ داہنی جانب تھے اور ترتیب مجلس کی رو سے انہی کا حق تھا آپ ﷺ نے انہی کو ترجیح دی۔[۲]

حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ میرے مکان پر تشریف لائے اور پینے کو پانی مانگا میں نے بکری کا دودھ پیش کیا مجلس کی ترتیب یہ تھی کہ حضرت ابوبکرؓ بائیں جانب حضرت عمرؓ سامنے اور ایک بدو داہنی طرف تھا آپ ﷺ نے پی لیا تو حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کی طرف اشارہ کیا یعنی بقیہ ان کو عنایت ہو آپ ﷺ نے فرمایا پہلے داہنی طرف والے کا حق ہے یہ کہہ کر بچا ہوا دودھ بدو کو عنایت فرمایا۔[۳]

قریش اپنے فخر و امتیاز کے لئے مزدلفہ میں قیام کرتے تھے لیکن آنحضرت ﷺ نے اس تفریق کو بھی پسند نہ فرمایا بعثت سے پہلے[۴] اور بعثت کے بعد[۵] بھی ہمیشہ عام لوگوں کے ساتھ مقام کرتے تھے علاوہ بریں یہ بھی گوارا نہ تھا کہ وہیں خاص طور سے کوئی عمدہ جگہ دیکھ کر آپ ﷺ کیلئے مخصوص کر دی جائے اور وہاں سایہ کیلئے کوئی چھپر ڈال دیا جائے صحابہؓ نے تجویز پیش کی تو فرمایا "جو پہلے پہنچ جائے اسی کا مقام ہے"۔[۶]

صحابہؓ جب سب مل کر کوئی کام کرتے تو ہمیشہ آنحضرت ﷺ ان کے ساتھ شریک ہو جاتے اور معمولی مزدور کی طرح کام انجام دیتے۔ مدینہ میں آ کر سب سے پہلا کام مسجد نبوی کی تعمیر تھی اس مسجد اقدس کی تعمیر میں دیگر صحابہؓ کی طرح خود آنحضرت ﷺ بھی بہ نفس نفیس شریک تھے۔ خود اپنے دست مبارک سے اینٹ اٹھا اٹھا کر لاتے تھے صحابہؓ عرض کرتے تھے کہ ہماری جانیں قربان آپ کیوں زحمت فرماتے ہیں لیکن آپ ﷺ اپنے فرض سے باز نہ آتے۔[۷] غزوہ احزاب کے موقع پر بھی جب تمام صحابہؓ مدینہ کے چاروں طرف خندق کھود رہے تھے آپ ﷺ بھی ایک ادنیٰ مزدور کی طرح کام کر رہے تھے یہاں تک کہ شکم مبارک پر مٹی اور خاک کی تہہ جم گئی تھی۔[۸]

---

۱ صحیح بخاری باب فداء المشرکین۔

۲ صحیح بخاری صفحہ ۸۸۸۔

۳ بخاری صفحہ ۳۵۰۔

۴ ابوداؤد کتاب المناسک۔

۵ ایضاً۔

۶ مسند ابن حنبل جلد ۲ صفحہ ۱۸۷۔

۷ صحیح بخاری باب الہجرۃ و بناء المسجد۔

۸ صحیح بخاری باب غزوۃ الاحزاب۔

ایک سفر میں کھانا تیار ہونے کو تھا تمام صحابہؓ نے مل کر پکانے کا سامان کیا، لوگوں نے ایک ایک کام بانٹ لیا، جنگل سے لکڑی لانے کا کام آنحضرت ﷺ نے اپنے ذمہ لیا، صحابہؓ نے عرض کی یا رسول اللہ! یہ کام ہم خدام کر لیں گے، فرمایا ہاں لیکن مجھے یہ پسند نہیں کہ میں تم سے اپنے کو ممتاز کروں، خدا اس بندہ کو پسند نہیں کرتا جو اپنے ہمراہیوں میں ممتاز بنتا ہے۔[1]

غزوۂ بدر میں سواریوں کا سامان بہت کم تھا، تین تین آدمیوں کے بیچ میں ایک ایک اونٹ تھا، لوگ باری باری سے چڑھتے اترتے تھے۔ آنحضرت ﷺ بھی عام آدمیوں کی طرح ایک اونٹ میں دو اور آدمیوں کے ساتھ شریک تھے، ہمراہ جاں نثاران اپنی باری پیش کرتے اور عرض کرتے کہ یا رسول اللہ! آپ سوار رہیں حضور کے بدلہ ہم پیدل چلیں گے، ارشاد ہوتا کہ تم مجھ سے زیادہ پیادہ پا چل سکتے ہو اور نہ میں تم سے کم ثواب کا محتاج ہوں۔[2]

تواضع

گھر کا کام کاج خود کرتے، کپڑوں میں پیوند لگاتے، گھر میں خود جھاڑو دیتے، دودھ دوہ لیتے، بازار سے سودا لاتے، جوتی پھٹ جاتی تو خود گانٹھ لیتے، گدھے کی سواری سے آپ ﷺ کو عار نہ تھا، غلاموں اور مسکینوں کے ساتھ بیٹھنے اور ان کے ساتھ کھانا کھانے سے پرہیز نہ تھا۔[3] ایک دفعہ گھر سے باہر تشریف لائے، لوگ تعظیم کو اٹھ کھڑے ہوئے، فرمایا کہ "اہل عجم کی طرح تعظیم کے لیے نہ اٹھو"۔[4] غریب سے غریب بیمار ہوتا تو عیادت کو تشریف لے جاتے۔ مفلسوں اور فقیروں کے ہاں جا کر ان کے ساتھ بیٹھتے، صحابہؓ کے ساتھ بیٹھتے تو اس طرح بیٹھتے کہ امتیازی حیثیت کی بنا پر کوئی آپ ﷺ کو پہچان نہ سکتا۔ کسی مجلس میں جاتے تو جہاں جگہ مل جاتی بیٹھ جاتے۔[5]

ایک دفعہ ایک شخص ملنے آیا لیکن نبوت کا اس قدر رعب طاری ہوا کہ کانپنے لگا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ گھبراؤ نہیں میں فرشتہ نہیں، ایک قریشی عورت کا بیٹا ہوں جو سوکھا گوشت پکا کر کھایا کرتی تھی۔[6]

تواضع اور خاکساری کی راہ سے آپ ﷺ اکڑوں بیٹھ کر کھانا تناول فرماتے تھے اور فرمایا کرتے تھے "میں بندہ اور بندوں کی طرح کھاتا ہوں اور بندوں ہی کی طرح بیٹھتا ہوں"۔ ایک دفعہ کھانے کے موقع پر جگہ تنگ تھی اور لوگ زیادہ آ گئے آپ ﷺ اکڑوں بیٹھ گئے کہ جگہ نکل آئے، ایک بدوی بھی مجلس میں شریک تھا اس نے کہا محمد! یہ کیا طرز نشست ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا خدا نے مجھ کو خاکسار بندہ بنایا ہے جبار اور سرکش نہیں بنایا ہے۔[7]

---

[1] زرقانی جلد ۴ صفحہ ۳۰۶ بحوالہ سیرت محب طبری۔ یہ روایت کسی اور کتاب میں نہیں ہے۔

[2] مسند ابن حنبل جلد ۱ صفحہ ۴۲۲ و مسند ابوداؤد طیالسی۔

[3] شمائل ترمذی۔

[4] ابوداؤد و ابن ماجہ۔

[5] شمائل ترمذی۔

[6] مستدرک حاکم ص ۴۶ علی شرط الشیخین والتصحیح کہ۔

[7] ابن ماجہ باب الاکل۔

تواضع کی انتہا یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ اپنے متعلق جائز تعظیمی الفاظ کو بھی نہیں پسند فرماتے تھے ایک بار ایک شخص نے ان الفاظ سے آپ ﷺ کو خطاب کیا "اے ہمارے آقا اور ہمارے آقا کے فرزند اے ہم میں سب سے بہتر اور ہم میں سب سے بہتر کے فرزند" آپ ﷺ نے فرمایا لوگو پرہیزگاری اختیار کرو شیطان تمہیں گرا نہ دے میں عبداللہ کا بیٹا محمد ہوں خدا کا بندہ اور اس کا رسول، مجھ کو خدا نے جو مرتبہ بخشا میں پسند نہیں کرتا کہ تم مجھے اس سے زیادہ بڑھاؤ۔[1] ایک دفعہ ایک شخص نے آپ ﷺ کو یا خیر البریہ (یعنی اے بہترین خلق) کہہ کر مخاطب کیا آپ ﷺ نے فرمایا وہ ابراہیمؑ تھے۔[2]

عبداللہ بن شخیر کا بیان ہے کہ بنی عامر کی سفارت کے ساتھ جب ہم لوگ خدمت اقدس میں آئے تو عرض کی حضور ہمارے آقا (سید) ہیں ارشاد فرمایا کہ "آقا خدا ہے" پھر ہم لوگوں نے عرض کی آپ ہم میں سب سے افضل اور سب سے برتر ہیں۔ ارشاد ہوا کہ "بات کہو دیکھو کہ شیطان تم کو نہیں چلا رہا ہے"۔[3]

مدینہ منورہ میں ایک عورت تھی جس کے دماغ میں کچھ فتور تھا آپ ﷺ کی خدمت میں آئی اور کہا کہ محمد! مجھ کو تم سے کچھ کام ہے فرمایا جہاں کہو چل سکتا ہوں (ابوداؤد کتاب الادب) وہ آپ ﷺ کو ایک کوچہ میں لے گئی اور وہ بیٹھ گئی آپ ﷺ بھی اس کے ساتھ بیٹھ گئے اور جو کام تھا انجام دے دیا۔[4] مخرمہؓ ایک صحابی تھے ایک دفعہ انہوں نے اپنے بیٹے مسورؓ سے کہا کہ آنحضرت ﷺ کے پاس کہیں سے چادریں آئی ہیں اور وہ تقسیم فرما رہے ہیں آؤ ہم بھی چلیں آئے تو آپ ﷺ زنانہ میں تشریف لے جا چکے تھے کہا آواز دو انہوں نے کہا میرا یہ رتبہ ہے کہ میں آنحضرت ﷺ کو آواز دوں مخرمہ نے کہا "بیٹا! محمد جبار نہیں ہیں" ان کی جرأت دلانے سے مسورؓ نے آواز دی آنحضرت ﷺ فوراً نکل آئے اور ان کو دیبا کی قبا عنایت کی جس کی گھنڈیاں زری تھیں۔[5]

ایک دفعہ ایک انصاری نے ایک یہودی کو یہ کہتے سنا کہ اس خدا کی قسم جس نے موسیٰ کو تمام انسانوں پر فضیلت دی یہ سمجھ کر کہ آنحضرت ﷺ پر تعریض ہے غصہ میں آ کر اس کے منہ پر تھپڑ کھینچ مارا وہ آنحضرت ﷺ کے پاس فریادی آیا آپ ﷺ نے انصاری کو بلا بھیجا اور واقعہ کی تحقیق کے بعد فرمایا کہ "مجھ کو انبیاء پر فضیلت نہ دو"۔[6]

انسان کے غرور و ترفع کا اصلی موقع وہ ہوتا ہے جب وہ اپنے چپ و راست جلو میں ہزاروں آدمیوں کو بچھے ہوئے دیکھتا ہے جو اس کے ایک اشارہ پر اپنی جان تک قربان کر دینے کو تیار ہو جاتے ہیں، خصوصاً جب وہ فاتحانہ ایک جرار پرجوش لشکر کے ساتھ شہر میں داخل ہوتا ہے لیکن آنحضرت ﷺ کے تواضع و خاکساری کا منظر اس وقت اور نمایاں ہو جاتا

---

1. مسند ابن حنبل جلد ۳ صفحہ ۱۵۳۔
2. صحیح مسلم باب فضائل ابراہیم۔
3. ابوداؤد کتاب الادب باب کراہیۃ التمادح۔
4. ایضاً۔
5. بخاری صفحہ ۸۶۵۔
6. بخاری کتاب الانبیاء ذکر موسیٰ۔

ہے۔ فتح مکہ کے موقع پر جب آپ ﷺ شہر میں داخل ہوئے تو تواضعاً سر مبارک کو اس قدر جھکا دیا کہ کجاوہ سے آ کر مل گیا۔ ۱ غزوہ خیبر میں جب آپ ﷺ کا داخلہ ہوا تو آپ ایک گدھے پر سوار تھے جس میں لگام کی جگہ کھجور کی چھال بندھی تھی۔ ۲ حجۃ الوداع میں جس کجاوہ پر آپ ﷺ سوار تھے بن چکے ہوں کی اس کی قیمت کیا تھی۔

تعظیم اور مدح مفرط سے روکتے تھے:

(شرک کا پہلا دیباچہ انبیاء اور صلحاء کی مبالغہ آمیز محبت ہے۔ آنحضرت اس نکتہ کا بڑا لحاظ فرماتے تھے حضرت عیسیٰ کی مثال پیش نظر تھی۔ فرمایا کرتے تھے کہ میری اس قدر مبالغہ آمیز مدح نہ کیا کرو جس قدر نصاریٰ ابن مریم کی کرتے ہیں۔ میں تو خدا کا بندہ اور اس کا فرستادہ ہوں"۔ قیس بن سعد کہتے ہیں کہ میں ایک دفعہ حیرہ گیا وہاں لوگوں کو دیکھا کہ رئیس شہر کے دربار میں جاتے ہیں تو اس کے سامنے سجدہ کرتے ہیں آنحضرت ﷺ کی خدمت میں یہ واقعہ بیان کیا اور عرض کی کہ آپ کو سجدہ کیا جائے تو آپ اس کے زیادہ مستحق ہیں آپ ﷺ نے فرمایا کہ میری قبر پر گزرو گے تو سجدہ کرو گے؟ کہا نہیں فرمایا تو جیتے جی بھی سجدہ نہیں کرنا چاہیے۔ ۳

معوذ بن عفراء کی صاحبزادی (ربیع) کی جب شادی ہوئی تو آپ ﷺ ان کے گھر تشریف لے گئے اور دلہن کے لیے جو فرش بچھایا گیا تھا اس پر بیٹھ گئے۔ گھر کی لڑکیاں آس پاس جمع ہو گئیں اور دف بجا بجا کر شہدائے بدر کا مرثیہ گانے لگیں گاتے گاتے ایک نے یہ مصرع گایا۔

﴿وفینا نبی یعلم ما فی غد﴾

ہم میں ایک پیغمبر ہے جو کل کی باتیں جانتا ہے۔

فرمایا یہ چھوڑ دو اور وہی کہو جو پہلے کہہ رہی تھیں۔ ۵

آنحضرت ﷺ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم نے جس روز انتقال کیا اتفاق سے اس روز سورج گرہن لگا لوگوں کے خیال میں ایک پیغمبر کی ظاہری عظمت کا فرضی تخیل یہ تھا کہ اس کے درد و صدمہ سے کم از کم اجرام سماوی میں انقلاب پیدا ہو جائے۔ لوگوں نے اس اتفاقی واقعہ کو اسی قسم کے واقعہ پر محمول کیا ایک جاہ پسند انسان کے لیے اس قسم کا اتفاق بہترین موقع ہو سکتا تھا لیکن نبوت کی شان اس سے بدرجہا ارفع واعلیٰ ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اسی وقت لوگوں کو مسجد میں جمع کیا اور خطبہ دیا کہ چاند اور سورج میں گرہن لگنا خدا کی آیات قدرت میں ہے کسی کی زندگی اور موت سے ان میں گرہن نہیں لگتا۔ ۶

---

۱ شرح شفا قاضی عیاض و سیرۃ ابن ہشام۔
۲ مشکوۃ اخلاق نبی بحوالہ ابن ماجہ و ترمذی۔
۳ صحیح بخاری جلد اول صفحہ ۳۰۳۔
۴ ابوداؤد کتاب النکاح باب فی حق الزوج علی المرأۃ۔
۵ صحیح مسلم باب ضرب الدف فی النکاح۔
۶ صحیح بخاری و مسلم باب صلوۃ الکسوف۔

ایک دفعہ آنحضرت ﷺ وضو کر رہے تھے وضو کا پانی جو دست مبارک سے گرتا فدائی برکت کے خیال سے اس کو چلو میں لے کر بدن میں مل لیتے' آپ ﷺ نے پوچھا کہ تم یہ کیوں کر رہے ہو؟ انہوں نے عرض کیا کہ خدا اور خدا کے رسول کی محبت میں' فرمایا اگر کوئی اس بات کی خوشی حاصل کرنا چاہے کہ وہ خدا اور خدا کے رسول سے محبت رکھتا ہے تو اس کو چاہیے کہ جب باتیں کرے سچ بولے جب امین بنایا جائے ادائے امانت کرے اور کسی کا پڑوسی ہے تو ہمسائیگی کو اچھی طرح نباہے۔ [1]

ایک صاحب بارگاہ نبوت میں حاضر ہوئے اثنائے گفتگو میں انہوں نے کہا "جو خدا چاہے اور جو آپ چاہیں" ارشاد ہوا" تم نے خدا کا شریک اور ہمسر ٹھہرایا' کہو کہ جو خدا تنہا چاہے"۔ [2]

شرم وحیا:

(صحاح میں ہے کہ آپ ﷺ دوشیزہ لڑکیوں سے بھی زیادہ شرمیلے تھے اور شرم وحیا کا اثر آپ ﷺ کی ایک ایک ادا سے ظاہر ہوتا تھا' کبھی کسی کے ساتھ بدزبانی نہیں کی' بازاروں میں جاتے تو چپ چاپ گزر جاتے' تبسم کے سوا کبھی لب مبارک خندہ وقہقہہ سے آشنا نہیں ہوئے) بھری محفل میں کوئی بات ناگوار ہوتی تو لحاظ کی وجہ سے زبان سے کچھ نہ فرماتے' چہرہ کے اثر سے ظاہر ہوتا اور صحابہ متنبہ ہو جاتے۔

عرب میں اور ممالک کی طرح شرم وحیا کا بہت کم لحاظ تھا' ننگے نہانا عام بات تھی' حرم کعبہ کا طواف ننگے ہو کر کرتے تھے۔ آنحضرت ﷺ کو بالطبع یہ باتیں سخت ناپسند تھیں' ایک دفعہ فرمایا کہ حمام سے پرہیز کرو' لوگوں نے عرض کی کہ حمام میں نہانے سے میل چھوٹتا ہے اور بیماری میں فائدہ ہوتا ہے' ارشاد فرمایا کہ نہاؤ تو پردہ کر لیا کرو۔ عرب میں حمام نہ تھے لیکن شام و عراق کے جو شہر عرب کی سرحد سے ملے ہوئے تھے وہاں کثرت سے حمام تھے اس بنا پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم جب عجم فتح کرو گے تو وہاں حمام ملیں گے ان میں جانا تو چادر کے ساتھ جانا۔

ایک دفعہ کچھ عورتیں حضرت ام سلمہؓ کے پاس آئیں انہوں نے وطن پوچھا' بولیں حمص (شام کا ایک شہر ہے) حضرت ام سلمہؓ نے کہا تمہیں وہ عورتیں ہو جو حمام میں نہاتی ہیں؟ بولیں کیا حمام کوئی بری چیز ہے؟ فرمایا کہ میں نے آنحضرت ﷺ سے سنا ہے کہ جو عورت اپنے گھر کے سوا کسی گھر میں کپڑے اتارتی ہے خدا اس کی پردہ دری کرتا ہے۔ [3]

ابوداؤد میں روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حمام میں نہانے کو مطلقاً منع کر دیا تھا' پھر مردوں کو پردہ کی قید کے ساتھ اجازت دی لیکن عورتوں کے لیے وہی حکم قائم رہا۔ عرب میں جائے ضرور نہ تھے۔ [4] لوگ میدانوں میں رفع حاجت کے لیے جایا کرتے تھے لیکن پردہ نہیں کرتے تھے بلکہ آمنے سامنے بیٹھ جایا کرتے اور ہر قسم کی بات چیت کرتے۔ آنحضرت ﷺ نے اس کی سخت ممانعت کی اور فرمایا کہ خدا اس سے ناراض ہوتا ہے۔ [5]

---

1. مشکوٰۃ بحوالہ شعب الایمان بیہقی۔
2. ادب المفرد امام بخاری صفحہ ۱۰۸ مصر۔
3. یہ تمام روایتیں ترغیب و ترہیب میں کتب حدیث کے حوالہ سے منقول ہیں۔
4. صحیح بخاری حدیث افک۔
5. ابوداؤد و ابن ماجہ۔

معمول تھا کہ رفع حاجت کے لیے اس قدر دور نکل جاتے کہ آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے۔ مکہ معظمہ میں جب تک قیام تھا حدود حرم سے باہر چلے جاتے جس کا فاصلہ مکہ معظمہ سے کم از کم تین میل تھا۔

اپنے ہاتھ سے کام کرنا:

اگرچہ تمام صحابہؓ آپ ﷺ کے جاں نثار خادموں میں داخل تھے تاہم آپ ﷺ خود اپنے ہاتھ سے کام کرنے کو پسند کرتے تھے۔ حضرت عائشہؓ، ابو سعید خدریؓ اور امام حسنؓ سے روایت ہے کہ گو کہ آپ ﷺ ملجا و ماویٰ تھے لیکن آپ ﷺ اپنے کام خود اپنے دست مبارک سے انجام دیا کرتے تھے۔ ایک شخص نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا کہ آپ گھر میں کیا کیا کرتے تھے؟ جواب دیا کہ "گھر کے کام کاج میں مصروف رہتے تھے کپڑوں میں اپنے ہاتھ سے خود پیوند لگاتے تھے گھر میں خود جھاڑو دے لیتے تھے دودھ دوہ لیتے تھے بازار سے سودا خرید لاتے تھے جوتی پھٹ جاتی تو خود گانٹھ لیتے تھے ڈول میں ٹانکے لگا دیتے تھے اونٹ کو اپنے ہاتھ سے باندھ دیتے تھے اس کو چارہ دیتے تھے غلام کے ساتھ مل کر آٹا گوندھتے"۔ [1]

ایک دفعہ حضرت انس بن مالکؓ خدمت مبارک میں حاضر ہوئے تو دیکھا کہ آپ ﷺ خود اپنے ہاتھ سے ایک اونٹ کے بدن پر تیل مل رہے تھے۔ ان سے دوسری روایت ہے کہ انہوں نے دیکھا کہ آپ ﷺ صدقے کے اونٹوں کو داغ رہے ہیں۔ تیسری روایت میں وہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ بکریوں کو داغ لگا رہے تھے۔ [2]

ایک دفعہ مسجد نبوی میں تشریف لے گئے دیکھا تو کسی نے مسجد میں ناک صاف کی ہے آپ ﷺ نے خود دست مبارک سے ایک کنکر لے کر اس کو کھرچ ڈالا اور آئندہ لوگوں کو اس فعل سے منع فرمایا۔ [3]

آپ ﷺ جب بچے تھے اور خانہ کعبہ کی تعمیر ہو رہی تھی تو اس وقت بھی پتھر اٹھا اٹھا کر معماروں کے پاس لاتے تھے۔ [4] مسجد قبا اور مسجد نبوی کی تعمیر اور خندق کے کھودنے میں جس طرح زمین کھودی اس کی تفصیل جلد اول کے واقعات میں گزر چکی ہے۔ ایک سفر میں صحابہؓ نے بکری ذبح کی اور اس کے پکانے کے لیے آپس میں کام بانٹ لیے آپ ﷺ نے فرمایا جنگل سے لکڑی میں لاؤں گا صحابہؓ نے تامل کیا تو فرمایا "میں امتیاز پسند نہیں کرتا"۔ [5] ایک اور سفر میں آپ ﷺ کی جوتی کا تسمہ ٹوٹ گیا آپ ﷺ نے خود اس کو درست کرنا چاہا ایک صحابیؓ نے عرض کی یا رسول اللہ لائیے

---

[1] شرح شفائے قاضی عیاض جلد ۲ صفحہ ۱۱۱۔

[2] صحیح بخاری کتاب الادب مسند و ہیب و مسند ابن حنبل جلد ۶ میں بھی منقول ہے قاضی عیاض نے شفا میں متعدد روایتوں سے لے کر اور کچھ اپنی طرف سے جمع کر دیے ہیں زرقانی نے جلد ۴ صفحہ ۳۰۰ میں مسند احمد وغیرہ سے یہ روایت نقل کی ہے اور لکھا ہے کہ ابن حبان نے اس کو صحیح کہا ہے۔

[3] یہ تینوں روایتیں صحیح مسلم میں ہیں پہلی روایت کتاب الادب میں اور دوسری اور تیسری باب جواز وسم الحیوان میں ہے۔

[4] سنن نسائی کتاب المساجد۔

[5] صحیح بخاری باب البنیان۔

[6] زرقانی جلد ۴ صفحہ ۳۰۶ بحوالہ محب طبری۔

تک اسلام کا ایک ایک کارنامہ آنحضرت ﷺ کے عزم و استقلال کا مظہر اتم ہے۔ عرب کے قبرستان میں ایک شخص تنہا کھڑا ہوتا ہے بے یار و مددگار دعوت حق کی صدائیں بلند کرتا ہے۔ ریگستان عرب کا ذرہ ذرہ اس کی مخالفت میں پہاڑ بن کر سامنے آتا ہے لیکن وہ عزیمت اور عزم ربانی سے ٹھوکر کھا کر پیچھے ہٹ جاتا ہے اور مخالفوں کی تمام قوت اس کے سامنے چور چور ہو جاتی ہے۔

تیرہ برس کی متواتر ناکامیوں کے بعد بھی ذات اقدس میں یاس سے آشنائی نہیں ہوتی اور بالآخر وہ دن آتا ہے جب ایک تنہا انسان ایک لاکھ جان نثاروں کو چھوڑ کر دنیائے فانی کو الوداع کہتا ہے۔ ہجرت سے قبل ایک دفعہ صحابہؓ نے کفار کی ایذا رسانیوں سے تنگ آ کر خدمت مبارک میں عرض کی کہ آپ ﷺ ہمارے لیے کیوں دعا نہیں فرماتے؟ آپ ﷺ کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا اور فرمایا کہ "تم سے پہلے جو لوگ گزرے ہیں ان کو آرے سے چیر کر دو ٹکڑے کر دیا جاتا تھا ان کے بدن پر لوہے کی کنگھیاں چلائی جاتی تھیں جس سے گوشت پوست سب علیحدہ ہو جاتا تھا لیکن یہ آزمائشیں بھی ان کو مذہب سے برگشتہ نہیں کر سکتی تھیں خدا کی قسم دین اسلام اپنے مرتبہ کمال کو پہنچ کر رہے گا یہاں تک کہ صنعاء سے حضر موت تک ایک سوار اس طرح بے خطر چلا جائے گا کہ اس کو خدا کے سوا کسی کا ڈر نہ ہوگا"۔[1]

مکہ میں رؤسائے قریش جب ہر قسم کی تدبیروں سے تھک گئے تو انہوں نے آپ ﷺ کے سامنے حکومت کا تخت، زر و جواہر کا خزانہ اور حسن کی دولت پیش کی، ان میں سے ہر چیز بجائے خود دنیا والوں کے قدم کو ڈگمگا دینے کے لیے کافی تھی لیکن آپ ﷺ نے ذلت کے ساتھ ان کی درخواست کو ٹھکرا دیا اور بالآخر وہ وقت آیا جب آخری حامی و مددگار یعنی ابو طالب نے بھی ساتھ چھوڑنا چاہا تو یہ غور و فکر کا آخری لمحہ اور عزم و استقلال کا آخری امتحان تھا، اس وقت آپ ﷺ نے جواب میں جو فقرے فرمائے عالم کائنات میں ثبات و پامردی کے اظہار کا سب سے آخری مرتبہ یہی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا "چچا جان! اگر قریش میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور بائیں میں چاند لا کر رکھ دیں تب بھی اپنے اعلان حق سے باز نہ آؤں گا"۔ (ابن ہشام)

غزوہ بدر میں جب تین سو بے سروسامان مسلم ایک ہزار باساز و سامان فوج سے معرکہ آرا تھے کفار قریش اپنے زور و کثرت سے بپھرتے آتے تھے اس وقت مسلمان سمٹ سمٹ کر آنحضرت ﷺ کے پہلو میں آ جاتے تھے اور یہی ہمت نبوت کا کوہ وقار اپنی جگہ پر قائم تھا۔[2]

غزوہ احد میں آپ ﷺ نے صحابہؓ سے مشورہ کیا تو سب نے حملہ کی رائے دی لیکن جب آپ ﷺ زرہ پہن کر تیار ہو گئے تو صحابہؓ نے رک جانے کا مشورہ دیا، آپ ﷺ نے فرمایا "پیغمبر زرہ پہن کر اتار نہیں سکتا"۔[3] غزوہ حنین میں جب قبیلہ ہوازن کے تیر اندازوں نے مسلسل تیروں کی بوچھاڑ کی تو اکثر صحابہؓ کے قدم اکھڑ گئے لیکن آپ ﷺ نہایت سکون و اطمینان سے چند جاں نثاروں کے ساتھ میدان میں ڈٹے رہے۔ اس وقت زبان مبارک پر یہ رجز جاری تھا۔

---

1. صحیح بخاری باب ما لقی النبی ﷺ۔
2. مسند ابن حنبل جلد ۱ صفحہ ۱۲۶۔
3. بخاری جلد ۲ صفحہ ۱۰۹۲ باب قول اللہ و امرھم شوریٰ بینھم۔

﴿انا النبی لا کذب انا ابن عبد المطلب﴾ [1]

میں پیغمبر صادق ہوں، میں فرزند عبدالمطلب ہوں۔

ایک بار آپ ﷺ کسی غزوہ میں درخت کے نیچے آرام فرما رہے تھے ایک کافر آیا اور اسی حالت خواب میں تلوار کھینچ کر بولا "محمد اب تم کو مجھ سے کون بچا سکتا ہے؟" آپ ﷺ نے فرمایا "خدا" اس عزم و استقلال اور جرأت صادقہ نے اس کو اس قدر مرعوب کر دیا کہ فوراً اس نے تلوار میان میں کر لی اور پاس بیٹھ گیا۔ [2]

شجاعت:

یہ وصف انسانیت کا اصل جوہر اور اخلاق کا سنگ بنیاد ہے۔ عزم، استقلال، حق گوئی، راست گفتاری، یہ تمام باتیں شجاعت ہی سے پیدا ہوتی ہیں۔ آنحضرت ﷺ کو سینکڑوں مصائب و خطرات اور بیسیوں معرکے اور غزوات پیش آئے لیکن کبھی پامردی اور ثبات کے قدم نے لغزش نہیں کھائی۔ غزوہ بدر میں گھمسان لڑائی میں ۳۰۰ نہتے مسلمانوں کے قدم جب ایک ہزار مسلح فوج کے حملوں سے ڈگمگا جاتے تھے تو دوڑ کر مرکز نبوت ہی کے دامن میں آ کر پناہ لیتے تھے۔ حضرت علیؓ جن کے دست و بازو نے بڑے بڑے معرکے سر کیے کہتے ہیں کہ بدر میں جب زور کا رن پڑا تو ہم لوگوں نے آپ ﷺ ہی کی آڑ میں آ کر پناہ لی۔ آپ ﷺ سب سے زیادہ شجاع تھے۔ مشرکین کی صف سے اس دن آپ ﷺ سے زیادہ کوئی قریب نہ تھا۔ [3]

غزوہ حنین میں ہوازن کے بے پناہ تیروں کی بارش ہوئی تو مسلمانوں کی کثیر التعداد فوج دفعتاً میدان سے ہٹ گئی لیکن آپ ﷺ مع چند جان نثاروں کے بدستور میدان میں کھڑے رہے۔ اس وقت بار بار آپ ﷺ اپنے خچر کو ایڑ لگا کر آگے بڑھ جانے کا قصد فرما رہے تھے لیکن جان نثار مانع آتے تھے۔ اب دشمنوں کی تمام فوج کا نشانہ صرف آپ ﷺ کی ذات تھی تاہم پائے اقدس میں لغزش نہیں ہوئی۔ حضرت براءؓ جو اس معرکہ میں شریک تھے کسی نے ان سے پوچھا کہ کیا حنین میں تم بھاگ کھڑے ہوئے تھے؟ جواب دیا "ہاں! لیکن میں گواہی دیتا ہوں کہ آنحضرت ﷺ اپنی جگہ سے نہیں ہٹے تھے خدا کی قسم جب لڑائی پورے زور پر ہوتی تھی تو ہم لوگ آپ ﷺ ہی کے پہلو میں آ کر پناہ لیتے تھے ہم میں سب سے بڑا بہادر وہ شمار ہوتا تھا جو آپ ﷺ کے ساتھ کھڑا ہوتا تھا"۔ [4]

حضرت انس بن مالکؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ سب سے زیادہ شجاع تھے۔ ایک دفعہ مدینہ میں شور ہوا کہ دشمن آ گئے۔ لوگ مقابلے کے لیے تیار ہو گئے لیکن سب سے پہلے جو آگے بڑھ کر نکلا وہ خود آنحضرت ﷺ تھے۔ جلدی میں آپ ﷺ نے اس کا بھی انتظار نہیں کیا کہ گھوڑے پر زین کسی جائے گھوڑے کی برہنہ پشت پر سوار ہو کر آپ ﷺ

[1] صحیح بخاری غزوہ حنین۔

[2] بخاری جلد ۲ صفحہ ۵۹۳ غزوہ ذات الرقاع۔

[3] مسند ابن حنبل جلد ا صفحہ ۱۲۶۔

[4] صحیح مسلم غزوہ حنین۔

تمام قطروں کے مقامات میں گشت لگا آئے اور واپس آ کر لوگوں کو تسکین دی کہ کوئی خطرہ کی بات نہیں۔[1]

آنحضرت ﷺ نے کبھی کسی کو اپنے دست خاص سے قتل نہیں کیا۔ ابی بن خلف آپ ﷺ کا سخت دشمن تھا، بدر میں فدیہ دے کر رہا ہوا تو ساتھ ساتھ یہ کہتا گیا "میرے پاس ایک گھوڑا ہے جس کو میں ہر روز جوار کھلاتا ہوں، اسی پر چڑھ کر محمد کو قتل کروں گا"۔ احد میں اسی گھوڑے کو اڑاتا اور صفوں کو چیرتا ہوا آپ ﷺ کے پاس پہنچ گیا۔ مسلمانوں نے چاہا کہ اس کو بیچ ہی میں روک لیں، آپ ﷺ نے منع فرمایا اور ایک مسلمان کے ہاتھ سے نیزہ لے کر آپ ﷺ اس کی طرف بڑھے اور آہستہ سے اس کی گردن میں انی چبھو دی، وہ چیخ مار کر بھاگا، لوگوں نے کہا کہ تو کوئی بڑا زخم نہیں، تم اس قدر خوف زدہ کیوں ہو؟ اس نے کہا سچ ہے لیکن یہ محمد کے ہاتھ کا زخم ہے۔[2]

راست گفتاری:

راست گفتاری پیغمبر کی ایک ضروری صفت ہے اور اس کا وجود ان کی ذات سے کبھی منفک نہیں ہو سکتا، اس بنا پر آنحضرت ﷺ کے اخلاق کے عنوان میں اس کے جزئیات کی تفصیل کی ضرورت نہ تھی لیکن اس موقع پر ہم صرف ان شہادتوں کو قلم بند کرنا چاہتے ہیں جو دشمنوں کے اعتراف سے ہاتھ آ سکی ہیں۔

آنحضرت ﷺ نے جب نبوت کا دعویٰ کیا تو کفار میں جو لوگ آپ ﷺ سے واقف تھے انہوں نے آپ ﷺ کو کاذب اور دروغ گو یقین نہیں کیا بلکہ یہ سمجھا کہ نعوذ باللہ آپ ﷺ کے حواس درست نہیں ہیں یا آپ عقل بجا نہیں رہی ہے یا یہ کہ ان میں ایک شاعرانہ تخیل پیدا ہو گئی ہے، اسی بنا پر انہوں نے آپ ﷺ کو مجنون کہا، مسحور کہا، شاعر کہا لیکن کاذب نہیں کہا۔

ایک روز قریش کے بڑے بڑے رؤسا جلسہ جمائے بیٹھے تھے اور آپ ﷺ کا ذکر ہو رہا تھا۔ نضر بن حارث نے جو قریش میں سب سے زیادہ جہاندیدہ تھا، کہا "اے قریش! تم پر جو مصیبت آئی ہے اب تک تم اس کی کوئی تدبیر نہ نکال سکے، محمد تمہارے سامنے بچے سے جوان ہوا، وہ تم میں سب سے زیادہ پسندیدہ، صادق القول اور امین تھا، اب جب اس کے بالوں میں سپیدی آ چلی اور تمہارے سامنے یہ باتیں پیش کیں تو کہتے ہو کہ وہ ساحر ہے، کاہن ہے، شاعر ہے، مجنون ہے، خدا کی قسم میں نے اس کی باتیں سنی ہیں، محمد میں یہ کوئی بات نہیں، تم پر کوئی مصیبت ہی آئی ہے۔[3] ابو جہل کہا کرتا تھا "محمد! میں تم کو جھوٹا نہیں کہتا البتہ جو کچھ کہتے ہو اس کو سچ نہیں سمجھتا"۔ قرآن مجید کی یہ آیت اسی موقع پر نازل ہوئی ہے۔[4]

﴿قَدْ نَعْلَمُ إِنَّهُ لَيَحْزُنُكَ الَّذِي يَقُولُونَ فَإِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُونَكَ وَلَٰكِنَّ الظَّالِمِينَ بِآيَاتِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ﴾ (انعام)

ہم جانتے ہیں کہ اے پیغمبر ان کافروں کی باتیں تم کو غمگین کرتی ہیں کیونکہ وہ تم کو جھٹلاتے نہیں البتہ یہ ظالم اللہ کی

---

1. صحیح بخاری کے متفرق ابواب میں یہ حدیث ہے مثلاً باب الشجاعۃ فی الحرب و باب عند الفزع باللیل
2. شرح شفائے قاضی عیاض جلد ۱ صفحہ ۳۲۸ بحوالہ بیہقی بسند صحیح و مصنف عبد الرزاق و ابن سعد و مقریزی۔
3. ابن ہشام۔
4. جامع ترمذی تفسیر انعام۔

آدمیوں کا انکار کرتے ہیں۔

جب آنحضرت ﷺ کو وحی الٰہی سے حکم ہوا کہ اپنے اہل خاندان کو اسلام کی دعوت دو تو آپ ﷺ نے ایک پہاڑ پر چڑھ کر پکارا یا معشر قریش! جب سب لوگ جمع ہو گئے تو فرمایا "اگر میں تم سے یہ کہوں کہ پہاڑ کے عقب سے ایک لشکر آ رہا ہے تو تم کو یقین آئے گا؟" سب نے کہا "ہاں! کیونکہ ہم نے تم کو کبھی جھوٹ بولتے نہیں دیکھا"۔ [1]

قیصر روم نے دربار میں ابوسفیان سے پوچھا کہ تمہارے ہاں جو مدعی پیدا ہوا ہے اس دعویٰ سے پہلے کبھی تم نے اس کو دروغ گوئی بھی پایا؟ ابوسفیان نے کہا نہیں۔ آخر میں قیصر نے جو تقریر کی اس میں کہا "میں نے تم سے پوچھا کہ تمہارے نزدیک وہ کبھی کذب کا بھی مرتکب ہوا تو تم نے جواب دیا کہ نہیں، مجھے یقین ہے کہ اگر وہ خدا پر افترا باندھتا تو وہ آدمیوں پر افترا باندھنے سے کب باز رہتا"۔ [2]

ایفائے عہد:

ایفائے عہد آپ ﷺ کی ایک ایسی خصوصیت تھی کہ دشمن بھی اس کا اعتراف کرتے تھے، چنانچہ قیصر نے اپنے دربار میں آپ ﷺ کے متعلق ابوسفیان سے جو سوالات کئے ان میں ایک یہ بھی تھا کہ کیا کبھی محمد نے بدعہدی بھی کی ہے؟ ابوسفیان کو مجبوراً یہ جواب دینا پڑا کہ نہیں۔ [3] وحشی جنہوں نے حضرت حمزہؓ کو شہید کیا تھا اسلام کے ڈر سے شہر بہ شہر پھرا کرتے تھے۔ اہل طائف نے مدینہ بھیجنے کے لیے جو وفد مرتب کیا اس میں ان کا نام بھی تھا لیکن ان کو ڈر تھا کہ کہیں مجھ سے انتقام نہ لیا جائے لیکن خود دشمنوں نے ان کو یقین دلایا کہ تم بے خوف و خطر جاؤ، محمد سفراء کو قتل نہیں کرتے، چنانچہ وہ اس اعتماد پر دربار نبوت میں حاضر ہوئے اور اسلام لائے۔ [4] صفوان بن امیہ (قبل از اسلام) شدید ترین دشمنوں میں تھے جب مکہ فتح ہوا تو وہ بھاگ کر یمن کے ارادہ سے جدہ چلے گئے۔ عمیرؓ بن وہب نے حاضر خدمت ہو کر واقعہ عرض کیا، آنحضرت ﷺ نے عمامہ مبارک عنایت کیا اور فرمایا کہ یہ صفوان کی امان کی نشانی ہے۔ عمیرؓ عمامہ مبارک لے کر صفوان کے پاس پہنچے اور کہا کہ تم کو بھاگنے کی ضرورت نہیں، تم کو امان ہے، جب خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تو عرض کی کہ کیا آپ نے مجھے امان دی ہے؟ ارشاد ہوا کہ ہاں یہ سچ ہے۔ [5]

ابورافع ایک غلام تھے۔ حالت کفر میں قریش کی طرف سے سفیر بن کر مدینہ منورہ آئے۔ دربار اقدس پر نظر پڑی تو بے اختیار اسلام کی صداقت ان کے دل میں جاگزیں ہو گئی۔ عرض کی یا رسول اللہ! اب میں کبھی کافروں کے پاس لوٹ کر نہ جاؤں گا، ارشاد ہوا نہ میں بدعہدی کر سکتا ہوں اور نہ قاصدوں کو اپنے پاس روک سکتا ہوں، تم اس وقت واپس جاؤ اگر وہاں پہنچ کر بھی تمہارے دل کی یہی کیفیت باقی رہے تو آ جاؤ، چنانچہ وہ اس وقت واپس گئے اور پھر

[1] صحیح بخاری تفسیر سورۂ تبت۔

[2] صحیح بخاری باب بدء الوحی۔

[3] صحیح بخاری باب بدء الوحی۔

[4] صحیح بخاری غزوۂ احد۔

[5] ابن ہشام۔

اسلام لائے۔ ؎

صلح حدیبیہ میں ایک شرط یہ تھی کہ مکہ سے جو مسلمان ہو کر مدینہ جائے گا وہ اہل مکہ کے مطالبہ پر واپس کر دیا جائے گا۔ عین اس وقت جب معاہدہ کی یہ شرطیں زیر تحریر تھیں ابوجندل پابزنجیر اہل مکہ کی قید سے بھاگ کر آئے اور رسول اللہ ﷺ سے فریادی ہوئے تمام مسلمان اس دردانگیز منظر کو دیکھ کر تڑپ اٹھے لیکن آنحضرت ﷺ نے باطمینان تمام ان کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا "اے ابوجندل! صبر کرو، ہم بدعہدی نہیں کر سکتے۔ اللہ تعالیٰ عنقریب تمہارے لیے کوئی راستہ نکالے گا"۔ ؎

نبوت سے پہلے کا واقعہ ہے کہ عبداللہ بن ابی الحمساء نے آنحضرت ﷺ سے کچھ معاملہ کیا اور آپ ﷺ کو بٹھا کر چلے گئے کہ آ کر حساب کر دیتا ہوں، اتفاق سے ان کو خیال نہ رہا، تین دن کے بعد آئے تو آنحضرت ﷺ اسی جگہ تشریف رکھتے تھے ان کو دیکھ کر فرمایا "میں تین دن سے یہاں تمہارے انتظار میں بیٹھا ہوں"۔ ؎

غزوہ بدر میں کافروں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی تعداد ایک ثلث سے بھی کم تھی، ایسے موقع پر آنحضرت ﷺ کی قدرتی خواہش یہ ہونی چاہیے تھی کہ جس قدر آدمی زیادہ ملیں بہتر ہے لیکن آپ ﷺ اس وقت بھی ہمہ تن وفا تھے۔ حذیفہ بن الیمان اور ابوحسیل دو صحابی کہیں سے آ رہے تھے، راہ میں کفار نے ان کو روکا کہ محمد کے پاس جا رہے ہو؟ انہوں نے انکار کیا، آخر اس شرط پر ان کو رہائی ملی کہ وہ جنگ میں آپ ﷺ کا ساتھ نہ دیں گے۔ یہ دونوں صاحب آنحضرت ﷺ کے پاس آئے تو صورت حال عرض کی، فرمایا تم دونوں واپس جاؤ، ہم ہر حال میں معاہدہ وفا کریں گے ہم کو صرف خدا کی مدد درکار ہے۔ ؎

زہد و قناعت:

مصنفین یورپ کا عام خیال ہے کہ آنحضرت ﷺ جب تک مکہ میں تھے پیغمبر تھے، مدینہ پہنچ کر پیغمبر سے بادشاہ بن گئے لیکن واقعہ یہ ہے کہ آپ ﷺ تمام عرب کے زیر نگیں ہو جانے پر بھی فاقہ کش رہے۔ صحیح بخاری باب الجہاد میں روایت ہے کہ وفات کے وقت آپ ﷺ کی زرہ ایک یہودی کے یہاں تیس صاع جو پر گرو تھی۔ جن کپڑوں میں آپ ﷺ نے وفات پائی ان میں اوپر تلے پیوند لگے ہوئے تھے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب تمام عرب حدود شام سے لے کر عدن تک فتح ہو چکا تھا اور مدینہ کی سرزمین میں زر و سیم کا سیلاب آ چکا تھا۔

اس میں شبہ نہیں کہ آپ ﷺ کی بعثت کے فرائض میں رہبانیت کا قلع قمع کرنا بھی تھا جس کی نسبت خدا نے نصاریٰ کی ملامت کی تھی کہ ﴿ وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا ﴾ اس بنا پر آپ ﷺ نے کبھی کبھی اچھے کھانے اور اچھے کپڑے بھی

؎ ابوداؤد باب الوفاء بالعہد۔

؎ صحیح بخاری کتاب الشروط، آخری فقرے اس مقام میں ہیں۔

؎ ابوداؤد کتاب الادب۔

؎ صحیح مسلم باب الوفا بالعہد صفحہ ۱۰۸۔

استعمال کئے ہیں لیکن اصلی میلان طبع زخارف دنیوی سے اجتناب تھا۔ فرمایا کرتے "فرزند آدم کو ان چند چیزوں کے سوا اور کسی چیز کا حق نہیں: رہنے کے لیے گھر، ستر پوشی کے لیے ایک کپڑا، اور شکم سیری کے لیے روکھی سوکھی روٹی اور پانی۔" [1]

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ﴿ولا یطوی له ثوب﴾ "کبھی آپ ﷺ کا کوئی کپڑا تہہ کر کے نہیں رکھا گیا" یعنی صرف ایک جوڑا کپڑا ہوتا تھا دوسرا نہیں ہوتا تھا جو تہہ کر کے رکھا جا سکتا۔

ایک دفعہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ گھر کی دیوار کی مرمت کر رہے تھے اتفاقاً آپ ﷺ کسی طرف سے آ گئے پوچھا کیا شغل ہے؟ عبداللہ بن عمرؓ نے عرض کی "دیوار کی مرمت کر رہا ہوں" ارشاد ہوا کہ "اتنی مہلت کہاں؟" [2]

گھر میں اکثر فاقہ رہتا تھا اور رات رات کو آپ ﷺ اور سارا گھر بھوکا سو رہتا تھا۔

﴿کان رسول اللہ یبیت اللیالی المتتابعة طاویا هو وأهله لا یجدون عشاء﴾ [3]

آپ ﷺ اور آپ کے اہل و عیال مسلسل کئی کئی راتیں بھوکے رہ جاتے تھے کیونکہ رات کا کھانا میسر نہیں ہوتا تھا

پیہم دو دو مہینے تک گھر میں آگ نہیں جلتی تھی۔ حضرت عائشہؓ نے ایک موقع پر جب یہ واقعہ بیان کیا تو عروہ ابن زبیر نے پوچھا کہ آخر گزارا کس چیز پر تھا؟ بولیں کہ پانی اور کھجور، البتہ ہمسایے کبھی کبھی بکری کا دودھ بھیج دیتے تھے تو پی لیتے تھے۔ [4] آپ ﷺ نے تمام عمر کبھی چپاتی کی صورت نہیں دیکھی۔ [5] میدہ جس کو عرب میں حواری اور نقی کہتے ہیں کبھی نظر سے نہیں گزرا۔ سہلؓ بن سعد جو اس واقعہ کے راوی ہیں ان سے لوگوں نے پوچھا کہ کیا آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں چھلنیاں نہ تھیں؟ بولے نہیں۔ لوگوں نے کہا پھر آخر کس چیز سے آٹا چھانتے تھے؟ بولے منہ سے پھونک کر بھوسی اڑا دیتے تھے جو رہ جاتا اس کو گوندھ کر پکا لیتے۔ [6] حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ تمام عمر یعنی مدینہ کے قیام سے وفات تک آپ ﷺ نے کبھی دو وقت سیر ہو کر روٹی نہیں کھائی۔ [7]

فدک اور خیبر وغیرہ کے ذکر میں محدثین اور ارباب سیر لکھتے ہیں کہ آپ ﷺ ان کی آمدنی سے سال بھر کا خرچ لے لیا کرتے تھے۔ یہ واقعہ بظاہر روایات مذکورہ بالا کے مخالف معلوم ہوتا ہے لیکن درحقیقت دونوں صحیح ہیں۔ بے شبہ آپ ﷺ بقدر نفقہ آمدنی میں سے لے لیتے تھے، باقی فقراء اور اہل حاجت کو دے دیتے تھے۔ لیکن آپ اپنے لئے جو رکھ لیتے تھے وہ بھی اہل حاجت کی نذر ہو جاتا تھا۔ احادیث میں آپ ﷺ کی فاقہ کشی اور تنگدستی کے واقعات نہایت کثرت سے منقول ہیں۔ چند روایتیں اس موقع پر ہم درج کرتے ہیں۔

---

1. جامع ترمذی ابواب الزہد۔
2. ابن ماجہ کتاب اللباس۔
3. جامع ترمذی معیشۃ النبی ﷺ۔
4. صحیح بخاری کتاب الرقاق۔
5. ایضاً۔
6. شمائل ترمذی
7. ایضاً۔

ایک دفعہ ایک شخص خدمت اقدس میں حاضر ہوا کہ سخت بھوکا ہوں، آپ ﷺ نے ازواج مطہرات میں سے کسی کے ہاں کہلا بھیجا کہ کچھ کھانے کو بھیج دو، جواب آیا کہ گھر میں پانی کے سوا کچھ نہیں، آپ ﷺ نے دوسرے گھر کہلا بھیجا، وہاں سے بھی یہی جواب آیا، مختصر یہ کہ تمام نو گھروں میں سے بجز پانی کے سوا کھانے کی کوئی چیز نہ تھی۔ ۱

حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ ایک دن خدمت اقدس میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ آپ ﷺ نے شکم مبارک پر پٹی کس کر باندھا ہے، سبب پوچھا تو حاضرین میں سے ایک صاحب نے کہا کہ بھوک کی وجہ سے۔ ۲

حضرت ابو طلحہؓ کہتے ہیں کہ ایک دن میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ مسجد میں زمین پر لیٹے ہوئے ہیں اور بھوک کی وجہ سے بار بار کروٹیں بدلتے ہیں۔ ۳

ایک دفعہ صحابہؓ نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں فاقہ کشی کی شکایت کی اور پیٹ کھول کر دکھایا کہ پتھر بندھے تھے، آپ ﷺ نے شکم کھولا تو ایک کے بجائے دو پتھر تھے۔ ۴

اکثر بھوک کی وجہ سے آواز اس قدر کمزور ہو جاتی تھی کہ صحابہؓ آپ ﷺ کی حالت سمجھ جاتے، ایک دن ابو طلحہؓ گھر آئے اور بیوی سے کہا کہ کچھ کھانے کو ہے؟ میں نے ابھی رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ ان کی آواز کمزور ہو گئی ہے۔ ۵

ایک دن بھوک میں ٹھیک دوپہر کے وقت گھر سے نکلے، راہ میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ ملے، یہ دونوں صاحب بھی بھوک سے بیتاب تھے، آپ ﷺ سب کو لے کر حضرت ابو ایوب انصاریؓ کے گھر آئے، ان کا معمول تھا کہ آنحضرت ﷺ کے لیے دودھ مہیا رکھتے تھے، آج آپ ﷺ کے آنے میں دیر ہوئی تو انہوں نے بچوں کو پلا دیا، آنحضرت ﷺ ان کے گھر پہنچے تو وہ نخلستان میں چلے گئے تھے، ان کی بیوی کو خبر ہوئی تو وہ باہر نکل آئیں اور عرض کی "حضور کا آنا مبارک" آپ ﷺ نے پوچھا ابو ایوبؓ کہاں ہیں؟ نخلستان پاس ہی تھا، وہ آواز سن کر دوڑتے آئے اور مرحبا کہہ کر عرض کی "یہ حضور ﷺ کے آنے کا وقت نہیں" آپ ﷺ نے صورت بیان کی، وہ نخلستان میں جا کر کھجوروں کا ایک خوشہ توڑ لائے اور کہا میں گوشت تیار کراتا ہوں، ایک بکری ذبح کی، آدھے کا سالن، آدھے کے کباب تیار کرائے، کھانا سامنے لا کر رکھا تو آنحضرت ﷺ نے ایک روٹی پر تھوڑا سا گوشت رکھ کر فرمایا کہ فاطمہؓ کو بھجوا دو کئی دن سے اس کو کھانا نصیب نہیں ہوا ہے، پھر خود صحابہؓ کے ساتھ تناول فرمایا، متعدد قسم کے کھانے دیکھ کر آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور فرمایا "خدا نے جو کہا ہے کہ قیامت میں نعیم سے سوال ہوگا وہ یہی چیزیں ہیں۔" ۶

---

۱ صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۲۰۱ مطبوعہ مصر، و صحیح بخاری صفحہ ۵۳۵۔

۲ صحیح مسلم صفحہ ۲۹۳

۳ ایضاً۔

۴ ایضاً۔

۵ ایضاً صفحہ ۱۱۰۔

۶ ترمذی باب... جلد ۲ صفحہ ۵۸ (باب) و صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۱۵۶ میں بھی اجمال، اختصار کے ساتھ مذکور ہے۔

اکثر ایسا ہوتا کہ آنحضرت ﷺ صبح کو ازواج مطہرات کے پاس تشریف لاتے اور پوچھتے کہ آج کچھ کھانے کو ہے؟ عرض کرتیں کہ نہیں! آپ ﷺ فرماتے کہ اچھا میں نے روزہ رکھ لیا۔ [1]

عفو و حلم:

ارباب سیر نے تصریح کی ہے اور تمام واقعات شاہد ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے کبھی کسی سے انتقام نہیں لیا' صحیحین میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے کبھی کسی سے اپنے ذاتی معاملہ میں انتقام نہیں لیا بجز اس صورت کے کہ اس نے احکام الٰہی کی تفضیح کی ہو۔ [2]

جنگ اُحد کی شکست سے زیادہ روز سیاہ طائف کے تفقیر آمیز برتاؤ کی یاد خاطر اقدس پر گراں تھی' [3] تاہم دس برس کے بعد غزوہ طائف میں جب وہ ایک طرف منجنیق سے مسلمانوں پر پتھر برسا رہے تھے تو دوسری طرف ایک سراپا ئے علم و رحم انسان (خود آنحضرت ﷺ) یہ دعا مانگ رہا تھا کہ خدایا انہیں سمجھ عطا کر اور ان کو آستانہ اسلام پر جھکا' چنانچہ ایسا ہی ہوا' [4] یہی جب ان کے وفد نے مدینہ کا رخ کیا تو آپ ﷺ نے صحن مسجد میں ان کو مہمان اتارا اور عزت و حرمت کے ساتھ ان سے پیش آئے۔ [5]

قریش نے آپ ﷺ کو گالیاں دیں' مارنے کی دھمکی دی' راستوں میں کانٹے بچھائے' جسم اطہر پر نجاستیں ڈالیں' گلے میں پھندا ڈال کر کھینچا' آپ ﷺ کی شان میں گستاخیاں کیں' نعوذ باللہ کبھی جادوگر' کبھی پاگل' کبھی شاعر کہا لیکن آپ ﷺ نے کبھی ان کی باتوں پر برہمی ظاہر نہیں فرمائی' قریب سے قریب آدمی بھی جب کسی مجمع میں جھٹلایا جاتا ہے تو وہ غصہ سے کانپ اٹھتا ہے' ایک صاحب جنہوں نے آنحضرت ﷺ کو ذی المجاز کے بازار میں اسلام کی دعوت دیتے ہوئے دیکھا تھا بیان کرتے ہیں کہ حضور ﷺ فرما رہے تھے کہ "لوگو! لا الہ الا اللہ کہو تو نجات پاؤ گے" پیچھے پیچھے ابوجہل تھا وہ آپ ﷺ پر خاک اڑا اڑا کر کہہ رہا تھا "لوگو! اس شخص کی باتیں تم کو اپنے مذہب سے برگشتہ نہ کردیں' یہ یہ چاہتا ہے کہ تم اپنے دیوتاؤں لات و عزیٰ کو چھوڑ دو" راوی کہتا ہے کہ آپ ﷺ اس حالت میں اس کی طرف مڑ کر دیکھتے بھی نہ تھے۔ [5]

سب سے بڑھ کر جوش اور غضب کا موقع ایک کا واقعہ تھا' جب کہ منافقین نے حضرت عائشہ صدیقہؓ کو نعوذ باللہ تہمت لگائی تھی' حضرت عائشہؓ آپ ﷺ کی محبوب ترین ازواج اور حضرت ابوبکرؓ جیسے یار غار اور افضل الصحابہ کی صاحبزادی تھیں' شہر منافقوں سے بھرا پڑا تھا' جنہوں نے دم بھر میں اس خبر کو اس طرح پھیلا دیا کہ سارا مدینہ گونج اٹھا' دشمنوں کی شماتت' ناموس کی بدنامی' محبوب کی تفضیح' یہ باتیں انسانی صبر و تحمل کے پیمانہ میں نہیں سما سکتیں' تاہم رحمت عالم نے

---

1. مسند ابن حنبل جلد ۶ صفحہ ۴۹۔
2. صحیح بخاری جلد ۲ صفحہ ۱۰۰۳ کتاب الادب۔
3. صحیح بخاری بدء الخلق۔
4. ابوداؤد ذکر طائف و مسند ابن حنبل جلد ۴ صفحہ ۳۴۹۔
5. مسند احمد جلد ۳ صفحہ ۴۹۲

ان سب باتوں کے ساتھ کیا کیا؟ تہمت کا تمام تر بانی رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی تھا، اور آپ ﷺ کو اس کا علم بھی ہو چکا تھا، تاہم آپ ﷺ نے صرف اس قدر کیا کہ مجمع عام میں منبر پر کھڑے ہو کر فرمایا "مسلمانو! جو شخص میرے ناموس کے متعلق مجھ کو ستاتا ہے، اس سے میری داد کون لے سکتا ہے؟" حضرت سعدؓ بن معاذ غصہ سے بیتاب ہو گئے اور اٹھ کر کہا میں اس خدمت کے لیے حاضر ہوں، آپ نام بتائیں تو اس کا سر اڑا دوں، سعد بن عبادہؓ نے جو عبداللہ بن ابی کے حلیف تھے مخالفت کی اور اس پر دونوں طرف سے حامی کھڑے ہو گئے، قریب تھا کہ تلواریں کھنچ جائیں، آپ ﷺ نے دونوں کو ٹھنڈا کیا، واقعہ کی تحقیق خود خدا نے کر دی اور تہمت لگانے والوں کو شرعی سزا دی گئی، تاہم عبداللہ بن ابی اس بنا پر چھوڑ دیا گیا کہ اس کو تہمت لگانے کا اقرار نہ تھا اور ثبوت کے لیے شرعی شہادت موجود نہ تھی، تہمت لگانے والوں میں جن کو سزا دی گئی ایک صاحب مسطح بن اثاثہ تھے، ان کی معاش کے کفیل حضرت ابوبکرؓ تھے، تہمت کے جرم میں حضرت ابوبکرؓ نے ان کا روزینہ بند کر دیا، اس پر یہ آیت اتری۔

﴿وَلَا يَأْتَلِ أُولُو الْفَضْلِ مِنكُمْ وَالسَّعَةِ أَن يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا ۗ أَلَا تُحِبُّونَ أَن يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾ (نور)

تم میں سے جو لوگ صاحب فضیلت اور ذی مقدور ہیں ان کو یہ قسم نہیں کھانا چاہیے کہ قرابت والوں، مسکینوں اور مجاہدوں سے سلوک نہ کریں گے، تم کو عفو اور درگذر سے کام لینا چاہیے، کیا تم نہیں چاہتے کہ خدا تم کو بخش دے، خدا غفور و رحیم ہے۔

حضرت ابوبکرؓ نے ان کا روزینہ بدستور جاری کر دیا۔

تہمت لگانے والوں میں (جیسا کہ صحیح ترمذی کتاب التفسیر سورۂ نور میں تصریح ہے) حضرت حسانؓ بھی تھے، حضرت عائشہؓ کو ان سے جو رنج تھا وہ طبعی حد سے متجاوز تھا، لیکن یہ آنحضرت ﷺ کے فیض صحبت کا اثر تھا کہ جب عروہ بن زبیر نے حضرت عائشہؓ کے سامنے حضرت حسانؓ کو برا کہنا شروع کیا تو حضرت عائشہؓ نے روک دیا کہ یہ (حسان) آنحضرت ﷺ کی طرف سے کفار کو جواب دیتے تھے۔[1]

مدینہ کے منافق یہودیوں میں سے لبید بن اعصم نے آپ ﷺ پر سحر کیا، تاہم آپ ﷺ نے کچھ تعرض نہ فرمایا، حضرت عائشہؓ نے مزید تحقیق کی تحریک کی تو فرمایا کہ میں لوگوں میں شورش نہیں پیدا کرنا چاہتا۔[2]

زید بن سعنہ جس زمانہ میں یہودی تھے، لین دین کا کاروبار کرتے تھے، آنحضرت ﷺ نے ان سے کچھ قرض لیا، میعاد ادا میں ابھی کچھ دن باقی تھے، تقاضے کو آئے، آنحضرت ﷺ کی چادر پکڑ کر کھینچی اور سخت سست کہہ کر کہا "عبدالمطلب کے خاندان والو! تم ہمیشہ یوں ہی حیلے حوالے کیا کرتے ہو۔" حضرت عمرؓ غصہ سے بیتاب ہو گئے، اس کی طرف مخاطب ہو کر کہا "او دشمن خدا! تو رسول اللہ کی شان میں گستاخی کرتا ہے۔" آنحضرت ﷺ نے مسکرا کر فرمایا "عمرؓ!

---

[1] صحیح بخاری قصہ افک۔

[2] صحیح بخاری صفحہ ۹۰۔

[3] یہ روایت بیہقی، ابن حبان، طبرانی اور ابو نعیم نے روایت کی ہے ... [شرح شفاء قاضی عیاض]

مجھ کو تم سے اور کچھ امید تھی اس کو سمجھانا چاہیے تھا کہ نرمی سے تقاضا کرے اور مجھ سے کہنا چاہیے تھا کہ میں اس کا قرض ادا کر دوں" پھر فرمایا کہ حضرت عمرؓ کو ارشاد فرمایا کہ قرض ادا کر کے تیس صاع کھجوریں زیادہ دے دو۔

ایک دفعہ آپ ﷺ کے پاس صرف ایک جوڑا کپڑا رہ گیا تھا اور وہ بھی موٹا اور گندہ تھا، پسینہ آتا تو اور بھی بوجھل ہو جاتا۔ اتفاق سے ایک یہودی کے یہاں شام سے کپڑے آئے۔ حضرت عائشہؓ نے عرض کی کہ ایک جوڑا اس سے قرض منگوا لیجئے۔ آنحضرت ﷺ نے یہودی کے پاس آدمی بھیجا۔ اس گستاخ نے کہا "میں سمجھ گیا، مطلب یہ ہے کہ میرا مال یوں ہی اڑا لیں اور دام نہ دیں۔" آنحضرت ﷺ نے یہ سنا تو صرف اس قدر فرمایا کہ "وہ خوب جانتا ہے کہ میں سب سے زیادہ متقی اور سب سے زیادہ امانت کا ادا کرنے والا ہوں۔" [1]

ایک دفعہ کہیں تشریف لے جا رہے تھے، ایک عورت قبر کے پاس بیٹھی رو رہی تھی، آپ ﷺ رک گئے اور اس سے مخاطب ہو کر فرمایا "صبر کرو"، وہ آپ ﷺ کو پہچانتی نہ تھی، گستاخی کے ساتھ بولی "جاؤ تم کیا جانو کہ مجھ پر کیا کیفیت ہے"۔ آپ ﷺ چلے آئے، لوگوں نے عورت سے کہا تو نے نہیں پہچانا، وہ رسول اللہ ﷺ تھے، دوڑی ہوئی آئی اور کہا میں حضور کو پہچانتی نہ تھی۔ ارشاد فرمایا "صبر وہی معتبر ہے جو عین مصیبت کے وقت کیا جائے۔" [2]

ایک دفعہ حضرت سعد بن عبادہؓ بیمار ہوئے، آپ ﷺ عیادت کو سواری پر تشریف لے گئے، راہ میں ایک جلسہ تھا، آپ ﷺ ٹھہر گئے، عبداللہ بن ابی جو رئیس المنافقین تھا وہ بھی جلسہ میں موجود تھا۔ آپ ﷺ کی سواری کی گرد اڑی تو اس نے چادر ناک پر رکھ لی اور آنحضرت ﷺ سے کہا "گرد نہ اڑاؤ"۔ جب آنحضرت ﷺ قریب پہنچے تو اس نے کہا "محمد! الگ ہٹ جاؤ، تمہارے گدھے کی بدبو نے میرا دماغ پریشان کر دیا۔" آنحضرت ﷺ نے سلام کیا، پھر سواری سے اتر گئے اور اسلام کی دعوت دی، عبداللہ بن ابی نے کہا "اے مرد! تم ہم کو نہ ستاؤ، جو شخص خود تمہارے پاس جائے اس کو تعلیم دو"۔ عبداللہ بن رواحہ جو مشہور شاعر تھے انہوں نے کہا آپ ضرور تشریف لائیں، بات بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچی کہ قریب تھا کہ تلواریں نکل آئیں۔ آنحضرت ﷺ نے دونوں فریق کو سمجھا بجھا کر ٹھنڈا کیا، جلسہ سے اٹھ کر آپ ﷺ سعد بن عبادہ کے پاس آئے اور ان سے کہا تم نے عبداللہ کی باتیں سنیں، سعد بن عبادہ نے عرض کی کہ آپ ﷺ کچھ خیال نہ فرمائیں، یہ وہ شخص ہے کہ آپ کی تشریف آوری سے پہلے اہل مدینہ نے اس کے سر پر ریاست کا تاج تیار کرایا تھا۔ [3]

غزوہ حنین میں آپ ﷺ نے مال غنیمت تقسیم فرمایا تو ایک انصاری نے کہا "یہ تقسیم خدا کی رضامندی کے لیے نہیں ہے"۔ آپ ﷺ نے سنا تو فرمایا "خدا موسیٰ پر رحم کرے، ان لوگوں نے ان کو اس سے بھی زیادہ ستایا تھا۔" [4]

ایک دفعہ ایک بدو خدمت اقدس میں آیا، آپ ﷺ مسجد میں تشریف رکھتے تھے، اس کو پیشاب کی حاجت

---

[1] جامع ترمذی کتاب البیوع۔

[2] بخاری کتاب الجنائز۔

[3] صحیح بخاری جلد ۲ صفحہ ۹۲۴۔

[4] صحیح بخاری غزوہ حنین صفحہ ۶۲۰۔

معلوم ہوا کہ آداب مسجد سے واقف نہ تھا، وہیں کھڑے ہو کر پیشاب کرنے لگا، لوگ ہر طرف سے دوڑ پڑے کہ اس کو سزا دیں، آپ ﷺ نے فرمایا "جانے دو اور پانی کا ایک ڈول اس پر بہا دو، خدا نے تم لوگوں کو دشواری کے لیے نہیں بلکہ آسانی کے لیے بھیجا ہے۔"[1]

حضرت انسؓ جو خادم خاص تھے ان کا بیان ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے مجھ کو کسی کام کے لئے بھیجنا چاہا، میں نے کہا نہ جاؤں گا، آپ ﷺ چپ رہ گئے، میں یہ کہہ کر باہر چلا گیا، دفعتاً آنحضرت ﷺ نے پیچھے سے آ کر میری گردن پکڑ لی، میں نے مڑ کر دیکھا تو آپ ﷺ ہنس رہے ہیں، پھر پیار سے فرمایا "انیس! جس کام کے لئے کہا تھا اب تو جاؤ" میں نے عرض کی اچھا جاتا ہوں، حضرت انسؓ نے اسی واقعہ کے ساتھ بیان کیا کہ میں نے سات برس آپ ﷺ کی ملازمت کی، کبھی یہ نہ فرمایا کہ تم نے یہ کام کیوں کیا، یہ کیوں نہیں کیا۔[2]

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ کی عادت تھی کہ ہم لوگوں کے ساتھ مسجد میں بیٹھ جاتے اور باتیں کرتے، جب اٹھ کر گھر میں جاتے تو ہم لوگ بھی اٹھ جاتے، ایک دن حسب معمول مسجد سے نکلے، ایک بدو آیا اور اس نے آپ ﷺ کی چادر اس زور سے پکڑ کر کھینچی کہ آپ کی گردن سرخ ہو گئی، آپ ﷺ نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا، بولا کہ میرے دو اونٹوں کو غلہ سے لاد دے، تیرے پاس جو مال ہے، وہ نہ تیرا ہے نہ تیرے باپ کا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا پہلے میری گردن کا بدلہ دو، تب لدوا دوں گا، وہ بار بار کہتا تھا خدا کی قسم میں ہرگز بدلہ نہ دوں گا، آپ ﷺ نے اس کے اونٹوں پر جو اور کھجوریں لدوا دیں اور کچھ تعرض نہ فرمایا۔[3]

قریش (نعوذ باللہ) آنحضرت ﷺ کو گالیاں دیتے تھے، برا بھلا کہتے تھے، ضد سے آپ ﷺ کو (تعریف کیا گیا) نہیں کہتے تھے بلکہ مذمم (مذمت کیا گیا) کہتے تھے، لیکن آپ ﷺ اس کے جواب میں اپنے دوستوں کو خطاب کر کے صرف اسی قدر فرمایا کرتے کہ "تمہیں تعجب نہیں آتا کہ اللہ تعالیٰ قریش کی گالیوں کو مجھ سے کیونکر پھیرتا ہے، وہ مذمم کو گالیاں دیتے اور مذمم پر لعنت بھیجتے ہیں اور میں محمد ﷺ ہوں"۔[4]

جس زمانہ میں آپ ﷺ فتح مکہ کے لیے تیاریاں کر رہے تھے، اس بات کی خاص احتیاط فرما رہے تھے کہ قریش کو ہمارے ارادوں کی خبر نہ ہو، حاطب بن ابی بلتعہ ایک صحابی تھے، انہوں نے چاہا کہ قریش کو اس کی اطلاع کر دیں، چنانچہ ایک خط لکھ کر انہوں نے چپکے سے ایک عورت کی معرفت مکہ روانہ کیا، آپ ﷺ کو اس کی خبر ہو گئی، حضرت علیؓ اور حضرت زبیرؓ اسی وقت بھیجے گئے، جو قاصد کو بیچ ہی سے گرفتار کر لائے، حاطب کو بلا کر دریافت کیا تو انہوں نے صاف صاف اپنے قصور کا اعتراف کیا اور معذرت چاہی، یہ موقع تھا کہ ہر سیاست داں مجرم کی سزا کو قتل ہی دیتا، لیکن آنحضرت

---

1. صحیح بخاری صفحہ ۳۵۔
2. صحیح مسلم و ابوداؤد کتاب الادب۔
3. ابوداؤد کتاب الادب، یہی واقعہ حضرت انسؓ سے بخاری و مسلم میں بھی مروی ہے بتغیر یسیر۔
4. مشکوٰۃ باب اسماء النبی ﷺ۔

ﷺ نے اس لیے ان کو معاف فرمایا کہ وہ شرکائے بدر میں تھے' عورت جو اس جرم میں شریک تھی اس سے بھی کسی قسم کا تعرض نہیں فرمایا۔[1] حالانکہ یہ خط اگر دشمنوں تک پہنچ جاتا تو مسلمانوں کو سخت خطرات کا سامنا ہو جاتا۔

فرات بن حیان ایک شخص تھا' ابوسفیان کی طرف سے مسلمانوں کی جاسوسی پر مامور تھا' اور آنحضرت ﷺ کی ہجو میں اشعار کہا کرتا تھا' ایک دفعہ وہ پکڑا گیا تو آنحضرت ﷺ نے اس کے قتل کا حکم دیا' لوگ اس کو پکڑ کر لے چلے جب انصار کے ایک حلقہ میں پہنچا تو بولا کہ میں مسلمان ہوں' ایک انصاری نے آکر اطلاع دی کہ وہ کہتا ہے کہ میں مسلمان ہوں' آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم میں کچھ لوگ ایسے ہیں جن کے ایمان کا حال ہم انہی پر چھوڑتے ہیں' ان میں سے ایک فرات بن حیان ہے۔[2] مورخین نے لکھا ہے کہ وہ بعد کو صدق دل سے مسلمان ہو گئے اور آنحضرت ﷺ نے ان کو یمامہ میں ایک زمین عنایت فرمائی' جس کی آمدنی ۴۲۰۰ درہم تھی۔[3]

دشمنوں سے عفو و درگزر اور حسن سلوک:

انسان کے ذخیرہ اخلاق میں سب سے زیادہ کمیاب' نادر الوجود چیز دشمنوں پر رحم اور ان سے عفو و درگزر ہے' لیکن حامل وحی و نبوت کی ذات اقدس میں یہ جنس فراواں تھی' دشمن سے انتقام لینا انسان کا قانونی فرض ہے لیکن اخلاق کے دائرہ شریعت میں آکر یہ فرضیت مکروہ تحریمی بن جاتی ہے' تمام راوی اس بات پر متفق ہیں کہ آپ ﷺ نے کبھی کسی سے انتقام نہیں لیا۔

دشمنوں سے انتقام کا سب سے بڑا موقع فتح حرم کا دن تھا جبکہ وہ کینہ خواہ سامنے آئے' جو آنحضرت ﷺ کے خون کے پیاسے تھے اور جن کے دست ستم سے آپ ﷺ نے طرح طرح کی اذیتیں اٹھائی تھیں' لیکن ان سب کو یہ کہہ کر چھوڑ دیا۔

﴿لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ اِذْهَبُوْا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ﴾

تم پر کوئی ملامت نہیں جاؤ تم سب آزاد ہو۔

وحشی جو اسلام کے قوت بازو اور آنحضرت ﷺ کے عزیز ترین چچا حضرت حمزہؓ کا قاتل تھا' مکہ میں رہتا تھا' جب مکہ میں اسلام کی قوت نے ظہور کیا تو وہ بھاگ کر طائف آیا' طائف نے بھی آخر سر اطاعت خم کیا' وحشی کے لیے یہ بھی مامن نہ رہا' لیکن اس نے سنا کہ آنحضرت ﷺ سفراء سے کچھ سختی کے ساتھ پیش نہیں آتے' تاہم وہ خود رحمت عالم کے دامن میں پناہ لی اور اسلام قبول کیا' آنحضرت ﷺ نے صرف اس قدر فرمایا کہ میرے سامنے نہ آیا کرو کہ تم کو دیکھ کر مجھے چچا کی یاد آتی ہے۔[4]

---

1. صحیح بخاری فتح مکہ۔
2. ابوداؤد کتاب الجہاد باب الجاسوس الذمی' یہ حدیث سفیان ثوری کے واسطہ سے دو طریقوں سے مروی ہے' ایک میں ابوہمام الدلال اور دوسرا طریق ہے۔ یہ طریق ضعیف ہے' دوسرا طریق بشر بن سری البصری کے ذریعہ سے ہے جو ثقہ ہیں۔ امام احمد نے بھی مسند میں یہ روایت نقل کی ہے۔
3. اصابہ بعد فرات تذکرہ۔
4. صحیح بخاری قتل حمزہ۔

اسی بنا پر فتح مکہ کے وقت ہبار، مشتہر مجرموں کی فہرست میں داخل تھا، چاہا کہ بھاگ کر ایران چلا جائے، مگر الٰہی ہدایت نے خود آستانۂ نبوت کی طرف جھکا دیا، آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی یارسول اللہ میں بھاگ کر ایران چلا جانا چاہتا تھا، لیکن پھر مجھے حضور کے احسانات اور عفو و کرم یاد آئے، میری نسبت آپ کو جو خبریں پہنچی تھیں وہ صحیح تھیں، مجھے اپنی جہالت اور قصور کا اعتراف ہے، اب اسلام سے مشرف ہونے آیا ہوں" باب رحمت وا تھا اور دوست و دشمن کی تمیز بکلی مفقود تھی۔[1]

ابوسفیان اسلام سے پہلے جیسے کچھ تھے غزوات نبوی کا ایک ایک حرف اس کا شاہد ہے، بدر سے لے کر فتح مکہ تک جس قدر لڑائیاں اسلام کو لڑنی پڑیں ان میں سے اکثر میں ان کا ہاتھ تھا، لیکن فتح مکہ کے موقع پر جب وہ گرفتار کر کے لائے گئے اور حضرت عباسؓ ان کو لے کر خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ ان سے محبت سے پیش آئے، حضرت عمرؓ نے گذشتہ جرائم کی پاداش میں ان کے قتل کا ارادہ کیا لیکن آپ ﷺ نے منع فرمایا اور نہ صرف یہ بلکہ ان کے گھر کو امن و امان کا حرم بنا دیا، فرمایا کہ "جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے گا اس کا قصور معاف ہوگا"۔[2] کیا دنیا کے کسی فاتح نے اپنے دشمن کے ساتھ یہ برتاؤ کیا ہے؟

عرب کا ایک ایک قبیلہ اطاعت کیشانِ اسلام کے پرچم کے نیچے جمع ہو رہا تھا، لیکن ایک قبیلہ نے آخر تک سرتابی کی، وہ بنو حنیفہ کا قبیلہ تھا، جس میں مسیلمہ نے ادعائے نبوت کیا تھا، ثمامہ بن اثال اس قبیلہ کے رئیس تھا، اتفاق سے وہ مسلمانوں کے ہاتھ لگ گیا، گرفتار کر کے مدینہ لائے، آنحضرت ﷺ نے حکم دیا کہ اس کو مسجد کے ستون میں باندھ دیا جائے، اس کے بعد آپ ﷺ مسجد میں تشریف لائے اور اس سے دریافت کیا کہ کیا کہتے ہو؟ اس نے کہا "اے محمد! اگر تم مجھے قتل کر دو گے تو ایک خونی کو قتل کرو گے، اور اگر احسان کرو گے تو ایک شکر گزار پر احسان ہوگا، اور اگر زر فدیہ چاہتے ہو تو مانگو میں دوں گا" یہ سن کر آپ ﷺ خاموش رہے، دوسرے دن بھی یہی تقریر ہوئی، تیسرے روز بھی جب اس نے یہی جواب دیا تو آپ ﷺ نے حکم دیا کہ ثمامہ کو کھول دو، وہ آزاد کر دیا گیا، ثمامہ پر اس غیر متوقع لطف و عنایت کا یہ اثر ہوا کہ قریب ایک درخت کی آڑ میں جا کر غسل کیا اور مسجد میں واپس آ کر کلمہ پڑھا اور مسلمان ہو گیا اور عرض کی "یا رسول اللہ! دنیا میں کوئی شخص میری نظر میں آپ سے زیادہ مبغوض نہ تھا، اور اب آپ سے زیادہ دنیا میں مجھے کوئی محبوب نہیں، کوئی مذہب آپ کے مذہب سے زیادہ میری نگاہ میں برا نہ تھا اور اب وہی سب سے زیادہ پیارا ہے، کوئی شہر آپ کے شہر سے زیادہ ناپسند نہ تھا، اور اب وہی پسندیدہ ہے۔"

قریش کی ستمگری و جفاکاری کی داستان دہرانے کی ضرورت نہیں، یاد ہوگا کہ شعب ابی طالب میں تین برس تک ان ظالموں نے آپ ﷺ اور آپ کے خاندان کو اس طرح محصور رکھا تھا کہ غلہ کا ایک دانہ اندر نہیں جا سکتا تھا، بچے بھوک سے روتے اور تڑپتے تھے اور بے درد ان کی آواز سن کر ہنستے اور خوش ہوتے تھے لیکن معلوم ہے کہ رحمت عالم نے اس کے معاوضہ میں قریش کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ قریش کو غلہ یمامہ سے آتا تھا، یمامہ کے رئیس یہی ثمامہ

---

[1] ابن سعد واصابہ تذکرہ ہبار۔

[2] صحیح بخاری و مسلم فتح مکہ، فتح الباری۔

ساتھیوں نے کہا "آسان بات یہ ہے کہ تم لوگ مہاجرین کی خبر گیری سے ہاتھ اٹھا لو تو وہ خود بخود چلے جائیں گے" چنانچہ قرآن مجید میں یہ واقعہ مذکور ہے۔

﴿هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا﴾ (منافقون)

یہی لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ پیغمبر کے ساتھیوں پر کچھ خرچ نہ کرو تا کہ وہ منتشر ہو جائیں۔

﴿يَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ﴾ (منافقون)

کہتے ہیں کہ جب ہم مدینہ واپس چلیں گے تو معزز لوگ کمینوں کو مدینہ سے نکال دیں گے۔

آنحضرت ﷺ نے عبداللہ بن ابی کو بلا بھیجا کہ تم نے یہ الفاظ کہے تھے؟ اس نے صاف انکار کیا۔ حضرت عمرؓ موجود تھے بولے یا رسول اللہ اجازت دیجئے کہ اس منافق کی گردن مار دوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا لوگ چرچا کریں گے کہ محمد اپنے ساتھیوں کو قتل کرتے ہیں۔ ۱

جنگ احد میں عبداللہ بن ابی عین لڑائی کے پیش آنے کے وقت تین سو آدمیوں کے ساتھ واپس چلا آیا جس سے مسلمانوں کی قوت کو سخت صدمہ پہنچا تاہم آنحضرت ﷺ نے درگزر فرمایا اور وہ جب مرا تو اس احسان کے معاوضہ میں کہ حضرت عباسؓ کو اس نے اپنا کرتہ دیا تھا' مسلمانوں کی برہمی کے باوجود آپ ﷺ نے اپنا قمیص مبارک اس کو پہنا کر دفن کیا۔ ۲

یہود و نصاریٰ کے ساتھ برتاؤ

خلق عظیم میں کافر و مسلم' دوست و دشمن' عزیز و بیگانہ کی تمیز نہ تھی' ابر رحمت دشت و چمن پر یکساں برستا تھا۔ یہود کو آنحضرت ﷺ سے جس شدت کی عداوت تھی اس کی شہادت غزوۂ خیبر تک کے ایک ایک واقعہ سے ملتی ہے لیکن آپ ﷺ کا طرز عمل مدت تک یہ رہا کہ جن امور کی نسبت مستقل حکم نازل نہ ہوتا آپ ﷺ ان میں انہیں کی تقلید فرماتے تھے۔ ۳

ایک دفعہ ایک یہودی نے بر سر بازار کہا "قسم ہے اس ذات کی جس نے موسیٰ کو تمام انبیاء پر فضیلت دی" ایک صحابی پاس کھڑے تھے ان سے رہا نہ گیا' انہوں نے پوچھا کہ "کیا محمد ﷺ پر بھی؟" اس نے کہا "ہاں" انہوں نے غصہ میں ایک تھپڑ اس کے مار دیا' آنحضرت ﷺ کے عدل و اخلاق پر دشمنوں کو بھی اس درجہ اعتبار تھا کہ وہ یہودی سیدھا آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور واقعہ عرض کیا' آپ ﷺ نے ان صحابی پر ناراضی ظاہر فرمائی۔ ۴

ایک یہودی کا لڑکا بیمار ہوا تو آپ ﷺ اس کی عیادت کو تشریف لے گئے اور اس کو اسلام کی دعوت دی' اس نے اپنے باپ کی طرف دیکھا' گویا باپ کی رضامندی دریافت کی' اس نے کہا "آپ جو فرماتے ہیں اس کو بجا لاؤ" چنانچہ

---

۱ صحیح بخاری تفسیر سورۂ منافقون۔

۲ بخاری میں یہ واقعہ متعدد روایتوں اور مختلف طریقوں سے منقول ہے۔

۳ صحیح بخاری۔

۴ صحیح بخاری ج ۱۔

اس لئے کھڑے ہو جاتے تھے ایک دفعہ سامنے سے ایک یہودی کا جنازہ گزرا تو آپ ﷺ کھڑے ہو گئے۔ [1]

ایک دفعہ چند یہودی آپ ﷺ کی خدمت میں آئے اور شرارت سے السلام علیکم کے بجائے السام علیکم (تم پر موت) کہا حضرت عائشہؓ نے غصہ میں "تم پر" ان کو بھی سخت جواب دیا لیکن آپ ﷺ نے روکا اور فرمایا "عائشہ بد زبانی نہ کرو اللہ تعالیٰ ہر بات میں نرمی پسند کرتا ہے"۔ [2]

یہودیوں کے ساتھ داد و ستد کرتے تھے ان کے سخت ناجائز تقاضوں اور درشت کلامیوں کو برداشت کرتے تھے یہودیوں اور مسلمانوں میں اگر معاملات میں اختلاف پیش آتا تو مسلمانوں کی بلا وجہ جانب داری نہ فرماتے چنانچہ اس قسم کی متعدد مثالیں دوسرے عنوانات میں مذکور ہیں ایک دفعہ ایک یہودی نے آ کر شکایت کی "محمدؐ! دیکھو ایک مسلمان نے مجھ کو تھپڑ مارا ہے"۔ آپ ﷺ نے اس مسلمان کو اسی وقت بلا کر تنبیہ فرمایا۔ نصاریٰ کا وفد نجران سے مدینہ حاضر ہوا تو آپ ﷺ نے ان کی مہمانداری کی مسجد نبوی میں ان کو جگہ دی بلکہ ان کو اپنے طریق پر مسجد میں نماز پڑھنے کی بھی اجازت دے دی اور جب عام مسلمانوں نے ان کو اس کام سے روکنا چاہا تو آپ ﷺ نے منع فرمایا۔ [4]

یہود و نصاریٰ کے ساتھ کھانے پینے، نکاح و معاشرت کی اجازت تھی اور ان کے لئے مخصوص امتیازی احکام شریعت اسلامیہ میں جاری فرمائے۔

غریبوں کے ساتھ محبت و شفقت:

مسلمانوں میں امیر بھی تھے اور غریب بھی، دولتمند بھی اور فاقہ کش بھی لیکن آنحضرت ﷺ کا برتاؤ سب کے ساتھ یکساں تھا بلکہ غریبوں کے ساتھ آپ ﷺ اس طرح پیش آتے تھے کہ دنیاوی دولت کی محرومی ان کے دلوں کو صدمہ نہیں پہنچاتی تھی ایک دفعہ تقاضائے بشریت سے آپ ﷺ کا ایک فعل اس کے خلاف ہوا تو بارگاہ احدیت سے اس پر باز پرس ہوئی۔ واقعہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے پاس چند اکابر قریش بیٹھے تھے اور آپ ﷺ ان کو اسلام کی دعوت دے رہے تھے کہ اتفاق سے عبداللہ بن ام مکتوم جو آنکھوں سے معذور اور غریب تھے، آ گئے اور وہ بھی ان لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر آپ ﷺ سے باتیں کرنے لگے رؤسائے قریش چونکہ سخت متکبر اور مغرور تھے ان کو یہ برابری ناگوار گزری آپ ﷺ نے ابن ام مکتومؓ کی طرف توجہ نہیں فرمائی اور اسی امید پر انہیں سے باتیں کرتے رہے کہ شاید یہ اشقیائے ازلی سعادت کو قبول کر لیں اور ان کے دل حق کی لذت سے آشنا ہوں لیکن خدا کو یہ تمیز پسند نہ آئی اور یہ آیت اتری۔ [5]

---

١ صحیح بخاری کتاب الجنائز۔

٢ صحیح بخاری کتاب الجنائز۔

٣ صحیح مسلم کتاب الادب صفحہ [illegible] مصر۔

٤ زاد المعاد۔

٥ ترمذی تفسیر سورہ عبس۔

لایا اور کہا جا کر دعوت اسلام پہنچاؤ۔ [1] یہ واقعہ مشہور ہو چکا ہے۔ ایک دفعہ آپ ﷺ ایک غزوہ سے واپس آ رہے تھے راہ میں ایک میدان آیا دھوپ تیز تھی لوگوں نے درختوں کے نیچے بستر لگا دیئے آنحضرت ﷺ نے بھی ایک درخت کے نیچے آرام فرمایا اور تلوار درخت کی شاخ سے لٹکا دی کفار موقع کے منتظر رہتے تھے۔ لوگوں کو غافل دیکھ کر ناگاہ ایک طرف سے ایک بدو نے آ کر بے خبری میں تلوار اتار لی اور کھینچ لی آپ ﷺ بیدار ہوئے تو دیکھا ایک شخص سرہانے کھڑا ہے اور ننگی تلوار اس کے ہاتھ میں ہے۔ آپ ﷺ کو بیدار دیکھ کر بولا "کیوں محمد! اب بتاؤ تم کو اس وقت مجھ سے کون بچا سکتا ہے؟" آپ ﷺ نے فرمایا "اللہ" یہ پر اثر آواز سن کر اس نے تلوار نیام میں کر لی اتنے میں صحابہ آ گئے آپ ﷺ نے ان سے واقعہ بیان کیا اور بدو سے کسی قسم کا تعرض نہیں فرمایا۔ [2]

ایک دفعہ ایک اور شخص نے آپ ﷺ کے قتل کا ارادہ کیا صحابہ اس کو گرفتار کر کے آنحضرت ﷺ کے سامنے لائے وہ آپ ﷺ کو دیکھ کر ڈر گیا آپ ﷺ نے اس کو مخاطب کر کے فرمایا "ڈرو نہیں اگر تم مجھ کو قتل کرنا چاہتے تھے تو نہیں کر سکتے تھے۔" [3]

صلح حدیبیہ کے زمانہ میں ایک دفعہ اسی آدمیوں کا ایک دستہ صبح سویرے جبل تنعیم سے اتر کر آیا اور چھپ کر آنحضرت ﷺ کو قتل کرنا چاہا اتفاق سے وہ لوگ گرفتار ہو گئے لیکن آنحضرت ﷺ نے ان کو چھوڑ دیا اور کچھ تعرض نہیں کیا قرآن مجید کی یہ آیت اسی واقعہ کے متعلق نازل ہوئی ہے۔ [4]

﴿وَهُوَ الَّذِي كَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ عَنْهُم﴾ (فتح)

اسی خدا نے ان کے ہاتھ تم سے اور تمہارے ہاتھ ان سے روک دیئے۔

خیبر میں ایک یہودیہ نے آنحضرت ﷺ کو کھانے میں زہر دیا آپ ﷺ نے کھانا کھایا تو زہر کا اثر محسوس کیا آپ ﷺ نے یہودیوں کو بلا کر دریافت کیا تو انہوں نے اقرار کیا لیکن آپ ﷺ نے کسی سے کچھ تعرض نہیں فرمایا لیکن اسی زہر کے اثر سے جب ایک صحابی نے انتقال کیا تو آپ ﷺ نے صرف اس یہودیہ کو قصاص کی سزا دی (حالانکہ خود آنحضرت ﷺ کو زہر کا اثر مرتے دم تک محسوس ہوتا رہا تھا۔ [5])

دشمنوں کے حق میں دعائے خیر:

دشمنوں کے حق میں بددعا کرنا انسان کی فطری عادت ہے لیکن پیغمبروں کا مرتبہ عام انسانی سطح سے بدرجہا بلند ہوتا ہے جو لوگ ان کو گالیاں دیتے ہیں وہ ان کے حق میں دعائے خیر کرتے ہیں اور جو ان کے تشنہ خون ہوتے ہیں وہ ان کو پیار کرتے ہیں ہجرت سے قبل مکہ میں مسلمانوں پر اور خود آنحضرت ﷺ پر جو ستم ہو رہے تھے اس داستان کے

---

۱ تاریخ طبری جلد ۳ صفحہ [illegible]

۲ صحیح بخاری کتاب الجہاد صفحہ ۴۰۶۔

۳ مسند ابن حنبل جلد ۳ صفحہ ۴۷۱۔

۴ جامع ترمذی تفسیر فتح۔

۵ صحیح بخاری وفات النبی ﷺ۔

دعوت کے لئے بھی سنگدلی درکار ہے اسی زمانہ میں خباب بن ارت ایک صحابی نے عرض کی کہ یا رسول اللہ دشمنوں کے حق میں بددعا فرمایئے، یہ سن کر چہرہ مبارک سرخ ہو گیا۔[1] ایک دفعہ چند صاحبوں نے مل کر اسی قسم کی بات کی تو فرمایا "میں دنیا کے لئے لعنت نہیں بلکہ رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں"۔[2]

قریش دشمنوں نے تین برس تک آپ ﷺ کو محصور رکھا اور آپ ﷺ کے پاس غلہ کا ایک دانہ تک پہنچنے نہ دیا اور جب انہی کی شرارتوں کی پاداش میں دعائے نبوی کی استجابت نے ابر رحمت کا سایہ ان کے سر سے اٹھا لیا اور مکہ میں اس قدر سخت قحط پڑا کہ لوگ ہڈی اور مردار کھانے لگے ابوسفیان نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ "محمد! تمہاری قوم ہلاک ہو رہی ہے خدا سے دعا کرو کہ یہ مصیبت دور ہو" آپ ﷺ نے بلا عذر فوراً دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے اور خدا نے اس مصیبت سے ان کو نجات دی۔[3]

جنگ احد میں دشمنوں نے آپ ﷺ پر پتھر پھینکے تیر برسائے تلواریں چلائیں، دندان مبارک کو شہید کیا، جبین اقدس کو خون آلودہ کیا لیکن ان حملوں کا وار آپ ﷺ نے جس سپر پر روکا وہ صرف یہ دعا تھی۔

﴿اللھم اھد قومی فانھم لا یعلمون﴾

خدایا! ان کو معاف کر کہ یہ نادان ہیں۔

وہ طائف جس نے دعوت اسلام کا جواب استہزا اور تمسخر سے دیا تھا، وہ طائف جس نے داعی اسلام کو اپنی پناہ میں لینے سے انکار کر دیا تھا، وہ طائف جس نے پائے مبارک کو لہولہان کیا تھا ان کی نسبت فرشتہ غیب پوچھتا ہے کہ حکم ہو تو ان پر پہاڑ الٹ دیا جائے، جواب ملتا ہے کہ "شاید ان کی نسل سے کوئی خدا کا پرستار پیدا ہو"۔[4] اسی بار دیگر کے بعد بھی طائف اسلام کی دعوت کا جواب تیر و تفنگ (منجنیق) سے دیتا ہے جاں نثاروں کی لاشوں پر لاشیں گر رہی ہیں، صحابہ عرض کرتے ہیں کہ "یا رسول اللہ! ان کے حق میں بددعا کیجئے"۔ آپ ﷺ دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتے ہیں لوگ سمجھتے ہیں کہ حضور ان کے حق میں بددعا فرمائیں گے لیکن زبان مبارک سے یہ الفاظ نکلتے ہیں "خداوندا! ثقیف (اہل طائف) کو اسلام نصیب کر اور وہ خود ان کو مدینہ لا"۔ وہ تیر جو میدان جنگ میں نشانہ پر نہیں لگے تھے مدینہ کے صحن مسجد میں زبان مبارک سے نکل کر ٹھیک اپنے ہدف پر پہنچے یعنی اہل طائف مدینہ آ کر خاص مسجد نبوی میں جہاں وہ مہمان ٹھہرائے گئے تھے، مسلمان ہوئے۔[5]

دوس کا قبیلہ یمن میں رہتا تھا۔ طفیل بن عمرو دوسی اس قبیلہ کے رئیس تھے۔ وہ قدیم الاسلام تھے مدت تک وہ اپنے قبیلہ کو اسلام کی دعوت دیتے رہے لیکن وہ اپنے کفر پر اڑا رہا، آخر وہ خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور اپنے قبیلہ کی حالت عرض کر کے گزارش کی کہ ان کے حق میں بددعا فرمایئے لوگوں نے یہ سنا تو کہا کہ اب دوس کی بربادی میں کوئی شک

---

[1] صحیح بخاری مبعث النبی ﷺ۔
[2] مشکوۃ اخلاق النبی ﷺ بحوالہ صحیح مسلم۔
[3] صحیح بخاری تفسیر سورۂ دخان حصہ دوم۔
[4] صحیح بخاری۔
[5] [illegible]

ایک دفعہ آپ ﷺ کے پاس کہیں سے کپڑے آئے جن میں ایک سیاہ چادر بھی تھی جس میں دونوں طرف آنچل تھے آپ ﷺ نے حاضرین سے کہا یہ چادر کس کو دوں؟ لوگ چپ رہے آپ ﷺ نے فرمایا "ام خالد کو لاؤ" [1] وہ آئیں تو آپ ﷺ نے ان کو پہنایا اور دو دفعہ فرمایا "پہنو اور پرانی کرو" چادر میں جو بوٹے تھے آپ ﷺ ان کو دکھا دکھا کے فرماتے تھے "ام خالد دیکھو یہ سنہ ہے سنہ ہے" [2] اوپر گزر چکا ہے کہ ام خالد حبش میں پیدا ہوئی تھیں اور کئی سال تک وہیں رہی تھیں اس لیے ان سے حبشی زبان میں خطاب کیا۔

ایک صحابیؓ کا بیان ہے کہ بچپن میں انصار کے نخلستان میں چلا جاتا اور ڈھیلوں سے مار کر کھجوریں گراتا لوگ مجھ کو خدمت اقدس میں لے گئے آپ ﷺ نے پوچھا کہ تم ڈھیلے کیوں مارتے ہو میں نے کہا کھجوریں کھانے کے لئے ارشاد فرمایا کہ کھجوریں جو زمین پر گرتی ہیں ان کو اٹھا کر کھا لیا کرو ڈھیلے نہ مارو، یہ کہہ کر میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور دعا دی۔ [3]

ماں بچے کی محبت کے واقعات سے آپ ﷺ پر خاص اثر ہوتا تھا ایک دفعہ ایک نہایت غریب عورت حضرت عائشہؓ کے پاس آئی دو چھوٹی چھوٹی لڑکیاں بھی ساتھ تھیں اس وقت حضرت عائشہؓ کے پاس کچھ نہ تھا ایک کھجور زمین پر پڑی ہوئی تھی وہی اٹھا کر دیدی عورت نے کھجور کے دو ٹکڑے کئے اور دونوں میں برابر تقسیم کر دیا" آنحضرت ﷺ باہر سے تشریف لائے تو حضرت عائشہؓ نے یہ واقعہ سنایا ارشاد ہوا کہ "جس کو خدا اولاد کی محبت میں ڈالے اور وہ ان کا حق بجا لائے وہ دوزخ سے محفوظ رہے گا"۔ [4] حضرت قیسؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ فرماتے تھے کہ میں نماز شروع کرتا ہوں اور ارادہ ہوتا ہے کہ دیر تک ختم کروں لیکن دفعتاً صف سے کسی بچے کے رونے کی آواز آتی ہے تو مختصر کر دیتا ہوں کہ اس کی ماں کو تکلیف ہوتی ہوگی۔ [5]

یہ محبت اور شفقت مسلمان بچوں تک محدود نہ تھی بلکہ مشرکین کے بچوں پر بھی اسی طرح لطف فرماتے تھے ایک دفعہ ایک غزوہ میں چند بچے جھپٹ میں آ کر مارے گئے آپ ﷺ کو خبر ہوئی تو نہایت آزردہ ہوئے ایک صاحب نے کہا یا رسول اللہ مشرکین کے بچے تھے آپ ﷺ نے فرمایا "مشرکین کے بچے بھی تم سے بہتر ہیں خبردار! بچوں کو قتل نہ کرو خبردار! بچوں کو قتل نہ کرو ہر جان خدا ہی کی فطرت پر پیدا ہوتی ہے"۔ [6]

معمول تھا کہ جب فصل کا نیا میوہ کوئی خدمت اقدس میں پیش کرتا تو حاضرین میں جو سب سے زیادہ کم عمر بچہ ہوتا اس کو عنایت فرماتے۔ [7] بچوں کو چومتے اور ان کو پیار کرتے تھے ایک دفعہ آپ ﷺ کسی طرح بچوں کو پیار کر

---

[1] اصابہ میں ہے کہ وہ اس قدر چھوٹی تھیں کہ لوگ ان کو گود میں اٹھا کر لائے (اصابہ ترجمہ ام خالد)

[2] بخاری کتاب اللباس، سنہ حبشی میں حسن کو کہتے ہیں۔

[3] ابوداؤد کتاب الجہاد۔

[4] بخاری صفحہ ۸۸۶۔

[5] بخاری کتاب الصلوٰۃ۔

[6] مسند ابن حنبل جلد ۳ صفحہ ۴۳۵۔

[7] معجم صغیر طبرانی باب محمد ﷺ

دیکھا کہ ایک بدوی آیا، اس نے کہا: "تم لوگ بچوں کو پیار کرتے ہو، میرے دس بچے ہیں مگر اب تک میں نے کسی کو پیار نہیں کیا۔" آپ ﷺ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ اگر تمہارے دل سے محبت کو چھین لے تو میں کیا کروں۔" [۱]

جابر بن سمرہؓ صحابی تھے وہ اپنے بچپن کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ میں نے آنحضرت ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی نماز سے فارغ ہو کر آپ ﷺ اپنے گھر کی طرف چلے میں بھی ساتھ ہو لیا کہ ادھر سے چند لڑکے نکل آئے آپ ﷺ نے سب کو پیار کیا اور مجھے بھی پیار کیا۔ [۲]

ہجرت کے موقع پر جب مدینہ میں آپ ﷺ کا داخلہ ہو رہا تھا انصار کی چھوٹی چھوٹی لڑکیاں خوشی سے دروازوں سے نکل نکل کر گیت گا رہی تھیں جب آپ ﷺ کا ادھر گذر ہوا تو فرمایا: "اے لڑکیو! تم مجھے پیار کرتی ہو؟" سب نے کہا: "ہاں یارسول اللہ" فرمایا: "میں بھی تمہیں پیار کرتا ہوں"۔ [۳]

حضرت عائشہؓ کمسنی میں بیاہ کر آئی تھیں محلہ کی لڑکیوں کے ساتھ وہ کھیلا کرتی تھیں آپ ﷺ جب گھر میں تشریف لاتے تو لڑکیاں آپ ﷺ کا لحاظ کر کے ادھر ادھر چھپ جاتیں آپ ﷺ تسکین دیتے اور کھیلنے کو کہتے۔ [۴]

غلاموں پر شفقت:

آنحضرت ﷺ غلاموں پر خصوصیت کے ساتھ شفقت فرماتے تھے فرمایا کرتے تھے کہ "یہ تمہارے بھائی ہیں جو خود کھاتے ہو وہ ان کو کھلاؤ اور جو خود پہنتے ہو وہ ان کو پہناؤ۔" آنحضرت ﷺ کی ملکیت میں جو غلام آتے ان کو آپ ﷺ ہمیشہ آزاد فرما دیتے تھے لیکن وہ حضور کے احسان و کرم کی زنجیر سے آزاد نہیں ہو سکتے تھے۔ ماں باپ قبیلہ خاندان کو چھوڑ کر عمر بھر آپ ﷺ کی غلامی کو شرف جانتے تھے زید بن حارثہ غلام تھے آنحضرت ﷺ نے ان کو آزاد کر دیا ان کے باپ ان کو لینے آئے لیکن وہ اس آستانہ رحمت پر باپ کے ظل عاطفت کو ترجیح نہ دے سکے اور اپنے جانے سے صاف انکار کر دیا زید کے بیٹے اسامہ سے آپ ﷺ اس قدر محبت کرتے تھے کہ آپ فرمایا کرتے تھے کہ اگر اسامہ لڑکی ہوتی تو میں اس کو زیور پہناتا خود اپنے دست مبارک سے ان کی ناک صاف کرتے تھے۔

غلاموں کو غلام اور لونڈی کہنا "غلام" کا نام کر پکارنا عرب میں عام تھا آپ ﷺ کو ذات محسوس ہوتی تھی۔ آنحضرت ﷺ کو ان کی یہ تکلیف بھی گوارا نہیں تھی فرمایا کوئی "میرا غلام" "میری لونڈی" نہ کہے "میرا بچہ" "میری بچی" کہے اور غلام بھی اپنے آقا کو خداوند نہیں "خداوند اللہ ہے" نہ کہیں۔ آنحضرت ﷺ کو غلاموں پر شفقت اتنی ملحوظ تھی کہ مرض الموت میں سب سے آخری یہ وصیت فرمائی کہ "غلاموں کے معاملہ میں خدا سے ڈرا کرو"۔

حضرت ابوذرؓ بہت قدیم الاسلام صحابی تھے آنحضرت ﷺ ان کی راست گوئی کی مدح فرماتے تھے ایک

---

۱ صحیح بخاری و مسلم کتاب الادب۔

۲ صحیح مسلم باب طیب رائحۃ النبی ﷺ۔

۳ سیرت جلد اول ہجرت۔

۴ ابوداؤد کتاب الادب باب اللعب۔

ایک بار قرابت کی بہت سی بیبیاں جمع تھیں، آنحضرت ﷺ سے بڑھ بڑھ کر باتیں کر رہی تھیں، حضرت عمرؓ آ گئے تو سب اٹھ کر چل دیں، آنحضرت ﷺ ہنس پڑے۔ حضرت عمرؓ نے کہا خدا آپ کو خنداں رکھے کیوں ہنسے؟ فرمایا مجھے ان عورتوں پر تعجب ہوا کہ تمہاری آواز سنتے ہی سب آڑ میں چھپ گئیں۔ حضرت عمرؓ نے ان کی طرف مخاطب ہو کر کہا "اے اپنی جان کی دشمنو! مجھ سے ڈرتی ہو اور آنحضرت ﷺ سے نہیں ڈرتیں"۔ سب نے کہا "تم رسول اللہ ﷺ کی نسبت سخت مزاج ہو"۔[1]

ایک دفعہ حضرت عائشہؓ کے گھر میں آپ ﷺ منہ ڈھانک کر سوئے ہوئے تھے عید کا دن تھا چھوکریاں گا رہی تھیں۔ حضرت ابوبکرؓ آئے تو ان کو ڈانٹا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "ان کو گانے دو یہ ان کی عید کا دن ہے"۔[2]

عورتیں عموماً نہایت دلیری کے ساتھ آپ ﷺ سے بے تکلف مسائل دریافت کرتی تھیں اور صحابہ کو ان کی اس جرأت پر حیرت ہوتی تھی لیکن آپ ﷺ کسی قسم کی ناگواری نہیں ظاہر فرماتے تھے۔ چونکہ عورتیں عموماً نازک طبع اور ضعیف القلب ہوتی ہیں ان کی خاطرداری کا نہایت خیال رکھتے تھے۔ انجشہ نام ایک حبشی غلام حدی خواں تھے جو اونٹ کے آگے حدی پڑھتے جاتے تھے۔ ایک دفعہ سفر میں ازواج مطہرات ساتھ تھیں۔ انجشہ حدی پڑھتے جاتے تھے، اونٹ زیادہ تیز چلنے لگے تو آپ ﷺ نے فرمایا "انجشہ! دیکھنا شیشے (عورتیں) ٹوٹنے نہ پائیں"۔[3]

حیوانات پر رحم:

حیوانات پر نہایت رحم فرماتے تھے۔ ان بے زبانوں پر جو ظلم مدت سے عرب میں چلے آتے تھے موقوف کرا دیئے۔ اونٹ کے گلے میں قلادہ لٹکانے کا عام معمول تھا اس کو روک دیا۔ زندہ جانور کے بدن سے گوشت کا ٹکڑا کاٹ لیتے تھے اور اس کو پکا کر کھاتے تھے اس کو منع کر دیا۔ جانور کی دم اور ایال کاٹنے سے بھی منع کیا اور فرمایا کہ "دم ان کا مورچھل ہے اور ایال ان کا لحاف ہے"۔ جانوروں کو دیر تک سواری میں باندھ کر کھڑا رکھنے کی بھی ممانعت کی اور فرمایا کہ "جانوروں کی پیٹھوں کو اپنی نشست گاہ اور کرسی نہ بناؤ"۔ اسی طرح جانوروں کو باہم لڑانا بھی ناجائز بتایا۔ ایک بے رحمی کا دستور یہ تھا کہ کسی جانور کو باندھ کر اس کا نشانہ بناتے تھے اور مشق تیر اندازی کرتے تھے۔ اس ظلم کی بھی قطعاً ممانعت کر دی۔

ایک دفعہ ایک گدھا سامنے سے گزرا جس کا چہرہ داغا گیا تھا فرمایا کہ "جس نے اس کا چہرہ داغا ہے اس پر خدا کی لعنت ہے"۔ علامت یا تشخص وغیرہ ضرورتوں کی وجہ سے اونٹوں اور بکریوں کو داغنا پڑتا تھا ایسی حالت میں آپ ﷺ اس عضو کو داغتے جو زیادہ نازک نہیں ہوتے۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ میں ایک دفعہ بکریوں کے ریوڑ میں گیا تو دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ بکریوں کے کان داغ رہے ہیں۔[4]

۱۔ صحیح بخاری مناقب عمر بن خطابؓ

۲۔ مسلم کتاب العیدین

۳۔ صحیح مسلم باب فضائل والحدیث

۴۔ یہ حدیثیں ترمذی، ابوداؤد وغیرہ میں مذکور ہیں۔

غزوۂ احد کے بعد جب آپ ﷺ مدینہ میں تشریف لائے تو گھر گھر شہیدوں کا ماتم برپا تھا۔ مستورات اپنے اپنے شہیدوں پر نوحہ کر رہی تھیں۔ یہ دیکھ کر آپ ﷺ کا دل بھر آیا اور فرمایا "حمزہ (عم رسول اللہ ﷺ) کا کوئی نوحہ خواں نہیں"۔ [1]

ایک بار ایک صحابیؓ جاہلیت کا اپنا ایک قصہ بیان کر رہے تھے کہ میری ایک چھوٹی لڑکی تھی۔ عرب میں لڑکیوں کے مار ڈالنے کا کہیں کہیں دستور تھا۔ میں نے بھی اپنی لڑکی کو زندہ زمین میں گاڑ دینا چاہا۔ وہ ابا ابا کہہ کر پکار رہی تھی اور میں اس پر مٹی کے ڈھیلے ڈال رہا تھا۔ اس بے دردی کو سن کر آنحضرت ﷺ کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "یہ قصہ پھر دہراؤ"۔ ان صحابیؓ نے اس درد ناک منظر کو دوبارہ بیان کیا۔ آپ ﷺ بے اختیار رو دیئے یہاں تک کہ روتے روتے محاسن مبارک تر ہو گئے۔ [2]

حضرت عباسؓ بدر میں گرفتار ہو کر آئے تو لوگوں نے ان کے ہاتھ پاؤں بہت جکڑ کر باندھ دیئے تھے اور وہ درد سے کراہ رہے تھے۔ ان کے کراہنے کی آواز گوش مبارک میں بار بار آ رہی تھی لیکن اس خیال سے ان کے ہاتھ نہیں کھلواتے تھے کہ لوگ کہیں گے کہ اپنے عزیز کے ساتھ غیر مساویانہ برتاؤ کیا۔ تاہم نیند نہیں آتی تھی۔ آپ ﷺ بے چین ہو ہو کر کروٹیں بدل رہے تھے۔ لوگوں نے بے قراری کا سبب سمجھ کر بندشیں ڈھیلی کر دیں۔ حضرت عباسؓ کی کرب اور بے چینی رفع ہوئی تو آپ ﷺ نے استراحت فرمایا۔

مصعب بن عمیرؓ ایک صحابی تھے جو اسلام سے پہلے بہت ناز و نعمت میں پلے تھے۔ ان کے والدین قیمتی سے قیمتی لباس ان کو پہناتے تھے۔ خدا نے ان کو اسلام کی توفیق عطا فرمائی اور وہ مسلمان ہو گئے۔ یہ دیکھ کر کہ لڑکے نے اپنے آبائی مذہب کو ترک کر دیا، والدین کی محبت دفعتاً عداوت میں بدل گئی۔ ایک دفعہ وہ آنحضرت ﷺ کی خدمت مبارک میں اس حالت میں آئے کہ وہ جسم جو حریر و قاقم میں ملبوس رہتا تھا اس پر پیوند سے ایک کپڑا سالم نہ تھا۔ یہ پر اثر منظر دیکھ کر آپ ﷺ آبدیدہ ہو گئے۔ [3]

عیادت و تعزیت و غمخواری و عزا:

بیماروں کی عیادت میں دوست دشمن مومن کافر کسی کی تخصیص نہ تھی۔ سنن نسائی باب التکبیر علی الجنازہ میں ہے کان النبی ﷺ احسن شیٔ عیادۃ لمریض "آنحضرت ﷺ بیمار کی عیادت کا بہت اچھی طرح خیال رکھا کرتے تھے"۔ بخاری و ابوداؤد وغیرہ میں روایت ہے کہ ایک یہودی غلام مرض الموت میں بیمار ہوا تو آپ ﷺ عیادت کو تشریف لے گئے۔ [4]

---

[1] سیرۃ جلد اول غزوۂ احد۔

[2] مسند دارمی صفحہ ۱۔

[3] ترغیب و ترہیب جلد دوم صفحہ ۲۲۳ بحوالہ ترمذی و مسند ابو یعلی۔

[4] صحیح بخاری باب عیادۃ المشرک۔

عبداللہؓ بن ثابت جب بیمار ہوئے اور آپ ﷺ عیادت کو گئے تو ان پر غشی طاری تھی' آواز دی وہ باخبر نہ ہوئے۔ فرمایا "افسوس ابوالربیع تم پر ہمارا زور اب نہیں چلتا" یہ سن کر عورتیں بے اختیار چیخ اٹھیں اور رونے لگیں' لوگوں نے روکا' آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا "اس وقت رونے دو' مرنے کے بعد البتہ رونا نہیں چاہیے" عبداللہؓ بن ثابت کی لڑکی نے کہا "مجھ کو ان کی شہادت کی امید تھی کیونکہ جہاد کے سب سامان تیار کر لیے تھے" آپ ﷺ نے فرمایا "ان کو نیت کا ثواب مل چکا"۔[1]

حضرت جابرؓ بیمار ہوئے تو اگرچہ ان کا گھر فاصلہ پر تھا' پیادہ پا ان کی عیادت کو جایا کرتے تھے۔[2] ایک دفعہ وہ بیمار ہوئے تو آپ ﷺ حضرت ابوبکرؓ کو ساتھ لے کر پیدل ان کی عیادت کو گئے' ان پر غشی طاری تھی' پانی منگوا کر وضو کیا اور بچے ہوئے پانی کو ان کے منہ پر چھڑکا۔ جابرؓ ہوش میں آ گئے اور عرض کی یا رسول اللہ اپنا ترکہ کس کو دوں؟ اس پر یہ آیت اتری ﴿يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ﴾[3]

ایک صاحب بیمار ہوئے آپ ﷺ چند دفعہ ان کی عیادت کو گئے جب انہوں نے انتقال کیا تو لوگوں نے اس خیال سے کہ اندھیری رات ہے آپ ﷺ کو تکلیف ہو گی' خبر نہ کی اور دفن کر دیا۔ صبح کو معلوم ہوا تو آپ ﷺ نے شکایت کی اور قبر پر جا کر نماز جنازہ پڑھی۔[4]

عبداللہ بن عمروؓ نے غزوہ احد میں شہادت پائی تھی اور کافروں نے ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالے تھے ان کی لاش آنحضرت ﷺ کے سامنے لا کر رکھی گئی اور اس پر چادر ڈال دی گئی ان کے صاحبزادے (جابر) آئے اور جوش محبت میں چاہا کہ کپڑا اٹھا کر دیکھیں' حاضرین نے روکا انہوں نے دوبارہ ہاتھ بڑھایا' لوگوں نے پھر روک دیا' آنحضرت ﷺ نے درد پدری کے خیال سے حکم دیا کہ چادر اٹھا دی جائے' چادر کا اٹھانا تھا کہ عبداللہ کی بہن بے اختیار چلا اٹھیں آنحضرت ﷺ نے فرمایا "رونے کی بات نہیں فرشتے ان کو اپنے پروں کے سایہ میں لے گئے"۔[5]

ایک دفعہ حضرت سعدؓ بن عبادہ بیمار ہوئے آپ ﷺ عیادت کو تشریف لے گئے ان کو دیکھ کر آپ ﷺ پر رقت طاری ہوئی اور آنکھوں سے آنسو نکل آئے آپ ﷺ کو روتا دیکھ کر سب رو پڑے۔[6]

ایک حبشی مسجد میں جھاڑو دیا کرتا تھا[7] مر گیا تو لوگوں نے آپ ﷺ کو خبر نہ کی' ایک دن آپ ﷺ نے اس

---

[1] ابوداؤد باب الجنائز۔

[2] ایضاً۔

[3] صحیح بخاری ج ۲ ص ۶۵۵ تفسیر آیت مذکور۔

[4] بخاری کتاب الجنائز۔

[5] بخاری کتاب الجنائز صفحہ ۱۶۶۔

[6] بخاری کتاب الجنائز صفحہ ۱۷۴۔

[7] بخاری باب الصلوۃ علی القبر میں ابوہریرہؓ کی روایت کے راوی نے شک کیا ہے کہ یہ مرد تھا یا عورت لیکن دوسری روایتوں میں اس کا عورت ہونا بہ تحقیق ذکر ہے۔ ہم نے بھی اس کو مانا ہے۔

کا حال دریافت فرمایا، لوگوں نے کہا وہ انتقال کر گیا، ارشاد ہوا تم نے مجھ کو خبر نہ کی، لوگوں نے اس کی تحقیر کی (یعنی وہ اس قابل نہ تھا کہ آپ ﷺ کو اس کے مرنے کی خبر کی جاتی) آپ ﷺ نے لوگوں سے اس کی قبر دریافت کی اور جا کر جنازہ کی نماز پڑھی۔ [۱]

جنازہ جاتا تو آپ ﷺ کھڑے ہو جاتے۔ بخاری میں روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جنازہ جاتا ہو تو اس کے ساتھ جاؤ ورنہ کم از کم کھڑے ہو جاؤ اور اس وقت تک کھڑے رہو کہ سامنے سے نکل جائے۔ [۲] اگرچہ آپ ﷺ نہایت رقیق القلب اور حساس الطبع تھے، خصوصاً اعزہ کی وفات کا آپ ﷺ کو سخت صدمہ ہوتا تھا، تاہم نوحہ اور ماتم کو نہایت ناپسند فرماتے تھے۔ حضرت جعفرؓ (حضرت علیؓ کے بھائی تھے) سے آپ ﷺ کو نہایت محبت تھی، جب ان کی شہادت کی خبر آئی تو آپ ﷺ مجلس ماتم میں بیٹھے، اسی حالت میں کسی نے آ کر کہا کہ جعفر کی عورتیں رو رہی ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ جا کر منع کر دو، وہ گئے اور واپس آ کر کہا کہ میں نے منع کیا لیکن وہ باز نہیں آتیں، آپ ﷺ نے دوبارہ منع کرا بھیجا، پھر بھی وہ باز نہ آئیں، تیسری بار منع کرنے پر بھی جب وہ باز نہ آئیں تو فرمایا کہ جا کر ان کے منہ میں خاک ڈال دو۔ [۳]

لطف طبع:

کبھی کبھی ظرافت کی باتیں فرماتے، ایک دفعہ حضرت انسؓ کو پکارا تو فرمایا "او دو کان والے"۔ [۴] اس میں یہ نکتہ بھی تھا کہ حضرت انسؓ نہایت اطاعت شعار تھے اور ہر وقت آنحضرت ﷺ کے ارشاد پر کان لگائے رکھتے تھے۔ حضرت انسؓ کے چھوٹے بھائی کا نام ابوعمیرؓ تھا، وہ کمسن تھے اور ایک ممولا پال رکھا تھا، اتفاق سے وہ مر گیا، ابوعمیرؓ کو بہت رنج ہوا، آپ ﷺ نے ان کو غمزدہ دیکھا تو فرمایا یا ابا عمیر ما فعل النغیر [۵] یعنی ابوعمیر! تمہارے ممولے نے کیا کیا؟

ایک شخص نے خدمت اقدس میں عرض کی کہ مجھ کو کوئی سواری عنایت ہو، ارشاد ہوا کہ "میں تم کو اونٹنی کا بچہ دوں گا" انہوں نے کہا "یا رسول اللہ میں اونٹنی کا بچہ لے کر کیا کروں گا" آپ ﷺ نے فرمایا کہ "کوئی اونٹ ایسا بھی ہوتا ہے کہ جو اونٹنی کا بچہ نہ ہو"۔

ایک بڑھیا خدمت اقدس میں آئی کہ حضور ﷺ میرے لیے دعا فرمائیں کہ مجھ کو جنت نصیب ہو۔ آپ ﷺ نے فرمایا بوڑھیاں جنت میں نہ جائیں گی، اس کو بہت صدمہ ہوا اور روتی ہوئی واپس چلی، آپ ﷺ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ اسے کہہ دو کہ بوڑھیاں جنت میں جائیں گی لیکن جوان ہو کر جائیں گی۔ [۶]

ایک بدوی صحابیؓ تھے جن کا نام زاہرؓ تھا، وہ دیہات کی چیزیں آپ ﷺ کی خدمت میں ہدیۃً بھیجا کرتے تھے

---

۱ بخاری صفحہ ۱۷۸ کتاب الجنائز۔

۲ بخاری صفحہ ۱۷۵ جلد اول کتاب الجنائز۔

۳ بخاری کتاب الجنائز باب من جلس عند المصیبۃ۔

۴ شمائل ترمذی۔

۵ صحیح بخاری۔

۶ شمائل ترمذی۔

ایک دفعہ وہ شہر میں آئے گاؤں سے جو چیزیں لائے تھے ان کو بازار میں فروخت کر رہے تھے اتفاقاً آپ ﷺ ادھر سے گزرے تو ان کے پیچھے جا کر ان کو گود میں دبا لیا انہوں نے کہا کون ہے چھوڑ دو مڑ کر دیکھا تو سرور عالم ﷺ تھے پھر پیٹھ اور بھی آنحضرت ﷺ کے سینہ سے لپٹا دی آپ ﷺ نے فرمایا کوئی اس غلام کو خریدتا ہے؟ وہ بولے کہ یا رسول اللہ مجھ جیسے غلام کو جو شخص خریدے گا نقصان اٹھائے گا آپ ﷺ نے فرمایا کہ لیکن خدا کے نزدیک تمہارے دام بہت ہیں۔ [۱]

ایک شخص نے آ کر شکایت کی کہ میرے بھائی کے شکم میں گرانی ہے۔ فرمایا شہد پلاؤ وہ دوبارہ آئے کہ شہد پلایا لیکن شکایت اب بھی باقی ہے آپ ﷺ نے پھر شہد پلانے کی ہدایت کی۔ سہ بارہ آئے پھر وہی جواب ملا چوتھی دفعہ آئے تو ارشاد فرمایا کہ خدا سچا ہے (قرآن مجید میں ہے کہ شہد میں شفا ہے) لیکن تمہارے بھائی کا پیٹ جھوٹا ہے جا کر شہد پلاؤ اب کی بار پلایا تو شفا ہو گئی۔ [۲] معدہ میں مادہ فاسد کثرت سے موجود تھا جب پورا نکل گیا تو گرانی جاتی رہی۔

اولاد سے محبت:

اولاد سے نہایت محبت تھی معمول تھا جب کبھی سفر فرماتے تو سب سے آخر میں حضرت فاطمہؓ کے پاس جاتے اور سفر سے واپس آتے تو جو شخص سب سے پہلے باریاب خدمت ہوتا وہ بھی حضرت فاطمہؓ ہی ہوتیں۔ ایک دفعہ کسی غزوہ میں گئے اس اثنا میں حضرت فاطمہؓ نے دونوں صاحبزادوں (حسنینؓ) کے لیے چاندی کے کنگن بنائے اور دروازہ پر پردے لٹکائے آنحضرت ﷺ واپس تشریف لائے تو خلاف معمول حضرت فاطمہؓ کے گھر نہیں گئے وہ سمجھ گئیں فوراً پردوں کو چاک کر ڈالا اور صاحبزادوں کے ہاتھ سے کنگن اتار لیے صاحبزادے روتے ہوئے خدمت اقدس میں حاضر ہوئے آپ ﷺ نے کنگن لے کر ارشاد کیا: بیچ کر ان کے بدلے ہاتھی دانت کے کنگن لا دو۔

حضرت فاطمہؓ جب آپ ﷺ کی خدمت میں تشریف لاتیں تو آپ ﷺ کھڑے ہو جاتے ان کی پیشانی چومتے اور اپنی نشست گاہ سے ہٹ کر اپنی جگہ بٹھاتے۔

ابوقتادہؓ کا بیان ہے کہ ہم لوگ مسجد نبوی میں حاضر تھے کہ دفعتاً رسول اللہ ﷺ امامہ (آنحضرت ﷺ کی نواسی) کو کندھے پر چڑھائے ہوئے تشریف لائے اور اسی حالت میں نماز پڑھائی۔ جب رکوع میں جاتے تو ان کو اتار دیتے پھر کھڑے ہوتے تو چڑھا لیتے اسی طرح پوری نماز ادا کی۔ [۳]

حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ میں نے کسی کو اپنے خاندان سے اتنی محبت کرتے نہیں دیکھا جس قدر آپ ﷺ کرتے تھے۔ آپ ﷺ کے صاحبزادے حضرت ابراہیمؓ عوالی میں پرورش پاتے تھے جو مدینہ سے تین چار میل ہے آپ ان کے دیکھنے کے لیے مدینہ سے پیادہ پا جاتے گھر میں دھواں ہوتا رہتا تاہم گھر میں جاتے۔ بچے کو انا کے ہاتھ سے لے لیتے اور منہ چومتے پھر واپس چلے آتے۔ [۴]

---

۱ شمائل ترمذی۔
۲ بخاری صفحہ ۸۴۹ باب الدواء بالعسل۔
۳ نسائی صفحہ ۱۲۰ باب ادخال الصبیان فی المساجد صحیح بخاری میں بھی یہ حدیث مذکور ہے۔
۴ صحیح مسلم صفحہ ۲۹۴

ایک دفعہ اقرع بن حابس عرب کے ایک رئیس خدمت اقدس میں آئے، آپ ﷺ حضرت امام حسینؓ کا منہ چوم رہے تھے، عرض کی کہ "میرے دس بچے ہیں میں نے کبھی کسی کو بوسہ نہیں دیا" ارشاد فرمایا کہ "جو اوروں پر رحم نہیں کرتا اس پر بھی رحم نہیں کیا جاتا" (یعنی خدا اس پر رحم نہیں کرتا)

حسنینؓ سے بے انتہا محبت تھی فرماتے تھے کہ یہ میرے گلدستے ہیں۔ حضرت فاطمہؓ کے گھر تشریف لے جاتے تو فرماتے کہ میرے بچوں کو لانا، وہ صاحبزادوں کو لاتیں آپ ﷺ ان کو سونگھتے اور سینہ سے لپٹاتے۔

ایک دفعہ مسجد میں خطبہ فرما رہے تھے اتفاق سے حسنینؓ سرخ کرتے پہنے ہوئے آئے، کمسنی کی وجہ سے ہر قدم پر لڑکھڑاتے جاتے تھے آپ ﷺ خطبہ ترک کر کے منبر سے اتر کر گود میں اٹھا لیا اور اپنے سامنے بٹھا لیا پھر فرمایا خدا نے سچ کہا ہے ﴿إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ﴾ فرمایا کرتے تھے حسینؓ میرا ہے اور میں حسینؓ کا ہوں، خدا اس سے محبت رکھے جو حسینؓ سے محبت رکھتا ہے۔

ایک دفعہ امام حسنؓ یا حسینؓ دوش مبارک پر سوار تھے کسی نے کہا کیا سواری ہاتھ آئی ہے آپ ﷺ نے فرمایا اور سوار بھی کیسا ہے؟[1]

ایک دفعہ امام حسنؓ یا حسینؓ (راوی کو بہ تعیین یاد نہیں رہا) آپ ﷺ کے قدم پر قدم رکھ کر کھڑے تھے آپ ﷺ نے فرمایا اوپر چڑھ آؤ، انہوں نے آپ ﷺ کے سینہ پر قدم رکھ دیئے آپ ﷺ نے منہ چوم کر فرمایا "اے خدا! میں اس سے محبت رکھتا ہوں تو بھی اس سے محبت رکھ"[2]

ایک دفعہ آپ ﷺ کہیں دعوت میں جا رہے تھے امام حسینؓ راہ میں کھیل رہے تھے آپ ﷺ نے آگے بڑھ کر ہاتھ پھیلا دیئے وہ ہنستے ہوئے پاس آ آ کر نکل جاتے تھے بالآخر آپ ﷺ نے ان کو پکڑ لیا ایک ہاتھ ان کی ٹھوڑی پر اور ایک سر پر رکھ کر سینہ سے لپٹا لیا، پھر فرمایا کہ حسین میرا ہے اور میں اس کا ہوں۔[3]

اکثر امام حسنؓ کو گود میں لیتے اور ان کے منہ میں منہ ڈالتے اور فرماتے کہ خدایا میں اس کو چاہتا ہوں اور اس کو بھی چاہتا ہوں جو اس کو چاہے۔

آپ ﷺ کے داماد (حضرت زینبؓ کے شوہر) جب بدر سے قید ہو کر آئے تو فدیہ کی رقم ادا کر سکے تو گھر کہلا بھیجا، حضرت زینبؓ نے اپنے گلے کا ہار بھیج دیا، یہ وہ ہار تھا کہ حضرت زینبؓ کے جہیز میں حضرت خدیجہؓ نے ان کو دیا تھا، آنحضرت ﷺ نے ہار دیکھا تو بے تاب ہو گئے اور آنکھوں سے آنسو نکل آئے پھر صحابہؓ سے فرمایا کہ اگر تمہاری مرضی ہو تو یہ ہار زینبؓ کو بھیج دو۔ سب نے بسر و چشم منظور کیا۔

حضرت زینبؓ کی کمسن صاحبزادی کا نام امامہ تھا، ان سے آپ ﷺ کو بہت محبت تھی آپ ﷺ نماز

---

1. یہ تمام روایتیں شمائل ترمذی میں مذکور ہیں، آخر حدیث کے ایک راوی کی نسبت ترمذی نے لکھا ہے کہ بعض اہل علم نے ان کو ضعیف الحافظہ کہا ہے
2. ادب المفرد بخاری صفحہ ۵۸
3. ادب المفرد بخاری صفحہ ۵۴

جاتے ہوئے بھی ان کو ساتھ رکھتے جب آپ ﷺ نماز پڑھتے تو وہ دوش مبارک پر سوار ہو جاتیں رکوع کے وقت آپ ﷺ ان کو کاندھے سے اتار دیتے پھر کھڑے ہوتے تو وہ پھر سوار ہو جاتیں۔ روایتوں کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ خود ان کو کاندھوں پر بٹھا لیتے اور اتار دیتے تھے لیکن ابن القیم نے لکھا ہے کہ یہ عمل کثیر ہے وہ خود سوار ہو جاتی ہوں گی اور آپ منع نہ فرماتے ہوں گے۔

آپ ﷺ کی ایک نواسی حالت نزع میں تھیں صاحبزادی نے بلا بھیجا آپ ﷺ تشریف لے گئے تو لڑکی اسی حالت میں آغوش مبارک میں رکھ دی گئی آپ ﷺ نے اس کی حالت دیکھی تو آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے حضرت سعدؓ نے کہا یا رسول اللہ آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا یہ رحم ہے جس کو خدا نے اپنے بندوں کے دلوں میں ڈال دیا ہے۔ [1]

حضرت ابراہیمؑ کی وفات میں بھی آپ ﷺ نے آبدیدہ ہو کر فرمایا تھا کہ "آنکھیں آنسو بہا رہی ہیں دل غمزدہ ہو رہا ہے لیکن منہ سے ہم وہی باتیں کہیں گے جس کو خدا پسند کرتا ہے" [2] لیکن یہ محبت صرف اپنے ہی آل واولاد تک کے ساتھ مخصوص نہ تھی بلکہ عام بچوں سے آپ ﷺ کو انس تھا۔

---

۱ بخاری کتاب الجنائز ص ۱۷۱۔
۲ بخاری کتاب الجنائز ص ۱۷۴۔

ازواج مطہراتؓ کے ساتھ معاشرت

حضرت خدیجہؓ

سلسلہ نسب یہ ہے خدیجہ بنت خویلد بن اسد بن عبدالعزیٰ بن قصی۔ قصی پر پہنچ کر ان کا خاندان رسول اللہ ﷺ کے خاندان سے مل جاتا ہے۔ آنحضرت ﷺ کی بعثت سے پہلے وہ طاہرہ کے لقب سے مشہور تھیں۔ ان کی والدہ فاطمہ بنت زائدہ تھیں۔ ان کے والد اپنے قبیلہ میں ممتاز تھے۔ مکہ میں آ کر سکونت اختیار کی اور عبدالدار کے حلیف بنے۔[1] عامر بن لوی کے خاندان میں فاطمہ بنت زائدہ سے نکاح کیا۔ ان کے بطن سے حضرت خدیجہؓ پیدا ہوئیں۔ ان کی پہلی شادی ابو ہالہ بن زرارہ تمیمی سے ہوئی۔ ان سے دو لڑکے پیدا ہوئے ایک کا نام ہند تھا[2] اور دوسرے کا حارث۔ ابو ہالہ کے انتقال کے بعد عتیق بن عائذ مخزومی کے عقد نکاح میں آئیں۔ ان سے ایک لڑکی پیدا ہوئی اس کا نام بھی ہند تھا۔ اسی بنا پر حضرت خدیجہؓ ام ہند کے نام سے پکاری جاتی تھیں۔ ہند نے اوائل اسلام قبول کیا۔ آنحضرت ﷺ کا مفصل حلیہ انہی کی روایت سے منقول ہے۔ نہایت فصیح و بلیغ تھے۔ حضرت علیؓ کے ساتھ جنگ جمل میں شریک تھے اور شہید ہوئے۔[3]

عتیق کے انتقال کے بعد حضرت خدیجہؓ رسول اللہ ﷺ کے عقد نکاح میں آئیں جس کے مفصل حالات گزر چکے ہیں۔ آنحضرت ﷺ سے چھ اولادیں ہوئیں۔ دو صاحبزادے کہ وہ بچپن میں انتقال کر گئے اور چار صاحبزادیاں حضرت فاطمہ زہراؓ، حضرت زینبؓ، حضرت رقیہؓ، حضرت ام کلثومؓ۔ ان سب کے حالات آگے آئیں گے۔ حضرت خدیجہؓ کی ایک بہن ہالہ تھیں وہ اسلام لائیں اور حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد تک زندہ رہیں۔

حضرت خدیجہؓ سے آنحضرت ﷺ کو بے انتہا محبت تھی، وہ جب عقد نکاح میں آئیں تو ان کی عمر چالیس سال کی تھی اور آنحضرت ﷺ پچیس سال کے تھے۔ نکاح کے بعد وہ پچیس برس تک زندہ رہیں۔ ان کی زندگی تک آنحضرت ﷺ نے دوسری شادی نہیں کی۔ حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد آپ ﷺ کا معمول تھا کہ جب گھر میں کوئی جانور ذبح ہوتا تو آپ ﷺ ڈھونڈ ڈھونڈ کر حضرت خدیجہؓ کی ہم نشین عورتوں کے پاس گوشت بھیجتے تھے۔ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ گو میں نے خدیجہؓ کو نہیں دیکھا لیکن مجھ کو جس قدر ان پر رشک آتا تھا کسی اور پر نہیں آتا تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ آنحضرت ﷺ ہمیشہ ان کا ذکر کیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ میں نے اس پر آپ ﷺ کو رنجیدہ کیا لیکن آپ ﷺ نے فرمایا کہ "خدا نے مجھ کو ان کی محبت دی ہے۔"[4]

ایک دفعہ ان کے انتقال کے بعد ان کی بہن ہالہ آنحضرت ﷺ سے ملنے آئیں اور دستور کے موافق اندر آنے کی اجازت مانگی ان کی آواز حضرت خدیجہؓ سے ملتی تھی آپ ﷺ کے کانوں میں آواز پڑی تو حضرت خدیجہؓ

---

[1] طبقات ابن سعد ذکر خدیجہؓ کتاب النساء

[2] طبقات ابن سعد

[3] اصابہ ترجمہ ہند۔

[4] صحیح مسلم فضائل خدیجہؓ۔

یاد آ گئیں اور آپ ﷺ بے تاب ہو گئے اور فرمایا کہ "ہالہ ہوں گی" حضرت عائشہؓ بھی موجود تھیں ان کو نہایت رشک ہوا بولیں کہ "آپ ﷺ کیا ایک بڑھیا کو یاد کرتے ہیں جو مر چکیں اور خدا نے ان سے اچھی بیویاں دے دیں"۔ صحیح بخاری میں یہ روایت یہیں تک ہے لیکن استیعاب میں ہے کہ جواب میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "ہرگز نہیں جب لوگوں نے میری تکذیب کی تو انہوں نے تصدیق کی، جب لوگ کافر تھے تو وہ اسلام لائیں، جب میرا کوئی معین نہ تھا تو انہوں نے میری مدد کی"۔

حضرت سودہؓ بنت زمعہ

ازواج مطہرات میں یہ فضیلت صرف حضرت سودہؓ کو حاصل ہے کہ حضرت خدیجہؓ کے انتقال کے بعد سب سے پہلے وہی آنحضرت ﷺ کے عقد نکاح میں آئیں۔ وہ ابتدائے نبوت میں مشرف با اسلام ہو چکی تھیں اس بنا پر ان کو قدیم الاسلام ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ان کی شادی پہلے سکرانؓ بن عمرو سے ہوئی تھی، حضرت سودہؓ انہیں کے ساتھ اسلام لائیں اور انہی کے ساتھ حبشہ کی طرف ہجرت (ہجرت ثانیہ) کی، حبشہ سے مکہ واپس آ کر سکرانؓ نے چند دن کے بعد وفات پائی اور ایک لڑکا یادگار چھوڑا، جس کا نام عبدالرحمن تھا انہوں نے جنگ جلولاء میں شہادت حاصل کی۔

حضرت خدیجہؓ کے انتقال سے آنحضرت ﷺ نہایت پریشان و غمگین تھے یہ حالت دیکھ کر خولہؓ بنت حکیم نے عرض کی کہ آپ ﷺ کو ایک مونس و رفیق کی ضرورت ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا ہاں گھر بار بال بچوں کا انتظام سب خدیجہؓ کے متعلق تھا آپ ﷺ کے ایما سے وہ حضرت سودہؓ کے والد کے پاس گئیں اور جاہلیت کے طریقہ پر سلام کیا۔ انعم صباحا پھر نکاح کا پیغام سنایا انہوں نے کہا ہاں محمد شریف کفو ہیں لیکن سودہ سے بھی تو دریافت کرو غرض سب مراتب طے ہو گئے تو آنحضرت ﷺ خود تشریف لے گئے اور سودہؓ کے والد نے نکاح پڑھایا۔[1] چار سو درہم مہر قرار پایا، نکاح کے بعد عبداللہ بن زمعہ (حضرت سودہؓ کے بھائی) جو اس وقت کافر تھے آئے اور ان کو یہ حال معلوم ہوا تو سر پر خاک ڈال لی کہ کیا غضب ہو گیا چنانچہ اسلام لانے کے بعد اپنی اس حماقت شعاری پر ہمیشہ افسوس آتا تھا۔ حضرت عائشہؓ اور سودہؓ کا خطبہ اور نکاح چونکہ قریب قریب ایک ہی زمانہ میں ہوا اس لئے مورخین میں اختلاف ہے کہ کس کو تقدم حاصل ہے۔ ابن اسحاق کی روایت ہے کہ سودہؓ کو تقدم ہے، عبداللہ بن محمد بن عقیل کا قول ہے کہ وہ حضرت عائشہؓ کے بعد نکاح میں آئیں۔

شکل و شباہت:

حضرت سودہؓ بلند و بالا اور فربہ اندام تھیں اور اس وجہ سے تیزی کے ساتھ چل پھر نہیں سکتی تھیں، حجۃ الوداع میں جب مزدلفہ سے روانہ ہونے کا وقت آیا تو انہوں نے آنحضرت ﷺ سے اس بنا پر سب سے پہلے چلنے کی اجازت مانگی کہ ان کو بھیڑ بھاڑ میں چلنے سے تکلیف ہوگی۔

---

[1] طبقات میں ہے کہ رمضان ۱۰ نبوی میں ان کا نکاح ہوا زرقانی نے ۸ نبوی بھی لکھا ہے یہ اختلاف اس وجہ سے ہے کہ خود حضرت خدیجہؓ کی وفات کے سنہ میں اختلاف ہے

آیتِ حجاب سے پہلے عرب کے قدیم طرز پر ازواج مطہرات قضائے حاجت کے لیے صحرا کو جایا کرتی تھیں حضرت عمرؓ کو یہ ناگوار ہوتا تھا اس بنا پر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پردہ کی تحریک کرتے رہتے تھے لیکن ابھی ان کی منشا پوری نہیں ہوئی تھی کہ حضرت سودہؓ رات کے وقت قضائے حاجت کے لیے نکلیں چونکہ ان کا قد نمایاں تھا حضرت عمرؓ نے کہا سودہ! ہم نے تم کو پہچان لیا۔ اس واقعہ کے بعد آیت حجاب نازل ہوئی۔ [1]

اخلاق و عادات:

آنحضرت ﷺ کے اخلاق و عادات میں سخاوت و فیاضی ایک نمایاں وصف تھا اس بنا پر جس کو جس قدر آپ ﷺ سے تقرب حاصل تھا اسی قدر اس پر اس وصف خاص کا زیادہ اثر پڑتا تھا۔ ازواج مطہراتؓ کو آپ ﷺ کے اخلاق و عادات و فیض صحبت سے متمتع ہونے کا سب سے زیادہ موقع حاصل تھا اس لیے یہ وصف ان میں نمایاں نظر آتا ہے۔ حضرت سودہؓ اس وصف میں باستثنائے حضرت عائشہؓ سب سے ممتاز تھیں ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے ان کی خدمت میں ایک تھیلی بھیجی لانے والے سے پوچھا اس میں کیا ہے؟ بولا درہم، بولیں کھجور کی طرح تھیلی میں درہم بھیجے جاتے ہیں یہ کہہ کر اسی وقت سب کو تقسیم کر دیا۔ اطاعت اور فرماں برداری بھی ان کا خاص وصف ہے اور اس وصف میں وہ تمام ازواج مطہراتؓ سے ممتاز تھیں۔

روایت حدیث:

ان کے ذریعے سے صرف پانچ حدیثیں مروی ہیں جن میں سے بخاری میں صرف ایک ہے۔ صحابہ میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور یحییٰ بن عبدالرحمٰن بن اسعد بن زرارہ نے ان سے روایت کی ہے۔

وفات:

حضرت سودہؓ کے سنہ وفات میں اختلاف ہے۔ واقدی کے نزدیک انہوں نے امیر معاویہؓ کے زمانہ خلافت ۵۴ھ میں وفات پائی۔ حافظ ابن حجر ان کا سال وفات ۵۵ھ قرار دیتے ہیں۔ امام بخاری نے تاریخ میں بسند صحیح روایت کی ہے کہ حضرت عمرؓ کی خلافت میں انتقال کیا۔ ذہبی نے تاریخ کبیر میں یہ اضافہ کیا ہے کہ حضرت عمرؓ کی خلافت کے آخری زمانہ میں وفات کی۔ حضرت عمرؓ نے ۲۳ھ میں شہادت پائی ہے اس لیے ان کا زمانہ وفات ۲۲ھ ہوگا۔ تیس

میں رات کے وقت دفن ہوئیں۔ قاسم بن محمد، عبداللہ بن عبدالرحمن، عبداللہ بن ابی عتیق، عروہ بن زبیر اور عبداللہؓ بن زبیر نے قبر میں اتارا۔ اس وقت حضرت ابوہریرہؓ مروان بن حکم کی طرف سے مدینہ کے حاکم تھے اس لیے انہوں نے نماز جنازہ پڑھائی۔

آنحضرت ﷺ کو حضرت عائشہؓ سے بہت محبت تھی اس محبت سے آپ ﷺ نے مرض الموت میں تمام ازواج مطہرات سے اجازت لی اور اپنی زندگی کے آخری دن حضرت عائشہؓ کے حجرے میں بسر کیے اس محبت کا اظہار جن طریقوں سے ہوتا تھا ان کے متعلق احادیث و سیر میں نہایت کثرت سے واقعات درج ہیں۔

علمی زندگی:

حضرت عائشہؓ کی علمی زندگی بھی نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں فتویٰ دیتی تھیں۔ اکابر صحابہؓ پر انہوں نے دقیق اعتراضات کیے ہیں جن کو علامہ سیوطی نے ایک رسالہ میں جمع کر دیا ہے ان سے ۲۲۱۰ حدیثیں مروی ہیں جن میں ۱۷۴ حدیثوں پر شیخین نے اتفاق کیا ہے۔ بخاری نے منفرداً ان سے ۵۴ حدیثیں روایت کی ہیں۔ ۶۸ حدیثوں میں امام مسلم منفرد ہیں۔ بعض لوگوں کا قول ہے کہ احکام شرعیہ میں سے ایک چوتھائی ان سے منقول ہے۔ ترمذی میں ہے کہ صحابہؓ کے سامنے جب کوئی مشکل سوال پیش آ جاتا تھا تو اس کو حضرت عائشہؓ ہی حل کرتی تھیں۔ ان کے شاگردوں کا بیان ہے کہ ہم نے ان سے زیادہ خوش تقریر نہیں دیکھا۔ تفسیر، حدیث، اسرار شریعت، خطابت، ادب، انساب میں ان کو کمال تھا۔ شعراء کے بہت سے قصیدے ان کو زبانی یاد تھے۔ حاکم نے مستدرک میں اور ابن سعد نے طبقات میں بہ تفصیل ان واقعات کو لکھا ہے اور مسند ابن حنبل وغیرہ میں بھی جستہ جستہ ان کے تفقہ و کمال کے دلائل و شواہد ملتے ہیں۔

حضرت حفصہؓ

حضرت حفصہؓ حضرت عمرؓ کی بیٹی تھیں، ماں کا نام زینب بنت مظعون تھا۔ بعثت سے پانچ برس پہلے جس سال جب قریش خانہ کعبہ کو تعمیر کر رہے تھے پیدا ہوئیں۔ ان کی شادی خنیسؓ بن حذافہ سے ہوئی اور انہی کے ساتھ مدینہ کو ہجرت کی۔ خنیسؓ نے غزوہ بدر میں زخم کھائے اور واپس آ کر انہی زخموں کی وجہ سے شہادت پائی۔[1] خنیسؓ نے اپنی یادگار میں حضرت حفصہؓ کے بطن سے کوئی اولاد نہیں چھوڑی۔[2] حضرت حفصہؓ کے بیوہ ہو جانے کے بعد حضرت عمرؓ کو ان کے نکاح کی فکر ہوئی۔ حسن اتفاق سے اسی زمانہ میں حضرت رقیہؓ کا انتقال ہو چکا تھا اس بنا پر سب سے پہلے حضرت عمرؓ نے

---

1. زرقانی ج ۳ ص ۲۷۱۔ عام طور پر یہی مشہور ہے لیکن اصابہ میں ہے کہ غزوہ احد میں شہید ہوئے۔ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے رقیہؓ کے انتقال کے بعد حضرت عثمانؓ سے ان کے نکاح کی خواہش کی تھی اور یہ مسلم ہے کہ حضرت رقیہؓ کا انتقال غزوہ بدر کے بعد ہوا اور اسی وجہ سے حضرت عثمانؓ شریک غزوہ نہ ہو سکے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خنیسؓ نے غزوہ بدر کے بعد وفات پائی۔ دوسری روایت میں ہے کہ حضرت عثمانؓ مغموم بیٹھے تھے حضرت عمرؓ ادھر سے گزرے اور پوچھا حفصہؓ سے نکاح کر لو تو اس کی مدت گزر چکی ہے اگر خنیسؓ نے احد میں شہادت پائی ہوتی تو ان کی عدت کا زمانہ ۳ھ ہوتا۔ فتح الباری ج ۹ ص ۱۵۰۔
2. طبری ج ۳ ص [illegible]۔

ان کے نکاح کی خواہش حضرت عثمانؓ سے کی۔ انہوں نے کہا کہ اس معاملہ میں غور کروں گا۔ حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ سے ذکر کیا انہوں نے خاموشی اختیار کی، حضرت عمرؓ کو ان کی بے التفاتی سے رنج ہوا۔ اس کے بعد خود جناب رسالت پناہ ﷺ نے حضرت حفصہؓ سے نکاح کی خواہش کی نکاح ہو گیا تو حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ سے ملے اور کہا کہ جب تم نے مجھ سے حفصہؓ کے نکاح کی درخواست کی اور میں خاموش رہا تو تم کو ناگوار گزرا لیکن میں نے اسی بناء پر کچھ جواب نہیں دیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کا ذکر کیا تھا اور میں آپ کا راز فاش کرنا نہیں چاہتا تھا اگر رسول اللہ ﷺ نے ان سے نکاح نہ کیا ہوتا تو میں اس کے لئے آمادہ تھا۔[1]

حضرت حفصہؓ آخر حضرت عمرؓ کی بیٹی تھیں اس لیے مزاج میں ذرا تیزی تھی۔ صحیح بخاری میں واقعہ ایلاء کے متعلق خود حضرت عمرؓ کا بیان ہے کہ "ہم لوگ زمانہ جاہلیت میں عورتوں کو کوئی چیز نہیں سمجھتے تھے۔ میں ایک دن کسی معاملہ میں غور کر رہا تھا اتفاق سے میری بیوی نے مجھ کو مشورہ دیا۔ میں نے کہا تم کو ان معاملات میں کیا دخل ہے۔ بولیں کہ تم میری بات پسند نہیں کرتے حالانکہ تمہاری بیٹی رسول اللہ ﷺ کو برابر کا جواب دیتی ہیں۔ میں اٹھا اور حفصہ کے پاس آیا۔ میں نے کہا بیٹی! تم رسول اللہ ﷺ کو جواب دیتی ہو یہاں تک کہ آپ دن بھر رنجیدہ رہتے ہیں بولیں ہاں ہم ایسا کرتے ہیں۔ میں نے کہا خبردار میں تمہیں عذاب الٰہی سے ڈراتا ہوں تم اس کے گھمنڈ میں نہ آ جانا جس کے حسن نے رسول اللہ ﷺ کو فریفتہ کر لیا ہے"۔[2] (یعنی عائشہؓ)

ترمذی میں ہے کہ ایک دفعہ حضرت صفیہؓ رو رہی تھیں، آنحضرت ﷺ تشریف لائے اور رونے کی وجہ پوچھی۔ انہوں نے کہا مجھ کو حفصہ نے کہا ہے کہ تم یہودی کی بیٹی ہو۔ آپ ﷺ نے فرمایا "تم نبی کی بیٹی ہو تمہارا چچا پیغمبر ہے اور پیغمبر کے نکاح میں ہو۔ حفصہؓ تم پر کس بات میں فخر کر سکتی ہے؟"[3]

ایک بار حضرت عائشہؓ اور حفصہؓ نے حضرت صفیہؓ سے کہا کہ "ہم رسول اللہ ﷺ کے نزدیک تم سے زیادہ معزز ہیں ہم آپ ﷺ کی بیوی بھی ہیں اور چچازاد بہن بھی"۔ حضرت صفیہؓ کو ناگوار گزرا انہوں نے آنحضرت ﷺ سے اس کی شکایت کی آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم نے یہ کیوں نہیں کہا کہ تم مجھ سے زیادہ کیونکر معزز ہو سکتی ہو میرے شوہر محمد ﷺ، میرے باپ ہارونؑ اور میرے چچا موسیٰؑ ہیں"۔

حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ کی بیٹیاں تھیں جو تقرب نبوی میں دوش بدوش تھے اس بناء پر حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ دیگر ازواج کے مقابلہ میں باہم ایک تھیں لیکن کبھی کبھی خود بھی باہم رشک و رقابت کا اظہار ہو جایا کرتا تھا ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ دونوں آنحضرت ﷺ کے ساتھ سفر میں تھیں۔ رسول اللہ راتوں کو حضرت عائشہؓ کے اونٹ پر چلتے تھے اور ان سے باتیں کرتے تھے۔ ایک دن حضرت حفصہؓ نے حضرت عائشہؓ سے کہا کہ آج رات کو تم میرے اونٹ پر اور میں تمہارے اونٹ پر سوار ہوں تا کہ مختلف مناظر دیکھنے میں آئیں

۱۔ ترمذی ج ۲ ص ۹۸
۲۔ صحیح بخاری جلد ۲ صفحہ ۷۳۰۔
۳۔ ترمذی صفحہ ۶۳۷ کتاب المناقب۔

حضرت عائشہؓ راضی ہو گئیں، آنحضرت ﷺ حضرت عائشہؓ کے اونٹ کے پاس آئے جس پر حفصہؓ سوار تھیں جب منزل پر پہنچے اور حضرت عائشہؓ نے آپ ﷺ کو نہیں پایا تو اپنے پاؤں کو اذخر (ایک گھاس ہے جس میں سانپ بچھو رہتے ہیں) کے درمیان لٹکا کر کہنے لگیں "خداوندا! کسی بچھو یا سانپ کو متعین کر جو مجھے ڈس جائے"۔ [1]

وفات:

حضرت حفصہؓ نے ۴۵ھ میں جو امیر معاویہ کی خلافت کا زمانہ تھا وفات پائی۔ وفات سے پیشتر اپنے بھائی عبدالرحمن بن عمرؓ سے اس وصیت کی تجدید کی جو حضرت عمرؓ نے ان کو کی تھی۔ کچھ جائداد بھی وقف کی اور کچھ مال صدقہ میں دیا مروان بن حکم نے جو اس وقت مدینہ کا گورنر تھا نماز جنازہ پڑھائی اور بنی حزم کے گھر سے مغیرہ بن شعبہ کے گھر تک جنازہ کو کاندھا دیا یہاں سے قبر تک حضرت ابوہریرہؓ جنازہ کو لے گئے ان کے بھائی عبداللہ، عاصم سالم، عبداللہ، حمزہ، عبداللہ بن عمرؓ کے لڑکوں نے قبر میں اتارا۔ [2]

حضرت زینب اُمّ المساکینؓ

زینب نام تھا، چونکہ فقراء و مساکین کو نہایت فیاضی کے ساتھ کھانا کھلاتی تھیں اس لیے اُمّ المساکینؓ کی کنیت کے ساتھ مشہور ہو گئیں آنحضرت ﷺ سے پہلے عبداللہؓ بن جحش کے نکاح میں تھیں، عبداللہؓ بن جحش نے جنگ احد ۳ھ میں شہادت پائی اور آنحضرت ﷺ نے اسی سال ان سے نکاح کر لیا، نکاح کے بعد آنحضرت ﷺ کے پاس صرف دو تین مہینے رہنے پائی تھیں کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ آنحضرت ﷺ کی زندگی میں حضرت خدیجہؓ کے بعد صرف یہی ایک بی بی تھیں جنہوں نے وفات پائی۔ آنحضرت ﷺ نے خود نماز جنازہ پڑھائی اور جنت البقیع میں دفن ہوئیں۔ وفات کے وقت ان کی عمر ۳۰ سال کی تھی۔

حضرت اُمّ سلمہؓ

ہند نام، اُمّ سلمہؓ کنیت تھی، باپ کا نام سہیل اور ماں کا عاتکہ تھا، پہلے عبداللہ بن عبدالاسد کے نکاح میں آئیں (جو زیادہ تر ابو سلمہ کے نام سے مشہور ہیں اور) جو ان کے چچا زاد اور رسول اللہ ﷺ کے رضاعی بھائی تھے، اپنے شوہر ہی کے ساتھ اسلام لائیں اور ان کے ساتھ سب سے پہلے حبشہ کی طرف ہجرت کی، چنانچہ سلمہ ان کے بیٹے حبشہ ہی میں پیدا

[1] اس امر کا خاص طور پر لحاظ رکھنا چاہیے کہ ازواج مطہراتؓ میں اس قسم کی روایتیں صرف حفصہؓ و عائشہؓ کے متعلق مذکور ہیں اس لیے اس کے اسباب کی تلاش کرنی چاہیے۔ حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ کے ساتھ منافقین کو جو عداوت تھی وہ قابل لحاظ ہے۔

[2] حضرت حفصہؓ کے سن وفات میں اختلاف ہے ایک روایت ہے کہ انہوں نے جمادی الاول ۴۱ھ میں وفات پائی اس وقت ان کا سن ۵۹ سال کا تھا لیکن اگر سن وفات ۴۵ھ قرار دیا جائے تو ان کی عمر ۶۳ سال کی ہوگی ایک روایت ہے کہ انہوں نے حضرت عثمانؓ کی خلافت میں ۲۷ھ میں انتقال کیا یہ روایت اس بنا پر پیدا ہو گئی کہ وہب نے ابن مالک سے روایت کی کہ جس سال افریقہ فتح ہوا حفصہؓ نے اسی سال وفات پائی اور افریقہ حضرت عثمانؓ کی خلافت میں ۲۷ھ میں فتح ہوا لیکن یہ سخت غلطی ہے افریقہ دو مرتبہ فتح ہوا ہے اس دوسری فتح کا افسر معاویہ بن خدیج تھا اور یہ فتح ۵۰ھ میں ہوئی وہب بن مالک نے حفصہؓ کا سال وفات اسی فتح کے سنہ کو قرار دیا ہے۔

ہوئے' حبشہ سے مکہ میں آئیں اور یہاں سے مدینہ کو ہجرت کی' ہجرت میں ان کو یہ فضیلت حاصل ہوئی کہ اہل سیر کے نزدیک وہ پہلی عورت ہیں جو ہجرت کر کے مدینہ آئیں۔ ان کے پہلے شوہر ابو سلمہؓ بڑے شہسوار تھے' مشہور غزوات بدر و احد میں شریک ہوئے' غزوہ احد میں چند زخم کھائے جن کے صدمہ سے جانبر نہ ہو سکے اور جمادی الثانی ۴ھ میں وفات پائی' ان کے جنازہ کی نماز نہایت اہتمام سے پڑھی گئی آنحضرت ﷺ نے ۹ تکبیریں کہیں لوگوں نے نماز کے بعد پوچھا یارسول اللہ! آپ کو سہو تو نہیں ہوا' فرمایا یہ ہزار تکبیر تک کے مستحق تھے۔ ابو سلمہؓ کی وفات کے وقت ام سلمہؓ حاملہ تھیں' وضع حمل کے بعد جب عدت گزر گئی تو آنحضرت ﷺ نے ان سے نکاح کرنا چاہا تو انہوں نے چند عذر پیش کئے۔

۱۔ میں سخت غیور عورت ہوں۔ ۲۔ صاحب عیال ہوں۔ ۳۔ میرا سن زیادہ ہے۔

آنحضرت ﷺ نے ان سب دقتوں کو گوارا کیا۔

وفات:

اہل سیر متفق اللفظ ہیں کہ ازواج مطہراتؓ میں سب کے بعد حضرت ام سلمہؓ نے وفات پائی' لیکن ان کے سنہ وفات میں نہایت اختلاف ہے۔ واقدی نے ۵۹ھ بتایا ہے ابراہیم حربی کے نزدیک ۶۲ھ ہے اور تقریب میں اسی کو صحیح کہا ہے۔ امام بخاری نے تاریخ کبیر میں لکھا ہے کہ ۵۸ھ میں وفات پائی' بعض روایتوں میں ہے کہ ۶۱ھ میں جب امام حسینؓ کی شہادت کی خبر آئی اس وقت ان کا انتقال ہوا ہے' ابن عبداللہ نے اس روایت کی تصحیح کی ہے۔

اس اختلاف روایت کی حالت میں سنہ وفات کی تعیین مشکل ہے تاہم یہ یقینی ہے کہ وہ واقعہ حرہ تک زندہ تھیں' مسلم میں ہے کہ حارث بن عبداللہ بن ابی ربیعہؓ اور عبداللہ بن صفوانؓ ام سلمہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس لشکر کا حال پوچھا جو زمین میں دھنس جائے گا' یہ سوال اس وقت کیا گیا تھا جب یزید نے مسلم بن عقبہ کو لشکر شام کے ساتھ مدینہ کی طرف بھیجا تھا اور واقعہ حرہ پیش آیا تھا' واقعہ حرہ ۶۳ھ میں پیش آیا ہے اس لئے اس سے پہلے ان کی وفات کی تمام روایتیں صحیح نہیں۔ ابن عبدالبر نے لکھا ہے کہ حضرت ام سلمہؓ کی وصیت کی بنا پر سعید بن زیدؓ نے نماز جنازہ پڑھائی لیکن اس روایت کی صحت میں کلام ہے' سعید بن زیدؓ نے باختلاف روایت ۵۱ھ ۵۲ھ یا ۵۹ھ میں انتقال کیا ہے اور یہ یقینی طور پر ثابت ہے کہ اس وقت ام سلمہؓ زندہ تھیں' واقدی نے لکھا ہے کہ ابو ہریرہؓ نے ان کا جنازہ پڑھایا اگر ان کی وفات کے وقت سعید بن زید زندہ ہوتے تو حضرت ابو ہریرہؓ خلاف وصیت کیونکر جنازہ پڑھ سکتے تھے بہرحال ازواج مطہرات میں سب کے بعد حضرت ام سلمہؓ نے وفات پائی اور وفات کے وقت ان کی عمر ۸۴ سال کی تھی۔

فضل و کمال:

ازواج مطہرات میں حضرت عائشہؓ کے بعد فضل و کمال میں انہیں کا درجہ ہے' ابن سعد نے طبقات میں اس کی تصریح کی ہے' روایت حدیث اور نقل احکام میں حضرت عائشہؓ کے سوا اور تمام بیبیوں پر ان کو فضیلت حاصل ہے۔ صلح حدیبیہ میں صحابہ کو مکہ سے باہر حلق اور قربانی میں تامل تھا تو حضرت ام سلمہؓ ہی کی تدبیر سے یہ مشکل حل ہوئی اور یہ ان کی دانشمندی و ذہانت کی سب سے بہتر مثال ہے' یہ واقعہ صحیح بخاری میں بہ تفصیل موجود ہے۔

حضرت زینبؓ

ازواج مطہرات میں جو بیبیاں حضرت عائشہؓ کی ہمسری کا دعویٰ رکھتی تھیں ان میں حضرت زینبؓ بھی تھیں خود حضرت عائشہؓ کہتی ہیں ﴿[illegible]﴾ یعنی وہ میرا مقابلہ کرتی تھیں اور ان کو اس کا حق بھی تھا کیونکہ نسبی حیثیت سے وہ آنحضرت ﷺ کی پھوپھی زاد بہن تھیں، جمال میں بھی ممتاز تھیں، آنحضرت ﷺ کو بھی ان سے نہایت محبت تھی، زہد و تورع میں یہ حال تھا کہ جب حضرت عائشہؓ پر اتہام لگایا گیا اور اس اتہام میں خود حضرت زینبؓ کی بہن حمنہؓ شریک تھیں تو آنحضرت ﷺ نے ان سے حضرت عائشہؓ کی اخلاقی حالت دریافت کی تو انہوں نے صاف لفظوں میں کہہ دیا۔

﴿ماعلمت الا خيرا﴾

مجھ کو حضرت عائشہؓ کی بھلائی کے سوا کسی چیز کا علم نہیں۔

حضرت عائشہؓ کو ان کے اس صدق و اقرار حق کا خود اعتراف کرنا پڑا۔

عبادت میں نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ مشغول رہتی تھیں، جب آنحضرت ﷺ نے ان کو عقد میں لانا چاہا تو انہوں نے کہا کہ میں بغیر استخارہ کے کوئی رائے قائم نہیں کرتی۔ ایک دفعہ آپ ﷺ مہاجرین پر کچھ مال تقسیم کر رہے تھے حضرت زینبؓ اس معاملہ میں کچھ بول گئیں، حضرت عمرؓ نے ڈانٹا آپ ﷺ نے فرمایا ان سے درگزر کرو یہ اواہ ہیں (یعنی خاشع و متضرع ہیں) نہایت قانع اور فیاض طبع تھیں، خود اپنے دست و بازو سے معاش پیدا کرتی تھیں اور اس کو خدا کی راہ میں لٹا دیتی تھیں۔ ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے ان کا سالانہ نفقہ بھیجا انہوں نے اس پر ایک کپڑا ڈال دیا اور برزہ بنت رافع کو حکم دیا میرے خاندانی رشتہ داروں اور یتیموں کو تقسیم کر دو برزہ نے کہا: آخر ہمارا بھی کچھ حق ہے؟ انہوں نے کہا کہ کپڑے کے نیچے جو کچھ ہو وہ تمہارا ہے، دیکھا تو پچاسی درہم نکلے جب تمام مال تقسیم ہو چکا تو دعا کی کہ خدایا اس سال کے بعد میں عمر کے عطیہ سے فائدہ نہ اٹھاؤں، یہ دعا مقبول ہوئی اور اسی سال ان کا انتقال ہو گیا۔

وفات

آنحضرت ﷺ نے ازواج مطہرات سے فرمایا تھا۔

﴿اسرعكن لحاقا بي اطولكن يدا﴾

تم میں مجھ سے جلد وہ ملے گی جس کا ہاتھ لمبا ہوگا۔

یہ استعارہ فیاضی کی طرف اشارہ تھا لیکن ازواج مطہرات اس کو حقیقت سمجھیں چنانچہ باہم اپنے ہاتھوں کو ناپا کرتی تھیں۔ حضرت زینبؓ اپنی فیاضی کی بنا پر اس پیشین گوئی کا مصداق ثابت ہوئیں اور ازواج مطہرات میں سب سے پہلے انتقال کیا۔ کفن کا خود سامان کر لیا تھا اور وصیت کی تھی کہ حضرت عمرؓ بھی کفن دیں تو ان میں سے ایک کو صدقہ کر دینا چنانچہ یہ وصیت پوری کی گئی۔ حضرت عمرؓ نے نماز جنازہ پڑھائی اس کے بعد ازواج مطہرات سے دریافت کیا کہ کون ان کو قبر میں داخل کرے گا؟ انہوں نے کہا وہ شخص جو ان کے گھر میں داخل ہوا کرتا تھا (یعنی محرم) اسامہ، محمد بن عبداللہ بن جحش، عبداللہ

ابن ابی احمد بن جحش نے ان کو قبر میں اتارا۔ ۲۰ھ میں انتقال کیا اور ۵۳ برس کی عمر پائی۔ واقدی نے لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ سے جس وقت نکاح ہوا اس وقت ۳۵ سال کی تھیں۔

حضرت جویریہؓ

حضرت جویریہؓ حارث بن ضرار کی بیٹی تھیں جو قبیلہ بنی مصطلق کا سردار تھا۔ مسافع بن صفوان سے شادی ہوئی تھی جو غزوہ مریسیع میں قتل ہوا۔ اس لڑائی میں کثرت سے لونڈی غلام مسلمانوں کے ہاتھ آئے۔ ان ہی لونڈیوں میں حضرت جویریہؓ بھی تھیں۔ جب مال غنیمت کی تقسیم ہوئی تو وہ ثابت بن قیس بن شماس انصاری کے حصہ میں آ گئیں۔

اسلام میں اگر آقا راضی ہو تو لونڈی غلام بعوض رقم ادا کر کے آزاد ہو سکتے ہیں۔ اس طریقہ کو فقہا کی اصطلاح میں کتابت کہتے ہیں۔ اسی اصول کے موافق حضرت جویریہؓ مکاتب بن گئیں یعنی ان کو شرط کے موافق ۹ اوقیہ سونا ادا کرنا تھا لیکن یہ رقم ان کی استطاعت سے بہت زیادہ تھی۔ وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئیں اور کہا "یا رسول اللہ! میں مسلمان ہو کر آئی ہوں اور حارث کی بیٹی جویریہ ہوں جو اپنی قوم کا سردار ہے۔ مجھ پر جو مصیبتیں آئیں وہ آپ سے مخفی نہیں۔ میں ثابت بن قیسؓ کے حصہ میں آئی اور نو اوقیہ سونے پر ان سے عہد کتابت کیا ہے۔ یہ رقم میرے امکان میں نہ تھی لیکن میں نے آپ کے بھروسہ پر اس کو منظور کر لیا اور اب آپ سے اس کا سوال کرنے کے لیے آئی ہوں۔" آپ ﷺ نے فرمایا تو کیا تم کو اس سے بہتر چیز کی خواہش نہیں؟ انہوں نے کہا وہ کیا چیز ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا میں یہ رقم ادا کر دیتا ہوں اور تم سے نکاح کر لیتا ہوں۔ وہ راضی ہو گئیں۔ آپ ﷺ نے ثابت بن قیس کو بلایا وہ بھی راضی ہو گئے۔ آپ ﷺ نے رقم ادا کی اور ان کو آزاد کر کے نکاح کر لیا۔ یہ خبر جب پھیلی تو لوگوں نے قبیلہ بنی مصطلق کے تمام لونڈی غلام کو اس بنا پر آزاد کر دیا کہ آنحضرت ﷺ نے ان لوگوں سے رشتہ مصاہرت قائم کر لیا۔ آزاد شدہ غلاموں کی تعداد ایک روایت میں سات سو بتائی گئی ہے۔ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ "جویریہؓ کی برکت سے سینکڑوں گھرانے آزاد کر دیئے گئے۔" بعض روایتوں میں ہے کہ آنحضرت ﷺ سے خود حضرت جویریہؓ نے یہ خواہش ظاہر کی تھی اور آپ ﷺ نے تمام قیدیوں کو ان پر ہبہ کر دیا تھا۔

حضرت جویریہؓ نے ۵۰ھ میں وفات پائی اور جنت البقیع میں دفن ہوئیں۔ اس وقت ان کا سن ۶۵ برس کا تھا۔

حضرت اُمّ حبیبہؓ

رملہ نام، ام حبیبہ کنیت تھی۔ آنحضرت ﷺ کی بعثت سے ۱۷ سال پہلے پیدا ہوئیں اور عبیداللہ بن جحش سے عقد ہوا۔ آنحضرت ﷺ مبعوث ہوئے تو دونوں مشرف باسلام ہوئے اور حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ ایک روایت ہے کہ ان کی بیٹی جن کی کنیت کے ساتھ وہ مشہور ہیں، حبشہ ہی میں پیدا ہوئیں۔ حبشہ میں جا کر عبیداللہ بن جحش نے عیسائیت قبول کر لی لیکن ام حبیبہؓ اسلام پر قائم رہیں۔ اختلاف مذہب کی وجہ سے عبیداللہ بن جحش نے ان سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اب وہ وقت آ گیا کہ ان کو اسلام اور ہجرت کی فضیلت کے ساتھ ام المومنین بننے کا شرف بھی حاصل ہو چنانچہ آنحضرت ﷺ نے عمرو بن امیہ ضمری کو نجاشی کی خدمت میں بغرض نکاح بھیجا۔ جب وہ نجاشی کے پاس پہنچے تو نجاشی نے ام حبیبہؓ کو اپنی لونڈی ابرہہ کے ذریعے سے پیغام دیا کہ آنحضرت ﷺ نے مجھ کو تمہارے نکاح کے لئے لکھا ہے۔ انہوں نے خالد بن

کے متعلق اگرچہ اختلاف ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ انہوں نے ۵۰ھ میں وفات پائی۔

حضرت صفیہؓ

صفیہ اصل نام نہ تھا' زرقانی نے لکھا ہے کہ عرب میں مال غنیمت کا جو بہترین حصہ امام یا بادشاہ کے لیے مخصوص ہو جاتا تھا اس کو صفیہ کہتے تھے چونکہ وہ جنگ خیبر میں اسی طریقے کے موافق آنحضرت ﷺ کے نکاح میں آئی تھیں اس لیے صفیہ کے نام سے مشہور ہو گئیں ورنہ اصلی نام زینب تھا۔ باپ کا نام حیی بن اخطب اور ماں کا نام ضرہ تھا' حضرت صفیہؓ کو باپ اور ماں دونوں کے جانب سے سیادت حاصل تھی' باپ قبیلہ بنو نضیر کا سردار اور ماں بنو قریظہ کے رئیس کی بیٹی تھی۔ حضرت صفیہؓ کی شادی پہلے سلام بن مشکم القرظی سے ہوئی تھی' ابن مشکم نے طلاق دی تو کنانہ بن ابی الحقیق کے نکاح میں آئیں' کنانہ جنگ خیبر میں مقتول ہوا۔ حضرت صفیہؓ کے باپ اور بھائی بھی کام آئے اور خود بھی گرفتار ہوئیں' جب خیبر کے تمام قیدی جمع کیے گئے تو دحیہ کلبی نے آنحضرت ﷺ سے ایک لونڈی کی درخواست کی' آنحضرت ﷺ نے انتخاب کرنے کی اجازت دی' انہوں نے حضرت صفیہؓ کو منتخب کیا' لیکن ایک صحابی نے آپ ﷺ کی خدمت میں آ کر عرض کی کہ آپ ﷺ نے رئیسہ بنو نضیر و قریظہ کو دحیہ کو دے دیا وہ تو صرف آپ کے قابل ہے۔ آپ ﷺ نے حکم دیا کہ دحیہ اس عورت کے ساتھ حاضر ہوں' وہ صفیہ کو لے کر آئے تو آپ ﷺ نے ان کو دوسری لونڈی عنایت فرمائی اور صفیہ کو آزاد کر کے نکاح کر لیا۔ خیبر سے روانہ ہوئے تو مقام صہبا میں رسم عروسی ادا کی اور جو کچھ سامان لوگوں کے پاس تھا اس کو جمع کر کے دعوت ولیمہ فرمائی' وہاں سے روانہ ہوئے تو آپ ﷺ نے ان کو خود اپنے اونٹ پر سوار کر لیا اور اپنی عبا سے ان پر پردہ کیا۔ یہ گویا اس بات کا اعلان تھا کہ وہ ازواج مطہرات میں داخل ہو گئیں۔

حضرت صفیہؓ کے ساتھ آنحضرت ﷺ کو نہایت محبت تھی اور ہر موقع پر ان کی دلجوئی فرماتے تھے۔ ایک بار آپ ﷺ سفر میں تھے' ازواج مطہرات بھی ساتھ تھیں' حضرت صفیہؓ کا اونٹ سوء اتفاق سے بیمار ہو گیا' حضرت زینبؓ کے پاس ضرورت سے زیادہ اونٹ تھے' آپ ﷺ نے ان سے کہا کہ ایک اونٹ صفیہؓ کو دے دو' انہوں نے کہا کیا میں اس یہودیہ کو اپنا اونٹ دوں؟ اس پر آنحضرت ﷺ ان سے اس قدر ناراض ہوئے کہ دو مہینے تک ان کے پاس نہ گئے۔ ایک بار آپ ﷺ حضرت صفیہؓ کے پاس تشریف لے گئے' دیکھا کہ رو رہی ہیں' آپ ﷺ نے رونے کی وجہ پوچھی' انہوں نے کہا کہ عائشہ اور زینب کہتی ہیں کہ "ہم تمام ازواج میں افضل ہیں' ہم آپ کی زوجہ ہونے کے ساتھ آپ ﷺ کی چچا زاد بہن بھی ہیں"۔ آپ ﷺ نے فرمایا "تم نے یہ کیوں نہ کہہ دیا کہ ہارونؑ میرے باپ' موسیٰؑ میرے چچا اور محمد ﷺ میرے شوہر ہیں اس لیے تم لوگ کیونکر مجھ سے افضل ہو سکتی ہو؟"

حضرت صفیہؓ نے ۵۰ھ میں وفات پائی اور جنت البقیع میں دفن ہوئیں۔

نیزہ سے زمین پر گرا دیا، وہ حاملہ تھیں، حمل ساقط ہو گیا، کنانہ نے ترکش سے تیر نکالے اور کہا کہ "اب اگر کوئی قریب آیا تو اس تیر اس کا نشانہ ہوگا" لوگ ہٹ گئے تو ابوسفیان سرداران قریش کے ساتھ آیا اور کہا "تیر روک لو ہم کو کچھ گفتگو کرنی ہے" انہوں نے تیر ترکش میں ڈال دیئے، ابوسفیان نے کہا "محمد کے ہاتھ سے جو مصیبتیں ہم کو پہنچی ہیں تم کو معلوم ہیں اب اگر تم علانیہ ان کی لڑکی کو ہمارے قبضے سے نکال کر لے گئے تو لوگ کہیں گے کہ ہماری کمزوری ہے، ہم کو زینب کے روکنے کی ضرورت نہیں، جب شور و ہنگامہ کم ہو جائے اس وقت چوری چھپے لے جانا"۔ کنانہ نے یہ رائے تسلیم کی اور چند روز کے بعد ان کو رات کے وقت لے کر روانہ ہوئے۔ زید بن حارثہ کو آنحضرت ﷺ نے پہلے بھیج دیا تھا، وہ بطن یاجج میں تھے، کنانہ نے زینب کو ان کے حوالے کیا اور وہ ان کو لے کر روانہ ہو گئے۔

حضرت زینب مدینہ میں آ گئیں اور اپنے شوہر ابوالعاص کو حالت شرک میں چھوڑ آئیں۔ ابوالعاص دوبارہ ایک سریہ میں گرفتار ہوئے۔[1] اس وقت بھی حضرت زینب نے ان کو پناہ دی، مکہ جا کر انہوں نے لوگوں کی امانتیں حوالے کیں اور اسلام لائے، اسلام لانے کے بعد ہجرت کر کے مدینہ میں آئے۔ حضرت زینب نے ان کو حالت شرک میں چھوڑا تھا اس لیے دونوں میں باہم تفریق ہو گئی تھی، وہ مدینہ آئے تو حضرت زینب دوبارہ ان کے نکاح میں آ گئیں۔ ترمذی وغیرہ میں حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ کوئی جدید نکاح نہیں ہوا، لیکن دوسری روایت میں جدید نکاح کی تصریح ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت کو اگرچہ اسناد کے لحاظ سے دوسری روایت پر ترجیح ہے لیکن فقہاء نے دوسری روایت پر عمل کیا ہے اور حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت کی یہ تاویل کی ہے کہ نکاح جدید کے مہر اور شرائط وغیرہ میں کسی قسم کا تغیر نہ ہوا ہوگا، اس سے حضرت عبداللہ بن عباس نے اس کو نکاح اول سے تعبیر کیا ورنہ بعد تفریق نکاح ثانی ضروری ہے۔

ابوالعاص نے حضرت زینب کے ساتھ نہایت شریفانہ برتاؤ کیا اور آنحضرت ﷺ نے ان کے شریفانہ تعلقات کی تعریف کی، نکاح جدید کے بعد حضرت زینب بہت کم زندہ رہیں۔ محرم ۷ ھ میں (باختلاف روایت) ابوالعاص اسلام لائے تھے اور اس لیے ۸ ھ میں حضرت زینب نے انتقال کیا۔ ام ایمن، حضرت سودہ بنت زمعہ اور ام سلمہ نے غسل دیا اور آنحضرت ﷺ نے نماز جنازہ پڑھائی، ابوالعاص اور آنحضرت ﷺ نے قبر میں اتارا۔

حضرت زینب نے دو اولاد چھوڑی، امامہ اور علی۔ علی کی نسبت ایک روایت ہے کہ بچپن میں وفات پائی لیکن عام روایت یہ ہے کہ سن رشد کو پہنچے، ابن عساکر نے لکھا ہے کہ یرموک کے معرکہ میں شہادت پائی۔

امامہ سے آنحضرت ﷺ کو نہایت محبت تھی، آپ ﷺ ان کو اوقات نماز میں بھی جدا نہیں کرتے تھے۔ صحاح میں ہے کہ آپ ﷺ ان کو کاندھے پر رکھ کر نماز پڑھتے تھے، جب رکوع میں جاتے تو دوش مبارک سے اتار دیتے، جب سجدہ سے سر اٹھاتے تو پھر سوار کر لیتے۔ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں ایک مرتبہ کسی نے کچھ چیزیں ہدیہ میں بھیجیں جن میں ایک زریں ہار بھی تھا، امامہ ایک گوشہ میں کھیل رہی تھیں، آپ ﷺ نے فرمایا میں اس کو اپنی محبوب ترین اہل کو

---

[1] اصابہ میں ہے کہ ابوالعاص قریش کے ایک قافلہ کے ساتھ جمادی الاولی ۶ ھ میں روانہ ہوئے، آنحضرت ﷺ نے زید بن حارثہ کو ۱۷۰ سواروں کے ساتھ بھیجا، مقام عیص میں قافلہ ملا، بعض لوگ گرفتار کیے گئے اور مال و اسباب لوٹ لیا، ان میں ابوالعاص بھی تھے، ابوالعاص آئے تو حضرت زینب نے ان کو پناہ دی اور ان کی سفارش سے آنحضرت ﷺ نے ان کا مال بھی واپس کر دیا۔

دوں گا ازواج نے سمجھا کہ یہ شرف حضرت عائشہؓ کو حاصل ہوگا لیکن آپ ﷺ نے امامہ کو بلا کر وہ ہار خود ان کے گلے میں ڈال دیا۔ ابوالعاص نے حضرت زبیر بن العوام کو، ان کے نکاح کی وصیت کی تھی۔ حضرت فاطمہؓ کا انتقال ہوا تو انہوں نے حضرت علیؓ سے ان کا نکاح کر دیا۔ حضرت علیؓ نے شہادت پائی تو مغیرہ کو وصیت کر گئے کہ امامہ سے نکاح کر لیں مغیرہ نے نکاح کیا اور ان سے ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام یحییٰ تھا لیکن بعض روایتوں میں ہے کہ امامہؓ کے کوئی اولاد نہیں ہوئی امامہؓ نے مغیرہ کے ہاں وفات پائی۔

حضرت رقیہؓ

جرجانی نے لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی لڑکیوں میں سب سے چھوٹی تھیں لیکن مشہور روایت یہ ہے کہ حضرت زینبؓ کے بعد ۳۳ سنہ قبل از نبوت پیدا ہوئیں پہلے ابولہب کے بیٹے عتبہ سے شادی ہوئی۔ ابن سعد نے لکھا ہے کہ یہ شادی قبل نبوت ہوئی تھی۔ آنحضرت ﷺ کی دوسری صاحبزادی ام کلثومؓ کی شادی بھی ابولہب کے دوسرے لڑکے عتیبہ سے ہوئی تھی جب آنحضرت ﷺ کی بعثت ہوئی اور آپ ﷺ نے دعوت اسلام کا اظہار کیا تو ابولہب نے بیٹوں کو جمع کر کے کہا "اگر تم محمد کی بیٹیوں سے علیحدگی اختیار نہیں کرتے تو تمہارے ساتھ میرا سونا بیٹھنا حرام ہے"۔ دونوں فرزندوں نے باپ کے حکم کی تعمیل کی۔ آنحضرت ﷺ نے حضرت رقیہؓ کی شادی حضرت عثمانؓ سے کر دی۔

دولابی نے لکھا ہے کہ حضرت عثمانؓ کے ساتھ ان کا نکاح زمانہ جاہلیت میں ہوا لیکن خود ایک روایت حضرت عثمانؓ سے مروی ہے جس میں زمانہ اسلام کی تصریح ہے نکاح کے بعد حضرت عثمانؓ نے حبش کی طرف ہجرت کی حضرت رقیہؓ بھی ساتھ گئیں۔ مدت تک آنحضرت ﷺ کو ان کا کچھ حال معلوم نہ ہوا ایک عورت نے آ کر خبر دی کہ میں نے ان دونوں کو دیکھا ہے آنحضرت ﷺ نے دعا دی اور فرمایا "صحبہما اللہ" لوطؑ کے بعد عثمان پہلے شخص ہیں جنہوں نے بی بی کو لے کر ہجرت کی ہے۔

حبش میں حضرت رقیہؓ کے ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام عبداللہ تھا لیکن صرف ۶ سال زندہ رہا۔ حضرت عثمانؓ حبش سے مکہ کو واپس آئے اور وہاں سے مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ حضرت رقیہؓ مدینہ پہنچ کر بیمار ہوئیں یہ غزوہ بدر کا زمانہ تھا۔ حضرت عثمانؓ ان کی تیمارداری کی وجہ سے شریک جہاد نہ ہو سکے عین اسی دن جس روز زیدؓ بن حارثہ نے مدینہ آ کر فتح کا مژدہ سنایا وفات پائی۔ غزوہ بدر کی وجہ سے آنحضرت ﷺ ان کے جنازہ میں شریک نہ ہو سکے۔

حضرت اُم کلثومؓ

کنیت ہی کے ساتھ مشہور ہیں۔ ۳ھ میں جو غزوہ بدر کا سال تھا جب حضرت رقیہؓ کا انتقال ہوا تو ربیع الاول میں حضرت عثمانؓ نے حضرت ام کلثومؓ کے ساتھ نکاح کر لیا۔ بخاری میں ہے کہ جب حضرت حفصہؓ بیوہ ہوئیں تو حضرت عمرؓ نے حضرت عثمانؓ کے ساتھ نکاح کا پیغام دیا۔ حضرت عثمانؓ نے ٹال دیا۔ لیکن دوسری روایتوں میں ہے کہ جب آنحضرت ﷺ کو یہ خبر معلوم ہوئی تو آپ ﷺ نے حضرت عمرؓ سے کہا "میں تم کو عثمانؓ سے بہتر شخص کا پتا بتاتا ہوں اور عثمان کے لیے تم سے بہتر شخص ڈھونڈتا ہوں تم اپنی لڑکی کی شادی مجھ سے کر دو اور میں اپنی لڑکی کی شادی عثمان سے کر دیتا

ابراہیم کو گود میں لیتے اور چومتے' اُم سیف کے شوہر لوہار تھے اس لئے گھر دھوئیں سے بھرا رہتا تھا لیکن آنحضرت ﷺ باوجود نفاست طبع گوارا فرماتے۔

ابراہیم نے اُم سیف ہی کے یہاں انتقال کیا۔ آنحضرت ﷺ کو خبر ہوئی تو عبدالرحمٰن بن عوف کے ساتھ تشریف لائے۔ نزع کی حالت تھی' گود میں اٹھا لیا' آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے' عبدالرحمٰن بن عوف نے کہا یا رسول اللہ! آپ کی یہ حالت ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا یہ رحمت ہے۔

عرب کا خیال تھا کہ جب کوئی بڑا شخص مر جاتا ہے تو چاند میں گہن لگ جاتا ہے' اتفاق سے جس روز حضرت ابراہیم نے وفات پائی سورج میں گہن لگ گیا تھا۔ عام طور پر مشہور ہو گیا کہ یہ انکی موت کا اثر ہے' آنحضرت ﷺ کو معلوم ہوا تو فرمایا "چاند اور سورج خدا کی نشانیاں ہیں' کسی کی موت سے ان میں گہن نہیں لگتا"۔

چھوٹی سی چارپائی پر جنازہ اٹھایا گیا۔ آنحضرت ﷺ نے خود نماز جنازہ پڑھائی' عثمانؓ بن مظعون کی قبر کے متصل دفن ہوئے۔ قبر میں فضلؓ بن عباس اور اسامہؓ نے اتارا۔ آنحضرت ﷺ قبر کے کنارے کھڑے تھے' قبر پر پانی چھڑکا گیا' اور اس پر ایک امتیازی علامت قائم کی گئی۔

ابوداؤد اور بیہقی کی روایت کے موافق دو مہینے دس دن کی عمر پائی۔ ذی الحجہ ۸ھ میں پیدا ہوئے تھے' اس روایت کی بنا پر ۹ھ میں انتقال ہوا۔ واقدی کے نزدیک ماہ ربیع الاول ۱۰ھ میں وفات کی' اس لحاظ سے تقریباً پندرہ مہینے زندہ رہے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ سولہ مہینے آٹھ دن کی عمر پائی' بعض لوگوں نے مدت حیات ایک برس دس ماہ چھ دن لکھی ہے لیکن صحاح میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ ابراہیم کا ۱۸ مہینے تک زندہ رہے۔

ازواج مطہراتؓ کے ساتھ معاشرت

ازواج مطہراتؓ کی تعداد نو تک پہنچی تھی ان میں عام اصول فطرت کے موافق ہر مزاج اور ہر طبیعت کی عورتیں تھیں باہم رشک اور منافست بھی تھی۔ آنحضرت ﷺ چونکہ ہمیشہ فقر و فاقہ سے بسر کرتے تھے ان کی خورش و پوشش کا انتظام بھی خاطر خواہ نہیں ہو سکتا تھا اس لیے ان کو شکایت کا موقع ملتا تھا۔ ان تمام حالات کے ساتھ بھی آپ ﷺ کی جبین خلق پر کبھی شکن نہیں پڑنے پائی۔ حضرت خدیجہؓ کے ساتھ آپ ﷺ کو بے انتہا محبت تھی جب وہ عقد نکاح میں آئیں تو آنحضرت ﷺ کا عنفوان شباب اور ان کا بڑھاپا تھا تاہم آپ ﷺ نے ان کی وفات تک کوئی شادی نہیں کی۔ وفات کے بعد بھی جب کبھی ان کا ذکر آ جاتا تو آپ ﷺ جوش محبت سے بے تاب ہو جاتے۔ (تفصیل اوپر گزر چکی ہے)

حضرت خدیجہؓ کے بعد حضرت عائشہؓ ازواج مطہرات میں سب سے محبوب تر تھیں لیکن محبت کے اسباب وہ نہ تھے جو عام انسانوں میں پائے جاتے ہیں۔ حسن صورت میں حضرت صفیہؓ ان سے بڑھ کر تھیں اور کمسن بھی تھیں دیگر ظاہری نکات میں بھی دیگر ازواج ان سے کم نہ تھیں لیکن حضرت عائشہؓ کی قابلیت ذاتی، قوت اجتہاد، دقت نظر، وسعت معلومات ایسے اوصاف تھے جو ان کی ترجیح کا اصلی سبب تھے۔

ایک دفعہ چند ازواج مطہراتؓ نے حضرت فاطمہ زہراؓ کو سفیر بنا کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں بھیجا۔ جناب سیدہؓ خدمت اقدس میں حاضر ہوئیں حسب دستور کے موافق پہلے اذن طلب کیا اجازت ملی تو سامنے آئیں اور عرض کی کہ ازواج مطہراتؓ نے مجھ کو وکیل بنا کر بھیجا ہے کہ آپ ابوبکرؓ کی بیٹی کو ہم پر کیوں ترجیح دیتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا "جان پدر! کیا تم اس کو نہیں چاہتیں جس کو میں چاہتا ہوں" جناب سیدہؓ کے لیے اتنا ہی کافی تھا واپس ہو کر ازواج مطہرات سے کہا میں اس معاملہ میں دخل نہ دوں گی۔

اب اس خدمت (سفارت) کے لیے حضرت زینبؓ انتخاب کی گئیں کیونکہ ازواج میں سے حضرت زینب کو خصوصیت کے ساتھ حضرت عائشہؓ کی ہمسری کا دعویٰ تھا اس لیے وہی اس خدمت کے لیے زیادہ موزوں تھیں انہوں نے یہ پیغام بڑی دلیری سے ادا کیا اور بڑے زور کے ساتھ یہ ثابت کرنا چاہا کہ حضرت عائشہؓ اس رتبہ کی مستحق نہیں ہیں۔ حضرت عائشہؓ چپ سن رہی تھیں اور رسول اللہ ﷺ کے چہرہ کی طرف دیکھتی جاتی تھیں حضرت زینبؓ جب تقریر کر چکیں تو مرضی پا کر کھڑی ہوئیں اور اس زور و شور کے ساتھ تقریر کی کہ حضرت زینبؓ لاجواب ہو کر رہ گئیں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "کیوں نہ ہو ابوبکرؓ کی بیٹی ہے"۔ [1]

آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ شادی کرنے کے لیے عورت کا انتخاب چار وصف کی بنا پر ہو سکتا ہے اول

۱۔ یہ واقعہ پوری تفصیل کے ساتھ بخاری و مسلم و دیگر احادیث کی کتابوں میں ہے۔ الفاظ روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں [illegible] صرف [illegible] اور ایک دوسرے سے [illegible] جیسا کہ عام طور پر [illegible] ہیں یہ نظری ہے۔ حضرت عائشہؓ نے [illegible] بیان کی [illegible] کا جواب [illegible]۔

گئیں۔ [1]

ایک دفعہ حضرت عائشہؓ آنحضرت ﷺ سے برہم ہو کر بلند آواز سے باتیں کر رہی تھیں۔ اتفاقاً حضرت ابوبکرؓ آگئے حضرت عائشہؓ کو پکڑ کر تھپڑ مارنا چاہا کہ تو رسول اللہ ﷺ سے چلا کر بولتی ہے۔ آنحضرت ﷺ بیچ میں آگئے اور حضرت عائشہؓ کے آڑے آ گئے۔ حضرت ابوبکرؓ غصہ میں بھرے ہوئے باہر چلے گئے۔ آنحضرت ﷺ نے حضرت عائشہؓ سے کہا کیوں کس طرح تم کو بچایا؟ چند روز کے بعد حضرت ابوبکرؓ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آئے تو وہ حالت بدل چکی تھی۔ بولے مجھ کو بھی صلح میں شریک کیجئے جیسا کہ اس موقع پر میں نے جنگ میں شرکت کی تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا "ہاں اور ہاں"۔ [2]

ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا کہ "تم مجھ سے جب ناراض ہوتی ہو تو میں سمجھ جاتا ہوں"۔ بولیں کیونکر؟ ارشاد ہوا جب تم خوش رہتی ہو (اور کسی بات پر قسم کھاتی ہو) تو یوں قسم کھاتی ہو "محمد کے خدا کی قسم" اور جب ناراض ہو جاتی ہو تو کہتی ہو "ابراہیم کے خدا کی قسم"۔ حضرت عائشہؓ نے کہا "ہاں یا رسول اللہ! میں صرف آپ کا نام چھوڑ دیتی ہوں"۔ [3]

حضرت عائشہؓ شادی کے وقت بہت کمسن تھیں اور لڑکیوں کے ساتھ کھیلا کرتی تھیں۔ آنحضرت ﷺ اتفاقاً آجاتے تو لڑکیاں بھاگ جاتیں آپ ﷺ ان کو بلا کر حضرت عائشہؓ کے پاس بھیج دیا کرتے۔ [4]

حبشی ایک چھوٹا سا نیزہ رکھتے ہیں جس کو حراب کہتے ہیں اور جس طرح ہمارے ملک میں پٹہ ہلاتے ہیں حبشی اس سے کھیلتے ہیں ایک دفعہ عید کے دن حبشی یہ تماشا کر رہے تھے حضرت عائشہؓ نے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی آنحضرت ﷺ آگے کھڑے ہو گئے حضرت عائشہؓ دوش مبارک پر رخسار رکھ کر تماشا دیکھتی تھیں اور دیر تک دیکھتی رہیں یہاں تک کہ آپ ﷺ نے فرمایا کیوں ابھی تک تم سیر نہیں ہوئیں؟ بولیں نہیں۔ آپ ﷺ چپ ہو رہے یہاں تک کہ خود تھک کر ہٹ گئیں۔

ایک دفعہ حضرت عائشہؓ گڑیوں سے کھیل رہی تھیں آنحضرت ﷺ باہر سے تشریف لائے گڑیوں میں ایک گھوڑا بھی تھا جس کے پر بھی تھے آپ ﷺ نے فرمایا یہ کیا ہے گھوڑوں کے تو پر نہیں ہوتے۔ بولیں کہ حضرت سلیمانؑ کے گھوڑوں کے پر تو تھے آپ ﷺ نے تبسم فرمایا۔ [5] عوام میں مشہور ہے کہ پہلے گھوڑوں کے پر ہوتے تھے حضرت سلیمانؑ نے اس بنا پر کہ گھوڑوں کی سیر میں ان کی نماز قضا ہو گئی تھی پر کٹوا دیئے اس وقت سے پر جاتے رہے لیکن قرآن

---

1. بخاری میں یہ روایت کتاب النکاح کے ذیل میں ہے لیکن ازواج کے نام نہیں۔ نسائی میں ان کی تصریح ہے لیکن روایت میں کسی قدر اختلاف ہے۔
2. ابوداؤد کتاب الادب باب ماجاء فی المزاح۔
3. صحیح مسلم۔
4. ایضاً۔
5. ابوداؤد کتاب الادب

اب بھی باقی ہے، حضرت عائشہؓ نے اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا تھا۔

ایک دفعہ آپ ﷺ نے حضرت عائشہؓ سے کہا کہ "آؤ تیز قدمی میں مقابلہ کریں" حضرت عائشہؓ اس وقت تک دبلی پتلی تھیں، آگے نکل گئیں، جب سن زیادہ ہوا اور بدن بھاری ہو گئیں تو پھر مسابقت کی نوبت آئی اب کے وہ پیچھے رہ گئیں آپ ﷺ نے فرمایا یہ اس دن کا جواب ہے۔ [1]

ازواج مطہرات اور اہل وعیال کی سادہ زندگی:

انسان بذات خود تو قناعت کر سکتا ہے، سخت سے سخت تکلیفیں اٹھا سکتا ہے، زخارف دنیوی کو لات مار سکتا ہے لیکن وہ اپنے اعزہ و اقربا یا بالخصوص عزیز ترین اولاد کو اس قسم کی سادہ اور متقشفانہ زندگی بسر کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں جن لوگوں نے زاہدانہ زندگی بسر کی ہے انہوں نے اپنے آپ کو ہمیشہ اہل و عیال کے جھگڑوں سے الگ رکھا ہے، دنیا کی مذہبی تاریخ میں صرف آنحضرت ﷺ کی زندگی اس کلیہ کی ایک مستثنیٰ مثال ہے۔ آپ ﷺ کے بیبیاں تھیں جن میں بعض ناز و نعمت میں پلی تھیں اور اکثر معزز گھرانوں سے تعلق رکھتی تھیں اس لیے ان کا قدرتی میلان غذاہائے لطیف اور لباس ہائے فاخرہ کی طرف ہو سکتا تھا، حضور صغیر السن بچے تھے جن کو کھانے پینے کی ہر خوشگوار اور خوشنما چیز اپنی طرف مائل کر سکتی تھی۔ آنحضرت ﷺ کو جیسا کہ اوپر کے واقعات سے معلوم ہوا ہوگا اعزہ و اولاد اور ازواج مطہراتؓ کے ساتھ سخت محبت تھی آپ ﷺ نے رہبانیت کا بھی قلع قمع کر دیا تھا اور فتوحات کی کثرت سے مدینہ میں مال و زر کے خزانے لگا دیئے تھے لیکن بایں ہمہ آنحضرت ﷺ نے اپنی ذات کی طرح ان کو بھی زخارف دنیوی کا خوگر نہیں بنایا بلکہ ہر موقع پر روک ٹوک کی اس بنا پر آپ ﷺ کے تمام خاندان کی زندگی آپ کے اسوۂ حسنہ کا اعلیٰ ترین مظہر بن گئی۔

حضرت فاطمہؓ آپ ﷺ کی محبوب ترین اولاد تھیں، لیکن انہوں نے آپ ﷺ کی محبت سے کوئی دنیوی فائدہ نہیں اٹھایا، ان کی عام خانگی زندگی یہ تھی کہ اس قدر چکی پیستی تھیں کہ ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے تھے بار بار مشک میں پانی بھر بھر کر لانے سے سینے پر گٹے پڑ گئے تھے، گھر میں جھاڑو دیتے دیتے کپڑے چیکٹ ہو جاتے تھے، چولہے کے پاس بیٹھتے بیٹھتے کپڑے دھوئیں سے سیاہ ہو جاتے تھے، لیکن بایں ہمہ جب انہوں نے آنحضرت ﷺ سے ایک بار گھر کے کاروبار کیلئے ایک لونڈی مانگی اور ہاتھ کے چھالے دکھائے تو آپ ﷺ نے صاف انکار کر دیا کہ یہ فقراء و یتامیٰ کا حق ہے۔ [2]

ایک دفعہ حضرت فاطمہؓ کے پاس آئے دیکھا کہ انہوں نے ناداری سے اس قدر چھوٹا دوپٹہ اوڑھا ہے کہ سر ڈھانکتی ہیں تو پاؤں کھل جاتے ہیں اور پاؤں چھپاتی ہیں تو سر برہنہ ہو جاتا ہے۔ [3]

صرف یہی نہیں کہ خود عام طریقہ اظہار محبت کے خلاف ان کو آرائش و زیب و زینت کی کوئی چیز نہیں دیتے تھے بلکہ اس قسم کی جو چیزیں ان کو دوسرے ذرائع سے ملتی تھیں ان کو بھی ناپسند فرماتے تھے چنانچہ ایک دفعہ حضرت علیؓ نے ان کو

---

۱ ابوداؤد۔

۲ ابوداؤد۔

۳ ایضاً۔

سونے کا ایک ہار دیا آپ ﷺ کو معلوم ہوا تو فرمایا کیوں فاطمہ! کیا لوگوں سے یہ کہلوانا چاہتی ہو کہ رسول اللہ ﷺ کی لڑکی آگ کا ہار پہنتی ہے چنانچہ حضرت فاطمہؓ نے اس کو فوراً بیچ کر اس کی قیمت سے ایک غلام خرید لیا۔[1]

ایک دفعہ آپ ﷺ کسی غزوہ سے تشریف لائے حضرت فاطمہؓ نے بطور خیر مقدم کے گھر کے دروازہ پر پردہ لٹکایا اور امام حسنؓ وامام حسینؓ کو چاندی کے کنگن پہنائے۔ آپ ﷺ حسب معمول حضرت فاطمہؓ کے یہاں آئے تو اس سامان کو دیکھ کر واپس چلے گئے حضرت فاطمہؓ کو آپ ﷺ کی ناپسندیدگی کا حال معلوم ہوا تو پردہ چاک کر دیا اور بچوں کے ہاتھ سے کنگن نکال ڈالے بچے آپ ﷺ کی خدمت میں روتے ہوئے آئے آپ نے فرمایا "یہ میرے اہل بیت ہیں میں یہ نہیں چاہتا کہ وہ ان تکلفات دنیا سے آلودہ ہوں اس کے بدلے فاطمہؓ کے لیے ایک عصب کا ہار اور ہاتھی دانت کے دو کنگن خرید لاؤ"۔[2] ازواج مطہرات کے ساتھ آپ ﷺ کو جو محبت تھی اس کا اظہار بھی دنیاوارانہ طریقے سے نہیں ہوتا تھا چنانچہ ازواج مطہرات نے جب اچھے کھانے اور اچھے لباس کی خواہش ظاہر کی تو آپ ﷺ نے ان سے ایلاء کر لیا۔ تمام ازواج میں آپ ﷺ کو حضرت عائشہؓ سب سے زیادہ محبوب تھیں لیکن یہ محبت رنگین لباس اور حسین زیوروں کی صورت میں کبھی نہیں ظاہر ہوئی۔ تمام بیبیوں کا جو لباس تھا وہی حضرت عائشہؓ کا بھی تھا چنانچہ وہ خود فرماتی تھیں۔

﴿ما کانت لاحدانا الا ثوب واحد﴾ (بخاری جلد اول صفحہ ۴۵)

ہم تمام بیبیوں کے پاس صرف ایک ایک جوڑا کپڑا تھا۔

مگر پھر بھی اس کے خلاف ان کے بدن پر زینت کی آرائش کے سروسامان نظر آتے تو آنحضرت ﷺ ان کو منع فرماتے۔ ایک مرتبہ انہوں نے سونے کے کنگن پہنے (مسکہ) آپ ﷺ نے فرمایا "اگر ورس کے کنگن زعفران سے رنگ کر پہنتیں تو بہتر ہوتا"۔ تمام اہل وعیال و خانوادہ نبوت کو ممانعت تھی کہ وہ پر تکلف ریشمی لباس اور سونے کے زیور استعمال کریں۔ آپ ﷺ ان سے فرمایا کرتے تھے کہ "اگر تم کو اس کی تمنا ہے کہ یہ چیزیں جنت میں ملیں تو دنیا میں ان کے پہننے سے پرہیز کرو"۔

انتظام خانگی:

اگرچہ ازواج مطہرات کی تعداد ایک زمانہ میں ۹ تک پہنچ گئی تھی اور اس وجہ سے خانہ داری کے بہت سے جھگڑے تھے تاہم آپ ﷺ کو خود بنفس نفیس ان چیزوں سے سروکار نہ تھا اپنی ذات کی نسبت تو التزام تھا کہ جو آتا تھا وہ اسی دن صرف ہو جاتا یہاں تک کہ اگر روپیہ لاکر کچھ باقی رہ جاتا تو آپ اس وقت تک گھر میں نہ جاتے جب تک وہ بھی کار خیر میں صرف نہ ہو جاتا لیکن ازواج مطہرات اور مہمانوں کے کھانے پینے رہنے سہنے کا انتظام حضرت بلالؓ کے متعلق تھا ابوداؤد میں عبداللہ ہوزنی سے روایت ہے کہ میں نے حضرت بلالؓ سے پوچھا کہ رسول اللہ ﷺ کے خانگی انتظام کا کیا حال تھا؟ انہوں نے کہا آنحضرت ﷺ کا تمام کاروبار میرے سپرد تھا اور آغاز سے آخر زمانہ وفات تک

---

1. نسائی کتاب الزینۃ۔
2. نسائی کتاب الزینۃ۔

میرے ہاتھ میں رہا تھا۔ معمول تھا کہ جب کوئی نادار مسلمان آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتا تو مجھ کو ارشاد ہوتا میں جا کر کسی سے قرض لاتا اور اس کے کھانے کپڑے کا انتظام کر دیتا۔ [1]

اہل و عیال کے مصارف کا انتظام:

ازواج مطہراتؓ کے لیے یہ انتظام تھا کہ بنو نضیر کے نخلستان میں ان کا حصہ مقرر کر دیا گیا تھا وہ تقریباً تقسیم کر دیا جاتا جو سال بھر کے مصارف کے لیے کافی ہوتا۔ [2] خیبر فتح ہوا تو تمام ازواج کے لیے فی کس ۸۰ وسق کھجور اور ۲۰ وسق جو سالانہ مقرر ہو گیا تھا۔ وسق ۶۰ صاع کا ہوتا ہے۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں بعض ازواج نے جن میں حضرت عائشہؓ بھی تھیں پیداوار کے بدلے زمین لے لی۔ [3]

﴿تم المجلد الثاني من السيرة النبوية على صاحبها الصلوٰة والتحية﴾

---

[1] ابوداؤد باب فی الامام یقبل ہدایا المشرکین۔

[2] بخاری ص ۸۰۲۔

[3] بخاری کتاب المزارعۃ جلد اول ص ۳۱۳۔

القاموس الوحید

جامع ترین مکمل عربی اردو لغت

تالیف

مولانا وحید الزماں قاسمی کیرانوی

استاذ حدیث و ادب عربی و معاون مہتمم دارالعلوم دیوبند

مراجعہ و تقدیم

مولانا عمید الزماں قاسمی کیرانوی

ادارہ اسلامیات

لاہور — کراچی